Zero Point
Javed Chaudhry

Regarded as Best Urdu Columnist, Javed Chaudhry is undoubtedly one of the most prominent journalists of Pakistan. Many domestic and international surveys have established that his column titled Zero Point is the most read column in Pakistan. A proof of his popularity is that Zero Point-I, the first collection-book of his columns has been reprinted in 72 editions since 2000 while the second book, "Zero Point-II, published in 2005, has already gone through 37 editions. Both these books and also Zero Point-III, IV V and VI are the current best sellers in Pakistan, which is another acid test of Mr. Chaudhry's popularity among the masses.

All Pakistan Newspapers Society (APNS) declared him the Best Columnist in 1997 and 1998. The Government of Pakistan awarded him with an ?Excellency Award? in 1998 for his outstanding performance in national journalism. He has, over the years, emerged as one of the most popular opinion makers in Pakistan and has been contributing his intellects to the vernacular press. With his distinctive writing style, he has raised many issues of social, political and economic importance and succeeded in leaving a mark on the thinking of his readers.
He holds a master degree in Mass Communication from Islamia University, Bahawalpur (1991) and the university awarded him a gold medal for his excellent academic performance.
A career journalist, Javed Chaudhry has held many positions in the national press. In 1997, he joined Daily Jang, as a columnist. In 2006, Javed Chaudhry joined Daily Express and is one of the leading members of the daily newspaper's team of Columnists. He is also the anchor of a popular TV current affairs program "Kal Tak". According to latest opinion poll surveys, the TV program Kal Tak ranks among the top three current affairs programs in Pakistan. He has also attended prestigious

institutions like Columbia University and John Hopkins University for courses on Media Management, Creative Writing, and Opinion Building. Mr. Chaudhary is also a personal trainer and delivers lectures on talent discovery and modern media related fields. He is on the panel of many national universities to hone the leadership skills among the youth. Many apex national institutions, including National Police Academy and Civil Services Academy, regularly invite him for his lectures & analysis on matters of national and international importance.
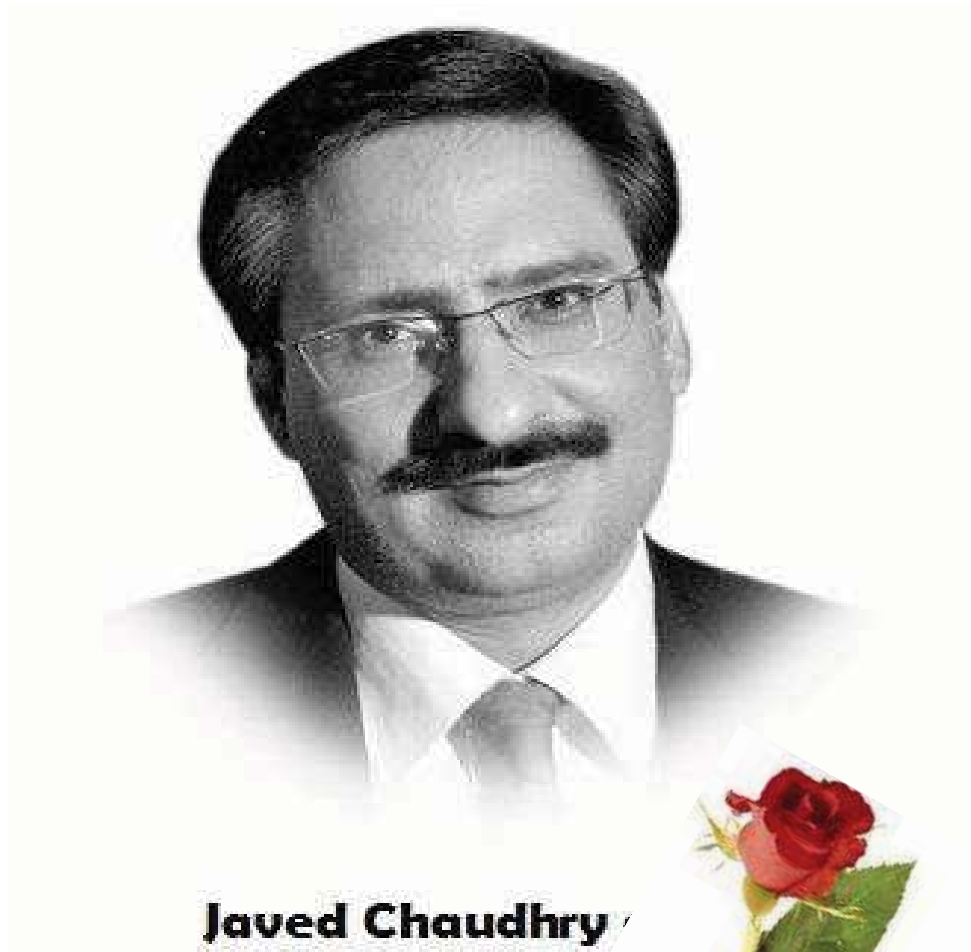
My this achievement is dedicated to my Mother

یااللہ تیرا شکر ہے
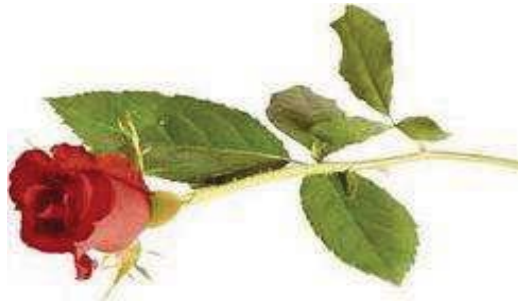
دنیا میں تین جگہیں ایسی ہیں جہاں آپ زندگی کی اصل حقیقت جان سکتے ہیں‘ ہم کیا ہیں‘ ہماری اوقات کیا ہے‘ ہماری حسرتوں‘ ہماری خواہشوں اور ہماری سماجی‘ معاشرتی اور معاشی ترقی کی حیثیت کیا ہے اور ہماری نفرتوں‘ ہماری رقابتوں اور ہماری دشمنیوں کی اصل حقیقت کیا ہے؟ آپ مہینے میں ایک بار ان جگہوں کی وزٹ کر لیا کریں آپ کو اپنے ظاہر اور باطن دونوں کی اوقات سمجھ آ جائے گی۔ میں اکثر ان جگہوں پر جاتا ہوں اور کسی کونے میں چپ چاپ بیٹھ کر زندگی کی اصل حیثیت دیکھتا ہوں اور پھر پوری طرح چارج ہو کر واپس آ جاتا ہوں۔ یہ تین جگہیں قبرستان‘ ہسپتال اور جیل ہیں۔ آپ کبھی اپنا سب سے قیمتی سوٹ پہنیں‘ شیو کریں‘ جسم پر خوشبو لگائیں‘ جوتے پالش سے چمکائیں‘ اپنی سب سے مہنگی گاڑی نکالیں اور شہر کے سب سے بڑے قبرستان میں چلے جائیں‘ آپ ایک کونے سے دوسرے کونے تک قبروں کے کتبے پڑھنا شروع کریں‘ آپ تمام قبروں کا سٹیٹس دیکھیں‘ آپ کو محسوس ہو گا ان قبروں میں سوئے ہوئے زیادہ تر لوگ سٹیٹس کے لحاظ سے آپ سے کہیں آگے تھے‘ یہ لوگ آپ سے زیادہ مہنگے سوٹ پہنتے تھے‘ دن میں دو‘ دو بار شیو کرتے تھے‘ ان کے پاس زیادہ مہنگی پرفیومز تھیں‘ یہ اطالوی جوتے خریدتے تھے اور ان کے پاس آپ سے زیادہ مہنگی اور لگژری گاڑیاں تھیں لیکن آج یہ مٹی میں مل کر مٹی ہو چکے ہیں اور قبر کا کتبہ ان کی واحد شناخت رہ گیا ہے۔ آپ کو محسوس ہو گا یہ لوگ رتبے‘ اختیار اور تکبر میں بھی آپ سے بہت آگے تھے‘ مکھیاں بھی ان کی ناک پر بیٹھنے سے پہلے سو سو بار سوچتی تھیں‘ ہوائیں بھی ان کے قریب پہنچ کر محتاط ہو جاتی تھیں اور یہ کبھی اس زمین‘ اس ملک اور اس سسٹم کیلئے ناگزیر سمجھے جاتے تھے لیکن پھر کیا ہوا‘ ایک سانس ان کے پھیپھڑوں سے باہر نکلی اور واپس جانے کا راستہ بھول گئی اور اس کے بعد یہ لوگ دوسروں کے کندھوں پر سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے اور زندگی انہیں فراموش کر کے واپس لوٹ گئی اور اب ان کا مرتبہ‘ ان کے اختیارات‘ ان کا تکبر اور ان کی ناگزیریت دو فٹ کے کتبے میں سمٹ کر رہ گئی۔ آپ قبرستان کی کسی شکستہ قبر کے سرہانے بیٹھ جائیں‘ اپنے اردگرد پھیلی قبروں پر نظر ڈالیں اور اپنے آپ سے یہ سوال پوچھیں ”میرے پاس کتنا وقت باقی ہے؟“ آپ کو اس سوال کے جواب میں تاریکی‘ سناٹا اور بے بسی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ آپ اسی طرح کبھی کبھی ہسپتالوں کا چکر بھی لگا لیا کریں‘ آپ کو وہاں اپنے جیسے سینکڑوں ہزاروں لوگ ملیں گے‘ یہ لوگ بھی چند دن‘ چند گھنٹے پہلے تک آپ کی طرح دوڑتے‘ بھاگتے‘ لپکتے اور شور مچاتے انسان تھے‘ یہ بھی آپ کی طرح سوچتے تھے کہ یہ زمین پر ایڑی رگڑیں گے تو تیل کے چشمے پھوٹ پڑیں گے‘ ان کا بھی خیال تھا یہ پاؤں مار کر زمین دہلا دیں گے اور ان کو بھی یہ گمان تھا کہ دنیا کا کوئی وائرس‘ کوئی جراثیم اور کوئی دھات انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی لیکن پھر ایک دن زندگی ان کیلئے عذاب بن گئی‘ ان کے پاؤں‘ ان کے ہاتھ‘ ان کی آنکھیں‘ ان کے کان‘ ان کا جگر‘ ان کا دل‘ ان کا دماغ اور ان کے گردے ان کے ساتھ بے وفائی کر گئے اور یہ اپنے ٹھنڈے گرم محلوں سے نکل کر ہسپتال کے بدبودار کوریڈورز کے مسافر بن گئے‘ آپ ہسپتالوں کی پرائیویٹ وارڈز اور مہنگے پرائیوٹ ہسپتالوں کا چکر ضرور لگایا کریں‘ آپ کو وہاں وہ لوگ ملیں گے جو مہنگے سے مہنگا ڈاکٹر اور قیمتی سے قیمتی ترین دوا خرید سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بے بسی کے عالم میں ہسپتالوں میں پڑے ہیں‘ کیوں؟ کیونکہ انسان ڈاکٹر اور

دوا تو خرید سکتا ہے لیکن شفا نہیں اور یہ لوگ قدرت کے اس قانون کے قیدی بن کر ہسپتالوں میں پڑے ہیں' آپ مریضوں کو دیکھیں' پھر اپنے آپ کو دیکھیں' اللہ کا شکر ادا کریں اور صحت کی اس مہلت کو مثبت طریقے سے استعمال کریں۔

آپ جیلوں کا چکر بھی لگایا کریں' آپ کو وہاں ایسے سینکڑوں ہزاروں لوگ ملیں گے جو کبھی آپ کی طرح آزاد پھرتے تھے' یہ رات کے تین بجے کافی پینے نکل جاتے تھے' یہ سردیوں کی یخ ٹھنڈی راتیں اپنے نرم اور گرم بستر پر گزارتے تھے لیکن یہ کسی دن کسی اپنے حیوانی جذبے کے بہکاوے میں آ گئے' یہ کسی کمزور لمحے میں بہک گئے اور طیش میں' عیش میں یا پھر خوف میں ان سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو گئی جس کی پاداش میں یہ لوگ سلاخوں کے پیچھے پہنچ گئے اور یہ اب جیل کے معمول کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ آپ سزائے موت کے سکھ قیدیوں سے بھی ضرور ملیں' آپ کو ان سے مل کر محسوس ہو گا ہم لوگ رقابت کے جذبے کو ایک لمحے کا دینے کیلئے' ہم اپنی انا کو گنے کے رس کا ایک گلاس پلانے کیلئے' ہم ایک منٹ کیلئے اپنی ناک کو دوسروں کی ناکوں سے بلند رکھنے کیلئے اور ہم دوسروں کی ضد کو کچلنے کیلئے بعض اوقات ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ موت بھی ہم پر ترس کھانے سے انکار کر دیتی ہے اور ہم جیل کی سلاخیں پکڑ کر اور اللہ سے معافی مانگ مانگ کر دن کو رات اور رات کو دن میں ڈھلتا ہوا دیکھتے ہیں لیکن ہماری سزا پوری نہیں ہوتی۔ آپ جیل کے قیدیوں کو سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہو کر اپنی بیویوں کو حسرتوں سے دیکھتے ہوئے دیکھئے' آپ ان کی کانپتی ہوئی ان انگلیوں کو دیکھئے جو اپنے بچوں کے لمس کو ترس گئی ہیں' آپ ان کے بے قرار پاؤں دیکھئے جنہیں آزادی کا احساس چکھے ہوئے کئی برس بیت گئے ہیں اور آپ ان کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے ان رت جگوں کی فصلیں بھی دیکھئے جو انہوں نے اپنی غلطی' اپنی کوتاہی اور اپنے جرم پر معافی مانگ مانگ کر اگائی ہیں لیکن قدرت یہ فصل کاٹنے پر راضی نہیں ہو رہی۔

آپ ان لوگوں کو دیکھئے' اپنے اوپر نگاہ ڈالئے اور پھر یہ سوچیے آپ پر بھی دن میں ایسے سینکڑوں ہزاروں کمزور لمحے آتے ہیں' آپ بھی لالچ کے بہکاوے میں آتے ہیں' آپ بھی غرور اور تکبر کے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ جاتے ہیں' آپ بھی رقابت کے نرغے میں آ کر دوسرے لوگوں کی زندگیوں کو کھیل بنا لیتے ہیں' آپ بھی غیرت کے سیراب میں الجھ کر دوسروں کا خون پینے کا فیصلہ کرتے ہیں اور آپ بھی دوسروں کے مال کو اپنا بنانے کے منصوبے بناتے ہیں لیکن کوئی نادیدہ ہاتھ' کسی دوست کی کوئی نصیحت اور حالات کی کوئی مہربانی آپ کو روک لیتی ہے' آپ باز آ جاتے ہیں اور یہ بھی ہوتا ہے قدرت آپ پر خاص مہربانی کرتے ہوئے آپ کی خامیوں' آپ کی کوتاہیوں' آپ کی غلطیوں' آپ کے گناہوں اور آپ کے جرائم پر پردہ ڈال دیتی ہے' یہ آپ کو گواہیوں' ثبوتوں' قانون اور کچہریوں سے بچائے رکھتی ہے لیکن آپ قدرت کی اس مہربانی کو اپنی چالاکی' اپنا کمال سمجھ لیتے ہیں' آپ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں آپ چارلس سوبھراج ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے قانون کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کیلئے دنیا میں بھیجا ہے اور دنیا کا کوئی قانون' کوئی ضابطہ آپ کو کبھی پکڑ نہیں سکے گا۔

آپ کو قبرستانوں' ہسپتالوں اور جیلوں میں بے گناہ' معصوم اور انتہائی شریف لوگ بھی ملیں گے' یہ لوگ کبھی کوئی ضابطہ' کوئی اصول نہیں توڑتے تھے' یہ اس قدر محتاط لوگ تھے کہ یہ آب زم زم بھی ابال کر پیتے تھے' یہ

اور صبح پانچ بجے اٹھ جاتے تھے اور ان سے پوری زندگی کوئی بے اعتدالی‘ کوئی غفلت سرزد نہیں ہوئی‘ آپ ایسے لوگ بھی دیکھیں گے جو آرام سے اپنے گھر میں سوئے ہوئے تھے‘ جو اپنی لین میں گاڑی چلا رہے تھے یا فٹ پاتھ پر اپنی سمت میں جا رہے تھے اور آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جنہوں نے پوری زندگی قانون کا احترام کیا‘ یہ تھانے کے سامنے گزرتے ہوئے سر جھکا لیتے تھے اور نیلی پیلی ہر قسم کی یونیفارم کو سلام کر کے آگے جاتے تھے اور جو دوسری جنگ عظیم کے دوران بننے والے قوانین کا بھی احترام کرتے تھے اور جنہوں نے آج بھی سائیکل پر بتی لگوا رکھی تھی لیکن پھر یہ لوگ دوسرے کردہ جرائم میں محبوس ہو گئے‘ یہ بے گناہ ہونے کے باوجود قانون کے نہ کھلنے‘ نہ ٹوٹنے والے دانتوں میں پھنس گئے‘ آپ کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو کھیرا کاٹنے سے پہلے اسے ڈیٹول سے دھوتے تھے لیکن یہ لوگ بھی ہسپتال کے مستقل مہمان بن گئے اور ایسے لوگ بھی جو فٹ پاتھ پر دوسروں کی موت کا نوالہ بن گئے‘ جو کسی آوارہ گولی کا نشانہ بن گئے یا پھر ان کے سر پر کوئی طیارہ آ کر گر گیا‘ آپ ان لوگوں کو دیکھئے اور اس کے بعد اپنے اوپر نگاہ ڈالئے اور پھر سوچئے یہ طیارہ آپ پر بھی گر سکتا ہے‘ دوسری لین سے کوئی گاڑی اڑ کر آپ کے موٹر سائیکل‘ آپ کی گاڑی پر بھی گر سکتی ہے اور ڈاکٹر اچانک آپ کو بھی کینسر کا مریض ڈکلیئر کر سکتے ہیں یا پھر آپ کے دل کے اندر بھی اچانک درد کی ایک لہر دوڑ سکتی ہے اور آپ کو کلمہ تک پڑھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ ہو سکتا ہے‘ یہ ہم بھی ہو سکتے ہیں لہٰذا آیئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور اس مہلت‘ اللہ تعالیٰ کی اس مہربانی پر اس کا شکریہ ادا کریں اور کبھی کبھی جیلوں‘ ہسپتالوں اور قبرستانوں میں بھی ایک گھنٹہ گزار لیا کریں کیونکہ یہ تین ایسی جگہیں ہیں جہاں گئے بغیر ہمیں زندگی کی اصل حقیقت‘ اپنی اوقات اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں کا اندازا نہیں ہو سکتا۔

وقت نہیں رکتا

چین کا نجومی بادشاہ کے دربار میں پیش ہو گیا' بادشاہ علم نجوم کے خلاف تھا' اس کا خیال تھا ستارہ شناسی ڈھونگ اور فریب ہے اور نجومی لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں لیکن وزیراعظم کا اصرار تھا یہ نجومی بادشاہ معظم کو حیران کر دے گا' آپ ایک بار اسے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دیں' بادشاہ نے ناچار اجازت دے دی یوں چین کا نجومی دربار میں پیش ہو گیا' بادشاہ نے اس سے پوچھا "میرا نام کیا ہے" نجومی نے ادب سے عرض کیا "حضور دنیا آپ کو اردشیر بابکان کے نام سے جانتی ہے" بادشاہ نے قہقہہ لگایا اور مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا "میں اپنا اصل نام جاننا چاہتا ہوں" نجومی نے حساب لگایا اور عرض کیا "حضور آپ وہ نام جاننا چاہتے ہیں جو آپ کی والدہ ماجدہ نے تجویز کیا تھا یا وہ جس سے آپ کے والد آپ کو پکارتے تھے یا پھر وہ جو آپ کی رضائی والدہ نے رکھا تھا" بادشاہ تھوڑا سا پریشان ہوا اور غور سے نجومی کی شکل دیکھنے لگا' نجومی نے تختی منگوائی' اس پر تینوں نام لکھے اور بادشاہ سلامت کو پیش کر دیئے' بادشاہ نام پڑھ کر پریشان ہو گیا' اس کے بعد بادشاہ نجومی سے پوچھتا رہا اور نجومی جواب دیتا رہا' نجومی کا ہر جواب درست تھا یہاں تک کہ بادشاہ نجومی کے فن کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا' سوال و جواب کا یہ سلسلہ رات تک جاری رہا' رات جب بادشاہ تھک گیا تو اس نے نجومی سے آخری سوال پوچھا' اس نے نجومی سے پوچھا "ہم آتش پرست ہیں' ہم آگ کو اپنا خدا مانتے ہیں' تم بتاؤ ہمارا مذہب کب تک زندہ رہے گا" نجومی نے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچیں اور ذرا سا سوچ کر بولا "بادشاہ سلامت آپ کا مذہب ڈیڑھ سو سال قائم رہے گا' آج سے ٹھیک ایک سو پچاس برس بعد ایک قوم ایران آئے گی' ایران فتح کرے گی اور آپ کا آتش کدہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بجھا دے گی" بادشاہ نے نجومی کو آرام کرنے کی اجازت دے دی' شاہی چراغ بجھایا اور بستر شاہی پر دراز ہو گیا' بادشاہ نے جوں ہی آنکھیں بند کیں' اسے اپنے مرحوم والد یاد آ گئے' بادشاہ کے والد نے اسے وصیت کی تھی "ہمارا مذہب دنیا کے آخری کونے اور آخری سانس تک پہنچنا چاہیے" بادشاہ اٹھ بیٹھا اور اس نے باقی رات ڈیڑھ سو سال کے اندیشوں میں کاٹ دی' یہ ایران کا مشہور بادشاہ اردشیر بابکان تھا' بابکان کے بارے میں کہا جاتا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے شیر کے ارادے اور ہاتھی کے فیصلے سے نواز رکھا تھا' وہ دل میں جو ٹھان لیتا تھا وہ اسے کر گزرتا تھا' اردشیر بابکان نے دوسرے دن جنتریاں بنانے والوں کو بلوایا اور دربار میں کھڑے ہو کر اعلان کر دیا "ہم حکم دیتے ہیں' ایران کے کیلنڈر کو تین سو سال پیچھے کر دیا جائے" بادشاہ کا حکم تھا چنانچہ تاریخ کو تین سو سال پیچھے دھکیل دیا گیا' بادشاہ کا خیال تھا اس اقدام سے وقت کے فرشتے مغالطہ کھا جائیں گے اور یوں آتش پرستی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا' اردشیر بابکان یہ بندوبست کر کے فوت ہو گیا اور اس کی جگہ نئے بادشاہوں نے لے لی' ان بادشاہوں نے بھی بابکان کے فیصلے کا احترام کیا لیکن وقت کے فرشتوں کا حساب آگے پیچھے نہ ہو سکا' ڈیڑھ سو سال ڈیڑھ سو سال ہی رہے اور پھر وہ لوگ ایران آئے' انہوں نے ایران فتح کیا اور آتش کدہ بجھا کر چلے گئے اور یوں اردشیر بابکان کو وقت کو تین سو سال پیچھے دھکیلنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

31 مئی اور یکم جون کی درمیانی رات گھڑی میرے سامنے میز پر پڑی تھی' ٹیلی ویژن پر بار بار اعلان ہو رہا تھا "عوام گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ آگے کر لیں" میں نے گھڑی اٹھائی اور بارہ بجے کو ایک بجے میں تبدیل کرنے لگا لیکن عین

اس وقت اردشیر بابکان تاریخ کے صفحات سے نکلا اور اس نے آ کر میری کلائی پکڑلی اُس کا کہنا تھا وقت کو آگے اور پیچھے کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' دس کلو لوہا اور دس کلو کپاس ایک برابر ہوتے ہیں' ہتھیلی پر رکھا بیج اور پتھروں میں بوئی گٹھلی کیلنڈر کو دو سو سال آگے کرنے سے درخت نہیں بن سکتی' جون کی تپتی دوپہریں جون کو دسمبر کہنے سے ٹھنڈی نہیں ہوتیں اور ابلتا ہوا پانی محض کیلنڈروں کو آگے پیچھے کرنے سے برف نہیں بنتا' انسان کا مقدر تاریخیں اور گھڑیاں بدلنے سے نہیں بدلا کرتا' اس کیلئے ارادے' عزم' ول اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہم لوگ محنت اور ارادے کا کام بھی گھڑیوں سے لینا چاہتے ہیں' میں نے ان باطل خیالات کو دماغ سے جھٹکنے کیلئے سر کو جھٹکے دیئے اور وقت کو وقت سے ملانے کیلئے گھڑی کی ناب تلاش کرنے لگا لیکن اس دوران شاہ ایران رضا شاہ پہلوی تاریخ کے اوراق سے نکلا اور میرے سامنے کھڑا ہو گیا' رضا شاہ پہلوی کی رگوں میں بھی اردشیر بابکان کا خون تھا چنانچہ اس نے بھی وقت کو شکست دینے کا فیصلہ کیا تھا' 1971ء میں شاہ ایران نے ایرانی شہنشاہیت کے 2500 سالہ جشن منانے کا فیصلہ کیا' اس نے پوری دنیا کے سربراہان کو اس جشن میں شرکت کی دعوت دی' جب دعوت نامے جاری ہو گئے تو پتہ چلا ایرانی شہنشاہیت کو ابھی محض ایک ہزار چار سو 64 سال گزرے ہیں اور اگر اس غلطی کی بھنک مغربی میڈیا کو ہو گئی تو وہ رائی کا پہاڑ بنا دے گا اور اس سے شاہ ایران کی سبکی ہو گی' معاملہ شاہ کے حضور پیش کیا گیا' بادشاہ نے چند سیکنڈ سوچا اور اس کے بعد وزیروں سے پوچھا" اڑھائی ہزار سال ہونے میں کتنے سال باقی ہیں" وزیروں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا" ایک ہزار 36 برس" بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیا اور عمائدین سلطنت کو حکم دیا" آج سے ایران کے کیلنڈر کو ایک ہزار 36 سال آگے کر دیا جائے" یہ بھی بادشاہ کا حکم تھا چنانچہ ایک ہفتے میں ایران کی ساری جنتریاں اور کیلنڈر جمع کئے گئے' انہیں سرے عام آگ لگا دی گئی اور عوام کو نئے کیلنڈر تھما دیئے گئے یوں تاریخ کا گیپ ختم ہو گیا شہنشاہیت کے اڑھائی ہزار سال پورے ہو گئے اور بادشاہ نے 12 اکتوبر 1971ء کو جشن منا لیا لیکن کیلنڈر کی یہ تبدیلی شاہ کے مسائل ختم نہ کر سکی' عوام کے دلوں میں سر اٹھاتی نفرت کا رخ نہ موڑ سکی' ایران میں انقلاب آیا اور محض آٹھ برسوں بعد کیلنڈر دوبارہ اصل پوزیشن پر بحال ہو گیا۔

شاہ ایران کو وقت کو شکست دینے کا خبط تھا' اس کے اس خبط سے اس کے تمام حواری سیاستدان اور تمام عمائدین واقف تھے' ایک دن وزیر اعظم عباس ہویدا اور مجلس شوریٰ کے صدر مہندس ریاضی بادشاہ کے پاس بیٹھے تھے' شاہ نے گھڑی دیکھی اور وزیر اعظم سے وقت پوچھا' وزیر اعظم نے عرض کیا" حضور شام کے چھ بجے ہیں" شاہ نے حیران ہو کر دوبارہ اپنی گھڑی دیکھی اور مجلس شوریٰ کے صدر سے بھی وقت پوچھا' مہندس ریاض نے فوراً عرض کیا" حضور چھ بجے ہیں" شاہ نے خفگی سے اپنی گھڑی اتاری اور غصے سے بولے" میری گھڑی ایک گھنٹہ پیچھے ہے" یہ سننے کی دیر تھی' وزیر اعظم اپنی نشست سے اٹھا' بھاگ کر شاہ کے پاس پہنچا' اس کے ہاتھ سے گھڑی اچک لی اور ادب سے عرض کیا" میں قربان جاؤں' آپ کے غلام یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ حضور گھڑی درست کرنے کی زحمت گوارہ کریں' آپ اپنی گھڑی کو ایسے ہی رہنے دیں' ہم ساڑھے تین کروڑ لوگ اپنی گھڑیاں ایک ایک گھنٹہ پیچھے کر لیتے ہیں" شاہ نے خوشی سے وزیر اعظم کو تھپکی دی' وزیر اعظم محل سے باہر آیا اور اس نے پورے ملک کی گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر دیں۔

گھڑیاں ایک گھنٹہ پیچھے کر دیں۔

یہ عباس ہویدا وہی وزیراعظم تھا جسے انقلاب کے بعد 7اپریل1979ء کو لاکھوں لوگوں کے سامنے سرِ عام پھانسی دے دی گئی تھی اور اس وقت ایران کی کوئی کلائی اور اس کلائی پر بندھی کوئی گھڑی اس کی پھانسی کی گھڑی کو نہ ٹال سکی اور یہ گھڑی آج تک چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے حکمران گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کر دیں' کیلنڈر کو تین سو سال پیچھے لے جائیں یا ایک ہزار 36 سال آگے لیکن بدقسمتی کی گھڑیاں نہیں ٹلتیں' وقت کے داغ نہیں دھلتے اور مسائل کے انبار ختم نہیں ہوتے' مسئلے صرف اور صرف مسئلے حل کرنے سے ختم ہوتے ہیں' اس ملک میں اگر لوڈ شیڈنگ ہے تو ہم خواہ اپنی گھڑیاں دس دس گھنٹے پیچھے کر لیں لیکن ہمارے بلب روشن نہیں ہوں گے' ہمارے پنکھے نہیں چلیں گے چنانچہ ہمیں بجلی کیلئے بجلی کا بندوبست کرنا پڑے گا' ہمیں ڈیم بنانے پڑیں گے' ہمیں نئے بجلی گھر لگانا پڑیں گے اور جب تک ہم یہ نہیں کریں گے ہم خواہ گھڑیوں کو روزانہ آگے یا پیچھے کرتے رہیں ہمارا یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا' انسان جلے ہوئے زخموں پر برف رکھ کر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے' لوگ بیمار کو ڈھول کی تھاپ سے زیادہ دیر تک نہیں بہلا سکتے اور معاشرے گھڑیوں کو آگے پیچھے کر کے زیادہ دیر تک وقت کو دھوکہ نہیں دے سکتے کہ وقت وہ خوفناک سچائی ہے جس کے سامنے فرعونوں کے سر بھی جھک گئے تھے اور جس کا رخ نمرود بھی نہیں بدل سکا تھا' وقت کسی کے کہنے پر رکتا ہے اور نہ ہی تھمتا ہے اور دنیا میں صرف وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو وقت کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چلتی ہیں' جو وقت کی دوست بن جاتی ہیں یا پھر وقت کو اپنا دوست بنا لیتی ہیں اور گھڑیوں اور کیلنڈروں سے دشمنی کرنے والی قومیں وقت کی دھول میں گم ہو جاتی ہیں اور ہم اگر وقت کی دھول میں گم ہونے سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی وقت کو دھوکہ دینے کا سلسلہ بند کرنا ہو گا' ہمیں بھی وقت کے ساتھ ساتھ بھاگنا ہو گا' ورنہ وقت کا ریلا ہمیں اپنے ساتھ بہا لے جائے گا اور ہم تاریخ کے جوہڑ میں کائی بن کر تیرتے رہیں گے' ایک ایسی کائی جو صرف مکھیاں اور مچھر پیدا کر سکتی ہے۔

مفادات کے طوفان میں پھنسے پرندے
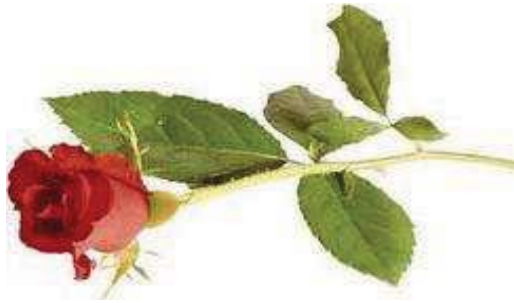
''وہ وقت بہتر تھا'اس میں خوشحالی نہیں تھی'روپے'پیسے'مکان'گاڑیاں'سڑکیں اور جہاز بھی نہیں تھے لیکن دل کا اطمینان'روح کا سکون اور ایمان کی روشنی ضرور تھی کاش ہم واپس پچاس کی دہائی میں چلے جائیں'' جہانزیب خان کی آنکھوں میں اداسی اور لہجے میں حسرت تھی'میں اس وقت چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پاکستان سے لندن جا رہا ہوں'میں تین دن لندن رہ کر پیرس جاؤں گا اور ان شاء اللہ اگلے ہفتے کے اختتام پر واپس پاکستان آ جاؤں گا'میں زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہو کر یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو جہانزیب خان کا لہجہ'اداسی اور حسرت بھی میرے ساتھ پرواز کر رہی ہے'سفر سے ایک دن پہلے مخدوم عباس سویڈن سے پاکستان آئے تو وہ جہانزیب خان کو چند گھنٹوں کیلئے لاہور سے اسلام آباد لے آئے'ہم لنچ کیلئے ریستوران میں بیٹھ گئے اور باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا'جہانزیب خان خاندانی بیوروکریٹ ہیں'ان کے والد بھی سرکاری افسر تھے اور یہ بھی اس وقت بیوروکریسی کے کل پرزے ہیں'یہ پنجاب حکومت میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں اور پچھلے دنوں ان کی فرانس میں بطور سفیر تقرری نے سرکاری اور سفارتی حلقوں میں بھونچال پیدا کر دیا تھا'جہانزیب خان پڑھے لکھے'کلچرڈ اور گفتگو کے فن کے ماہر ہیں'میں نے ان سے پوچھا''آپ اپنے والد کے دور سے بیوروکریسی کو دیکھ رہے ہیں'آپ کو ماضی کے سرکاری افسروں اور موجودہ بیوروکریٹس میں کیا فرق دکھائی دیتا ہے''اس سوال کے بعد گفتگو کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کے آخر میں ہم تینوں کا خیال تھا ماضی حال سے بہتر تھا'جہانزیب خان نے اس دوران صوبہ سرحد کے ایک بزرگ افسر کی زندگی کا دلچسپ واقعہ سنایا'جہانزیب خان کا کہنا تھا'صوبہ سرحد میں شیر محمد خان نام کے افسر ہوتے تھے'یہ پچاس کی دہائی میں صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم خان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے'پرائیویٹ سیکرٹری کا عہدہ تازہ تازہ ایجاد ہوا تھا'اس کا مقصد چیف منسٹر کے ذاتی امور مثلاً ریل کا ٹکٹ'سفر کی تاریخیں'دورے کے دوران رہائش'ذاتی دوستوں کے ساتھ ملاقاتیں اور فیملی فنکشنز کے معاملات طے کرنا تھا'پرائیوٹ سیکرٹری چیف منسٹر کے ساتھ سفر بھی کرتا تھا'اس وقت دارالحکومت کراچی میں تھا چنانچہ وزراءاعلیٰ کو ہر مہینے کراچی آنا پڑتا تھا'یہ لوگ ٹرین کے ذریعے کراچی آتے تھے'سفر کے دوران صرف پرائیویٹ سیکرٹری ان کے ساتھ ہوتا تھا'کراچی پہنچ کر انہیں ایک سرکاری گاڑی'ایک ڈرائیور اور ایک پولیس اہلکار مل جاتا تھا'وزراءاعلیٰ ہوٹل میں رہتے تھے'میٹنگ اٹینڈ کرتے تھے اور اگلے دن واپسی کا سفر شروع ہو جاتا تھا۔

شیر محمد خان وزیراعلیٰ سرحد کے پرائیویٹ سیکرٹری بنے تو یہ عجیب مسئلے کا شکار ہو گئے'کراچی سے واپسی پر ڈرائیور'وزیراعلیٰ اور پرائیویٹ سیکرٹری کو ریلوے سٹیشن پر اتارتا تھا اور پولیس کانسٹیبل اور ڈرائیور دونوں ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے'یہ ٹپ حاصل کرنے کا بین الاقوامی انداز ہے لہٰذا شیر محمد خان کو انہیں مجبوراً دو'دو تین تین روپے ٹپ دینا پڑتی تھی'اس وقت پرائیویٹ سیکرٹری کی تنخواہ پچاس روپے ہوتی تھی'حکومت سیکرٹری کو ٹپ کیلئے کسی قسم کا کوئی اضافی فنڈ نہیں دیتی تھی چنانچہ یہ خسارہ سیدھا شیر محمد خان کی جیب میں منتقل ہو جاتا تھا'پرائیویٹ سیکرٹری دو تین مرتبہ یہ ظلم سہہ گئے لیکن ان کیلئے یہ روٹین نبھانا مشکل ہو گیا'

انہوں نے ایک دن سفر کے دوران چیف منسٹر سے عرض کیا" جناب اس ٹپ کا کوئی حل نکالیں' میرا بجٹ خراب ہو جاتا ہے" خان عبدالقیوم خان نے غور سے ان کی بات سنی اور جواب دیا" ہاں یار یہ مسئلہ تو ہے لیکن پیسے تو میرے پاس بھی نہیں ہوتے' ہم اب کیا کریں" شیر محمد خان نے عرض کیا" جناب ہم سرکاری کام سے کراچی آتے ہیں' میرا خیال ہے ہمیں فنانس ڈیپارٹمنٹ سے ٹپ کیلئے فنڈ لے لینا چاہیے" خان عبدالقیوم خان نے ستائشی انداز سے سر ہلایا لیکن ساتھ ہی کہا" لیکن یار چیف سیکرٹری بہت سخت ہے' مجھے خطرہ ہے' میں اس سے کہوں گا اور وہ انکار کر دے گا اور یوں سبکی ہو گی" شیر محمد خان چیف منسٹر کو سارا راستہ حوصلہ دیتے رہے یہاں تک کہ وزیراعلیٰ نے ان سے کہا" تم چیف سیکرٹری پر نظر رکھو جس دن اس کا موڈ اچھا ہوا' تم مجھے بتا دینا' میں اس سے بات کر لوں گا" یوں یہ معاملہ طے پا گیا' جس کے بعد شیر محمد خان ہر سرکاری میٹنگ میں چیف سیکرٹری پر نظر رکھتے' ایک دن انہیں چیف سیکرٹری قہقہے لگاتا دکھائی دیا تو وہ وزیراعلیٰ کے پاس گئے اور انہیں بتایا" سر چیف سیکرٹری کا موڈ اچھا ہے' آپ مہربانی فرما کر ان سے بات کر لیں" وزیراعلیٰ نے بھی چیف سیکرٹری کی طرف دیکھا' وہ واقعی خوش گوار موڈ میں تھا' وزیراعلیٰ چیف سیکرٹری کو ایک کونے میں لے گئے اور اسے شیر محمد خان کا مسئلہ بریف کر دیا' چیف سیکرٹری نے شیر محمد خان کو اگلے دن اپنے دفتر بلا لیا۔

شیر محمد خان دوسرے دن فاتح کی حیثیت سے چیف سیکرٹری کے دفتر میں داخل ہوئے' چیف سیکرٹری اس وقت کوئی فائل دیکھ رہا تھا' اس کی نظر جوں ہی شیر محمد خان پر پڑی' اس نے فائل اٹھا کر دیوار سے ماری اور شیر محمد خان کی بے عزتی شروع کر دی' چیف سیکرٹری کا کہنا تھا" تم سرکاری افسر ہو اور ہم نے تمہیں سیاستدانوں کو مس گائیڈ کرنے کیلئے ان کے ساتھ نہیں لگایا اور ہم سرکاری خزانے کو ٹپ پر کیسے ضائع کر سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ" شیر محمد خان چیف سیکرٹری کی دھاڑ سن کر لرز گئے' انہوں نے اس سے معافی مانگی لیکن وہ ان پر مسلسل برستے رہے' قصہ مختصر چیف سیکرٹری نے آخر میں انہیں سیکرٹری فنانس کے پاس بھجوایا' سیکرٹری فنانس نے بھی انہیں ٹھیک ٹھاک جھاڑ پلائی جس کے بعد سیکرٹریٹ میں میٹنگز ہوئیں اور بڑی مشکل سے ٹپ کیلئے پانچ روپے کی منظوری ہوئی لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی رکھی گئی کہ پرائیویٹ سیکرٹری واپسی پر باقاعدہ رسید یا سرٹیفکیٹ دے گا کہ اس نے یہ پانچ روپے کیسے خرچ کئے اور اگر یہ رسید یا سرٹیفکیٹ غلط ثابت ہوا تو اس کی خیر نہیں' شیر محمد خان نے مدت بعد جہانزیب خان کو بتایا" یہ میری زندگی کی واحد حماقت تھی' میں نے اس کے بعد کبھی وزیراعلیٰ یا کسی وزیر کو "مس گائیڈ" کرنے کا رسک نہیں لیا" یہ تھا پچاس اور ساٹھ کی دہائی کا پاکستان جس میں وزیراعلیٰ کو سرکاری خزانے سے پانچ روپے ٹپ دینے کا اختیار نہیں تھا اور وزیراعلیٰ نے جب یہ اختیار حاصل کیا تو اسے چیف سیکرٹری سے بات کرنے کیلئے اس کے اچھے موڈ کا باقاعدہ انتظار کرنا پڑا تھا اور جب بیوروکریسی نے یہ اجازت دی تو اس نے ان پانچ روپوں کیلئے بھی احتساب اور آڈٹ کا باقاعدہ نظام بنایا' یہ تھا وہ پاکستان جس میں وزراءاعلیٰ ٹرینوں پر سفر کرتے تھے' وہ درمیانے درجے کے ہوٹلوں میں رہتے تھے' انہیں ایک دو دن کیلئے سرکاری گاڑی' ایک ڈرائیور اور ایک کانسٹیبل ملتا تھا' یہ بیوروکریسی کے باس نہیں ہوتے تھے بلکہ بیوروکریسی ان کی افسر ہوتی تھی' اس وقت کے پاکستان میں قوانین' ضوابط اور رولز کی حکمرانی ہوتی تھی' بیوروکریسی عوام اور عوامی خزانے کی نگران تھی اور یہ کسی

کو قومی امانت میں خیانت کی اجازت نہیں دیتی تھی [illegible] میں حکمرانوں کی سرکاری اور نجی مصروفیات الگ الگ ہوتی تھیں اور یہ لوگ نجی مصروفیات کا مالیاتی بوجھ خود اٹھاتے تھے اور جس میں خان عبدالقیوم خان جیسا دبنگ وزیراعلیٰ' جسے بھٹو صاحب ڈبل بیرل خان کہتے تھے اور ملک بھر کے سیاستدان' بیوروکریٹس اور دانشوران کا احترام کرتے تھے اور جنہوں نے پاکستان کی تاریخ کا طویل ترین لانگ مارچ کیا تھا اوران کے بعد پاکستان کا کوئی لیڈر عوام کو اتنی تعداد میں سڑکوں پر نہیں لا سکا تھا' اس وزیراعلیٰ' ان جیسے سیاستدان کو بھی پانچ روپے کی جائز ضرورت کیلئے افسروں سے درخواست کرتے ہوئے خوف آتا تھا' یہ تھا وہ پاکستان جس کی آخری سیڑھی پر ہم نے پہنچنا تھا لیکن پھر مفادات' سمجھوتوں' مارشل لاؤں اور بے ایمانیوں کی ایسی آندھی چلی کہ ایمان' ایمانداری اور دیانتداری کے سارے سنگ میل گردو غبار میں کھو گئے اور ہم راستہ بھٹک کر وہاں آ گئے جہاں آج جب سوئس کیسز' میاں صاحبان کی لندن اور جدہ کی جائیدادوں' سیاستدانوں' بیوروکریٹس' جرنیلوں' ججوں اور جرنلسٹوں کے اثاثوں کی بات ہوتی ہے تو ان کے تحفظ کیلئے آئین کی کوئی نہ کوئی شق نکال لی جاتی ہے' آپ خان عبدالقیوم خان کا واقعہ پڑھئے اور پھر آج حکمرانوں کے ترجمانوں کے وہ بیان پڑھئے جس میں یہ لوگ نہایت ڈھٹائی سے اعلان کرتے ہیں "سوئس کیسز نہیں کھل سکتے کیونکہ صدر صاحب کو آئینی استثنیٰ حاصل ہے" ہمیں شرم سے ڈوب مرنا چاہیے' ہم کیا تھے اور ہم کیا ہو گئے ہیں؟ ہم کہاں سے چلے تھے اور ہم کہاں پہنچ گئے ہیں؟ کیا ہم قوم ہیں؟ نہیں ہم قوم نہیں ہیں' ہم مفادات کے طوفان میں پھنسے ہوئے ایسے پرندے ہیں جنہیں اپنے گھر کا راستہ نہیں مل رہا اور یہ کڑکتی ہوئی بجلی کو پناگاہ سمجھ کر اس کی طرف اڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

میاں صاحب اٹس ناٹ فیئر
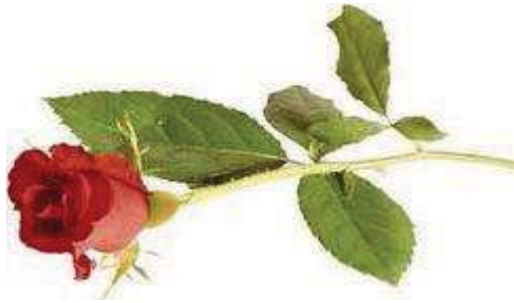
یہ بہر حال غلطی ہے اور میاں نواز شریف اور پاکستان مسلم لیگ کی پاپولیرٹی اس سے متاثر ہو گی' پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے نوماہ قبل آئینی اصلاحات کیلئے 27رکنی کمیٹی بنائی تھی' اس کمیٹی کا مقصد سترہویں ترمیم سمیت آئین میں موجود خامیاں دور کرنا تھا' کمیٹی کے نوماہ میں 76 اجلاس ہوئے' ان نوماہ کے دوران جب بھی کمیٹی کی کارکردگی کے بارے میں سوال ہوتا تھا تو پاکستان مسلم لیگ ن کے ارکان حکومت کو اس تاخیر کا ذمہ دار قرار دیتے تھے' ان کا کہنا تھا پاکستان پیپلز پارٹی سترہویں ترمیم ختم نہیں کرنا چاہتی' یہ حکومت جنرل پرویز مشرف کا پارٹ ٹو ہے اور یہ لوگ صدر آصف علی زرداری کو مضبوط رکھنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ' اس کے جواب میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ارکان یہ موقف اختیار کرتے تھے کہ اگر مسلم لیگ ن کمیٹی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تو یہ اپنے ارکان کو کمیٹی سے نکال لے' اسحاق ڈار' احسن اقبال اور سردار مہتاب احمد خان عباسی کمیٹی کے اجلاس میں کیوں جاتے ہیں؟ پاکستان مسلم لیگ ن کے ارکان کے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود لوگ اس تاخیر کا ذمہ دار پاکستان پیپلز پارٹی ہی کو ٹھہراتے تھے' اس کی وجہ پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت کا ٹریک ریکارڈ تھا' پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت نے بدقسمتی سے اتنے وعدے توڑے تھے کہ عوام میں ان کی کریڈیبلٹی ختم ہو گئی تھی چنانچہ لوگوں کا دھیان پاکستان مسلم لیگ ن کی خامیوں کی طرف نہیں جاتا تھا لیکن 25 مارچ کی شام جب آئینی کمیٹی کی تمام سفارشات مکمل ہو گئیں' مسودہ تیار ہو گیا اور اگلے دن صدر نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کے دوران اس پیکیج کا اعلان کرنا تھا تو عین اس وقت میاں نواز شریف نے پریس کانفرنس کی اور پختونخواہ کے نام اور ججز کی تقرری کے سسٹم کو جواز بنا کر نوماہ کی ساری ایکسر سائز "کھوہ کھاتے" ڈال دی اور یہ بہر حال غلط سیاسی چال تھی اور اس سے میاں نواز شریف اور پاکستان مسلم لیگ ن کی پاپولیرٹی کو نقصان پہنچے گا' میاں صاحب نے بدقسمتی سے بدنامی کے وہ کانٹے جواب تک پاکستان پیپلز پارٹی نے کاشت کئے تھے وہ سارے اٹھا کر اپنی جھولی میں ڈال لئے ہیں اور یہ کانٹے اب واپس بھی چن لئے جائیں تو بھی میاں صاحب کے دامن میں چھوٹے چھوٹے سوراخ رہ جائیں گے۔

ہم اب پاکستان مسلم لیگ ن کے ان دو جوازوں کی طرف آتے ہیں جو میاں نواز شریف نے اپنی پریس کانفرنس میں پیش کئے' میاں صاحب نے فرمایا پختونخواہ کے نام اور ججز کی تقرری کے نظام پر اختلاف کی وجہ سے آئینی پیکیج فوری طور پر پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا جا سکتا' ہم ان دونوں جوازوں کا باری باری جائزہ لیتے ہیں' پاکستان پیپلز پارٹی نے اقتدار سنبھالتے ہی اے این پی کا دیرینہ مطالبہ مان لیا تھا' صدر' وزیراعظم اور وفاقی وزراء اپنی تقریروں میں پچھلے دو برس سے صوبہ سرحد کو پختونخواہ کہتے چلے آ رہے ہیں' میاں صاحب جانتے تھے جب تک اے این پی کا یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک آئینی پیکیج منظور نہیں ہو سکے گا' شاید اسی لئے وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف پشاور کے دورے پر گئے تو انہوں نے وزیر اعلیٰ سرحد امیر حیدر خان ہوتی کو پیش کش کی کہ اگر پختونخواہ کے ساتھ خیبر یا اباسین کا لاحقہ لگا دیا جائے تو پختونخواہ پاکستان مسلم لیگ ن کیلئے قابل قبول ہو جائے گا' وزیر اعلیٰ سرحد نے وزیر اعلیٰ پنجاب کی یہ آفر اپنی ہائی کمان کے سامنے رکھ دی اور یوں دونوں جماعتوں کے

درمیان بیک چینل رابطے شروع ہو گئے' آخری دنوں میں ان بیک چینل رابطوں میں اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ 25 مارچ کا دن آ گیا اور اسلام آباد میں اے این پی اور پاکستان مسلم لیگ ن کے الگ الگ اجلاس شروع ہو گئے' اے این پی کے اجلاس میں اسفند یار ولی نے اپنے ارکان کو بتایا ''ہم نے پاکستان مسلم لیگ ن کو پختونخواہ کے ساتھ اباسین یا خیبر لگانے کی رضامندی دے دی ہے'' تو پارٹی کے چار ارکان نے اس پر شدید ردعمل ظاہر کیا' یہ لوگ استعفے تک دینے پر تیار ہو گئے لیکن اسفند یار ولی' بلور برادرز اور حاجی عدیل کی کوششوں سے یہ لوگ ٹھنڈے ہو گئے اور انہوں نے اسفند یار ولی کو نام کے فیصلے کا اختیار دے دیا' دوسری طرف پاکستان مسلم لیگ ن کی قیادت نے پارٹی اجلاس میں پختونخواہ کا ایشو چھیڑا تو پارٹی کے سیکرٹری جنرل اقبال ظفر جھگڑا اور سرانجام خان نے جھگڑا شروع کر دیا' یہ دونوں حضرات اور ان کے بعد دو مزید حضرات پختونخواہ کے نام پر راضی نہیں تھے لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے اگر پارٹی میں پختونخواہ کے نام پر اختلاف رائے تھا تو پھر میاں شہباز شریف نے وزیراعلیٰ سرحد کو پیش کش کیوں کی تھی؟ اے این پی کے ساتھ بیک ڈور رابطے شروع کرنے سے پہلے پارٹی کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا گیا تھا اور تیسرا میاں نواز شریف کی پارٹی پر گرفت اتنی ڈھیلی پڑ چکی ہے کہ وہ لوگ جو کونسلر کا الیکشن بھی نہیں جیت سکے وہ نہ صرف پوری پارٹی کو ڈکٹیٹ کروا رہے ہیں بلکہ سال بھر کی کوششوں پر بھی پانی پھیر رہے ہیں' کیا یہ فیئر ہو گا؟' آپ اب نئے ججز کے تقرر کے ایشو کا بھی جائزہ لیجئے' کمیٹی نے تفصیلی غور کے بعد مارچ کے شروع میں جوڈیشل کمیشن اور پارلیمانی کمیٹی کے سسٹم کا اعلان کیا تھا' اس اعلان پر وکلاء نے اپنا ردعمل ظاہر کیا' کمیٹی کے چار اجلاسوں میں اس ردعمل پر بحث بھی ہوئی اور بحث کے نتیجے میں جوڈیشل کمیشن میں ایک ممبر کے اضافے اور وزیر قانون کو اس سے نکالنے پر اتفاق بھی ہو گیا لیکن اس اتفاق کے باوجود میاں صاحب نے اس کو بھی جواز بنا دیا' میاں صاحب کے ذہن میں اگر کوئی نیا فارمولا تھا یا یہ اگر کمیٹی کی سفارشات سے مطمئن نہیں تھے تو انہیں یہ مسئلہ کمیٹی ہی میں اٹھانا چاہیے تھا کیونکہ یہ فیصلہ اگر آخر میں میاں نواز شریف ہی نے کرنا تھا تو پھر کمیٹی اور کمیٹی کے 76 اجلاسوں کی کیا ضرورت تھی؟' آپ پہلے ہی کوئی فارمولا طے کر لیتے! پاکستان مسلم لیگ ن کے کلوز ڈور اجلاس میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ موجودہ پارلیمنٹ آئین ساز اسمبلی نہیں اگر پارلیمنٹ نے ایسی ترامیم کر دیں جنہیں بعد ازاں عدالت اپنے لئے خطرہ سمجھ بیٹھی اور کسی نے سپریم کورٹ میں پٹیشن دائر کر دی تو عدالت ان تمام ترامیم کو غیر آئینی قرار دے دے گی چنانچہ میاں نواز شریف نے اسحاق ڈار کو یہ پیغام دے کر وزیراعظم کے پاس بھجوا دیا کہ آپ چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری' میاں رضا ربانی اور اسحاق ڈار کو اکٹھا بٹھا لیں اور ججز کی تقرری کے سسٹم کے معاملے میں چیف جسٹس کو اعتماد میں لے لیں' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے میاں نواز شریف کا پیغام قبول کر لیا اور یوں بات آگے نکل گئی' میاں صاحب کا یہ خدشہ درست بھی ہو تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے آپ نے یہ تجویز پندرہ سے بیس مارچ کے دوران کیوں نہیں دی؟' آپ نے اس کارروائی کیلئے 25 مارچ کا وہ دن کیوں منتخب کیا جب دلہن پارلر سے تیار ہو کر شادی کے ہال کی طرف چل پڑی تھی

-

پاکستان مسلم لیگ ن اور اس کی قیادت اب اس سیاسی بلنڈر کا جو بھی جواز دے' آپ خواہ دلائل کے پہاڑ ہی کیوں نہ

ٹھہرے گی اور چند دن بعد یہ مسئلہ کسی کو یاد نہ ہو جائے لیکن یہ طے ہے دودھ میں مینگنیاں پڑ چکی ہیں ریشم کی چادر کانٹوں کی جھاڑی سے الجھ چکی ہے اور شیشے کا گلاس ہاتھ سے پھسل چکا ہے چنانچہ اب کوئی طاقت شیشے میں بال پڑنے' چادر سے ریشم کے تار نکلنے اور دودھ کو مینگنیوں کی بو سے پاک نہیں کر سکے گی' یہ درست ہے قوموں کی زندگی میں دو چار دن زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور آئین کے ڈھانچے میں بڑی بڑی تبدیلیوں کیلئے ایک آدھ ہفتے کا "گیپ" زیادہ نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے سیاسی جماعتوں کی لیڈرشپ کے پاس بچگانہ حرکتوں اور اچانک فیصلوں کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی' صدر آصف علی زرداری نے اپریل 2008ء میں ججز کی بحالی کے وعدے کو سیاسی بیان قرار دے کر دودھ میں مینگنیاں ڈالی تھیں' جج بعد ازاں بحال ہو گئے لیکن صدر آصف علی زرداری کا وہ بیان آج بھی ڈھول بن کر پاکستان پیپلز پارٹی کے گلے میں لٹک رہا ہے' یہ آئینی پیکیج بھی جلد یا بدیر عملی شکل اختیار کر لے گا' یہ پارلیمنٹ میں بھی پیش ہو گا اور منظور بھی ہو گا' پختونخواہ کے ساتھ خیبر یا اباسین کا لاحقہ بھی لگ جائے گا اور ججز کی تقرری کا فارمولا بھی طے ہو جائے گا لیکن میاں نواز شریف کی 25 مارچ کی پریس کانفرنس ٹاٹ کا ٹکڑا بن کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے پاکستان مسلم لیگ کے مخمل میں لگی رہے گی' مسلم لیگ کے قائدین اور ارکان باقی زندگی اس کی وضاحت ہی کرتے رہیں گے کیونکہ میاں صاحب سے جانے یا ان جانے میں ایسی سیاسی غلطی ہو گئی ہے جس کا پارٹی کی پاپولیرٹی کو دھچکا پہنچے گا چنانچہ میاں صاحب اٹس ناٹ فیئر' آپ نے قوم کا وقت ضائع کیا۔

بارہ آنے کا چکر
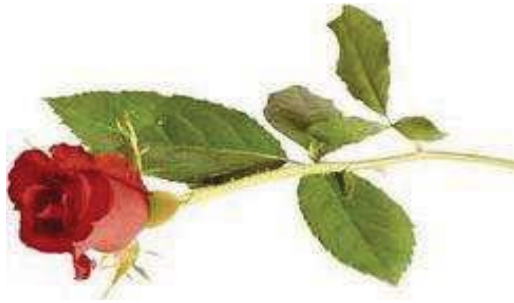
وہ منظر بہت دلچسپ تھا' ایک صاحب دوست کے ساتھ ریستوران میں آئے' دونوں نے کھانا آرڈر کیا' دونوں کے درمیان کسی بات پر تکرار ہوئی' یہ تکرار چند لمحوں میں لڑائی کی شکل اختیار کر گئی اور دونوں نے ریستوران کی چیزیں اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے پر پھینکنا شروع کر دیں' میزیں الٹ دیں' کرسیاں توڑ دیں' لائٹیں' شیشے اور کراکری چکنا چور کر دی' اس دوران جو شخص چھڑانے کیلئے آگے بڑھا دونوں نے اس کو بھی مارنا شروع کر دیا بہر حال قصہ مختصر سارا ریستوران آدھ گھنٹے میں کھنڈر بن گیا' اس وقت تک دونوں دوست بھی لڑ لڑ کر ''ہف'' گئے تھے چنانچہ دونوں سانس درست کرنے کیلئے نیچے بیٹھ گئے' سانس بحال ہوئی تو دونوں نے کونے میں کھڑے ویٹر کو قریب بلایا اور اونچی آواز میں حکم دیا ''ہمارا آرڈر کینسل کر دو' ہم کھانا نہیں کھا رہے '' اس کے ساتھ ہی دونوں اٹھے اور ریستوران سے باہر نکل گئے' اس صورتحال کو شاید لاہوری اردو میں ''کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے'' کہا جاتا ہے لیکن اس منظر کے صاحبان نے تو بارہ آنے دینا بھی گوارہ نہیں کیا۔

پاکستان میں اس سے ملتی جلتی صورتحال اس وقت جعلی ڈگری ہولڈر ایم این اے اور ایم پی اے پیدا کر رہے ہیں' صوبائی اور قومی اسمبلی کے ایک حلقے میں الیکشن کرانے پر حکومت کے قریباً ایک کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں' ہم اگر اس رقم میں امیدواروں کے اخراجات' ان کے بینرز' پوسٹرز' پلے کارڈز' جلسے جلوسوں' پولنگ کیمپس' ڈیرے داریوں' مہمان نوازیوں' ٹرانسپورٹ' ووٹوں کی خرید و فروخت اور امدادی چیکس کی رقم بھی شامل کر لیں تو اس ساری ایکسر سائز پر کم از کم دس کروڑ خرچ ہو جاتے ہیں' اس ساری مشقت اور سرکاری خزانے کے استعمال کے بعد ایک ایم این اے' ایک ایم پی اے اسمبلی میں پہنچتا ہے' وہاں یہ تنخواہ بھی وصول کرتا ہے اور سرکاری مراعات سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے لیکن پھر اچانک معلوم ہوتا ہے ایم این اے یا ایم پی اے کی ڈگری جعلی تھی' ایم پی اے یا ایم این اے کے خلاف قانونی کارروائی ہوتی ہے اور وہ اپنی نشست سے استعفیٰ دے دیتا ہے اور یوں اس حلقے میں دوبارہ الیکشن کرا دیا جاتا ہے اور ظاہر ہے اس دوسرے الیکشن پر بھی دس بارہ کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں' اب سوال یہ ہے حکومت کے ایک کروڑ اور امیدواروں کے نو دس کروڑ روپے کے نقصان کا ذمہ دار کون ہے؟ یقیناً اس نقصان کا ذمہ دار وہ ایم این اے اور ایم پی اے ہے جس نے جعلی ڈگری جمع کرا کر الیکشن لڑا تھا لیکن حکومت' عدلیہ اور سیاسی جماعتیں صرف استعفیٰ لے کر اس جعل ساز کو معاف کر دیتی ہیں' کیوں؟ آپ اس پس منظر میں این اے 55 راولپنڈی کے حاجی پرویز' این اے 178 مظفر گڑھ کے جمشید دستی' این اے 167 وہاڑی کے چودھری نذیر جٹ' پی پی 63 کے ایم پی اے محمد اجمل اور پی پی 111 کے حاجی ناصر کے واقعات کا مطالعہ کیجئے' حاجی پرویز ایم این اے منتخب ہونے کے بعد جعلی امتحان کے جرم میں پکڑے گئے' پاکستان مسلم لیگ ن نے ان سے استعفیٰ لے لیا۔

جمشید دستی' چودھری نذیر جٹ اور محمد اجمل نے سپریم کورٹ کے فیصلے کے ڈر سے استعفیٰ دے دیا اور حاجی ناصر کو لاہور ہائی کورٹ نے جعلی ڈگری کے جرم میں ڈس کوالی فائی کر دیا' این اے 55 اور پی پی 111 میں دوبارہ الیکشن ہو چکے ہیں جبکہ باقی تین حلقوں میں اب ہوں گے' سوال یہ ہے کیا جعلی ڈگری ہولڈر سرکاری رقم' قوم کے وقت اور وسائل ضائع کرنے کے مرتکب نہیں ہوئے؟ اور کیا ان جرائم پر انہیں معاف کر دینا چاہیے؟ دوسرا جمشید دستی'

نذیر جٹ‘ محمد اجمل‘ حاجی پرویز اور حاجی ناصر رکن اسمبلی کی حیثیت سے جو تنخواہ وصول کرتے رہے یا انہوں نے جو مراعات انجوائے کیں کیا یہ مراعات اور تنخواہیں واپس نہیں ہونی چاہئیں؟ کیا ان پر جرمانہ بھی عائد نہیں ہونا چاہئے؟ اور کیا صرف استعفیٰ یا معافی کافی ہو گی؟۔ میرا خیال ہے نہیں‘ اسمبلیاں حساس ترین ادارے ہوتے ہیں اور جعلی ڈگریوں کے ذریعے ان حساس ترین اداروں میں پہنچنے والے لوگوں کیلئے زیادہ سخت سزائیں ہونی چاہئیں ۔ان سے ضمنی الیکشن اور سابق امیدواروں کے تمام اخراجات بھی وصول کرنے چاہئیں اور اگر یہ لوگ اس سے انکار کریں تو یہ رقم ان کی سیاسی پارٹیوں سے وصول کی جائے تاکہ پارٹیاں ٹکٹ دیتے ہوئے امیدوار کی اخلاقی پوزیشن ضرور دیکھ لیں‘ یہ ان کی ڈگریوں کی پڑتال کرا لیا کریں۔

پاکستان کی تاریخ میں یہ ہفتہ سیاسی لحاظ سے بڑا اہم تھا‘ اس ہفتے جہاں اٹھارہویں ترمیم کا آئینی بحران ختم ہو گیا‘ صوبہ سرحد کو نیا نام خیبر پختونخواہ مل گیا‘ پاکستان مسلم لیگ ن کے مطالبے پر جوڈیشل کمیشن کے ارکان کی تعداد چھ سے سات ہو گئی اور آئینی اصلاحات کمیٹی نے آئین میں 95 ترامیم کی منظوری دے دی وہاں سوئس کیسز کے سلسلے میں بھی شاندار پیش رفت ہوئی‘ سپریم کورٹ نے ایف آئی اے کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل احمد ریاض شیخ کو عدالت میں ہتھکڑی لگوادی اور انہیں وہیں سے جیل بھجوا دیا۔ احمد ریاض شیخ صدر آصف علی زرداری اور وزیر داخلہ رحمان ملک کے ذاتی دوست ہیں اور انہوں نے بے نظیر بھٹو کی سابق حکومت میں میاں نواز شریف کے والد میاں شریف مرحوم کو لاہور سے گرفتار کیا تھا‘ انہوں نے میاں نواز شریف کی پچھلی حکومت میں اس وقت کے وزیر قانون خالد انور اور احتساب کمیشن کے سربراہ سیف الرحمان کی جسٹس قیوم ملک کے ساتھ ٹیلی فونک گفتگو بھی ریکارڈ کی تھی جس میں یہ حضرات جسٹس قیوم کو حکم دے رہے تھے ’’آپ زرداری صاحب اور بی بی کو جلد سے جلد سزا دے دیں‘‘ احمد ریاض شیخ کی گرفتاری کے بعد سپریم کورٹ نے نیب کو چوبیں گھنٹوں کے اندر این آر او کے تحت بند ہوئے تمام مقدمات بشمول سوئس کیسز کھولنے کا حکم بھی دیا۔ اس حکم کی پیروی میں نیب نے گزشتہ روز سوئٹزرلینڈ حکومت سے صدر آصف علی زرداری کے مقدمات کھولنے کی درخواست کر دی‘ اس درخواست پر سوئس حکومت نے حکومت پاکستان کو جواب دیا آصف علی زرداری پاکستان کے صدر ہیں اور صدر کی وجہ سے انہیں پاکستان اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق استثنیٰ حاصل ہے‘ ہم اس وقت تک یہ کیسز ری اوپن نہیں کر سکتے جب تک پاکستان کی عدلیہ صدر کے استثنیٰ کا فیصلہ نہیں کرتی‘ نیب کا خط اور سوئس حکومت کا جواب ابھی تک کورٹ میں پیش نہیں کیا گیا لیکن اس خط اور سوئس حکومت کے جواب کے بعد وہ مرحلہ آ جائے گا جس سے حکومت بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حکومت کا خیال تھا نیب جب سوئس حکومت سے زرداری صاحب کے کیسز ری اوپن کرنے کی درخواست کرے گی اور سوئس حکومت صدر صاحب کے استثنیٰ کی بنیاد پر کیسز کھولنے سے انکار کر دے گی اور نیب کو سوئٹزرلینڈ حکومت کا جواب عدالت میں پیش کرنا پڑے گا تو عدالت آئین کی دفعہ 248 کی تشریح شروع کر دے گی اور یہ وہ دفعہ ہے جس کے تحت صدر کو ملکی اور غیر ملکی عدالتوں میں مقدمات سے استثنیٰ حاصل ہے۔ یہ دفعہ کیونکہ آج تک استعمال نہیں ہوئی چنانچہ اس کی تشریح بھی نہیں ہو سکی لیکن جونہی سوئٹزرلینڈ حکومت کا جواب عدالت میں پیش ہو گا تو اس کی تشریح کا مرحلہ آ جائے گا اور حکومت کے بعض

میں تقسیم کر دے گی‘ وہ مقدمے جو صدارتی یا گورنر شپ کے حلف سے پہلے زیر سماعت تھےاور وہ مقدمے جو گورنر شپ یا صدارتی پوزیشن کے دوران قائم ہوئے‘ حکومتی سقراطوں کواندیشہ ہے عدالت صدارتی اور گورنر شپ کے حلف سے پہلے قائم ہونے والے مقدموں کو استثنٰی کے دائرے سے نکال دے گی اور یوں صدر صاحب کے خلاف کارروائی شروع ہو جائے گی اور اگر ایک بار یہ کارروائی شروع ہو گئی اور سپریم کورٹ نے نیب کی نگرانی شروع کر دی تو نتیجہ آپ کے سامنے ہے! یہ وہ خدشات ہیں جن کے امکانات اس وقت نظر آ رہے ہیں لیکن میری ذاتی رائے ہے ہمیں اب ان تمام ایشوز پر مٹی ڈال دینی چاہیےاور مستقبل کی طرف بڑھنا چاہیے‘ آئینی کمیٹی نے اصلاحات کے نئے پیکیج پر دستخط کر کے کمال کر دیا ہے‘ ہم اس کمال پر میاں رضا ربانی کو جس قدر مبارک باد دیں وہ کم ہو گی‘ اس پیکیج کے تحت بلوچستان اور صوبہ خیبر پختونخواہ کو بھی وہ تمام حقوق مل گئے جن کیلئے ان کی آنکھیں ترس رہی تھیں اور آئین کا حلیہ بھی اب ٹھیک ہو جائے گا چنانچہ ہمیں تاریخ کے اس آئین ساز لمحے میں ساری تلخیاں‘ ماضی کی ساری غلطیاں بھلا کر آگے بڑھنا چاہیے‘ ہمیں اپنی انا کی قربانی دے دینی چاہیے کیونکہ اسی سے ملک آگے بڑھ سکے گا‘ ہم اگر اس وقت بھی بارہ آنے کے چکر میں رہے تو مجھے خطرہ ہے کہیں سارا ریستوران ہی برباد نہ ہو جائے۔
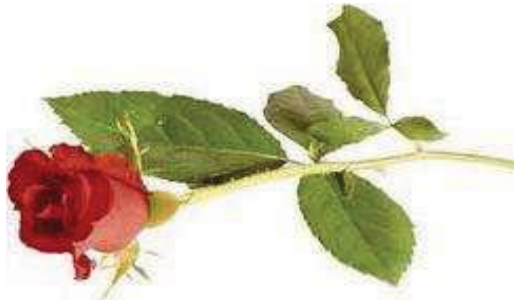
مٹی کے بیٹے

لاہوریاں والا کے ریلوے ٹریک پر خون کے چھینٹے ابھی تک چمک رہے ہیں اور ممتاز کی سرخ پھول دار قمیض کی دھجیاں ٹریک کے پتھروں پر لرز رہی ہیں اور یہ دھجیاں اور خون کے یہ چھینٹے جانے کب تک اس ٹریک پر لرزتے اور چمکتے رہیں گے اور غربت کے ان داغوں کو دھونے کیلئے اب کتنی برساتیں اور کتنے سیلاب درکار ہوں گے ' ہم اسلام آباد جیسے بے مہر شہر میں اس کا تخمینہ نہیں لگا سکتے غربت اور بے روزگاری میں دلوں کی آگ بڑھانے کی کتنی طاقت ہوتی ہے اس کا اندازہ بھی بڑے شہروں کے سفید پوش اور پارلیمنٹ جیسی گونگی بہری اور ٹھنڈی عمارتوں میں بیٹھے لوگ نہیں لگا سکتے ' غربت کی چھری کی دھار محسوس کرنے کیلئے انسان کا غریب ' بے روزگاری کے کانٹوں کی چبھن کو چھونے کیلئے بے روزگار اور وقت اور حالات کی تلخی کو سمجھنے کیلئے انسان کا جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن ہونا ضروری ہوتا ہے اور ظاہر ہے ہم سب میں کوئی ممتاز ماچھن ہے اور نہ ہی جاوید ماچھی۔ ہم نے آج تک صرف حالات کا رونا رویا ہے ہم نے اپنے دلوں پر ان حالات کے سائے محسوس نہیں کئے ' ہم نے آج تک صرف بے روزگاری ہائے ہائے کے نعرے لگائے ہیں ' ہم نے کبھی خود کو اس شکنجے میں کسے ہوئے نہیں پایا اور ہم نے آج تک ' جی ہاں ہم نے آج تک صرف غربت غربت کے سلوگن نشر کئے ہیں ' ہم نے کبھی اسے اپنی روحوں پر اترتے محسوس نہیں کیا! ہم میں سے کسی نے ' جی ہاں کسی فرزانہ راجہ نے ' کسی ممتاز عالم گیلانی نے ' کسی حفیظ پاشا نے ' کسی شوکت ترین نے ' کسی یوسف رضا گیلانی اور کسی آصف علی زرداری نے غربت ' بے روزگاری اور تلخ ہوتے حالات کی کڑواہٹ کو اپنی روح پر اترتے محسوس کیا ہوتا تو آج لاہوریاں والا کے گرم ریلوے ٹریک پر جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن کے لہو کے چھینٹے نہ ہوتے اور ریلوے لائن کے پتھروں پر ان کے تار تار کپڑوں کی دھجیاں نہ لرز رہی ہوتیں اور اس ٹریک سے گزرنے والی ہر ٹرین کیکر کے اس درخت کے پاس پہنچ کر دلدوز چیخ نہ مارتی اور انجن کی آنکھوں میں آنسو نہ آتے اور ڈبوں کے شاکس سے آہیں اور سسکیاں نہ ٹپکتیں مگر ٹھہریئے ' میں نے ابھی تک جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن کا تعارف تو کروایا ہی نہیں! کیوں نہیں کروایا؟ اس لئے نہیں کروایا کہ یہ لوگ تعارف کے قابل کب ہوتے ہیں! تعارف تو انسانوں کا کروایا جاتا ہے اور نام ' پتے ' نسبت اور خاندان تو انسانوں کے ہوتے ہیں اور جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن جیسے اس ملک کے ستر فیصد لوگ انسان کہاں ہیں؟ یہ لوگ تو پیدا ہی ریلوے ٹریکس کو اپنے خون سے سینچنے کیلئے ہوتے ہیں یا پھر کسی رسی کو پھانسی کا اعزاز بخشنے ' کسی نہر کو اپنے جسم کی سوغات دینے یا پھر کسی غار ' کسی پہاڑ اور کسی بلند عمارت کی بنیاد کو اپنے بدن کی کھاد فراہم کرنے کیلئے ہوتے ہیں ' یہ لوگ آنکھوں میں انتظار کی پنیری لے کر پیدا ہوتے ہیں ' ساری زندگی خوابوں کی گرم ریت پر ننگے پاؤں چلتے ہیں اور اس عمر رائیگاں کے آخر میں ان کی آنکھوں کی پنیری جب بے ہنگم جنگل بن جاتی ہے تو بھی ان کا انتظار ختم نہیں ہوتا ' یہ خوشحالی ' سکون ' اطمینان اور آسائش کے کناروں تک نہیں پہنچ پاتے ' یہ ماچھی کے ماچھی ' موچی کے موچی اور لوہار کے لوہار رہتے ہیں ' یہ عوام کے سٹیٹس سے اوپر نہیں اٹھ پاتے۔

جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن چیچہ وطنی کے آر سیون 109 کے رہنے والے تھے ' دونوں چھ ماہ پہلے میاں بیوی بنے تھے ' دونوں کا خیال تھا شادی کے بعد ان کے حالات تبدیل ہو جائیں گے ' یہ غربت اور بے روزگاری کے اس

چنگل سے آزاد ہو جائیں گے جس میں یہ لوگ پیدائش سے پہلے ہی گرفتار ہو گئے تھے سیلن معلوم ہوا شادی صرف ان لوگوں کا مقدر بدلتی ہے جن پر تقدیر مہربان ہوتی ہے اور اس ملک کے ستر فیصد لوگ ستاروں' مقدر اور تقدیر کے بغیر پیدا ہوتے ہیں' ان کی ''جنم کنڈلی'' میں مقدر کا کوئی ستارہ اور ان کے ہاتھوں میں تقدیر کی کوئی لکیر نہیں ہوتی' یہ لوگ محض پیدا ہوتے ہیں' مشقت کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور ان کی پیدائش پر کوئی باجا بجتا ہے اور نہ ہی ان کے انتقال پر کسی آنکھ میں دکھ' درد اور تکلیف کی ریت چبھتی ہے' یہ لوگ محض لوگ ہیں اور یہ اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ اس ملک کی تقدیر کے مالک انہیں دیکھ کر روٹی' کپڑا اور مکان کے نعرے لگا سکیں' کچھ لوگ ان لوگوں کے نام پر اربوں روپے ڈکار سکیں اور ان کے ننگے پاؤں' ننگے سروں اور کھردرے ہاتھوں کے نام پر کروڑوں روپے کے اشتہار دیئے جا سکیں اور بیورو کریسی ہر اشتہار سے پندرہ فیصد کمیشن کھا سکے' جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن شادی کے چھ ماہ میں اس حقیقت تک پہنچ گئے' انہیں معلوم ہو گیا یہ خوشحالی کی اس ٹیل پر ہیں جہاں کبھی پانی نہیں پہنچ سکے گا۔ اسلام آباد کے ایوانوں اور ماچھیوں کے درمیان بیورو کریسی کی اتنی گہری بھل موجود ہے کہ خوشحالی کبھی ان کے دروازے تک نہیں آ سکے گی چنانچہ دونوں نے زندگی کے عذاب سے نکلنے کا فیصلہ کیا' یہ دونوں سائیکل پر بیٹھے' جاوید ماچھی پیڈل چلا رہا تھا اور ممتاز ماچھن سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھی تھی' یہ دونوں روتے جاتے تھے' آسمان کی طرف دیکھتے جاتے تھے اور موت کی طرف بڑھتے جاتے تھے' یہ لوگ اس عالم میں لاہوریاں والا کے ریلوے ٹریک تک پہنچے تو گاڑی لیٹ تھی' انہوں نے سائیکل کھڑی کی اور کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے' آپ' میں' اسلامی جمہوریہ کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور صدر پاکستان آصف علی زرداری سمیت حکمران موت کے انتظار کی اس اذیت کا اندازہ نہیں لگا سکتے' آپ تصور کیجئے کراچی ایکسپریس لاہوریاں والا کی طرف بڑھ رہی تھی اور ٹرین کی ٹھک ٹھک پٹڑیوں پر تھرکتی ہوئی جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن کے دلوں پر دستک دے رہی تھی' ان بیس منٹوں میں یہ لوگ کتنی بار جیئے اور کتنی بار مرے ہوں گے اور اذیت کے یہ بیس منٹ کتنے بھاری' کتنے بوجھل اور کتنے تلخ ہوں گے' ہم برسر روزگار' ہم جیسے امیر کلاس کے سپوت اور ہم جیسے وائٹ کالر خوشبودار لوگ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے' دنیا کی اذیت ناک ترین موت وہ ہوتی ہے جس کا فیصلہ انسان خود کرتا ہے' ہمیں موت کس وقت آ کر دبوچ لے گی ہم اس سے واقف نہیں ہیں اور ہماری یہ ناواقفیت اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے لیکن جب انسان خود اپنی موت کا دن' وقت اور طریقہ طے کرتا ہے اور یہ اپنے فیصلے کے مطابق موت کا شیڈول بنا کر اس کی طرف چل پڑتا ہے تو آپ اس کی اذیت کا اندازہ لگایئے' مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے انسان کے اس فیصلے پر موت کو بھی پسینہ آ جاتا ہو گا' اس فیصلے سے اجل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہوں گے' جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن نے بھی موت کا شیڈول بنا لیا تھا اور یہ اب اس شیڈول کے مطابق کراچی ایکسپریس کا انتظار کر رہے تھے' دور سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی' پٹڑیوں پر چھک چھک' ٹھک ٹھک کی آوازیں تھرکتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں' جاوید ماچھی کھڑا ہوا' اس نے اپنا ہاتھ ممتاز ماچھن کی طرف بڑھایا' ممتاز نے ایک ہاتھ جاوید ماچھی کے ہاتھ میں دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا پیٹ دبایا' اس کے پیٹ میں ایک اور ماچھی پرورش پا رہا تھا اور یہ دونوں اس نظام کو نئے غلام کا تحفہ نہیں دینا چاہتے تھے' یہ دونوں اٹھے اور تیزی سے بھاگتے

ہوئے پٹڑیوں کے قریب پہنچ گئے ٹرین کے ڈرائیور کو پٹڑیوں پر دو سائے منڈلاتے ہوئے نظر آئے اس نے ہارن کے ذریعے سایوں کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کی لیکن سایوں کا فیصلہ اٹل تھا' یہ غریب آدمی کا فیصلہ تھا' یہ کوئی آئینی ترمیم نہیں تھی کہ یہ ٹھٹک کر' سہم کر پیچھے ہٹ جاتی' ٹرین دو گز کے فاصلے پر تھی کہ جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن نے انجن کے سامنے چھلانگ لگا دی' سائنس کہتی ہے انسانی جسم جب ایک سو دس کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگتے انجن سے ٹکراتا ہے تو یہ ایک سیکنڈ میں دو سو چالیس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے' جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن نے سائنس کو بھی شکست دے دی' ان دونوں کا جسم غبارے کی طرح پھٹا' خون کے چھوٹے چھوٹے چھینٹوں میں تقسیم ہوا اور یہ چھینٹے لاہوریاں والا کی خشک پٹڑیوں' کیکر کی سوکھی شاخوں' ٹرین کے تپتے انجن اور ٹریک کے گرد آلود پتھروں کو سیراب کر گیا' بے نظیر بھٹو انکم سپورٹ پروگرام کے دو امیدوار کم ہو گئے' اب یہ سرمایہ صرف دس کروڑ باون لاکھ تیس ہزار نو سو گیارہ لوگوں میں تقسیم ہو گا' دو لوگ' دو امیدوار اس فہرست سے کم ہو چکے ہیں اور ہاں جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن نے جمہوریت کو یہ ہدیہ تبریک اس ذوالفقار علی بھٹو کی برسی سے ایک دن پہلے پیش کیا تھا جنہوں نے ملک میں پہلی بار روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا تھا اور جو کہتے تھے جب تک غریب کی چھت ٹپکتی رہے گی اس وقت تک بھٹو زندہ رہے گا اور ممتاز ماچھن اور جاوید ماچھی نے لاہوریاں والا ریلوے ٹریک کے خشک پتھروں کو اپنا لہو اس پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے دو دن پہلے پیش کیا تھا جس کے ہر اجلاس میں یہ نعرہ لگایا جاتا ہے "کل بھی بھٹو زندہ تھا' آج بھی بھٹو زندہ ہے" بھٹو واقعی زندہ ہے لیکن جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن مر چکے ہیں کیونکہ یہ ماچھی تھے اور ماچھیوں کے بچے حکمران بننے کے لئے پیدا نہیں ہوتے' یہ مٹی کے بیٹے ہوتے ہیں' مٹی سے جنم لیتے ہیں اور پتھروں پر خون کے چھینٹے بن کر فنا ہو جاتے ہیں۔
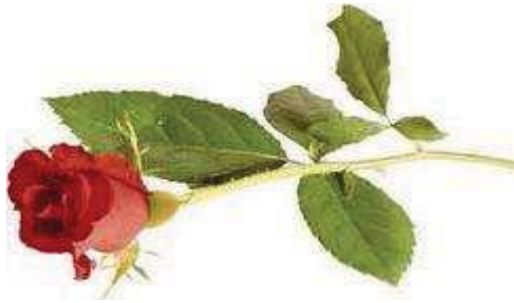
نوکروں کی زبان

یہ طے کرنا ابھی باقی ہے کہ ہماری حکمران کلاس اردو میں خطاب کیوں نہیں کرتی؟ یہ لوگ انگریزی کو اردو پر فوقیت کیوں دیتے ہیں؟' صدر آصف علی زرداری نے 5 اپریل 2010ء کو پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا تھا' صدر آصف علی زرداری سندھی پاکستانی ہیں' اُن کا سارا بچپن اور جوانی سندھی اور پاکستانی کلچر میں گزری اور یہ اب اپنی ادھیڑ عمری بھی اسی کلچر میں گزار رہے ہیں' یہ رواں اردو بولتے ہیں اور انہیں فیض احمد فیض اور علامہ اقبال کے اشعار بھی زبانی یاد ہیں لیکن انہوں نے پارلیمنٹ سے خطاب انگریزی زبان میں کیا' صدر صاحب کی انگریزی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اچھی ہوتی جارہی ہے' یہ اب ڈیموکریسی کو ڈیماکریسی کہتے ہیں' ہمیں اچھی طرح یاد ہے صدر صاحب جب صدر بنے تھے تو اس وقت ان کی انگریزی ذرا سی سندھی محسوس ہوتی تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا ہی اور شی درست ہوتا جارہا ہے لیکن اس ترقی کے باوجود صدر صاحب کی انگریزی کو ''بھٹوز کا لہجہ'' نہیں کہا جاسکتا' ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی مرحوم صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو جس روانی' سلاست اور خوبصورتی سے انگریزی بولتی تھیں صدر صاحب اس سے کوسوں دور ہیں اور یہ شاید اس دوری کو کم بھی نہیں کرسکیں گے کیونکہ بھٹوز کے لہجے میں انگریزی بولنے کیلئے ایک خاص قسم کا ''براٹ اپ'' درکار ہوتا ہے۔ اس انگریزی لہجے کیلئے برٹش آیا چاہیے ہوتی ہیں' امریکن سکول چاہیے ہوتے ہیں اور بعد ازاں آکسفورڈ' کیمبرج اور ہارورڈ یونیورسٹی کے لیکچر تھیٹر' ہاسٹلز' لائبریریاں اور کیفے درکار ہوتے ہیں اور جہاں تک ہمارا علم ہے صدر آصف علی زرداری کا تعلق سندھ کے ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا اور ان کا تعلیمی سفر فوجیوں کے لوئر مڈل کلاس بچوں کے ساتھ پٹارو کیڈٹ کالج میں گزرا تھا اور کیڈٹ کالج کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں یہ آکسفورڈ بہر حال نہیں ہوتے۔ صدر صاحب کا خطاب پارلیمنٹ کے ارکان سن رہے تھے' ان ارکان کی زیادہ تر تعداد بھی دیہاتی علاقوں سے تعلق رکھتی ہے اور ان میں سے اکثر لوگوں کی ڈگریاں جعلی نکل رہی ہیں' ہماری پارلیمنٹ نے صدر پرویز مشرف کی گریجوایٹ اسمبلی کی ٹھیک ٹھاک مخالفت کی تھی اور صدر آصف علی زرداری نے جب رکن اسمبلی بننے کیلئے بی اے کی شرط ختم کرائی تھی تو پارلیمنٹ نے تالیاں بجا کر اظہار مسرت کیا تھا چنانچہ مجھے یقین ہے ہماری پارلیمنٹ کی اکثریت کو انگریزی سمجھ نہیں آتی۔ صدر صاحب کا خطاب ٹیلی ویژن کے ذریعے قوم بھی سن رہی تھی' پاکستان کی شرح خواندگی باسٹھ برسوں میں پینتیس فیصد تک پہنچی ہے اور اس پینتیس فیصد میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو بمشکل الف انار اور ب بکری پڑھ سکتے ہیں اور جنہوں نے ٹیڑھے میڑھے طریقے سے دستخط کرنا سیکھ لئے ہیں۔ ہماری تعلیم کا معیار یہ ہے کہ ہمارے نوے فیصد پوسٹ گریجوایٹ انگریزی میں نوکری کی درخواست نہیں لکھ سکتے چنانچہ مجھے یقین ہے پارلیمنٹ کے ارکان سمیت ملک کے پچانوے فیصد عوام کو صدر صاحب کی تقریر سمجھ نہیں آئی اور یہ لوگ ٹیلی ویژن چینلز کے نیوز اینکرز کے تبصروں اور اگلے دن کے اخبارات کی خبروں سے صدر صاحب کے مافی الضمیر تک پہنچے ہوں گے چنانچہ پھر سوال پیدا ہوتا ہے یہ تقریر کس کیلئے کی گئی تھی؟ قوم سے' پارلیمنٹ سے انگریزی میں خطاب کی کیا ضرورت تھی؟ آپ سیدھی سادی اردو میں تقریر کریں' آپ بھی خوش رہیں' ارکان پارلیمنٹ کو بھی سمجھ آجائے اور قوم بھی آپ کے خیالات سے لطف اندوز ہوسکے۔

ہم بنیادی طور پر انگریزی کے احساس کمتری میں مبتلا ہیں' ہمارے حکمران جب تک انگریزی نہ بول لیں انہیں اس وقت تک اپنے صدر' اپنے وزیراعظم' اپنے گورنر' اپنے وزیراعلیٰ اور اپنے وزیر ہونے کا احساس نہیں ہوتا چنانچہ یہ لوگ غلط مواقع پر غلط انگریزی بولتے ہیں اور پھر دائیں بائیں دیکھ کر داد سمیٹنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ دوسری قوموں کا رویہ اس سے بالکل برعکس ہے۔ آپ بھارتی صدر یا وزیراعظم کی تقریر سنیں' آپ کو یہ لوگ ٹھیٹھ ہندی میں بات کرتے دکھائی دیں گے' آپ چین چلے جائیں یا چین کے حکمرانوں کو دنیا کے دوسرے ملکوں میں دیکھیں یہ لوگ آپ کو کبھی انگریزی بولتے نظر نہیں آئیں گے۔ چین کے وزیراعظم چو این لائی اور چیئرمین ماؤزے تنگ انگریزی دان تھے' یہ انگریزی میں چھپنے والی ہر بڑی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے لیکن انہوں نے زندگی بھر منہ سے انگریزی کا ایک لفظ نہیں نکالا۔ ماؤزے تنگ کے بارے میں مشہور تھا انہیں انگریزی زبان میں لطیفہ سنایا جاتا تھا تو وہ لطیفہ سننے کے بعد خاموش بیٹھے رہتے تھے لیکن جونہی اس کا چینی زبان میں ترجمہ ہوتا تھا تو وہ دل کھول کر قہقہہ لگاتے تھے۔ میں 2007ء میں چین گیا' ہماری وہاں چین کی اعلیٰ سیاسی قیادت کے ساتھ ملاقات ہوئی' یہ لوگ ہمارے ساتھ لفٹوں' کوریڈور اور کھانے کی میزوں پر انگریزی میں بات چیت کرتے تھے لیکن جونہی سرکاری گفتگو شروع ہوتی تھی یہ لوگ فوراً چینی زبان میں چلے جاتے تھے اور ہمارے درمیان ترجمان بیٹھ جاتا تھا۔ چو این لائی سے کسی نے پوچھا تھا ''آپ انگریزی جانتے ہیں لیکن آپ انگریزی بولتے نہیں' کیوں؟'' وہ بولے ''میرے عزیز ہم ثابت کرنا چاہتے ہیں چین گونگا نہیں' قدرت نے چینیوں کو بھی ایک زبان دی ہے اور انہیں اس زبان پر فخر ہے'' آپ ترکی کی مثال بھی لے لیجئے' ترکی کے وزیراعظم عبداللہ گل 30 مارچ 2010ء کو پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تھے' مجھے وفاقی وزراء نے بتایا' ترک وزیراعظم کھانے کی میز پر کابینہ کے ارکان سے انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے لیکن جب انہیں خطاب کیلئے سٹیج پر بلوایا گیا تو انہوں نے ترک زبان بولنا شروع کر دی اور ترجمان ساتھ ساتھ ان کے خیالات کا ترجمہ کرتا رہا۔ میں پچھلے سال کے آخر میں وزیراعظم کے ساتھ جرمنی گیا' برلن میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور جرمن چانسلر انجیلا مرکل نے مشترکہ پریس کانفرنس کی' اس پریس کانفرنس میں جرمن چانسلر جرمنی بول رہی تھیں جبکہ ہمارے وزیراعظم انگریزی میں جواب دے رہے تھے' جرمنی' ترکی اور چین کی قیادت اس رویے کو اپنی زبان پر اعتبار اور اپنی ذات پر اعتماد کہتے ہیں جبکہ ہماری حالت یہ ہے ہمارا اپنا صدر پارلیمنٹ اور قوم سے انگریزی میں خطاب کرتا ہے اور ارکان اسمبلی ان کی تقریر کے دوران اونگھتے رہتے ہیں۔ مجھے وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے بتایا تھا' صدر آصف علی زرداری نے ایک بار چاروں وزرائے اعلیٰ کو گفتگو کیلئے بلوایا تھا' چاروں وزرائے اعلیٰ ایوان صدر پہنچے' صدر صاحب سے ملاقات ہوئی تو صدر صاحب نے ان کے ساتھ انگریزی میں گفتگو شروع کر دی' یہ ساری میٹنگ انگریزی میں ہوئی تھی' ایسا کیوں ہے؟ ہم کس کو متاثر کرنا چاہتے ہیں؟ اور ہم کیوں یہ سمجھ بیٹھے ہیں اچھی بات صرف انگریزی میں ممکن ہے! اگر اچھی اور سچی باتیں صرف انگریزی میں ممکن ہوتیں تو آج دنیا میں شاہ عبداللطیف بھٹائی' بابا بلھے شاہ' شاہ حسین اور وارث شاہ کا نام تک نہ ہوتا۔ اگر یہ لوگ علاقائی زبانوں میں آفاقی سچائیاں بیان کر گئے ہیں تو صدر اور وزیراعظم بھی اردو بھی مہمانوں کو خوش آمدید کہہ سکتے ہیں اور اردو میں ان کا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔ بات

بات ہوتی ہے اور اس بات کے اظہار کیلئے زبان [illegible] اور اپنی زبان پر اعتماد ہونا چاہئے۔

میں انگریزی کو برا نہیں سمجھتا' انگریزی بلا شبہ دنیا میں رابطے کی سب سے بڑی زبان ہے' آپ دنیا کے کسی کونے میں چلے جائیں آپ کو وہاں انگریزی سمجھنے اور بولنے والا کوئی نہ کوئی مل جائے گا لیکن اس حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے قومیں اس وقت تک قومیں نہیں بنتیں جب تک وہ اپنی سرحدوں' اپنی ثقافت' اپنے نظریات اور اپنی زبان پر فخر کرنا نہ سیکھ لیں۔ جاپان کیا ہے؟ جاپان سرحد' ثقافت اور زبان کا نام ہے اور اگر آج ہم اس سے جاپانی زبان چھین لیں تو جاپان دس پندرہ' بیس سال بعد جاپان نہیں رہے گا' اسی طرح فرانس' جرمنی اور چین کیا ہیں؟ یہ بھی سرحد' ثقافت اور زبان کا نام ہیں اور ہم اگر ان سے بھی زبان الگ کر دیں تو ان کے پیچھے بھی کچھ نہیں بچے گا۔ اردو ہماری قومی زبان ہے اور جب تک ہماری رولنگ ایلیٹ اس زبان کو اعتماد نہیں دے گی اس وقت تک ہمارے اندر قومی تفاخر پیدا نہیں ہو گا چنانچہ آپ بے شک انگریزی سیکھیں' آپ آکسفورڈ کا لہجہ بھی اپنا لیں لیکن خدا کیلئے کم از کم پارلیمنٹ یا قوم سے خطاب تو اردو میں کر لیں کیونکہ اگر آپ نے آج یہ فیصلہ نہ کیا تو دس بیس سال بعد اردو نوکروں کی زبان بن کر رہ جائے گی یا پھر لوگ اسے دو کلو آلو خریدنے کیلئے بولیں گے' زبان اور قوم دونوں ختم ہو جائیں گے۔

ایک خبطی نوجوان کی فضول گفتگو
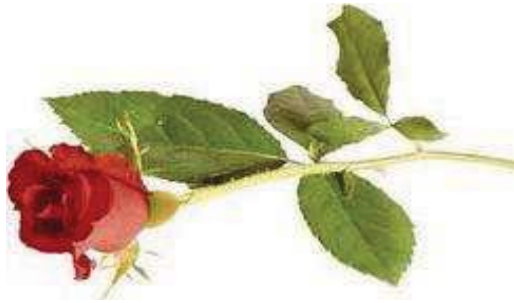
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا وہ ان لوگوں میں شمار ہوتا تھا جنہوں نے جمہوریت سے ہزاروں‘ لاکھوں توقعات وابستہ کر لی تھیں اور جن کا خیال تھا پرویز مشرف رخصت ہوگا تو ملک میں جمہوریت کا سورج طلوع ہوگا‘ عوامی نمائندے سامنے آئیں گے‘ یہ لوگ عوام کے لئے عوامی منصوبے شروع کریں گے جن سے ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنا شروع ہو جائیں گی اور یوں ان کے سارے دکھ‘ سارے درد ختم ہو جائیں گے لیکن ہوا اس سے برعکس ۔مردے کی کمر میں ڈنڈا ٹھونک دیا گیا اور قبر کی سلیں بھی غائب کر دی گئیں چنانچہ اس نے اس جمہوریت کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔اس کا کہنا تھا آمریت میں کم از کم جمہوریت کی امید تو باقی تھی‘ ہم آمریت کے دکھ یہ کہہ کر سہہ جاتے تھے کہ ہمارے ملک میں جلد ہی جمہوریت کی صبح طلوع ہوگی اور ہمارے سارے درد‘ سارے دکھوں کی سیاہی اس میں تحلیل ہو جائے گی لیکن ہم اب کس امید پر زندگی گزاریں؟ ہم اب کس کا راستہ دیکھیں؟۔اس کا کہنا تھا ہماری جمہوریت نے ہمارے سارے جمہوری خواب توڑ دیئے ہیں اور ہم اب خود کو کوسنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

مجھے اس سے اختلاف تھا‘ میں کیونکہ اب مڈل ایج میں پہنچ چکا ہوں اور مڈل ایج کی پہلی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسان نوجوانوں سے اختلاف شروع کر دیتا ہے‘ اسے جوانوں‘ نوجوانوں اور بچوں کی ہر بات ناپختہ‘ بے وقوفانہ اور خام دکھائی دینے لگتی ہے اور وہ ان کے ٹھیک کو ٹھیک سمجھتے ہوئے بھی غلط کہنا شروع کر دیتا ہے" وہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن مجھے اس کے ٹھیک سے اختلاف تھا۔ میں نے اس سے کہا" میرے عزیز جمہوریت انسان کے دس ہزار سال کے شعوری ارتقاء کا پھل ہے‘ انسان نے اس سٹیج پر پہنچنے کیلئے بے شعوری کے اندھیرے میں لاکھوں سال اور شعور کی روشنی میں دس ہزار سال ٹامک ٹوئیاں ماری ہیں اور اس کے بعد کہیں جا کر اسے معلوم ہوا دنیا کی بدترین جمہوریت دنیا کی بہترین آمریت سے اچھی ہوتی ہے اور تم اس پہیے کو ایک بار الٹا چلانا چاہتے ہو" اس نے قہقہہ لگایا اور بولا" آپ صرف سلوگنز سے میری بے روزگاری‘ میری غربت‘ میرے ساتھ ہونے والی سماجی بے انصافیوں اور میری فرسٹریشن کا علاج نہیں کر سکتے‘ میں نے ٹاٹ کے ٹکڑے پر تعلیم حاصل کی‘ میرا والد ڈرائیور تھا اس نے ڈرائیوری کر کے مجھے ایم فل کرایا‘ میں نے ہر کلاس میں فرسٹ ڈویژن لی‘ مجھے اپنی محنت‘ اپنی صلاحیت اور اپنی مہارت پر بھی اعتماد ہے لیکن میں پچھلے تین سال سے بے روزگار ہوں‘ میں نے فزکس میں ایم فل کیا ہے‘ میں غیر سرکاری نوکری کے لئے اپلائی کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے انہیں کمپیوٹر کے ایکسپرٹ چاہئیں‘ میں نے کمپیوٹر کے کورسز بھی کر لئے‘ پتہ چلا صرف کمپیوٹر کی مہارت کافی نہیں‘ انہیں ایم بی اے کی ڈگری بھی چاہئے‘ میں ایم بی اے کرنے کیلئے گیا تو پتہ چلا میں فزکس میں ایم فل کے بعد ایم بی اے نہیں کر سکتا‘ میں سرکاری نوکری کیلئے اپلائی کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے‘ بڑے صاحب نے درخواستوں سے پہلے ہی کسی کو نوکری دے دی تھی اور یہ ساری ایکسر سائز صرف فائلوں کا پیٹ بھرنے کیلئے ہو رہی ہے۔ میں نے تین برسوں میں صرف فوٹو سٹیٹس پر ڈیڑھ لاکھ روپے خرچ کر دیئے ہیں‘ میں درخواستیں لکھ لکھ کر تھک گیا ہوں لیکن میرے لئے کوئی دروازہ نہیں کھلا" اس نے لمبی سانس لی‘ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا" لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تم مایوس ہو جاؤ یا تم جمہوریت کو گالی دینا

شروع کر دو' بالآخر اسی نظام کے انڈوں سے اچھے بچے نکلیں گے" میری بات سن کر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور وہ بولا "جمہوریت کا مطلب 'عوام کی حکومت' عوام کیلئے اور عوام سے' ہوتا ہے لیکن کیا ہماری جمہوریت عوام سے ہے' کیا پارلیمنٹ کے ارکان کا تعلق عوام سے ہے' کیا یہ بے روزگار طبقے' محروم طبقے' مزدور طبقے اور غریب طبقے سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا یہ لوگ کروڑ اور ارب پتی لوگ نہیں' کیا ان کی لاکھوں' کروڑوں روپے کی کوٹھیاں اور ڈیرے نہیں ہیں' کیا یہ ملک کے باثر طبقوں سے تعلق نہیں رکھتے اور کیا یہ کروڑوں روپے کی زمینوں' پلازوں' فارم ہاؤسز اور فیکٹریوں کے مالک نہیں ہیں اور کیا ان کے لائف سٹائل سے نمود و نمائش' لوٹ کھسوٹ اور تکبر کی بو نہیں آتی؟' کیا میرے نمائندے میرے ڈرائیور والد سے گلے مل لیں گے اور کیا یہ مجھے اپنا بھائی سمجھ کر گلے لگا لیں گے' نہیں ہرگز نہیں۔ مجھے آج تک اپنے تھرڈ ڈویژن گریجوایٹ ایم این اے سے ہاتھ ملانے کی سعادت نصیب نہیں ہوئی؟' کیا ہماری جمہوریت عوام کیلئے ہے؟ اگر ہاں تو ہماری پارلیمنٹ نے دو سال اٹھارہویں ترمیم میں ضائع کیوں کر دیئے' انہوں نے لوڈشیڈنگ کے خاتمے کیلئے اب تک کیا کیا؟ انہوں نے کتنے ڈیم بنائے' ملک میں ساڑھے چار ہزار میگاواٹ کی کمی ہے' کیا یہ لوگ یہ کمی چار ماہ کیلئے سرکاری ائر کنڈیشنز پر پابندی لگا کر پوری نہیں کر سکتے لیکن انہیں آج تک اتنی توفیق نہیں ہو سکی' انہوں نے کرپشن' بے روزگاری' ناانصافی' تعلیم اور صحت کیلئے کیا کیا؟ کیا انہوں نے معیشت کو بہتر بنانے کیلئے کوئی پالیسی دی؟ انہوں نے دو سال میں عوام کو صاف پانی ہی دے دیا ہو تو میں جمہوریت کو سلام پیش کرنے کیلئے تیار ہوں' سچ تو یہ ہے ہم نے جن لوگوں کو مارچ 2008ء میں چھوٹی گاڑیوں پر قومی اسمبلی آتے دیکھا تھا اور جنہوں نے چار' چار سو روپے کے سویٹر پہن رکھے تھے وہ آج کروڑ روپے کی گاڑی سے اترتے ہیں اور انہوں نے دنیا کے مہنگے ترین سوٹ پہن رکھے ہوتے ہیں' وہ لوگ جو کل تک سگریٹ ادھار لے کر پیتے تھے وہ آج پچاس ڈالر کا سگار پیتے ہیں اور انگریزی میں غریبوں کی غربت ختم کرنے کے دعوے کرتے ہیں۔ اس نے لمبا سانس لیا اور دوبارہ بولا "میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف پاکستان کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ کہتے تھے اور یہ مکہ میں بیٹھ کر دعا کرتے تھے "یااللہ ہمیں پاکستان واپس بھجواؤ" لیکن آج کیا ہے؟ آج ان کی بلٹ پروف گاڑیاں' ان کی سیکورٹی اور ان کے شاہانہ طرز رہائش دیکھ کر ہمارا دل خون کے آنسو روتا ہے' میں نے چند دن پہلے اخبار میں پڑھا تھا پنجاب کے سینئر وزیر راجہ ریاض کی ایک بلٹ پروف گاڑی میں ماہانہ ساڑھے تین لاکھ روپے کا پٹرول خرچ ہوتا ہے' قومی اسمبلی کے ایک رکن تین کروڑ روپے کی گاڑی میں اسمبلی آتے ہیں' اگر قوم کے ایک ہزار 76 نمائندوں کی صرف گاڑیاں فروخت کر دی جائیں تو بیس ارب روپے جمع ہو سکتے ہیں اور یہ بھی آپ لوگوں ہی کے ٹیلی ویژن شوز میں انکشاف ہوا تھا کہ ہمارے ہر وزیر پر روزانہ ایک لاکھ روپے خرچ ہوتے ہیں!۔ کیا یہ ہے جمہوریت؟ جس کا لولی پاپ آپ میرے منہ میں دے رہے ہیں۔ آپ خود ان جمہوریت زادوں کے ساتھ عیش کر رہے ہیں اور مجھے بدترین جمہوریت بھی بہترین آمریت سے اچھی ہے کے سلوگن سے بہلا رہے ہیں۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے' صدر آصف علی زرداری' میاں نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف میں کیا فرق ہے؟ بس اتنا فرق ہے ناں کہ پرویز مشرف نے یونیفارم پہن رکھی تھی اور اس نے بندوق کے زور پر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا' پرویز مشرف کے مقابلے میں آصف علی زرداری محترمہ بے نظیر بھٹو کی وصیت کے زور پر صدر بن گئے اور میاں نواز شریف ... اٹھارہویں ترمیم کر کے ... اقتدار میں آ جائیں

[illegible]
گے۔ فرق کیا ہوا؟ جنرل پرویز مشرف کے سامنے ایم این اے ' ایم پی اے اور وزراء لیفٹیننٹ اور کیپٹن کی طرح سر جھکا کر بیٹھتے تھے اور میاں نواز شریف اور صدر آصف علی زرداری کے سامنے بھی کسی کو سر اٹھانے کی جرات نہیں ہوتی۔ پرویز مشرف کی اسمبلی بھی ان کے ہر ناجائز کارنامے کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتی تھی اور میاں نواز شریف اور آصف علی زرداری کے ایم این اے اور ایم پی اے بھی آج یہی کر رہے ہیں۔ فرق کہاں ہے؟ وہ جمہوریت ہے کہاں جو بہترین آمریت سے اچھی ہوتی ہے؟ مجھے پہلے وہ جمہوریت دکھایئے پھر مجھ سے اس جمہوریت کے حق میں نعرہ لگانے کی توقع کیجئے گا"

وہ تھک کر خاموش ہو گیا۔ میں نے ایک لمبی جمائی لی اور پاکستان کھپے کا نعرہ لگا کر اس خبطی نوجوان کی فضول گفتگو کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

چیونگم
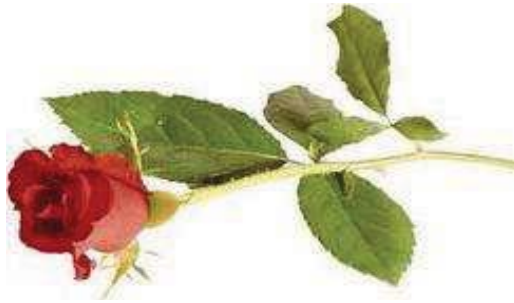
''آپ پہلے ایک کہانی سنیں اور اس کے بعد فیصلہ کریں'' وہ خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگا' وہ میرے ایک سینئر دوست کا بیٹا تھا' وہ ڈیڑھ سال سے میڈیا کی دنیا میں دھکے کھا رہا تھا' کبھی ایک اخبار میں' کبھی ایک نیوز ایجنسی میں اور کبھی ایک ٹیلی ویژن چینل میں لیکن اسے کامیابی نہیں ہو رہی' میرے دوست نے اسے میرے پاس بھجوا دیا' وہ اپنا رونا رو چکا تو میں نے اس سے پانچ منٹ مانگے اور اسے میڈیا کے ایک ورکر کی کہانی سنانا شروع کر دی' اس کردار کا تعلق سنٹرل پنجاب کے ایک گاؤں سے تھا' اس کا خاندان سماجی لحاظ سے مضبوط تھا' زمین بھی تھی' جائیداد بھی تھی' مزارعے بھی تھے' دشمنیاں بھی تھیں' دس پندرہ قتلوں کی ذمہ داری بھی تھی اور علاقے کے تھانوں میں ریکارڈ بھی تھا' اگر کسی چیز کی کمی تھی تو وہ علم تھا' اس خاندان کا کوئی بچہ کبھی سکول نہیں گیا تھا' اس کی وجہ ذمہ داریاں تھیں' اس خاندان کے بچے دشمنیاں نبھانے اور ڈیرے داری چلانے کیلئے پیدا ہوتے تھے' پانچ سال کی عمر میں جب دوسرے خاندانوں کے بچے بیگ اٹھا کر سکول جاتے تھے اس وقت یہ خاندان دشمنی کی گٹھڑی اپنے بچے کے سر پر رکھ دیتا تھا اور اس کے بعد وہ بچہ مرنے تک یہ گٹھڑی اٹھائے رکھتا تھا لیکن اس بچے کے والد نے اس سسٹم سے بغاوت کر دی' اس نے بچے کو سکول داخل کرا دیا اور یہ بغاوت آگے چل کر خاندان کی ہجرت کا باعث بن گئی' یہ بچہ' اس کا والد اور اس کی والدہ گاؤں سے شہر آ گئے' والد نے کاروبار شروع کیا اور ان پر دولت کے دروازے کھلتے چلے گئے' بچہ اور اس کے دوسرے بھائی بہن بھی سکول داخل ہوئے اور یہ بھی پڑھتے چلے گئے' یہ بچہ سکول بھی گیا' کالج بھی گیا اور یونیورسٹی بھی گیا لیکن اسے گائیڈ کرنیوالا کوئی نہیں تھا' اس کی کوئی سفارش بھی نہیں تھی چنانچہ اس کے پاس صرف ایک ہی آپشن تھا' محنت' محنت اور محنت چنانچہ اس نے محنت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا' اس نے یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور عملی میدان میں آ گیا لیکن اسے نوکری حاصل کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا' اسے نوکری کی درخواست بھی لکھنا نہیں آتی تھی' اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا نوکری کا ٹیسٹ کیا ہوتا ہے اور انٹرویو کس بلا کو کہتے ہیں لیکن اس نے یہ مرحلہ بھی محنت کے ذریعے سر کرنے کا فیصلہ کیا' اس نے تھیلے میں تین کتابیں اور آدھ درجن کیلے ڈالے اور لاہور کے ایک بڑے اخبار کے دفتر پہنچ گیا' ریسپشن پر ایک باریش کلرک بیٹھا تھا' یہ نوجوان اس کے پاس گیا اور اس سے عرض کیا ''میں چیف ایڈیٹر سے ملنا چاہتا ہوں'' ریسپشنسٹ نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا' اس کے عجیب و غریب حلیے پر نظر ڈالی اور انکار میں سر ہلا دیا' نوجوان نے شکریہ ادا کیا اور ریسپشن کے بینچ کے ایک کونے میں بیٹھ گیا' اس نے تھیلے سے کتاب نکالی اور پڑھنا شروع کر دی' ریسپشنسٹ کو غصہ آ گیا اور اس نے چلا کر کہا ''میں نے آپ سے کہا ہے چیف ایڈیٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکتی'' نوجوان نے عاجزی سے جواب دیا ''جناب باہر گرمی بہت ہے' اگر آپ اجازت دیں تو میں یہاں بیٹھ کر پڑھتا رہتا ہوں' دھوپ ذرا کم ہو گی تو چلا جاؤں گا'' ریسپشنسٹ خاموش ہو گیا' یہ نوجوان شام تک وہاں بیٹھا رہا' اس دوران اسے بھوک لگتی تھی تو وہ تھیلے سے کیلا نکال کر کھا لیتا تھا' پیاس لگتی تھی تو یہ ریسپشن کے کولر سے پانی پی لیتا تھا' شام ہوئی تو اس نے ریسپشنسٹ کو سلام کیا اور واپس ہاسٹل چلا گیا' جی ہاں وہ پنجاب یونیورسٹی کے نو نمبر ہاسٹل میں اپنے ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا''۔

میرے دوست کا بیٹا پوری دلچسپی سے کہانی سن رہا تھا' میں نے اسے بتایا "وہ نوجوان دوسرے دن دوبارہ اسی اخبار کے دفتر پہنچ گیا' ریسپشنسٹ نے اسے دیکھا تو غصے سے بولا "میں نے تمہیں کل کہا تھا چیف ایڈیٹر صاحب لوگوں سے اس طرح نہیں ملتے" نوجوان نے انکساری سے کہا "سر کوئی بات نہیں' نہ ملیں لیکن میں چاہتا ہوں میں یہاں آتا رہوں' ہو سکتا ہے چیف ایڈیٹر صاحب کبھی اپنی پالیسی تبدیل کر لیں اور وہ میرے جیسے لوگوں سے ملاقات شروع کر دیں" اس کے بعد وہ نوجوان دوبارہ بینچ کے کونے پر بیٹھ گیا' اس نے تھیلے سے کتاب نکالی اور پڑھنا شروع کر دی' شام کو ریسپشنسٹ کو سلام کیا اور واپس ہاسٹل چلا گیا' آپ یقین کرو گے یہ نوجوان ڈیڑھ ماہ تک مسلسل اخبار کے دفتر آتا رہا تھا' یہ روز ریسپشن پر آتا تھا' ریسپشنسٹ اسے وہی جواب دیتا تھا اور یہ بینچ پر بیٹھ کر کتاب پڑھتا رہتا تھا' اس دوران بارشیں بھی ہوئیں' آندھیاں بھی آئیں اور لوہے کو موم بنانے والی گرمی بھی پڑی لیکن یہ نوجوان روزانہ اخبار کے دفتر پہنچتا رہا یہاں تک کہ وہ ریسپشنسٹ اس کا سفارشی بن گیا' وہ اسے چیف ایڈیٹر کے چپڑاسی کے پاس لے گیا اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر اس کی سفارش کی' چپڑاسی اسے چیف ایڈیٹر کے پاس لے گیا' چیف ایڈیٹر نے نیوز ایڈیٹر کو بلوایا اور نوجوان کا ٹیسٹ لینے کا حکم دے دیا' نیوز ایڈیٹر آج کے ایکسپریس کے گروپ ایڈیٹر عباس اطہر تھے' نیوز ایڈیٹر نے ٹیسٹ لیا اور نوجوان اس ٹیسٹ میں ناکام ہو گیا' عباس اطہر صاحب نے نوجوان کو کوئی دوسرا مناسب کام کرنے کا مشورہ دیا اور واپس بھجوا دیا' نوجوان ہاسٹل واپس گیا اور دوسرے دن دوبارہ عباس اطہر صاحب کے پاس حاضر ہو گیا اور ان سے عرض کیا "میں دوبارہ ٹیسٹ دینا چاہتا ہوں" عباس اطہر صاحب نے انگریزی کا اخبار اٹھایا' ایک خبر پر پنسل سے نشان لگایا' اسے اس خبر کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا اور خود واک پر چلے گئے' وہ نوجوان دوسرے دن بھی فیل ہو گیا لیکن تیسرے دن پھر ٹیسٹ دینے کیلئے پہنچ گیا' اس کے بعد ایک نیا کھیل شروع ہو گیا' یہ نوجوان روز اخبار کے دفتر آتا' ٹیسٹ دیتا' فیل ہوتا اور اگلے دن پھر دفتر پہنچ جاتا' یہ سلسلہ مہینہ بھر جاری رہا یہاں تک کہ عباس اطہر صاحب نے اپنی جان چھڑانے کیلئے اسے پاس کر دیا' اس کے بعد ایک نیا مرحلہ تھا' نوجوان کی درخواست نیوز ایڈیٹر کی ری کمنڈیشن کے ساتھ ایڈیٹر کو آرڈینیشن کے پاس پہنچ گئی' اس وقت محمد اقبال زبیری اخبار کے ایڈیٹر تھے' وہ بہت سینئر صحافی تھے' انہوں نے درخواست دیکھی اور نوجوان سے کہا "بیٹا آپ اپنا ٹیلی فون نمبر دے دیں' ہمارے پاس سردست کوئی نوکری نہیں' جس دن گنجائش پیدا ہو گی' ہم آپ کو کال کر دیں گے" نوجوان نے ٹیلی فون نمبر دیا' سلام کیا اور واپس چلا گیا لیکن اگلے دن ایڈیٹر کے پاس دوبارہ حاضر ہو گیا' ایڈیٹر نے پر جلال نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھنکار کر بولے "تم پھر آ گئے ہو' میں نے تمہیں کہا تھا جب گنجائش پیدا ہو گی تو تمہیں ٹیلی فون کر دیں گے" نوجوان نے لجاجت سے جواب دیا "جناب میں ہاسٹل میں رہتا ہوں' میں نے آپ کو ہاسٹل ہی کا نمبر دیا تھا' یہ نمبر اکثر مصروف رہتا ہے' مجھے خطرہ ہے آپ مجھے کال کریں تو آپ کا پیغام مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا لہٰذا آپ اگر مہربانی کریں تو میں روزانہ آپ سے نوکری کا پوچھ لیا کروں" ایڈیٹر صاحب کے غصے میں اضافہ ہو گیا اور چلا کر بولے "کیا میں اتنا فارغ ہوں کہ تمہیں روز جواب دوں" نوجوان نے عرض کیا "لیکن میں فارغ ہوں' میں سارا دن فارغ رہتا ہوں' یہ میری واحد مصروفیت ہے" ایڈیٹر حیرت سے نوجوان کی طرف دیکھنے لگا' نوجوان نے عرض کیا "جناب آپ کے دروازے پر ایک فٹ کا شیشہ لگا ہے' آپ اگر اجازت دیں تو میں روز تین بجے آپ کے دروازے پر آ کر اس شیشے سے اندر جھانک لیا

[illegible] ہے آپ اگر اجازت دیں تو میں روز تین بجے آپ کے دروازے پر آ کر اس شیشے سے اندر جھانکا کروں اور آپ اندر سے صرف انکار میں سر ہلا دیا کریں‘ میں چپ چاپ واپس چلا جاؤں گا‘ اس سے آپ بھی ڈسٹرب نہیں ہوں گے اور میرا کام بھی ہو جائے گا“ ایڈیٹر نے ہاں میں سر ہلا دیا اور یوں ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا‘ یہ نوجوان روز اخبار کے دفتر جاتا‘ شیشے سے ایڈیٹر کے کمرے میں جھانکتا‘ ایڈیٹر اسے دیکھ کر انکار میں سر ہلا دیتا اور یہ چپ چاپ واپس چلا جاتا‘ آپ یقین کرو یہ سلسلہ تین ماہ تک چلتا رہا۔

یہ نوجوان اس دوران نوے بانوے مرتبہ ایڈیٹر کے دروازے پر آیا اور اتنی ہی مرتبہ ایڈیٹر نے انکار میں سر ہلا دیا یہاں تک کہ ایک بار یہ نوجوان ایڈیٹر کے دروازے پر پہنچا تو ایڈیٹر دروازہ کھول کر کھڑا تھا‘ اس نے نوجوان کو کان سے پکڑا‘ اپنے سامنے بٹھایا‘ گھنٹی بجا کر نیوز ایڈیٹر کو بلوایا‘ نوجوان کی درخواست نیوز ایڈیٹر کو پکڑائی اور قہقہہ لگا کر بولا ”شاہ جی یہ بچہ چیونگم ہے‘ میں نے آج تک اس جیسا مستقل مزاج نہیں دیکھا‘ میں نے نظامی صاحب سے منظوری لے لی ہے‘ آپ اسے ڈیسک پر بٹھا لیں لیکن میں آج پیشن گوئی کرتا ہوں‘ ہم لوگ کبھی اس کے استاد ہونے پر فخر کریں گے“ محمد اقبال زبیری صاحب نے نوجوان کا دوسرا کان بھی کھینچا‘ اس کے گال تھپتھپائے اور دروازہ کھول کر اسے میڈیا کی دنیا میں دھکیل دیا‘ وہ نوجوان لاہور کے دوسرے بڑے اخبار کے نیوز ڈیسک پر پہنچ گیا لیکن یہ کہانی کا اختتام نہیں تھا‘ یہ کہانی کا آغاز تھا کیونکہ یہاں سے کیلوں کے نئے تھیلوں کا آغاز ہوتا ہے‘ نوجوان کی مستقل مزاجی کا دوسرا امتحان یہاں سے شروع ہوتا ہے“ میں خاموش ہو گیا۔

میرے دوست کا بیٹا حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا‘ میں خاموش ہوا تو وہ پریشانی کے عالم میں بولا ”یہ نوجوان کون تھا“ میں نے قہقہہ لگایا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا ”اس کہانی کا ایاز تمہارے سامنے بیٹھا ہے‘ میں ہی وہ ایاز ہوں جسے اللہ تعالیٰ نے چیونگم جیسی مستقل مزاجی دے کر پیدا کیا تھا“۔
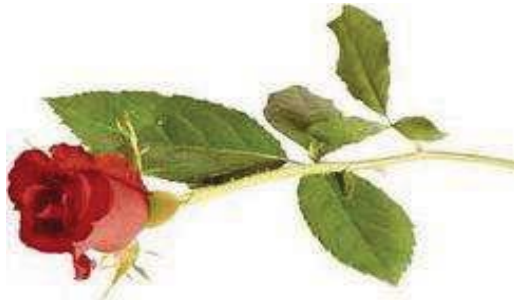
یہ ہے جمہوریت

''ہم منافقت کی سزا بھگت رہے ہیں'' یہ فقرہ تحریک پاکستان کے نامور راہنما اور پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے آج سے 45 سال پہلے کہا تھا' وہ ان دنوں ڈھاکا میں مقیم تھے' علیل تھے اور سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے' اس دور میں ملک میں ایوب خان کی حکومت تھی اور فیلڈ مارشل پاکستان کے ایماندار' محب وطن اور وژنری سیاستدانوں سے چن چن کر بدلے لے رہے تھے اور اس وقت کسی نے خواجہ صاحب سے پوچھا ''ہمیں کس بات کی سزا مل رہی ہے'' خواجہ صاحب نے فوراً جواب دیا ''ہم منافقت کی سزا بھگت رہے ہیں'' خواجہ ناظم الدین کا کہنا تھا ''ہم نے قائداعظم کی تصویر نوٹ پر چھاپ دی لیکن ہم نے ان کا ایک بھی اصول نہیں اپنایا' ہم نے قومی اسمبلی میں قائداعظم کی تصویر بھی لگا دی لیکن ہم نے اس تصویر کے نیچے ایک آمر کو بٹھا دیا اور ہم لوگ حلف جمہوریت' مساوات اور میرٹ کا لیتے ہیں لیکن اپنے ہاتھوں سے میرٹ' مساوات اور جمہوریت کو پرزے پرزے بھی کر دیتے ہیں چنانچہ قدرت ہمیں اس منافقت کی سزا دے رہی ہے' ہم تیزی سے زوال کی گہرائیوں میں اترتے جا رہے ہیں'' خواجہ ناظم الدین تاریخ کے بہت بڑے لیڈر تھے لیکن مجھے اتنے بڑے لیڈر کی اس آبزرویشن سے اختلاف ہے کیونکہ اگر ہم آج کی منافقت کا تقابل ایوب خان کے سیاسی سمجھوتوں سے کریں تو ہمیں صدر ایوب خان کی سیاسی منافقت آج کی منافقت کے مقابلے میں پہاڑ پر رائی محسوس ہوگی' ہم نے 2010ء میں پاکستان کو سیاسی منافقت میں جس سطح پر پہنچا دیا ہے خواجہ ناظم الدین اور ان کی کلاس اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی' آج ہماری سیاسی منافقت کا یہ عالم ہے کہ سپیکر قومی اسمبلی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا نے قومی اسمبلی کا نیا لوگو تیار کرایا' یہ لوگو چند دنوں میں اسمبلی کے تمام کاغذات' دستاویزات اور پیشانی پر لگا دیا جائے گا' یہ لوگو تین الفاظ پر مشتمل ہے' جمہوریت' حاکمیت اور مساوات۔ آپ اس لوگو کو سامنے رکھئے اور آج کے سیاسی کلچر کا مطالعہ کیجئے اور بتایئے کیا اس ملک میں جمہوریت' حاکمیت اور مساوات موجود ہے؟ آپ سب سے پہلے جمہوریت کو لیجئے' ہمارے ملک میں جمہوریت کا مطلب کرپشن' اقربا پروری اور شخصی آمریت ہے۔ آپ اس ضمن میں جمشید دستی اور نذیر جٹ کی مثال لے سکتے ہیں' جمشید دستی این اے 178 مظفر گڑھ سے رکن قومی اسمبلی تھے' یہ پاکستان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر کامیاب ہو کر قومی اسمبلی پہنچے تھے' 25 مارچ 2010ء کو سپریم کورٹ میں ان کی ایم اے اسلامیات کی ڈگری جعلی ثابت ہو گئی' جمشید دستی نے سزا سے بچنے کیلئے قومی اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دے دیا۔ نذیر جٹ این اے 167 بورے والا سے پاکستان مسلم لیگ ق کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن بنے تھے' یہ بھی 25 مارچ کو جعلی ڈگری کے مجرم ثابت ہو گئے اور انہوں نے بھی جمشید دستی کی طرح استعفیٰ دے دیا۔ آج پندرہ دن بعد پاکستان پیپلز پارٹی نے نا صرف جمشید دستی کو ٹکٹ دے دیا بلکہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے جمشید دستی کو اپنے بھائی مجتبیٰ گیلانی کے حق میں ٹکٹ سے دستبردار ہونے کے عوض وزیراعظم کا مشیر بننے کی پیش کش بھی کر دی۔ جمشید دستی نے یہ پیش کش قبول بھی کر لی تھی اور ان کیلئے گاڑی اور دفتر کا بندوبست بھی ہو گیا تھا لیکن صدر آصف علی زرداری نے دوبئی سے مداخلت کی اور جمشید دستی کو دوبارہ ٹکٹ مل گیا۔ نذیر جٹ کو بھی پاکستان مسلم لیگ ق چھوڑنے کے عوض پاکستان پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دے دیا۔ آپ ملاحظہ کیجئے پاکستان پیپلز پارٹی نے

دونوں حضرات کو ٹکٹ دیتے ہوئے اور وزیراعظم نے جمشید دستی کو مشیر کی پوزیشن آفر کرتے ہوئے ایک لمحے کیلئے یہ نہیں سوچا تھا یہ دونوں وہ حضرات ہیں جو چند دن قبل سپریم کورٹ میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہوئے تھے اور جنہوں نے نا صرف یہ تسلیم کیا تھا کہ ان کی ڈگریاں جعلی ہیں بلکہ انہوں نے اپنی اپنی نشستوں سے استعفیٰ بھی دے دیا اور ہم قانون کے ان مجرموں کو ٹکٹ دے رہے ہیں' یہ ہے جمہوریت۔ جمہوریت کی دوسری مثال ایف آئی اے کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل احمد ریاض شیخ ہیں' یہ صاحب کرپشن اور مس کنڈیکٹ کے الزام میں نوکری سے فارغ ہوئے' گرفتار ہوئے' جیل گئے' این آر او کے ذریعے باہر آئے' نوکری پر بحال ہوئے' انہیں آؤٹ آف دی ٹرن پروموشن ملی' سپریم کورٹ نے این آر او کے خاتمے کا اعلان کیا تو ان کے مقدمے دوبارہ کھلے اور سپریم کورٹ نے انہیں عدالت سے گرفتار کرا کر جیل بھجوا دیا' یہ قانونی لحاظ سے اپنی تین چوتھائی سزا پوری کر چکے ہیں' ان کے چار ماہ باقی ہیں' صدر آصف علی زرداری نے آئین کے آرٹیکل 45 کے تحت پاکستان کے تمام قیدیوں کی ایک چوتھائی سزا معاف کر دی' اس کا دس ہزار قیدیوں کو فائدہ ہوا اور ان قیدیوں میں احمد ریاض شیخ بھی شامل ہیں۔ مجھے یقین ہے احمد ریاض شیخ کو بھی رہائی کے بعد کوئی نہ کوئی اعلیٰ عہدہ دے دیا جائے گا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا تا چلوں احمد ریاض شیخ قیدی ہیں لیکن یہ اس وقت دل کے مرض کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہیں اور انہیں مشیروں کی تمام سہولیات حاصل ہیں۔

آپ جمہوریت کی ایک اور شاندار مثال بھی ملاحظہ کیجئے' صدر پرویز مشرف نے ایل ایف او کے ذریعے تمام سیاسی جماعتوں کے اندر الیکشن ضروری قرار دے دیا تھا' یہ حکم بعدازاں سترہویں ترمیم کے ذریعے آئین کا حصہ بن گیا اور یوں تمام سیاسی جماعتوں نے پارٹی الیکشن کرانا شروع کر دیئے' یہ صدر پرویز مشرف کی اس ترمیم کا نتیجہ تھا کہ راجہ ظفرالحق پاکستان مسلم لیگ ن کے چیئرمین اور میاں شہباز شریف پارٹی کے صدر بن گئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی' پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز بنی اور مخدوم امین فہیم اس کے صدر اور راجہ پرویز اشرف اس کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے لیکن ہماری جمہوری اسمبلی نے 8 اپریل کو اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے یہ شق ختم کر دی جس کے بعد تمام سیاسی جماعتیں نہ صرف الیکشن کے تکلف سے آزاد ہو گئیں بلکہ پارٹیوں میں موجود خاندانی آمریت کو آئینی تحفظ بھی مل گیا۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد تمام سیاسی جماعتوں کے ایم این اے پارٹی قیادت کے حکم کے پابند ہوں گے اور اگر کسی ایم این اے نے پارٹی لائین کے خلاف منہ کھولنے یا ایوان میں ووٹ دینے کی جرات کی تو پارٹی قیادت الیکشن کمیشن کو خط لکھ کر اس کی رکنیت ساقط کروا سکے گی۔ اس شق کے ذریعے بلاول زرداری بھٹو' میاں نواز شریف اور الطاف حسین کی شکل میں اسمبلی سے باہر بیٹھی قیادت کسی بھی ایم این اے' وزیراعلیٰ اور وزیراعظم کو ان کے عہدوں سے برخاست کر سکے گی یوں اس شق کی مدد سے جمہوری لیڈروں کو وہ تمام اختیارات مل گئے جو آج تک پاکستان کے بڑے سے بڑے آمر کو بھی حاصل نہیں تھے۔ یہ شق 8 اپریل 2010ء کو منظوری کے لئے قومی اسمبلی میں پیش ہوئی تو صرف جاوید ہاشمی' خواجہ سعد رفیق اور کشمالہ طارق نے کھڑے ہو کر اس کی مخالفت کی۔ میں جاوید ہاشمی کا دل سے مداح ہوں' یہ ملک کے ان چند لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں جن کے ضمیر کو آج تک کوئی خرید سکا اور نہ ہی دبا سکا۔

[illegible]

سیدھے اور کھرے انسان ہیں لیکن مجھے کشمالہ طارق سے اختلاف تھا' اس کی وجہ ان کا بیک گراؤنڈ تھا' یہ صدر پرویز مشرف کے دور میں سامنے آئی تھیں اور ان کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں بھی گردش کرتی رہی تھیں لیکن کشمالہ طارق نے اس شق پر کلمہ جہاد بلند کر کے اپنے سارے شکوک دھو دیئے اور جاوید ہاشمی اور خواجہ سعد رفیق نے اس پر پارٹی موقف کے خلاف ووٹ دے کر کمال کر دیا جبکہ قومی اسمبلی کے بڑے بڑے جغادری سیاستدان اور جمہوریت کے چیمپئن شہنشاہیت کے اس دور کے آغاز پر خاموش بیٹھے رہے' یہ تین لوگ سیاسی منافقت کے اس دور میں فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہوں نے اس شق کے خلاف آواز بلند کر کے ثابت کر دیا' ضمیروں کے قبرستان میں ابھی چند مردے زندہ ہیں لیکن سوال یہ ہے باقی لوگ کہاں تھے؟ جمہوریت کے باقی چیمپئن کیوں خاموش تھے؟ ان کی زبانوں پر تالے کیوں پڑے رہے اور کیا ان کی خاموشی پاکستان میں جمہوریت کی سنجیدگی اور مستقبل کی نشاندہی نہیں کرتی؟۔

آپ 8 اپریل کی قومی اسمبلی کی کارروائی دیکھئے' آپ کو فوراً اندازا ہو جائے گا ہمارے سیاستدانوں کی نظر میں جمہوریت کا مطلب کیا ہے؟ یہ لوگ جنرل پرویز مشرف کے ڈنڈے کو میاں نواز شریف' آصف علی زرداری یا الطاف حسین کے ہاتھ میں پکڑنے کو جمہوریت کہتے ہیں' ان لوگوں کیلئے آمریت جرنیل ہوتے ہیں اور اگر کوئی سول آمر جرنیلی اختیارات استعمال کر رہا ہو تو یہ اسے عین جمہوریت کہتے ہیں اگر یہ جمہوریت ہے تو میں آج اس جمہوریت کا مخالف ہوں کیونکہ میں پاکستان کا آزاد شہری ہونے کے ناتے میاں نواز شریف' بلاول زرداری بھٹو' آصف علی زرداری' اسفند یار ولی' چودھری شجاعت حسین اور الطاف حسین کو جنرل پرویز مشرف کا رول دینے کیلئے تیار نہیں ہوں' میں اس سیاسی منافقت کا سپورٹر بننے کیلئے رضامند نہیں ہوں۔

ڈیموکریسی ......ان دی لائن آف فائر
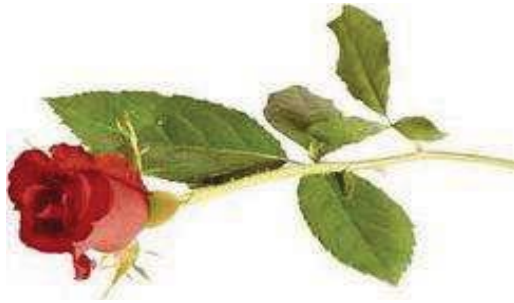
سینیٹر ظفر علی شاہ پاکستان کے معروف قانون دان اور سیاستدان ہیں' یہ اپنے مخصوص لب و لہجے' گرج دار آواز اور اٹل مؤقف کی وجہ سے سیاستدانوں میں قابل عزت سمجھے جاتے ہیں' سینیٹر رضا ربانی نے 12 اپریل 2010ء کو اٹھارہویں ترمیم سینٹ میں پیش کی تو ظفر علی شاہ نے فوراً تحریک التواء پیش کر دی' شاہ جی کا کہنا تھا ہزارہ ڈویژن میں اس وقت آگ لگی ہوئی ہے' 14 لوگ (حکومتی ذرائع کے مطابق سات لوگ) شہید ہو چکے ہیں' پولیس ایبٹ آباد میں فائرنگ کر رہی ہے' شہر میں آنسو گیس کی بو پھیلی ہے' ایک ہفتے سے شاہراہ ریشم بند ہے' ہزارہ کے پانچ شہروں میں ٹریفک بلاک ہے' سکول' مارکیٹوں اور بازاروں کو تالے لگے ہیں اور شہری زندگی مفلوج ہے چنانچہ ہمیں اس دکھ کی گھڑی میں اٹھارہویں ترمیم کی بجائے خیبر پختونخواہ کے ایشو پر بات کرنی چاہیے' ہمیں ہزارہ کے لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھنا چاہیے۔ ظفر علی شاہ اٹھارہویں ترمیم کے کچھ نقائص بھی بیان کرنا چاہتے تھے لیکن سینیٹر اسحاق ڈار نے انہیں روک دیا' اسحاق ڈار کا کہنا تھا اٹھارہویں ترمیم کو پاس ہو جانا چاہیے کیونکہ یہ اگر تعطل کا شکار ہو گئی تو اس کا سارا ملبہ پاکستان مسلم لیگ ن پر گر جائے گا اور تمام سیاسی جماعتیں' تمام صوبے اور میڈیا پاکستان مسلم لیگ ن کو مورد الزام ٹھہرائے گا' اس پر شاہ جی نے اسحاق ڈار کو جواب دیا ''میں آنکھوں دیکھ کر مکھی نہیں نگل سکتا' میرے سامنے غیر آئینی کام ہو رہے ہیں اور میں خاموش رہوں' یہ میرے ضمیر کے خلاف ہے'' اس کے بعد شاہ جی سینٹ سے باہر آگئے کیونکہ ان کا خیال تھا وہ اگر ایوان میں بیٹھے رہے تو وہ اپنی ہی جماعت سے الجھ پڑیں گے اور یوں پاکستان مسلم لیگ ن کی جگ ہنسائی ہو گی۔

میں نے اس شام ظفر علی شاہ سے پوچھا ''کیا آپ نے اسحاق ڈار کو استعفیٰ کی دھمکی دے دی تھی'' شاہ جی مسکرائے اور اپنے مخصوص لہجے میں بولے ''ابھی نہیں دی''۔

ہمیں ظفر علی شاہ کی طرح یہ ماننا پڑے گا اٹھارہویں ترمیم میں بے شمار خامیاں ہیں' ان میں سے پہلی خامی کا عملی مظاہرہ ہم ہزارہ ڈویژن میں دیکھ رہے ہیں' ہزارہ پرامن ترین علاقہ تھا لیکن آئینی کمیٹی نے ہزارہ میں خیبر پختونخواہ کا کریکر پھینک کر آج اس کی پرامن فضا کو دھواں دھار بنا دیا۔ اس کی دوسری خامی 27 رکنی کمیٹی تھی' اس میں کوئی شک نہیں اس کمیٹی میں تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندے تھے اور اس کمیٹی نے بڑی عرق ریزی سے تمام آئینی مسائل کا حل تجویز کیا لیکن سوال یہ ہے کیا کمیٹی کے 27 ارکان پارلیمنٹ کے 444 ارکان کا متبادل ہو سکتے ہیں اور اگر پاکستان کے بڑے بڑے مسائل پانچ سات بڑی سیاسی جماعتوں کے قائدین اور 27 ارکان نے ہی طے کرنا ہیں تو پھر پارلیمنٹ کی کیا ضرورت ہے؟ پاکستان کے چھ بڑے ایک جگہ بیٹھیں' فیصلہ کریں اور اس پر عملدر آمد شروع کر دیا جائے یا پھر تمام سیاسی جماعتیں بیس' پچیس' تیس ارکان کی کمیٹی بنائیں' اس کمیٹی کو تمام آئینی اور دستوری اختیارات دے دیئے جائیں اور یہ کمیٹی تمام چھوٹے بڑے مسائل کا حل تجویز کر دے' پارلیمنٹ کی کیا ضرورت ہے؟ پارلیمنٹ پر ایک منٹ میں قوم کے 55 ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں اور الیکشنوں میں کھربوں روپے ضائع ہو جاتے ہیں' یہ سرمایہ تو کم از کم بچ جائے گا۔ اس ترمیم کا دوسرا سقم آمرانہ رویہ ہے' آپ اٹھارہویں ترمیم سے پہلے صدر پرویز مشرف کی سترویں ترمیم کی بیک گراؤنڈ دیکھئے' یہ ترمیم جنرل پرویز مشرف

کی ہدایت پر آئی ایس آئی کی ٹیم نے ملک کے معروف قانون دانوں سے تیار کروائی تھی‘ آئی ایس آئی نے تمام سیاسی جماعتوں بشمول ایم ایم اے کو اس کی حمایت پر رضامند کیا‘ پرویز مشرف کی کٹھ پتلی حکومت نے یہ ترمیم ایوان میں پیش کی اور ایوان نے آدھ گھنٹے میں اس کی منظوری دے دی‘ بات ختم‘ اٹھارہویں ترمیم کیلئے بھی بالکل یہی طریقہ اختیار کیا گیا تھا‘ پرویز مشرف کے قانونی ماہرین کی بجائے 27 رکنی آئینی کمیٹی کی مدد لے لی گئی‘ آئی ایس آئی کا کام پارٹیوں کے قائدین نے سرانجام دیا‘ ترمیم تیار ہوئی اور قومی اسمبلی نے دو گھنٹے میں 102 ترامیم کی منظوری دے دی‘ اس سارے کھیل کے دوران ایم این ایز کا کام صرف اتنا تھا کہ سپیکر قومی اسمبلی ترمیم کا نام لیں اور ارکان اسمبلی چپ چاپ اس کی حمایت میں ہاتھ کھڑے کر دیں کیونکہ ان کی قیادت انہیں ہاتھ کھڑے کرنے کا حکم دے چکی تھی۔ اس ترمیم کے دوران آرٹیکل (4)17 جیسی شق بھی موجود تھی جس کے ذریعے تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین کو جرنیلی اختیارات دے دیئے گئے اور آرٹیکل 63 کی وہ ترمیم بھی شامل تھی جس کے ذریعے ملزموں اور مفروروں کو بھی الیکشن لڑنے کی اجازت مل جائے گی‘ اس جیسی ترامیم بھی ڈیڑھ منٹ میں پاس ہو گئیں لہٰذا ہماری قومی اسمبلی نے ثابت کر دیا آمریت اور جمہوریت میں کوئی فرق نہیں‘ اگر پرویز مشرف کے دور میں ارکان اسمبلی بھیڑ بکریاں تھے تو آج بھی صورتحال مختلف نہیں‘ اگر مشرف اسمبلی کا کام جنرل صاحب کے ڈنڈے کے اشارے پر ہاں ہاں کرنا تھا تو آج آصف علی زرداری‘ میاں نواز شریف‘ چودھری شجاعت حسین‘ الطاف حسین‘ اسفند یار ولی اور مولانا فضل الرحمٰن بھی جمہوری ارکان اسمبلی سے یہی کام لے رہیں چنانچہ جنرل پرویز مشرف اور آصف علی زرداری کی جمہوریت میں صرف یونیفارم اور اچھی انگریزی اور بری انگریزی کا فرق ہوا ہے۔

آپ اس جمہوری آمریت کا المیہ دیکھئے‘ پاکستان کی سیاسی قیادت نے اپنی پارٹیوں کے ارکان تک کو اٹھارہویں ترمیم کی بریفنگ کے قابل نہیں سمجھا تھا‘ پاکستان پیپلز پارٹی ہو‘ مسلم لیگ ن ہو‘ ق ہو یا پھر اے این پی ہو اٹھارہویں ترمیم کی تمام شقیں کسی جماعت کی میٹنگ میں ڈسکس نہیں ہوئیں‘ حد تو یہ ہے جب قومی اسمبلی میں (4)17 کا نام لیا گیا تو کشمالہ طارق نے اٹھ کر ایوان کو بتایا اس شق کے ذریعے پارٹیوں کے اندر آمریت قائم ہو جائے گی‘ اس پر مخدوم جاوید ہاشمی اور خواجہ سعد رفیق کھڑے ہو گئے‘ ان کا کہنا تھا اس شق کے بارے میں انہیں بریف نہیں کیا گیا تھا‘ مجھے جاوید ہاشمی نے خود بتایا ”میں بھاگتا ہوا چودھری نثار کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کیا آپ کو اس کے بارے میں معلوم تھا‘ چودھری نثار نے انکار میں سر ہلایا اور مجھ سے کہا ہاشمی صاحب مجھے کسی نے اس شق کے بارے میں نہیں بتایا تھا“ جاوید ہاشمی کے بقول ”میں نے چودھری نثار سے کہا چودھری صاحب پھر آج میں آپ کے ضمیر کی آواز بھی بلند کر رہا ہوں“ اس کے بعد جاوید ہاشمی اور خواجہ سعد رفیق نے اس شق پر پارٹی لائین کے خلاف ووٹ دیا‘ خواجہ سعد رفیق کا کہنا ہے ”اگر وقت ہوتا تو باقی ارکان بھی اس شق کے خلاف ووٹ دیتے“ اب سوال یہ ہے اتنے بڑے بڑے فیصلے کون کر رہا ہے؟ اور اس پر پارٹیوں کے ارکان کو اعتماد میں کیوں نہیں لیا جا رہا؟ اور کیا ہم ارکان اسمبلی کو بکریوں کا کردار سونپ کر ملک میں اچھی جمہوریت قائم کر سکیں گے اور اگر یہ جمہوریت ہے تو پھر آمریت کس کو کہتے ہیں؟ یقین کیجئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ہماری جمہوریت ان دی لائن آف فائر ہے اور اس بار جی ہاں اس بار اس ملک میں مارشل لاء فوج نہیں لگائے گی‘ عوام لگائیں گے اور یہ صورتحال خطرناک بھی ہے اور قابل افسوس بھی۔

ویلڈن چاچا جی
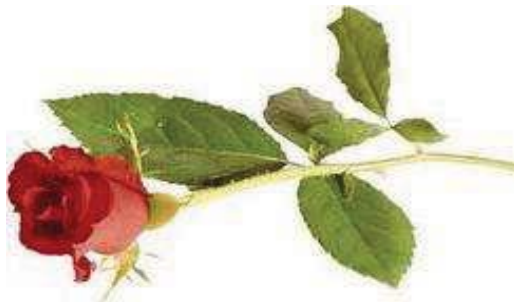
شکیل انجم کے ساتھ میری پہلی ملاقات 1995ء میں ہوئی' میں روزنامہ پاکستان میں شفٹ انچارج تھا' شکیل انجم پہلی بار دفتر میں داخل ہوا اور رپورٹنگ سیکشن میں چلا گیا' وہ جوانی سے بھرپور نوجوان دکھائی دیتا تھا' اسی شام پتہ چلا شکیل انجم اخبار کا نیا چیف رپورٹر ہے' میرے سمیت تمام لوگ اس تقرری پر حیران رہ گئے کیونکہ یہ عہدہ ہمیشہ سینئر رپورٹر کو پیش کیا جاتا ہے اور شکیل انجم کسی رخ سے سینئر دکھائی نہیں دیتا تھا' ہم لوگوں نے تھوڑی سی تحقیق کی تو پتہ چلا شکیل انجم عمر چور ہے' یہ ہم سب سے سینئر ہے' یہ بھرپور صحافتی زندگی گزار کر امریکا چلا گیا تھا' امریکا میں اس نے اپنے اندر کے صحافی کو مارنے کی بے شمار کوششیں کیں' اس نے اس صحافی کو کبھی ٹیکسی کے نیچے کچلنے کی کوشش کی' کبھی کچرے کے ڈبے میں پھینکنے کی جدوجہد کی اور کبھی اسے کسی ڈیپارٹمنٹل سٹور یا گیس سٹیشن میں دفن کرنے کی سعی کی لیکن صحافت دنیا کا وہ بھوت ہے جو اپنے مردے کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا' یہ اس بیل کی طرح ہے جو سوکھ جائے تو بھی برسات میں اس کے پتے نکل آتے ہیں چنانچہ شکیل انجم کے اندر کے بھوت نے اس کے ساتھ سمجھوتہ نہ کیا اور یہ دوبارہ اسے پرانی حویلی یعنی پاکستان لے آیا۔ یہ پاکستان آیا اور روزنامہ پاکستان کا چیف رپورٹر بن گیا' مجھے جب اس کی اصل عمر کا پتہ چلا تو میرے منہ سے بے اختیار "چاچا جی" نکل گیا' شکیل انجم مسکرایا اور اس نے جواب میں مجھے چاچا جی کا لقب دے دیا اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہم جہاں ملتے ہیں یا ہم جب بھی ایک دوسرے کو فون کرتے ہیں تو ہم دونوں کی کوشش ہوتی ہے ہم چاچا جی کا نعرہ لگانے میں پہل کریں اور اکثر ایسا ہوتا ہے ہم دونوں کے منہ سے بیک وقت چاچا جی کا نعرہ نکل جاتا ہے اور اس کے بعد ہم دیر تک ہنستے رہتے ہیں۔ شکیل انجم روزنامہ پاکستان کے بعد انگریزی کے ایک قومی اخبار میں گیا اور یہ آج تک اسی اخبار کا کرائم رپورٹر ہے۔ شکیل انجم میں تین خصوصیات ہیں' یہ عمر چور ہے' یہ انتہائی سینئر ہونے کے باوجود شکل سے نوجوان دکھائی دیتا ہے' آپ اس سے ملیں آپ کو یہ کسی بھی زاویے سے سینئر صحافی نظر نہیں آئے گا' ہم جونیئر لوگ آہستہ آہستہ چاچا جی یا انکل ہو گئے ہیں لیکن شکیل انجم اسی طرح بھتیجا بن کر صحافت کے کوچے میں پھر رہا ہے۔ دو' یہ نظریاتی لحاظ سے پکا جیالا ہے' اس کے اندر پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو خاندان سے محبت موجیں مارتی رہتی ہے' یہ 1996ء میں اس وقت محترمہ بے نظیر بھٹو کا پورا پورا انٹرویو کر آتا تھا جب میڈیا محترمہ کے قریب تک نہیں پھٹک سکتا تھا اور تین یہ صحافیوں کی اس کلاس سے تعلق رکھتا ہے جن کی ایمانداری' پروفیشنل ازم اور بے خوفی کی قسم کھائی جا سکتی ہے' یہ باہر سے بے خوف اور اندر سے کھرا شخص ہے اور مجھے اس کا "چاچا جی" ہونے پر فخر ہے۔

شکیل انجم نے پچھلے دنوں انگریزی زبان میں "Who Assassinated Benazir Bhutto" کے نام سے ایک تہلکہ خیز کتاب لکھی ہے' یہ محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی لیڈر کے قتل پر ملک کے ایک بڑے کرائم رپورٹر کی کتاب ہے اور میں جوں جوں یہ کتاب پڑھتا گیا مجھ پر محترمہ کے قتل کی وجوہات' قتل کی سازش کے تانے بانے' قاتلوں کے ہاتھ اور قتل کے بعد اس جرم پر پردہ ڈالنے والے مجرموں کے چہرے آشکار ہوتے گئے' مجھے پہلی بار ان تمام سوالوں کے جواب ملنا شروع ہو گئے جو محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے دن سے میرے دماغ میں سر اٹھا

رہے تھے مثلاً مجھے اس کتاب میں پہلی بار معلوم ہوا محترمہ کی شہادت کے تین بڑے ذمہ دار تھے' صدر پرویز مشرف' تحریک طالبان پاکستان اور محترمہ کے چند اپنے ساتھی۔ شکیل انجم کا کہنا ہے قاتلوں کو جب تک محترمہ کے اپنے ساتھیوں کی مدد حاصل نہ ہوتی اس وقت تک وہ محترمہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے کیونکہ محترمہ کی نقل و حرکت' ان کا آنا جانا اور ان کے روٹس کا تعین ان کے اپنے ساتھی کرتے تھے' ان ساتھیوں میں سے بعض لوگ قاتلوں کے ساتھ ملے ہوئے تھے اور یہی لوگ آج قاتلوں کی گرفتاری کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ شکیل انجم نے اپنی کتاب میں بریگیڈیئر جاوید چیمہ کی لیور کنٹروورسی کا بھی زبردست پوسٹ مارٹم کیا۔ شکیل انجم کا کہنا ہے صدر پرویز مشرف کے دور میں جوائنٹ انوسٹی گیشن ٹیم نے جان بوجھ کر لیور کنٹروورسی پیدا کی تھی' اس کا مقصد عوام کی توجہ اصل حقائق سے ہٹانا تھا اور یہ قتل کی اس سازش کا باقاعدہ حصہ تھی۔ شکیل انجم نے اپنی کتاب میں ایف آئی اے کے ایک ماہر کی خفیہ رپورٹ بھی شامل کی جس نے حکومتی ادارے میں ہونے کے باوجود لیور کنٹروورسی کو مسترد کر دیا تھا اور حکومت نے بعدازاں اس رپورٹ کو جامع تحقیقاتی رپورٹ کا حصہ نہیں بننے دیا۔ شکیل انجم نے کتاب میں دعویٰ کیا ڈاکٹروں نے محترمہ کے سر کے جس حصے کے ٹوٹنے کو ان کی موت کی وجہ قرار دیا اسے توڑنے کیلئے 50 نیوٹن فورس کی ضرورت ہوتی ہے اور سات انچ کے فاصلے پر موجود چار انچ کا لیور انسانی کھوپڑی میں اتنا بڑا سوراخ نہیں کر سکتا چنانچہ لیور کی تھیوری سو فیصد غلط اور حقائق کے منافی ہے۔ شکیل انجم نے ایف آئی اے کے ماہر کی خفیہ رپورٹ کے ذریعے یہ بھی ثابت کیا ”بے نظیر بھٹو کی موت گولی لگنے کی وجہ سے ہوئی تھی“ شکیل انجم کے بقول محترمہ بے نظیر بھٹو ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال راولپنڈی سے صرف ڈیڑھ کلو میٹر کے فاصلے پر تھیں لیکن حملے کے بعد محترمہ کو ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال لے جانے کی بجائے جان بوجھ کر سات کلو میٹر دور راولپنڈی جنرل ہسپتال لے جایا گیا جہاں منصوبہ سازوں کی ہدایت پر غیر متعلقہ ڈاکٹروں کی ٹیم پہلے سے موجود تھی اور اس ٹیم نے پوسٹ مارٹم کے بغیر محترمہ بے نظیر بھٹو کی نعش ورثاء کے حوالے کر دی اور یہ قانون کی سیدھی سادی خلاف ورزی تھی۔ شکیل انجم نے کتاب میں انکشاف کیا محترمہ کے قتل میں ان کے کچھ قریبی ساتھی بھی ملوث ہیں' یہ لوگ موجودہ حکومت پر دباؤ ڈال کر محترمہ کے قتل کی رپورٹ سامنے نہیں آنے دے رہے۔ اس کتاب میں ”چاچا جی“ نے محترمہ کے قتل کی تحقیقات کے سلسلے میں حکومت کی غیر سنجیدگی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا' شکیل انجم کا کہنا ہے صدر پرویز مشرف کی حکومت نے اپنی لیور کنٹروورسی کی بین الاقوامی تصدیق کیلئے سکاٹ لینڈ یارڈ کی مدد بھی لی تھی' پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت نے اس وقت سکاٹ لینڈ یارڈ کی بھرپور مخالفت کی تھی لیکن پرویز مشرف نے اس مخالفت کے باوجود نہ صرف سکاٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم کو پاکستان بلوایا بلکہ اسے محترمہ کے قتل کی وجوہات تلاش کرنے کی بجائے صرف لیور کو ”کاز آف ڈیتھ“ ثابت کرنے کا ٹاسک دیا اور سکاٹ لینڈ یارڈ نے پرویز مشرف حکومت کے دباؤ میں آ کر جوائنٹ انوسٹی گیشن ٹیم کی رپورٹ کی تصدیق کر دی اور یوں عالمی سطح پر سکاٹ لینڈ یارڈ کی کریڈیبلٹی بھی مشکوک ہو گئی۔ شکیل انجم نے کتاب میں انکشاف کیا محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد منصوبہ سازوں نے سازش میں شامل تمام کرداروں کو ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کر دیا اور یوں تیزی سے شواہد اور گواہ ختم ہوتے چلے گئے“ شکیل انجم نے اس کتاب میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے سکیورٹی گارڈ خالد شہنشاہ اور تحریک طالبان پاکستان کے سربراہ بیت اللہ محسود کے درمیان

محترمہ بے نظیر بھٹو کے سیکورٹی گارڈ خالد شہنشاہ اور تحریک طالبان پاکستان کے سربراہ بیت اللہ محسود کے درمیان موجود رابطوں پر بھی بے شمار سوال اٹھائے' انہوں نے وزیر داخلہ رحمٰن ملک اور صدر آصف علی زرداری کی خاموشی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا' قتل سے پہلے اور قتل کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے بعض اہم مہروں کے صدر پرویز مشرف سے رابطوں پر بھی بڑے بڑے سوالیہ نشان لگائے اور شکیل انجم نے تحقیقات میں حکومت کی عدم دلچسپی پر بھی شبہات ظاہر کیے۔ شکیل انجم کی یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز بھی ہے' ایک تحقیقاتی رپورٹ بھی' انکشافات پر مبنی ایک حیران کن تحریر بھی' ایک کرائم رپورٹر کے جاسوسانہ دماغ میں پروان چڑھنے والے سوالوں کا شہکار بھی اور محترمہ بے نظیر بھٹو سے جنون کی حد تک عقیدت رکھنے والے ایک جیالے کے سلگتے ابلتے خیالات کی ترجمان بھی۔

میں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کتاب پر کالم لکھ رہا ہوں اور اس کالم میں شکیل انجم کی ذات کا اتنا عمل دخل نہیں جتنا زور اس کتاب کا ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں یہ کتاب پاکستان میں سیاسی اور صحافتی کتابوں کے ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوگی اور اس کو دیکھ کر میرے دوسرے صحافی دوستوں کو بھی اس نوعیت کی کتابیں لکھنے کی تحریک ملے گی۔ صحافی اپنے دور کی تاریخ ہوتے ہیں کیونکہ یہ لوگ وقت کی ہر کروٹ کے عینی شاہد بھی ہوتے ہیں گواہ بھی اور مدعی بھی چنانچہ یہ لوگ اگر شکیل انجم کی سپرٹ سے اپنے تجربات کھل کر بیان کرنا شروع کر دیں تو یقین کیجئے وہ سارے رازاسرار کے پردوں سے باہر آجائیں جو وقت کی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں اور مستقبل کے مؤرخ کے ہاتھ شکوک و شبہات اور اندازوں کی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں آتا۔ ہمارے صحافی دوست اگر آج سے شکیل انجم جیسے قدم اٹھانا شروع کر دیں تو اس ملک کی تاریخ کی سمت درست ہو جائے گی چنانچہ میں اپنے دوست شکیل انجم کو ہیٹ اتار کر ''ویل ڈن چاچا جی'' کہتا ہوں کیونکہ اس کتاب کے بعد شکیل انجم صرف میرے جیسے چند ساتھیوں کا دوست نہیں رہا' یہ اب پورے پاکستان کا دوست بن چکا ہے' ویل ڈن چاچا جی۔
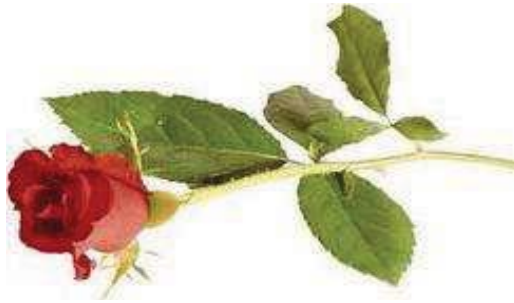
کیونکہ یہ آپ کا بچہ نہیں تھا

ہم لوگ اکثر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں پاکستان میں بیس ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے لیکن ہم پانچ سے چھ ہزار میگاواٹ کے شارٹ فال کا شکار ہیں‘ پورے ملک میں لوڈ شیڈنگ کے خلاف مظاہرے ہو رہے ہیں اور حکومت بجلی کی پیداوار بڑھانے کی بجائے رینٹل پاور پلانٹس اور دوسرے ممالک سے بجلی خریدنے پر زور دے رہی ہے‘کیوں ؟ ہم ایک دوسرے سے یہ بھی پوچھتے ہیں پاکستان میں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام قائم ہے‘ پاکستان کی 69 فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے‘ پاکستان کا دنیا کے ان دس ممالک میں شمار ہوتا ہے جس میں چاروں موسم پوری شدت کے ساتھ آتے ہیں‘ جس میں صرف ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد منفی پچاس درجے کی سردی پچاس درجے سینٹی گریڈ کی گرمی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جس میں سمندر سے لے کر گلیشئر تک ہر قسم کی زمین موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہر سال اس میں گندم کا بحران پیدا ہو جاتا ہے‘ دالیں غائب ہو جاتی ہیں‘ سبزیاں مہنگی ہو جاتی ہیں‘ دودھ کی قلت ہو جاتی ہے اور چینی کیلئے قطاریں لگ جاتی ہیں۔۔کیوں ؟ ہم لوگ اکثر ایک دوسرے سے یہ بھی پوچھتے ہیں پاکستان کے طول و عرض پر سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال بچھا ہے‘ لاکھوں کی تعداد میں استاد‘ لیکچرار اور پروفیسر موجود ہیں‘ پاکستان میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بھی ہے اور ہمارے ڈاکٹروں اور انجینئروں کی دنیا بھر میں مانگ بھی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارا تعلیمی نظام پست ہے کیوں ؟ سرکاری سکولوں کے ساتھ پرائیویٹ انگریزی سکول کھلے ہیں اور لوگ سرکاری سکولوں کی بجائے اپنے بچوں کو پرائیویٹ سکولوں میں تعلیم کیوں دلاتے ہیں اور پاکستان دنیا کا ایسا واحد ملک ہے جس میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں سے لے کر سیکرٹری تعلیم‘ وزیر تعلیم اور وزرائے اعلیٰ‘ وزیراعظم اور صدر تک کے بچے پرائیویٹ سکولوں‘ نجی کالجوں اور غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پڑھتے ہیں؟ کیوں اور کیوں؟ ہم میں سے اکثر لوگ ایک دوسرے سے یہ بھی پوچھتے ہیں پاکستان اٹھارہ کروڑ لوگوں کا ملک ہے لیکن اتنی بڑی آبادی ہونے کے باوجود یہ ضروریات زندگی درآمد کرتا ہے‘ ہم کپڑوں سے لے کر جوتوں تک‘ فرنیچر سے لے کر کراکری اور پنکھے سے لے کر کولر تک دوسرے ملکوں سے منگواتے ہیں کیوں ؟ اور پاکستان میں خوفناک بے روزگاری کے باوجود پورے ملک میں اچھا پنکچر لگانے والا‘ اچھا الیکٹریشن‘ اچھا پلمبر‘ اچھا پینٹر‘ اچھا کارپنٹر‘ اچھا مستری اور اچھا ڈرائیور کیوں نہیں ملتا؟ اور پاکستان دودھ کی پیداوار میں دنیا میں پانچویں نمبر پر ہے‘ پاکستان میں کوئلوں کی سینکڑوں میل لمبی کانیں ہیں‘ پاکستان میں ایسی ایسی جڑی بوٹیاں اور ادویاتی پودے اگتے ہیں جو کینسر جیسے امراض کا علاج کر سکتے ہیں اور ہم میں ایسے ایسے باصلاحیت لوگ بھی موجود ہیں جو صرف دیکھ کر‘ سن کر یا کچی پکی ڈرائنگز پڑھ کر پاکستان کو ایٹمی طاقت بنا سکتے ہیں اور ایسے ایسے سائنس دان بھی ہیں جن کا بنایا ہوا میزائل آج تک ہدف سے دو تین میٹر دائیں بائیں نہیں ہوا اور پاکستان فی کس آمدنی کے لحاظ سے خیرات کرنے والا دنیا کا پانچواں ملک بھی ہے اور یہ ہاکی میں چار مرتبہ اور کرکٹ میں ایک مرتبہ ورلڈ چیمپئن بھی رہا ہے اور جس کے کھلاڑیوں کو آج بھی دنیا بھر میں قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم تیسری دنیا کا محروم ترین ملک کیوں ہیں ؟۔

یہ وہ سوال ہیں جو پاکستان کے ہر پڑھے لکھے شخص کے دماغ میں اٹھتے ہیں اور وہ حیرت سے دوسرے کی طرف دیکھتا

ہے سیلن اسے اس کا کوئی جواب نہیں ملتا سیلن اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں یہ سوال ناقابل جواب ہیں یا یہ کوئی ناقابل حل مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ بہت سیدھا اور سادا ہے اور اس کا جواب چین کی ایک قدیم داستان میں چھپا ہے۔ چین کے ایک پہاڑ پر دو قومیں آباد تھیں' ایک قوم پہاڑ کی چوٹی پر رہتی تھی اور دوسری پہاڑ کے دامن میں۔ یہ دونوں بے انتہا بہادر' جری اور بے خوف لیکن ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ چوٹی پر رہنے والے لوگ دامن میں نہیں آسکتے تھے اور دامن میں رہنے والے لوگ پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتے تھے کیونکہ جو اس قانون کی خلاف ورزی کرتا تھا وہ مارا جاتا تھا۔ ایک رات پہاڑ سے دس پندرہ جوان نیچے اترے' انہوں نے سردار کا دو سال کا بچہ اٹھایا اور پہاڑ پر واپس چلے گئے۔ صبح دامن میں رہنے والی قوم کو پتہ چلا تو اس نے اپنے قبیلے کے بہادر ترین لوگوں کو جمع کیا' اسلحہ اور خوراک دی اور انہیں پہاڑ پر جاکر بچہ واپس لانے کا ٹاسک دے دیا' یہ لوگ پہاڑ پر چڑھنا شروع ہوئے لیکن پہاڑ پر چڑھائی مشکل تھی' ان لوگوں کو پہاڑ پر چڑھنے اور اترنے کی ٹریننگ بھی نہیں تھی چنانچہ یہ دو تین ماہ تک پہاڑ کے غاروں' گھاٹیوں اور چٹانوں میں مارے مارے پھرتے رہے' یہ لوگ ایک دن چٹان پر بیٹھ کر سستا رہے تھے کہ انہوں نے دور اوپر سے کسی عورت کو نیچے اترتے دیکھا' یہ عورت اطمینان سے نیچے اتر رہی تھی' یہ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے' وہ عورت ان کے قریب پہنچی تو یہ لوگ دیکھ کر حیران رہ گئے وہ عورت ان کے سردار کی بیوی تھی اور اس نے اغواء شدہ بچہ اپنی کمر پر باندھ رکھا تھا۔ ان لوگوں نے حیرت سے سردار کی بیوی سے پوچھا ''ہم قبیلے کے بہادر اور مضبوط ترین لوگ ہیں لیکن ہم تین ماہ کی کوشش کے باوجود پہاڑ پر نہیں چڑھ سکے' ہم یہ بھی جانتے ہیں جو قبیلہ بچہ اٹھا کر لے گیا تھا وہ انتہائی خونخوار اور بہادر ہے اور اس سے بچہ واپس لانا چیل کے گھونسلے سے ماس لانے کے برابر ہے لیکن تم اکیلی پہاڑ پر چڑھ بھی گئی' بچہ بھی واپس لے آئی اور تمہیں کوئی چوٹ' کوئی زخم بھی نہیں آیا' آخر تم میں ہمارے مقابلے میں کون سی چیز اضافی ہے'' عورت مسکرائی اور نرم آواز میں بولی ''تم پہاڑ پر اس لئے نہیں پہنچ پائے کیونکہ یہ تمہارا بچہ نہیں تھا''۔ عورت نے یہ کہا اور چپ چاپ نیچے اترنا شروع کر دیا۔

پاکستان میں بھی بجلی سے لے کر چینی تک کے مسائل اس لئے حل نہیں ہو رہے کہ یہ ہمارے حکمرانوں کے بچے نہیں ہیں' بجلی ہماری حکمران کلاس کا مسئلہ نہیں' تعلیم' صحت' روزگار' مہنگائی' لاقانونیت' ٹرانسپورٹ اور گندگی بھی ہماری حکمران کلاس کے بچے نہیں ہیں چنانچہ 62 سال گزرنے کے باوجود ان لوگوں کو چوٹی تک پہنچنے کا راستہ نہیں مل سکا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں آج اگر اعلیٰ بیوروکریسی' حکومتی عہدیداروں اور اپوزیشن سمیت تمام سیاستدانوں اور ان تمام لوگوں جن کی آمدنی پانچ لاکھ روپے ماہانہ سے زیادہ ہے ان کی بجلی کاٹ دی جائے' ان سے یوپی ایس اور جنریٹر واپس لے لئے جائیں تو بجلی کا مسئلہ ایک ماہ میں ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح صدر صاحب اور وزیراعظم صاحب سے لے کر اپوزیشن لیڈر' تمام ارکان اسمبلی' تمام سرکاری ملازموں اور اس ملک کے تمام بڑے تاجروں' بزنس مینوں اور صنعت کاروں کے بچوں اور پوتے پوتیوں کو سرکاری سکولوں میں داخل کرا دیا جائے' ان کو قطاروں میں بیٹھا کر ان کا سرکاری ہسپتالوں سے علاج کرایا جائے' انہیں بیس ہزار روپے ماہانہ میں گزارا کرنے پر مجبور کر دیا جائے اور ملک میں ضروریات زندگی کی درآمد پر پابندی لگا دی جائے یا پھر حکمران کلاس کیلئے یہ

قانون بنا دیا جائے یہ لوگ دس سال تک کوئی بیرونی پراڈکٹ استعمال نہیں کریں گے تو میں دیکھتا ہوں مہنگائی
تعلیم اور صحت کے مسئلے کیسے حل نہیں ہوتے اور اسی طرح اگر یہ قانون بنا دیا جائے اس ملک میں ہر شخص اپنے کیریئر کا آغاز پہلے گریڈ سے کرے گا اور وہاں سے ہوتا ہوا بیسویں گریڈ تک جائے گا تو میں دیکھتا ہوں اس ملک سے بے روزگاری کیسے ختم نہیں ہوتی اور ملازموں کی تنخواہوں میں مہنگائی کے مطابق اضافہ کیسے نہیں ہوتا؟ لیکن مجھے یقین ہے اس تجویز پر اس ملک میں کبھی عمل نہیں ہوگا' اس تجویز کو ''نان پریکٹیکل'' قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جائے کیونکہ بے روزگاری سے لے کر بجلی تک اس ملک کے سارے مسائل ہماری حکمران کلاس کے بچے نہیں ہیں' یہ عام لوگوں کے مسئلے ہیں چنانچہ ہمارے حکمران ان مسئلوں کے حل کیلئے صرف کوشش کر سکتے ہیں انہیں حل کرنے کی گارنٹی نہیں دے سکتے۔

آپ پاکستان کی دو سال کی سیاسی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو الیکشن میں بی اے کی شرط سے لے کر لوکل باڈیز' این ایف سی ایوارڈ' کیری لوگر بل اور اٹھارہویں ترمیم تک سارے مسئلے حل ہوتے ہوئے دکھائی دیں گے' کیوں؟ کیونکہ یہ اس ملک کی حکمران کلاس کے بچے تھے چنانچہ ان لوگوں نے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے دیر نہیں لگائی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے اس قسم کی کوشش پھر بجلی' مہنگائی اور بے روزگاری کے مسائل حل کرنے کیلئے کیوں نہیں کی گئی' بات سیدھی ہے یہ حکمرانوں کے بچے نہیں تھے چنانچہ ان مسائل کے حل کیلئے یہ لوگ ابھی تک جوتے تلاش کر رہے ہیں اور انہیں یہ جوتے اس وقت تک نہیں ملیں گے جب تک یہ مسئلے ان کے اپنے بچے نہیں بنیں گے۔ ہماری رولنگ ایلیٹ دراصل جہنم میں برف کے کمرے بنانے کی ماہر ہے' یہ لوگ تپتے صحرا کے خیمے میں اے سی لگا لیتے ہیں چنانچہ انہیں باہر کی گرمی' باہر کی تپش کا احساس نہیں ہوتا اور یوں یہ لوگ عوامی مسائل پر میٹنگز کر کے اپنی مدت پوری کر لیتے ہیں اور عوام کے بلکتے ہوئے بچے دوسروں کی گود میں دے کر رخصت ہو جاتے ہیں اور یہ ہمارے مسائل کی جڑ ہے۔

پولیس بھی آخر انسان ہے
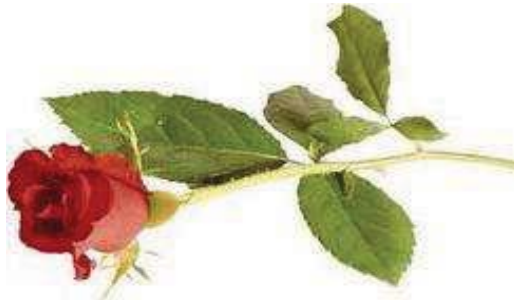
خالد سلیم موٹا پاکستانی فلموں کا مشہور مزاحیہ اداکار تھا' پاکستان میں ایک ایسا وقت بھی تھا جب یہ اداکار ہر فلم کا لازمی حصہ ہوتا تھا اور فلم کوئی بھی ہو' یہ کسی بھی زبان میں ہوتی' اس کی کہانی' اس کے ڈائیلاگ کسی نے بھی لکھے ہوں اور اس کا ڈائریکٹر' پروڈیوسر یا ہیرو' ہیروئن کوئی بھی ہو اس میں خالد سلیم موٹا ضرور ہوتا تھا اور اس فلم میں اس کا بس ایک ہی کام ہوتا تھا' ہیروئن کو تنگ کرنا اور ہیرو سے جی بھر کر مار کھانا۔ خالد سلیم موٹا آج کل کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے' ذیابیطس کی وجہ سے اس کا ایک پاؤں کٹ چکا ہے اور یہ بستر علالت پر حکومتی امداد کا انتظار کر رہا ہے لیکن حکومت کے پاس ایسے چھوٹے چھوٹے اداکاروں اور معمولی معمولی کاموں کیلئے وقت نہیں بہر حال اصل موضوع کی طرف آتا ہوں' اردو کی ایک فلم میں خالد سلیم موٹا اور اس کے "کن ٹٹے" ہیرو سے مار کھا رہے ہوتے ہیں' خالد سلیم موٹا اچانک اپنے بدمعاش ساتھیوں کو روکتا ہے اور اونچی آواز میں کہتا ہے "بھاگو ہم نے ہر فلم میں مار کھانے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا" اور ساتھ ہی خالد سلیم موٹا تمام بدمعاشوں کے ساتھ سین سے غائب ہو جاتا ہے۔ میں جب بھی ٹیلی ویژن پر عوام اور پولیس کو ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا دیکھتا ہوں تو مجھے خالد سلیم موٹا کا یہ ڈائیلاگ یاد آ جاتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کیا ہمارے معاشرے' ہمارے نظام نے خالد سلیم موٹا کی طرح مار کھانے کی ذمہ داری پولیس کو نہیں سونپ رکھی؟ کیا پولیس کا کام ہر حکمران جماعت کی سیکورٹی اور اس کے حکم پر عوام پر ڈنڈے' آنسو گیس اور گولیاں برسانا نہیں رہ گیا اور بعد ازاں اس غیر قانونی حرکت پر معطل ہونا' ٹرانسفر ہونا' عدالتوں کے دھکے کھانا اور احتساب کے کڑے عمل سے گزرنا ان کی ذمہ داری نہیں بن گیا؟'

طارق قریشی گجرات کے ڈی پی او ہیں' دو روز قبل انہوں نے مجھ سے بڑا سادہ سا سوال پوچھا تھا' انہوں نے پوچھا شہر میں لوڈشیڈنگ ہوتی ہے' لوگ گھروں سے نکلتے ہیں' اکٹھے ہوتے ہیں' ہاتھوں میں پتھر اور اینٹیں اٹھاتے ہیں اور شہریوں کی گاڑیوں' گھروں' دکانوں اور پلازوں پر حملہ کر دیتے ہیں یا پھر سرکاری عمارتوں کا گھیراؤ کر لیتے ہیں' ہم یعنی پولیس اگر ان لوگوں کا راستہ نہیں روکتی' انہیں سرکاری املاک کو نقصان پہنچانے سے نہیں روکتی تو پولیس پر انگلیاں اٹھنا شروع ہو جاتی ہیں' پاکستان بھر کا میڈیا ہمیں الزام دینے لگتا ہے' ہمیں اوپر سے احکامات آنا شروع ہو جائیں گے' ہمارے تبادلے بھی ہو جائیں گے اور ہم لوگ معطل بھی کر دیئے جائیں گے' ہم اس کے برعکس اگر جلوس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں' ہم سرکاری املاک یا عام شہریوں کی پراپرٹی اور بپھرے ہوئے عوام کے درمیان کھڑے ہو جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ ہمیں سب سے پہلے عوام کے پتھروں' اینٹوں اور ڈنڈوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' لوگ جی بھر کر ہمارے افسروں اور کانسٹیبلوں کو مارتے ہیں' ان کی وردیاں پھٹ جاتی ہیں' سر کھل جاتے ہیں' بازو اور ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں اور بعض اوقات یہ لوگ مارے بھی جاتے ہیں' ہم جہاں تک اس سلوک کو سہہ سکتے ہیں ہم سہہ لیتے ہیں لیکن جب حالات کنٹرول سے باہر ہو جاتے ہیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے مظاہرین پولیس کو روند کر معصوم شہریوں کی جان اور مال کو نقصان پہنچا دیں گے تو ہم لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے استعمال پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس لمحے ایک بار پھر ہم ہی مجرم ہو جاتے ہیں' میڈیا ہمارے ہی خلاف جہاد شروع کر دیتا ہے اور میڈیا کے پریشر میں آ کر ہمیں ہی معطل کر دیا جاتا ہے' ہمارے ہی تبادلے ہوتے ہیں اور ہمیں ہی انکوائریوں کا

سامنا کرنا پڑتا ہے‘ ہم لوگ اس صورتحال کی وجہ سے کنفیوژن کا شکار ہو گئے‘ آپ بتائیے ہمیں اس صورتحال میں کیا کرنا چاہیے؟“ سچی بات ہے میرے پاس قریشی صاحب کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ہمارے حالات اس قدر گنجلک ہو چکے ہیں کہ ہماری رائٹ اور رانگ کی تمیز ختم ہوتی جا رہی ہے‘ آپ صورتحال کی نزاکت کا اندازہ ہزارہ ڈویژن میں 12 اپریل کے ہنگاموں اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے قتل کی یو این انکوائری کا نتیجہ دیکھ لیجئے‘ 12 اپریل کو صوبہ سرحد کی حکومت نے پولیس مردان‘ صوابی اور پشاور سے ایبٹ آباد‘ مانسہرہ اور ہری پور بھجوا دی‘ شہر میں ہنگامے ہوئے‘ پولیس نے جواب میں لاٹھی چارج کیا‘ پھر آنسو گیس پھینکی اور آخر میں گولی چلا دی‘ فائرنگ میں 14 لوگ جاں بحق اور سو زخمی ہو گئے‘ پورے ملک میں کہرام مچ گیا‘ اس کہرام کے نتیجے میں حکومت نے ڈی آئی جی ہزارہ امتیاز الطاف اور ڈی سی او ہزارہ کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا‘ اب سوال یہ ہے اگر اس دن ہزارہ میں اضافی پولیس نہ بھجوائی جاتی‘ حالات کنٹرول سے باہر ہو جاتے‘ مظاہرین سرکاری املاک کو آگ لگا دیتے اور اس کے نتیجے میں دو تین سو لوگ مارے جاتے تو کیا ہوتا؟ اس کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جاتا؟ دوسرا پولیس اگر اس دن حالات کنٹرول نہ کرتی اور مظاہرین دو تین سو پولیس اہلکاروں کو قتل کر دیتے یا پورے شہر کو آگ لگا دیتے تو اس کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جاتا؟ اور کیا یہ بات مضحکہ خیز نہیں کہ حکومت نے ڈی آئی جی اور ڈی سی او ہزارہ کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا لیکن جس وزیر‘ چیف سیکرٹری‘ سینئر وزیر یا وزیر اعلیٰ نے گولی چلانے کا حکم دیا تھا اس پر آج تک کوئی انگلی نہیں اٹھی‘ کیوں؟ اس ساری صورتحال کی ذمہ دار صرف پولیس ہی کیوں ٹھہرائی گئی؟ آپ اب اقوام متحدہ کی بے نظیر بھٹو انکوائری رپورٹ پر آ جائیے‘ حکومت نے ڈی پی او راولپنڈی سعود عزیز‘ ڈی سی او عرفان الٰہی‘ ایڈیشنل آئی جی مجید مروت‘ ایس پی یاسین فاروق‘ ایس پی خرم شہزاد اور ایس پی اشفاق انور کو او ایس ڈی بھی بنا دیا اور ان کے نام ای سی ایل پر بھی ڈال دیئے ہیں‘ ان سب پر محترمہ کو مناسب سیکورٹی فراہم نہ کرنے کے الزامات ہیں‘ ڈی پی او سعود عزیز پر الزام ہے انہوں نے جائے حادثہ کو فوری طور پر دھو دینے کا حکم جاری کیا تھا‘ یہ سارے الزامات درست ہو سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے یہ لوگ اگر اس وقت صدر پرویز مشرف اور ان کے ”رفقاء“ کے احکامات نہ مانتے‘ یہ جائے حادثہ کو دھونے سے انکار کر دیتے یا وفاقی حکومت کے احکامات سے سرتابی کرتے ہوئے محترمہ کیلئے خصوصی سیکورٹی کا بندوبست کر دیتے یا مرحومہ کا سیکورٹی روٹ تبدیل کر دیتے تو کیا ہوتا؟ کیا یہ اسی وقت معطل نہ کر دیئے جاتے؟ کیا ان کے خلاف انکوائری شروع نہ ہو جاتی اور ان کی ٹرانسفر ٹنڈو آدم نہ کر دی جاتی یا انہیں ژوب نہ بھجوا دیا جاتا؟ یہ بے چارے تو خالد سلیم موٹا کی طرح پرویز مشرف کی فلم میں بھی مار کھا رہے تھے اور یہ آج پاکستان پیپلز پارٹی کی ”مووی“ میں بھی مار ہی کھا رہے ہیں‘ ان کا کام ہی یہ ہے‘ سینئر افسروں کی جھاڑ کھانا‘ وزیروں‘ ایم این اے‘ ایم پی اے اور ناظموں کی گالیاں کھانا اور عوام کے ڈنڈے‘ جوتے اور نعرے سہنا۔ مجھے یقین ہے محترمہ شہادت کیس میں صدر پرویز مشرف‘ میجر جنرل ندیم اعجاز‘ سیکرٹری داخلہ (سابق) کمال شاہ اور آئی بی کے سابق ڈائریکٹر جنرل اعجاز شاہ صاف صاف چھوٹ جائیں گے‘ ان سے کوئی انکوائری ہو گی اور نہ ہی انہیں ہتھکڑی لگے گی‘ پرویز مشرف باقی زندگی ڈانس پارٹیوں میں ناچ ناچ کر گزار دیں گے‘ بیمار ہوں گے‘ دنیا کے بہترین ہسپتالوں میں ان کا علاج ہو گا‘ وہ عمر عزیز گزار کر انتقال فرمائیں گے‘ ان کا جسد خاکی

پاکستان لایا جائے گا ان کے تابوت کو پرچم میں لپیٹا جائے گا اور سلامی دے کر انہیں خاک کے سپرد کر دیا جائے گا جبکہ سعود عزیز جیسے چھوٹے کارندوں کا سارا کیریئر برباد ہو جائے گا۔

میں پولیس کو مکمل بے گناہ یا حرمین شریفین کی پیدائش نہیں سمجھتا' یہ لوگ اس ظالم نظام کے داروغہ ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بھی انسان ہیں اور انہیں بھی ان کا جائز حق اور جائز مقام ملنا چاہیے کیونکہ صرف یونیفارم یا پولیس کے ٹائٹل کی وجہ سے انہیں ''اکراس دی بورڈ'' برا سمجھنا زیادتی ہوگی تاہم میری پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں سے بھی درخواست ہے یہ لوگ سروسز رولز کی عبادت کی طرح پیروی کریں' اعلیٰ حکام ہوں' میڈیا ہو یا عوام ہوں یہ لوگ کسی کے دباؤ میں نہ آئیں' کسی کا غیر قانونی حکم نہ مانیں اور کسی کی انا کی تسکین کو اپنی ڈیوٹی نہ بنائیں' آپ لوگ خالد سلیم موٹا جیسا کردار نبھانا بند کر دیں' اس انکار پر حکومت آپ کی زیادہ سے زیادہ ٹرانسفر کر دے گی یا آپ کو معطلی کی سزا بھگتنا پڑے گی لیکن کیا ہو جائے گا؟ حکومت کتنے افسروں کو معطل کرے گی یا کتنے افسروں کے تبادلے ہو جائیں گے؟ پولیس اس سسٹم کیلئے ناگزیر ہے' اس ملک میں پولیس کے بغیر حکومت ممکن نہیں چنانچہ آپ لوگوں نے اگر سٹینڈ لے لیا تو حکومت قانون کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائیگی چنانچہ آپ ایک بار اپنے ضمیر کا حکم مان کر دیکھیں یہ ملک آپ کو اس کا صلہ ضرور دے گا بصورت دیگر آپ بھی خالد سلیم موٹا کی طرح ہر فلم میں مار کھائیں گے اور آپ کی آخری عمر بستر علالت پر گزرے گی اور وہ نظام اور اس نظام کے وہ بیٹے آپ کو فراموش کر چکے ہوں گے جن کی خدمت کرتے کرتے آپ بستر علالت تک پہنچ گئے تھے چنانچہ آج سے ہم آپ کو انسان سمجھ رہے ہیں اور آپ بھی خود کو خالد سلیم موٹا کے کردار سے اوپر اٹھا کر دیکھیں۔
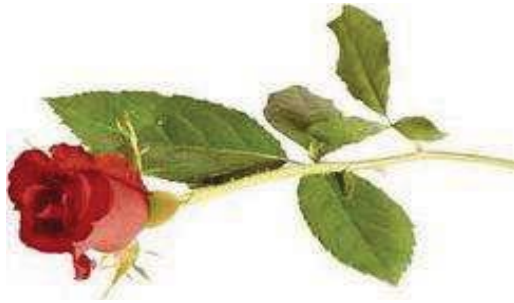
میں وزیر داخلہ رحمان ملک کا فین ہوں کیوں ہوں؟اس کی بے شمار وجوہات ہیں۔ مثلاًرحمان ملک شرماتے نہیں ہیں اور میں نہ شرمانے والے لوگوں کو بے انتہا پسند کرتا ہوں۔ آپ رحمان ملک کو الطاف حسین کے پاس بھجوا دیں یہ نا صرف پہنچ جائیں گے بلکہ انہیں منا کر واپس آئیں گے۔ یہ فرانس کے صدر نکولس سرکوزی کے پاس بھی بلا جھجک اور بے دھڑک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں بھی "کچھ لو' کچھ دو" پر مجبور کر آتے ہیں۔ یہ صدر کرزئی کے محل میں بھی داخل ہو جاتے ہیں اور ان کو بھی راضی کر کے اٹھتے ہیں۔ یہ طالبان کے ساتھ بھی مذاکرات کر لیتے ہیں اور یہ قومی اسمبلی اور سینٹ میں کھڑے ہو کر یہ اعلان بھی کر دیتے ہیں "بلوچستان میں بھارت ملوث ہے" یہ خوبی رحمان ملک کے سوا پاکستان پیپلز پارٹی کے کسی دوسرے کارکن' کسی دوسرے وزیر' کسی دوسرے راہنما میں موجود نہیں۔ یہ تمام لوگ کسی نہ کسی مرحلے پر پہنچ کر شرما جاتے ہیں لیکن رحمان ملک اپنے اعتماد کے ذریعے شرمانے والے تمام مراحل عبور کر جاتے ہیں۔ ان کی دوسری خوبی یہ ہے کہ یہ تھکتے نہیں ہیں' آپ انہیں ہر وقت متحرک پائیں گے' آپ انہیں رات کے تین بجے بھی ملیں' یہ آپ کو شوخ ٹائی اور جیب میں اسی رنگ کے رومال کے ساتھ ملیں گے اور کوئی نہ کوئی اہم کام کر رہے ہوں گے اور ان کی تیسری خوبی یہ ہے کہ یہ اکتاتے نہیں ہیں' یہ اپنے کام کو انجوائے کرتے ہیں۔ آپ نے رحمان ملک کو کبھی سید نوید قمر کی طرح قومی اسمبلی' اپنے دفتر' سرکاری تقریب یا کسی ٹیلی ویژن شو میں اونگھتے نہیں دیکھا ہو گا' یہ آپ کو ہر وقت ایکٹو دکھائی دیں گے۔ میرے نفسیات دان دوست ڈاکٹر عامر بھی رحمان ملک کے مداح ہیں اور ان کا کہنا ہے رحمان ملک پورا سکول آف تھاٹ ہیں۔ یہ لوگ پنجابی میں "وجسی جا" کے قائل ہوتے ہیں اور یہ دوسروں سے مرعوب ہونے کی بجائے آنکھیں بند کر کے دریا میں چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کی آبزرویشن سے اتفاق کرتا ہوں لہٰذا میں جب بھی محترم رحمان ملک کو دیکھتا ہوں تو مجھے پنجابی کا یہ محاورا یاد آ جاتا ہے "کامیابی کے لئے ضروری ہوتا ہے انسان تھکے ناں' اکے (اکتائے) ناں اور جھکے (جھجک) ناں" اور رحمان ملک اس محاورے کی پوری پوری تشریح ہیں۔

رحمان ملک کی یہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ پارٹی کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر تنقید کا نشانہ بنتے ہیں' پارٹی کے لوگ انہیں کسی دوسرے سیارے سے آئی ہوئی مخلوق سمجھتے ہیں جبکہ دوسری پارٹیوں کے لوگ انہیں ہائی جیکر کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے رحمان ملک نے پہلے محترمہ بے نظیر بھٹو کو ہائی جیک کر رکھا تھا اور محترمہ کے بعد یہ پارٹی کے شریک چیئرمین اور پارٹی دونوں کو ہائی جیک کر چکے ہیں اور یہ پارٹی قیادت کے اتنے قریب ہیں جہاں پہنچ کر دوسروں کے پر جل جاتے ہیں لیکن میں ہائی جیکر کی تھیوری سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرا خیال ہے رحمان ملک کے حاسدین ان کی وفاداری کو مشکوک کرنے کیلئے اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے ہیں' یہ پارٹی میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں اس کا اندازہ وزیراعظم کے خیالات سے لگائیے' مجھے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے بتایا تھا "ہم وضو کئے بغیر رحمان ملک کا نام نہیں لیتے" جبکہ مجھے پاکستان مسلم لیگ کے ایک اہم ترین لیڈر نے بتایا "ہم جب آصف علی زرداری صاحب سے مذاکرات کر رہے تھے تو صدر صاحب نے اپنے تمام ساتھیوں کی نالائقیوں کا رونا رویا اور آخر میں رحمان ملک کا ذکر کر کے فرمایا یہ واحد شخص ہے جس کی وفاداری پر مجھے یقین ہے' میں اسے آگ

میں کودنے کا حکم دے دوں تو یہ آنکھیں بند کر کے کود جائے گا۔

یہ ہے پارٹی اور قائدین کی رحمان ملک کے بارے میں رائے۔ یہ رائے درست ہے کیونکہ جس دور میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے تمام اکاؤنٹس منجمد تھے' اس وقت رحمان ملک لندن میں پارٹی اور محترمہ کے تمام اخراجات چلاتے تھے' یہ پارٹی کی خدمت بھی کرتے تھے اور انہوں نے 1997ء میں محترمہ کیلئے اپنی نوکری کو بھی ٹھوکر مار دی تھی۔ انہوں نے محترمہ کی شہادت کے بعد پارٹی پر آصف علی زرداری کی گرفت مضبوط بنانے کیلئے بھی بے انتہا خدمات سرانجام دی تھیں۔ انہوں نے آصف علی زرداری کو صدارتی الیکشن جتوانے کیلئے بھی بھرپور مہم چلائی تھی اور یہ حکومت کو دہشت گردی کے گرداب سے نکالنے میں بھی اسی فیصد کامیاب ہو گئے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے رحمان ملک کی وزارت واحد وزارت ہے جس میں کچھ نہ کچھ کام ہوتا دکھائی دے رہا ہے اور رحمان ملک واحد وزیر ہیں جو کچھ نہ کچھ کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن رحمان ملک کے اس سارے پوٹینشل' ان کی تمام خدمات کے باوجود قانون قانون اور میرٹ میرٹ ہوتا ہے اور آپ جب تک میرٹ اور قانون کو ذاتی پسند' ذاتی وفاداری اور ذاتی تعلق سے بلند نہیں کرتے اس وقت تک ملک ترقی کرتا ہے اور نہ ہی آپ کی ذات محترم ہوتی ہے۔ رحمان ملک 1996ء تک ایف آئی اے میں ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل تھے' یہ اس دور میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے بہت قریب تھے اور یہ اس وقت بھی اسی وفاداری کے ساتھ وہ تمام خدمات سرانجام دے رہے تھے جو یہ آج کل ادا کر رہے ہیں۔ 1996ء میں صدر فاروق احمد لغاری نے محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت ختم کی تو انہوں نے محترمہ کی ٹیم کے خلاف بھی قانونی کارروائی شروع کر دی' احتساب کمیشن بنایا گیا' یہ احتساب کمیشن رحمان ملک تک پہنچ گیا' نگران وزیراعظم ملک معراج خالد نے انہیں برطرف کر دیا' میاں نواز شریف کی حکومت آئی تو ملک صاحب ملک سے فرار ہو گئے' ان کی غیر موجودگی میں ان کے خلاف سرکاری کارروائی ہوئی اور ان کی نوکری ختم ہو گئی۔ انہوں نے صدر رفیق احمد تارڑ سے اپیل کی' صدر نے یہ اپیل خارج کر دی اور یوں رحمان ملک ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نوکری سے فارغ ہو گئے۔ رحمان ملک کی برطرفی سزا کی حیثیت رکھتی تھی اور یہ اس سزا کے بعد قومی اسمبلی یا سینٹ کے الیکشن لڑنے کے اہل تھے اور نہ ہی وزیر بن سکتے تھے لیکن اس کے باوجود 27 مارچ 2008ء کو انہیں وزارت داخلہ کا مشیر بنا دیا گیا۔ یہ مارچ 2009ء میں سینیٹر منتخب ہوئے اور 27 اپریل 2009ء کو انہیں وفاقی وزیر داخلہ کا قلمدان سونپ دیا گیا جس کے بعد رحمان ملک کی سینیٹر شپ اور وزارت چیلنج ہو گئی' یہ دعوے ابھی زیر سماعت ہیں کہ منگل 20 اپریل 2010ء کو وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کی سفارش پر صدر آصف علی زرداری نے رحمان ملک کی برطرفی کو ریٹائرمنٹ میں تبدیل کر دیا ہے۔ رحمان ملک اس حکم کے بعد 15 نومبر 2002ء سے ریٹائرڈ بھی سمجھے جائیں گے اور انہیں ریٹائرمنٹ کی تمام مراعات بھی دی جائیں گی۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں اس نوعیت کا انوکھا واقعہ ہے اور اس پر مختلف وزارتوں کے مابین ٹھیک ٹھاک قانونی تنازعہ پیدا ہو گیا ہے۔ وزارت قانون کا کوئی افسر اس ریٹائرمنٹ کے نوٹیفکیشن کیلئے تیار نہیں تھا چنانچہ رحمان ملک نے اپنی وزارت یعنی وزارت داخلہ کے سیکرٹری سے اس کا نوٹیفکیشن جاری کرایا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ماتحت یعنی سیکرٹری داخلہ نے اپنے باس یعنی وزیر داخلہ کی برطرفی کو ریٹائرمنٹ میں تبدیل کرنے کے احکامات

جاری ہے یہ اس نوعیت کا پہلا واقعہ ہے۔

ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ وزیراعظم کے پاس اٹھارہویں ترمیم کے بعد یہ اختیارات موجود ہیں یا نہیں اور کیا صدر صاحب ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے ایسا کر سکتے ہیں یا نہیں لیکن ہم اگر اخلاقی معیار یا میرٹ کے پیمانے سے دیکھیں تو یہ غلط ہے۔ میں اعتراف کر چکا ہوں رحمان ملک ایک ان تھک اور متحرک انسان ہیں اور انہوں نے ملک اور پارٹی دونوں کیلئے ناقابل فراموش خدمات سرانجام دی ہیں اور میں ان کا فین ہوں لیکن اس کے باوجود قانون قانون' میرٹ میرٹ اور اخلاقیات اخلاقیات ہوتی ہیں۔ آپ اگر اس طرح اپنے اختیارات استعمال کریں گے تو اس سے ملک میں قانون' اصول اور اخلاقیات مذاق بن جائیں گی۔ عوام کے دلوں سے سیاستدانوں کا احترام پہلے ہی ختم ہو تا جا رہا ہے آپ کے اس قسم کے آمرانہ اقدامات سے رہے سہے احترام کا جنازہ بھی نکل جائے گا چنانچہ آپ نے اگر یہ سلسلہ بند نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے وہ وقت آتے دیر نہیں لگے گی جب لوگ سیاست کے لفظ تک سے نفرت کریں گے اور رحمان ملک جیسے وفادار بھی آپ کو عوام کے غصے سے نہیں بچا سکیں گے۔ ہمیں کسی جگہ تو اپنے آپ کو روکنا ہوگا' ہمیں کہیں تو بند باندھنا ہوں گے' ہمیں کسی اصول' کسی قانون اور کسی قاعدے کا احترام تو کرنا ہوگا کیونکہ ہم اگر اسی طرح معاشرے کو اپنے لوگوں اور پرائے لوگوں میں تقسیم کرتے رہیں گے اور اپنے لوگوں کیلئے ہر قاعدے' ہر قانون کو روندیں گے اور پرایوں سے ان کا آکسیجن تک کا حق چھین لیں گے تو پھر سوسائٹی' یہ معاشرہ' یہ ملک آگے کیسے بڑھے گا لہذا ایسا نہ کریں' اس سے آپ اور سیاست دونوں کا بھرم ختم ہو جائے گا۔
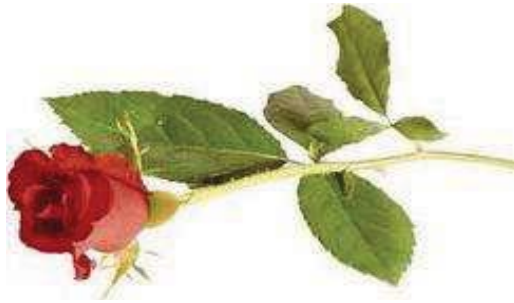
ساتھیوں کی غلطیاں

پاکستان کی سیاسی قیادت سراج الدولہ کے انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔
سراج الدولہ ہندوستان کا مشہور نواب تھا'اس کی ریاست بنگال' بہار اور اڑیسہ تک پھیلی تھی اور یہ ٹیپو سلطان کی طرح ہندوستان کے ان چند فرمانرواؤں میں شامل ہوتا تھا جنہوں نے انگریز کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور گیدڑ کی سو سالہ زندگی پر شیر کے ایک دن کو فوقیت دی۔ نواب سراج الدولہ نے جون 1757ء کو انگریز کے خلاف پلاسی کے میدان میں آخری جنگ لڑی اور اپنی جان اور اپنی سلطنت دونوں ہار دیں۔ مؤرخین کی نظر میں وہ ایک شاندار حکمران 'ایماندار انسان اور سچا مسلمان تھا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے وہ پھر یہ جنگ ہار کیوں گیا؟اس کی دو وجوہات تھیں' پہلی وجہ اس کی دولت تھی' سراج الدولہ کو اپنی دولت سے بے انتہا پیار تھا'اس کی شکست کے بعد جب اس کا خزانہ کھولا گیا تو وہ فرش سے چھت تک سونے' چاندی اور ہیرے جواہرات سے بھرا تھا' یہ خزانہ دیکھ کر انگریز جرنیل لارڈ رابرٹ کلائیو نے افسوس سے ہاتھ ملے اور کہا''سراج الدولہ نے اگر اس خزانے کا ایک چوتھائی حصہ فوج اور اسلحہ بارود پر خرچ کیا ہوتا تو آج ہم فاتح کی حیثیت سے یہاں نہ کھڑے ہوتے'' سراج الدولہ کی شکست کی دوسری وجہ اس کی نرم دلی تھی' وہ دل کا نرم تھا' وہ اپنے ساتھیوں کی بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دیتا تھا' یہ عادت اچھی ہوتی ہے کیونکہ یہ عام انسان کو ولی بنا دیتی ہے لیکن حکومت کاری میں نرم دلی قبر کی مٹی ثابت ہوتی ہے 'حکمران کو اصول' قانون اور ضابطے کے معاملے میں حضرت عمرؓ کی طرح اتنا سخت ہونا چاہیے کہ جرم بیٹا بھی کرے تو اس میں بیٹے کو اپنے ہاتھ سے کوڑے مارنے کی ہمت ہو۔ سراج الدولہ نرم دل تھا' وہ اپنی اس نرم دلی کی وجہ سے میر جعفر کے جرم معاف کرتا رہا یہاں تک کہ میر جعفر انگریزوں کے ساتھ مل گیا' سراج الدولہ کو شکست ہوئی' وہ میر جعفر کے بیٹے کے ہاتھوں اذیت ناک موت مرا اور ہندوستان دو سو سال کیلئے انگریز کی جھولی میں گر گیا۔

ہماری دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کی قیادت بھی یہی غلطی کر رہی ہے' آصف علی زرداری اور میاں نواز شریف جہاں اپنی دولت کو بچانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں وہاں یہ لوگ اپنے ساتھیوں' اپنے دوستوں کی کوتاہیوں پر بھی پردہ ڈالتے چلے جا رہے ہیں' نواز شریف گو ان معاملات میں آصف علی زرداری سے قدرے بہتر ہیں' میاں صاحب نے جعلی ڈگری ہولڈر ایم این اے اور ایم پی اے سے استعفے لینا شروع کر دیئے ہیں اور انہوں نے حاجی پرویز اور شمائلہ رانا کے معاملے میں بھی انصاف سے کام لیا تھا لیکن جہاں تک پنجاب کے وزیر قانون رانا ثناء اللہ کے پلازے کا تعلق ہے یا پھر پارٹی پر خاندان کی گرفت کا معاملہ ہے اس میں میاں صاحب کلیئر نہیں ہیں جبکہ آصف علی زرداری کی نظر میں تو دوستوں کا ہر گناہ' ہر جرم قابل معافی ہے یا پھر ایوان صدر میں موجود ان کے دوستوں نے فرمایا ہو' صدر کی نظر میں یہ سب جرم' سارے گناہ' ساری غلطیاں معاف ہیں اور یہ وہ اپروچ ہے جو حکمرانوں کو تباہی کے دہانے پر لے جاتی ہے اور خواہ یہ حکمران سراج الدولہ جیسے شاندار لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔!

آپ اٹھارہویں ترمیم کو لے لیجئے 'اٹھارہویں ترمیم میں دو آمرانہ غلطیاں ہیں' آئین کی دفعہ 17 سیاسی جماعتوں کیلئے ضابطہ اخلاق طے کرتی ہے 'اس دفعہ کی شق چار میں درج تھا پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں پارٹی کے اندر

الیکشن کرانے کی پابند ہوں گی 8 اپریل 2010ء کو قومی اسمبلی نے آرٹیکل 17 کی شق چار ختم کر دی جس کے بعد پارٹیاں الیکشن کی پابندی سے آزاد ہو گئیں' یہ تبدیلی اچانک تھی' اس پر آئینی کمیٹی کے اندر کسی قسم کی گفتگو ہوئی تھی اور نہ ہی پاکستان مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی میں اس پر بحث ہوئی۔ اپوزیشن لیڈر چودھری نثار علی نے دو دن قبل میرے سامنے تسلیم کیا وہ شق کے اسمبلی میں پیش ہونے تک اس سے آگاہ نہیں تھے اور وہ بھاگتے ہوئے اسحاق ڈار کے پاس گئے' اسحاق ڈار اس وقت قومی اسمبلی کی لابی میں بیٹھے تھے' اسحاق ڈار نے انہیں بتایا یہ شق پاکستان پیپلز پارٹی کے اصرار پر ہٹائی گئی۔ چودھری نثار علی نے یہ دعویٰ بھی کیا "میاں نواز شریف بھی اس ترمیم سے واقف نہیں تھے" چودھری صاحب کا یہ دعویٰ حیران کن بھی تھا اور پریشان کن بھی کیونکہ اگر میاں صاحب' چودھری نثار علی اور پارٹی کے نوٹس میں لائے بغیر آئین میں اتنی بڑی تبدیلی کر دی گئی تو یہ نااہلیت ہے اور میاں صاحب کو اس نااہلیت کا نوٹس لینا چاہیے۔ آپ اب اس سے اگلی حماقت بھی ملاحظہ کیجئے' پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کی قیادت نے اس ترمیم کے جواز میں فرمایا ملک میں پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ موجود ہے اور تمام پارٹیز اس ایکٹ کے تحت انٹرا پارٹی الیکشن پر مجبور ہیں چنانچہ اس شق کی ضرورت نہیں تھی' یہ دعویٰ رضا ربانی' اسحاق ڈار' احسن اقبال اور چودھری نثار علی جیسے راسخ العقیدہ سیاستدان ڈیڑھ ہفتے سے کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے ملک میں پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ نام کا کوئی ایکٹ ہی موجود نہیں' پاکستان کا آخری پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ 1962ء میں بنا تھا' یہ ایکٹ 2002ء تک قائم رہا' پرویز مشرف نے 22 جولائی 2002ء کو یہ ایکٹ ختم کر کے اس کی جگہ پولیٹیکل پارٹیز آرڈر جاری کر دیا تھا اور ہمارے سیاستدان ایکٹ اور آرڈر کے فرق کو بخوبی جانتے ہیں۔ ہم اگر ایک لمحے کیلئے پرویز مشرف کے اس پولیٹیکل پارٹیز آرڈر کو پولیٹیکل ایکٹ سمجھ لیں تو صورتحال مزید گھمبیر ہو جاتی ہے کیونکہ یہ آرڈر پرویز مشرف کے ایل ایف او کا حصہ تھا اور یہ ایل ایف او اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے ختم ہو گیا ہے چنانچہ پھر وہ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کہاں ہے جسے یہ لوگ آرٹیکل 17 کی شق چار کا متبادل قرار دے رہے ہیں' یہ سب لوگ خود آئین سے ناواقف ہیں یا پھر پوری قوم کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور اس کھیل میں اس بار دونوں پارٹیاں شامل ہیں۔

اٹھارہویں ترمیم کی دوسری غلطی آرٹیکل 63 میں تبدیلی تھی' اس دفعہ میں دو بڑی تبدیلیاں کی گئیں' پہلی تبدیلی کے ذریعے ملزموں' مجرموں اور مفروروں کو بھی الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی گئی اور دوسری تبدیلی کے ذریعے پارٹی کی قیادت کو خواہ یہ قیادت پارلیمنٹ میں موجود ہو یا پارلیمنٹ سے باہر ہو اُسے یہ اختیار دے دیا گیا کہ یہ اپنی پارٹی کے کسی رکن کو' یہ رکن خواہ گورنر' وزیراعلیٰ' وزیر یا وزیراعظم ہی کیوں نہ ہو اسے پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی' پارٹی لائین کے خلاف ووٹ دینے اور کسی دوسری پارٹی کی حمایت کے جرم میں رکنیت سے فارغ کر سکتی ہے' یہ ترمیم بھی پاکستان پیپلز پارٹی کی خواہش پر کی گئی' اس کا مقصد وزیراعظم کو صدر کے کنٹرول میں رکھنا ہے اور یہ شق بھی پاکستان مسلم لیگ ن اور پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹیوں میں ڈسکس نہیں ہوئی اور دونوں جماعتوں کے نمائندوں یعنی رضا ربانی اور اسحاق ڈار نے اپنے طور پر اس کا فیصلہ کر لیا تھا' ان دونوں ترامیم نے سیاسی قیادتوں کو وہ تمام آمرانہ اختیارات دے دیئے جس کے خلاف پوری سوسائٹی نے جدوجہد کی تھی۔ ہو سکتا ہے میاں نواز شریف اور صدر آصف علی زرداری کا اس میں کوئی قصور نہ ہو اور یہ دونوں ترامیم شاہ کے

وفاداروں نے وفاداری نبھانے کیلئے اپنے طور پر کر دی ہوں لیکن اس کے باوجود یہ دونوں ترامیم واپس ہونی چاہئیں' پاکستان کے آئین کو اکیسویں صدی کا جمہوری آئین بننا چاہیے اور ملکی سیاست سے شہنشاہت ختم ہونی چاہیے کیونکہ جب آپ فوجی جرنیلوں کے سر سے آمریت کا تاج اتار کر اپنے سروں پر سجانے کی کوشش کریں گے تو لوگوں کا آپ پر اعتبار ختم ہو جائے گا اور آپ کا اعتبار اٹھ گیا تو آپ یہ ملک نہیں سنبھال سکیں گے' یہ ملک انارکی میں چلا جائے گا۔

سیب ابھی تازہ تازہ زمین پر گرے ہیں' یہ ابھی آلودہ نہیں ہوئے' آپ مہربانی فرما کر انہیں اٹھالیں' پھونک ماریں' صاف کریں اور دوبارہ ٹوکری میں رکھ دیں' آپ نے اگر تاخیر کی تو آپ سراج الدولہ کے انجام تک پہنچ جائیں گے' وہ سراج الدولہ جو اپنے ساتھیوں کی غلطیاں معاف کرتا رہتا تھا اور وہی ساتھی آخر میں اس کے زوال کی وجہ بن گئے' وہ مرتے ہوئے پانی مانگ رہا تھا لیکن اس کے وزیراعظم میر جعفر کے بیٹے نے اسے ایک گھونٹ پانی نہیں دیا تھا اور وہ خشک ہونٹوں کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

اللہ سے خوش قسمتی مانگو
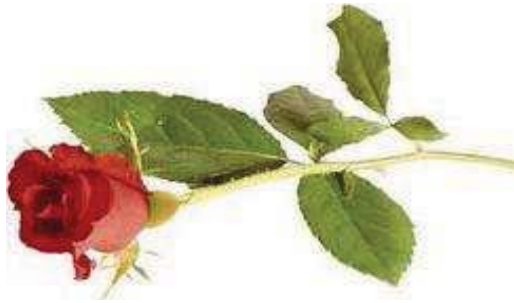
''علم کے ساتھ مقدر بھی چاہئے' تم خوش قسمتی کی دعا بھی کیا کرو'' نوجوان نے حیرت سے میری طرف دیکھا' میں نے عرض کیا ''بیٹا خلیفہ ہارون الرشید کہا کرتا تھا مقدر ہمیشہ علم سے بڑا ہوتا ہے کیونکہ میں نے بڑے بڑے عالموں کو خوش قسمت جاہلوں کے پاس ملازم دیکھا ہے چنانچہ اللہ سے جب بھی مانگو مقدر مانگو' اللہ خوش قسمتی دے گا تو عقل اور علم خود بخود پاس آ کر بیٹھ جائیں گے اور گھر میں اگر بدقسمتی کے ڈیرے ہوں گے تو عقل فساد بن جائے گی اور علم محرومی''۔ نوجوان کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے' وہ مجھے نالائق اور منافق شخص سمجھ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا میں ہمیشہ علم اور عقل کی تلقین کرتا ہوں لیکن جب اسے مشورے کی ضرورت پڑی تو میں نے اسے میمن اور شیخ برادری کی طرح خوش قسمتی کا درس دینا شروع کر دیا اور یہ فکری تضاد ہے۔ میں اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس سے عرض کیا ''میں تمہیں دنیا کے چند لوگوں کی کہانیاں سناتا ہوں' ان لوگوں کے پاس عقل بھی تھی' محنت بھی اور علم بھی لیکن یہ لوگ مقدر سے مار کھا گئے چنانچہ آج دنیا میں کوئی شخص ان کے نام سے بھی واقف نہیں جبکہ ان کی محنت' ان کے علم اور ان کی عقل سے فائدہ اٹھانے والوں نے دنیا میں دولت بھی کمائی' نام بھی اور شہرت بھی''۔

میں نے نوجوان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا' نوجوان نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور دکھی آواز میں بولا ''مثلاً'' میں نے عرض کیا'' مثلاً تم بجارنی ہرجلف سن کو لے لو' اس شخص نے کرسٹوفر کولمبس سے پانچ سو چھ سال پہلے امریکا دریافت کر لیا تھا' یہ 986ء میں گرین لینڈ کیلئے روانہ ہوا' راستے میں اس کا جہاز سمندری طوفان میں پھنس گیا' یہ روٹ سے ہٹا اور امریکا کے ساحل پر پہنچ گیا' طوفان ختم ہوا تو اس نے خود کو عجیب دنیا میں پایا' اس کے سامنے چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور گھنے جنگل تھے' یہ نئی دنیا دیکھ کر ڈر گیا' اس کے ساتھیوں نے اس سے زمین پر اترنے کی درخواست کی لیکن بجارنی نہ مانا' اس نے جہاز موڑا اور واپس گرین لینڈ چلا گیا' اس نے واپسی پر اپنے دوست لیف ایریکسن کو اس عجیب و غریب زمین کے بارے میں بتایا' لیف ایریکسن کو تجسس ہوا' اس نے بجارنی کا بحری جہاز لیا' اس سے نقشے حاصل کئے اور وہ بھی امریکا پہنچ گیا لیکن تم قسمت کا ہیر پھیر دیکھو دنیا آج ان دونوں کے نام تک سے واقف نہیں اور وہ کرسٹوفر کولمبس جو 1492ء میں انڈیا کا نیا راستہ تلاش کرتے ہوئے امریکا پہنچا' جو مرنے تک نئی دنیا کو انڈیا سمجھتا رہا دنیا آج اسے امریکا کا ''فاتح'' قرار دے رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیا یہ مقدر کا کھیل نہیں؟'' نوجوان نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں نے عرض کیا ''تم اب والٹر ہنٹ کو دیکھو' اس نے دنیا کو 25 چیزیں دیں' اس نے سلائی مشین بنائی' اس نے ری پیٹنگ رائفل بنائی' اس نے فونٹین پین ایجاد کیا تھا اور اس نے سیفٹی پن بنائی لیکن یہ ایجادات پوری زندگی اس کیلئے مذاق بنی رہیں' یہ ان سے ایک وقت کا کھانا نہیں کھا سکا۔ اس نے 1834ء میں سلائی مشین بنائی تو لوگوں نے یہ کہہ کر اس کی مشین مسترد کر دی ''اس سے درزی بے روزگار ہو جائیں گے'' وہ اس رائے سے دل برداشتہ ہو گیا اور اس نے سلائی مشین رجسٹر نہیں کرائی' اس نے فونٹین پین بنایا لوگوں نے اسے کھلونا قرار دے دیا' اس نے ری پیٹنگ رائفل بنائی' لوگوں نے اس کا بھی مذاق اڑایا اور آخر میں اس نے سیفٹی پن ایجاد کر لی' ہم سب والٹر ہنٹ کی بنائی سیفٹی پن استعمال کرتے ہیں لیکن والٹر ہنٹ کو اس کا کوئی

فائدہ نہیں ہوا تھا‘ وہ کیفتی پن کی رجسٹریشن سو ڈالر میں بیچنے پر مجبور ہو گیا‘ خریدنے والوں نے اس سے اربوں روپے کمائے لیکن والٹر ہنٹ 63 سال کی عمر میں اپنی ورکشاپ کی میز پر خون تھوک کر مر گیا تھا‘ یہ کیا ہے؟ کیا یہ بدقسمتی نہیں“ نوجوان نے ہاں میں سر ہلایا۔ میں نے اس سے عرض کیا ”اور تم ٹیلی فون کی کہانی بھی سنو‘ یہ ٹیلی فون جرمنی کے ایک سکول ٹیچر فلپ رئیس نے 1860 میں ایجاد کیا تھا‘ وہ اس کے ذریعے گھر بیٹھ کر اپنے طالب علموں کو لیکچر دیتا تھا‘ اس آلے کو ٹیلی فون کا نام بھی فلپ رئیس ہی نے دیا تھا‘ وہ اس پر برسوں کام کرتا رہا جب ٹیلی فون خوبصورت شکل میں آ گیا تو اس نے جرمنی کے چوٹی کے سائنس دانوں کے پاس بھجوایا لیکن سب نے اسے کھلونا کہہ کر گودام میں پھینک دیا‘ اس وقت ایلیشا گرے نام کا ایک دوسرا سائنس دان بھی ٹیلی فون پر کام کر رہا تھا‘ وہ بھی کامیاب ہو گیا لیکن اسے یہ آلہ سائنسی لحاظ سے شاندار مگر بزنس کے پوائنٹ سے فضول دکھائی دیتا تھا چنانچہ اس نے ٹیلی فون بنا کر دوستوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ ٹیلی فون کا پہلا موجد فلپ رئیس کوٹی بی ہو گئی اور وہ 1874ء میں انتقال کر گیا۔ گراہم بیل ان دنوں ٹیلی گراف کو بہتر بنانے پر کام کر رہا تھا لیکن اس نے بھی اتفاقاً ٹیلی فون ایجاد کر لیا‘ وہ 1876ء میں اپنی یہ ایجاد لے کر رجسٹریشن آفس پہنچ گیا اور اسے ”پیٹنٹ“ کرا لیا۔ ٹیلی فون کا دوسرا موجد ایلیشا گرے بھی اسی دن رجسٹریشن آفس گیا لیکن یہ گراہم بیل سے دو گھنٹے لیٹ ہو گیا چنانچہ ٹیلی فون کی عزت اور دولت دونوں گراہم بیل کے حصے میں آ گئی اور کیا یہ فلپ رئیس اور ایلیشا گرے کی بدقسمتی نہیں تھی؟“ نوجوان نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

میں نے عرض کیا ”تاریخ ایسی بے شمار داستانوں‘ ایسی ہزاروں لاکھوں کہانیوں سے بھری پڑی ہے‘ یہ لوگ عالم بھی تھے‘ عامل بھی‘ محنتی بھی‘ مخلص بھی‘ جرات منداور بہادر بھی اور ان لوگوں نے اپنے مقصد کیلئے جانیں بھی دی تھیں لیکن ان کے پاس مقدر نہیں تھا۔ یہ خوش قسمت نہیں تھے چنانچہ ان کی تیار فصلیں کھیتوں میں کھڑی رہ گئیں اور خوش قسمت لوگ راہ چلتے خوشی‘ کامیابی‘ شہرت اور نصیب سمیٹ کر گھر لے گئے‘ ان لوگوں کی نسلوں تک کا مقدر بدل گیا۔ میں علم کا حامی ہوں‘ میں محنت کی عظمت کا بھی داعی ہوں اور میں عقل کو قدرت کا بہت بڑا معجزہ بھی سمجھتا ہوں‘ یہ عقل ہے جو انسان کو جانوروں کی سطح سے بلند کرتی ہے‘ یہ محنت ہے جو لوہے کو سونے کی شکل دیتی ہے اور یہ علم ہے جو انسان کو خدا تک لے جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم مقدر کے عنصر کو زندگی سے نہیں نکال سکتے۔ یہ مقدر ہے جو ایک ہی کان میں پڑے پتھروں میں سے کسی کو کوئلہ بنا دیتا ہے اور کسی کو ہیرا۔ جو ایک ہی غار کی دھات کو لوہے کی شکل دیتا ہے اور اسی غار میں پڑی دھات کو سونا بنا دیتا ہے۔ لوہے اور سونے کے فرق اور کوئلے اور ہیرے کے ”ڈیفرنس“ کو مقدر کہا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ سے جب بھی مانگو مقدر مانگو کیونکہ لوہا چاہے جتنا بھی مضبوط‘ چمکدار اور شاندار ہو جائے وہ لوہا ہی رہتا ہے اور سونا خواہ کتنا ہی میلا‘ پرانا اور گندا کیوں نہ ہو جائے یا یہ نالی ہی میں کیوں نہ گر جائے یہ سونا ہی رہتا ہے۔۔ دنیا کا کوئی علم‘ دنیا بھر کی مشترکہ محنت اور ساری خلقت خدا مل کر بھی لوہے کو سونے تک ترقی نہیں دے سکتی اور دنیا بھر کے حاسدین مل کر بھی سونے کو لوہے کے لیول تک نہیں گرا سکتے“۔ نوجوان نے میری بات سے اتفاق کیا لیکن تھوڑی دیر سوچ کر پوچھا ”انسان اگر بدقسمت ہو‘ اگر اس کی سیدھی ہمیشہ الٹی پڑتی ہو‘ اگر اس کا یکا ہمیشہ ستے سے مار کھا جاتا ہو اور اس کا بادشاہ اگر ہمیشہ

پیادے سے پٹ جاتا ہو تو اس کو کیا کرنا چاہیے میں نے قہقہہ لگایا لیکن نوجوان کی بات واقعی قابل غور تھی۔ دنیا میں آخر بد قسمت لوگ بھی ہوتے ہیں' یہ بد قسمت لوگ کیسے زندگی گزاریں؟ یہ کیا کریں؟۔ یہ دنیا کا مہنگا ترین سوال ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ کوئی ناقابل حل معمہ ہے۔ آپ بد قسمتی کو خوش قسمتی میں کیسے تبدیل کر سکتے ہیں اس کا بھی ایک فارمولا ہے اور یہ فارمولا آسان بھی ہے اور سیدھا بھی لیکن میں یہ فارمولا آپ کو اگلے اتوار کو بتاؤں گا۔

سسٹم کو کوئی خطرہ نہیں

چیف جسٹس آف پاکستان کا دفتر نسبتاً ٹھنڈا تھا' یہ 24 اپریل تھا' اسلام آباد شہر تپ رہا تھا لیکن چودھری صاحب کے کمرے میں ہلکی ہلکی خنکی تھی' یہ ہفتے کا دن تھا' سپریم کورٹ میں چھٹی تھی لیکن سپریم کورٹ کا عملہ موجود تھا' جج صاحبان کے دفتر کھلے تھے اور کوریڈورز میں بھی آمدورفت جاری تھی' چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کے سامنے فائلز کا ڈھیر لگا تھا' ہفتے کو عدالت میں مقدمات کی چھٹی ہوتی ہے لیکن افتخار محمد چودھری کے چیف جسٹس بننے کے بعد چھٹی کا یہ دن عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ مصروف ہو گیا' جج صاحبان اس دن بھی دفتر آتے ہیں اور فیصلے تحریر کرتے ہیں۔ مجھے چیف جسٹس کے پروٹوکول آفیسر حمید صاحب نے بتایا "ہم پچھلی رات بھی ساڑھے تین بجے تک کام کرتے رہے" حمید صاحب کا کہنا تھا "چیف صاحب ایک منٹ ضائع نہیں کرتے' یہ تمام کاموں سے فارغ ہو جائیں تو عام سائلوں کی درخواستیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں' تمام درخواستیں خود پڑھتے ہیں اور ان پر حکم جاری کرتے ہیں"۔

میں دفتر میں داخل ہوا تو چودھری صاحب صوفے پر بیٹھے تھے اور میز پر فائلوں کا انبار لگا تھا۔ چیف جسٹس نے رانا بھگوان داس کا ذکر بڑی محبت سے کیا' ان کا کہنا تھا "مسلمان ہم ہیں لیکن یقین رانا صاحب کا پکا ہے" میں نے عرض کیا "مجھے عدلیہ کے بحران کے دوران رانا صاحب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا' یہ واقعی شاندار اور مضبوط انسان ہیں۔ ان دنوں انہیں دبانے کی کوشش بھی کی گئی تھی' ڈرانے کی بھی اور خریدنے کی بھی لیکن رانا صاحب مسکرا کر ہر مرحلے سے گزر گئے۔ انہوں نے میرے سامنے ڈی جی آئی ایس آئی کی کال سننے سے انکار کر دیا تھا' انہوں نے آپریٹر سے کہا تھا جنرل صاحب سے کہو جج جرنیلوں کے فون نہیں سنا کرتے" چیف جسٹس اس کے بعد بڑی دیر تک رانا بھگوان داس کا ذکر کرتے رہے' میں نے موجودہ جمہوری نظام کا ذکر چھیڑا تو چیف جسٹس کے خیالات سن کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ چیف جسٹس کے خیالات اس تاثر کے برعکس تھے جو عوام میں ان کے بارے میں پھیلایا جا رہا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے نوے فیصد جبکہ پاکستان مسلم لیگ ن کے تیس چالیس فیصد ارکان کا خیال ہے پارلیمنٹ اور عدلیہ عن قریب آمنے سامنے کھڑی ہو جائے گی' سپریم کورٹ سے ایک آرڈر نکلے گا اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ختم ہو جائے گی' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں نے چیف جسٹس کے خیالات سنے تو یہ باہر کے سیاسی درجہ حرارت سے بالکل مختلف تھے مثلاً چیف جسٹس کا خیال تھا ملک کے استحکام اور نظام کی بہتری کیلئے پولیٹیکل سسٹم کا چلنا انتہائی ضروری ہے۔ ان کا خیال تھا پارلیمنٹ کو پانچ سال پورے کرنے چاہئیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کو عوامی مینڈیٹ کے مطابق چلنا چاہئے' کسی غیر جمہوری طاقت کو درمیان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دینی چاہئے' یہ سسٹم چلے گا تو ہی ملک میں استحکام آئے گا اور سسٹم شفاف ہو گا۔ چیف جسٹس آف پاکستان نے اداروں کے ٹکراؤ کو یکسر مسترد کر دیا۔ ان کا کہنا تھا ہم سب اس ملک کے شہری ہیں' ہم اپنے اپنے دائرے میں رہ کر کام کر رہے ہیں چنانچہ ٹکراؤ کا خیال تک غلط ہے۔ چیف جسٹس کا کہنا تھا ملک کو لیڈ کرنے کی ذمہ داری سیاستدانوں پر عائد ہے' انہیں مضبوط بھی ہونا چاہئے اور انہیں کام کرنے کا بھرپور موقع بھی ملنا چاہئے۔ انہوں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم سب ریاست کے ملازم ہیں' ہمیں اپنے دائرے میں

رہنا چاہئے“ چیف جسٹس نے محترمہ بے نظیر بھٹو کا ذکر بھی بڑی محبت سے کیا‘ ان کا کہنا تھا ”محترمہ کی شہادت کا پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا‘ وہ آج زندہ ہوتیں تو پاکستان کے حالات بالکل مختلف ہوتے“ میں نے اپنے اس نفسیات دان دوست کا ذکر کیا جس کے ساتھ محترمہ اپنی زندگی کے مختلف پہلو ڈسکس کرتی رہتی تھیں‘ میں نے انہیں بتایا محترمہ ماضی کی غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتی تھیں۔ چیف جسٹس آف پاکستان کا کہنا تھا محترمہ نے جلا وطنی کے دوران بہت کچھ سیکھا تھا اور وہ اگر اقتدار میں آجاتیں تو گورننس کے حالات آج سے کہیں بہتر ہوتے۔ چیف جسٹس میڈیا کی کارکردگی سے بھی مطمئن تھے‘ چودھری صاحب کا فرمانا تھا میڈیا نے تین کمال کئے ہیں‘ میڈیا کے ہوتے ہوئے اب کسی بات کو چھپانا ممکن نہیں رہا‘ میں ہاف سلیو شرٹ میں آپ کے سامنے بیٹھا ہوں‘ یہ شام تک ساری قوم کو معلوم ہو جائے گا۔ دو‘ وہ تمام ایشوز جو کل تک صرف چند لوگوں تک محدود رہتے تھے آج یہ ہر رات ٹیلی ویژن میں ڈسکس ہوتے ہیں اور ان کی تمام پرتیں کھل کر عام آدمی کے سامنے آجاتی ہیں اور تیسری میڈیا نے عام آدمی کو پاکستان کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ لوگ اب ملک کے تمام ایشوز پر کھل کر بات بھی کرتے ہیں اور اپنی رائے بھی دیتے ہیں۔ چیف جسٹس کا کہنا تھا وہ روزانہ ٹیلی ویژن پر عوامی پول دیکھتے ہیں‘ لوگوں کو مختلف ایشوز پر رائے دیتے دیکھتے ہیں تو انہیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ان کا کہنا تھا میڈیا کی اس آزادی سے کچھ طبقے‘ کچھ لوگ خوش نہیں ہیں لیکن اس کا قائم رہنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ آزادی ہی آگے چل کر ملک کو بہتری کی طرف لے کر جائے گی۔ چیف جسٹس کا کہنا تھا این آر او کیس کے دوران حکومت کے وکیل عدالت سے بار بار درخواست کرتے تھے میڈیا عدالتی کارروائی کو غلط رنگ دے رہا ہے‘ آپ انہیں روکیں لیکن ہم کہتے تھے میڈیا کے لوگ ذمہ دار ہیں یہ خود کو ٹھیک کر لیں گے اور میڈیا خود کو ٹھیک بھی کر رہا ہے۔

میں نے پارٹیوں کے اندر آمریت کا ذکر کیا تو چیف جسٹس کا فرمانا تھا سیاستدانوں کو ماضی میں کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا‘ اگر سسٹم چلتا رہتا‘ اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی نہ کی جاتیں تو آج سیاسی جماعتوں کا اندرونی کلچر بھی جمہوری ہوتا۔ میں نے چیف جسٹس کو جرمنی کی مثال دی۔ میں نے عرض کیا جرمنی کی تین سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے پولیٹیکل کالج بنا رکھے ہیں‘ یہ پارٹیاں اپنے ارکان کو ان کالجوں میں سیاست کی باقاعدہ ٹریننگ دیتی ہیں‘ یہ انہیں پڑھاتی بھی ہیں اور سمجھاتی بھی ہیں۔ جرمنی میں سیاست کا آغاز کونسلر کے عہدے سے ہوتا ہے اور ان کے تمام ارکان کونسلر سے ہوتے ہوئے چانسلر کے عہدے تک پہنچتے ہیں۔ جرمنی میں کوئی شخص کونسلر کی سیٹ جیتے بغیر رکن اسمبلی یا چانسلر نہیں بن سکتا۔ چیف جسٹس نے پوچھا ”یہ سسٹم کب شروع ہوا تھا“ میں نے عرض کیا ”دوسری جنگ عظیم کے بعد“ چیف جسٹس نے فرمایا ”پھر تو اس کو زیادہ وقت نہیں گزرا“ میں نے عرض کیا ”جی ہاں“ وہ بولے ”ہمارے ملک میں بھی اگر سیاستدانوں کو کام کرنے کا موقع ملتا‘ یہ لوگ بھی 1947ء سے تعطل اور رکاوٹ کے بغیر 2010ء تک آتے تو آج ہم بھی جرمنی کے قریب قریب ہوتے لیکن افسوس راستے میں رکاوٹیں آتی رہیں‘ سسٹم بار بار بریک ہوتا رہا جس کی وجہ سے آج سیاستدانوں میں بھی اعتماد کی کمی ہے اور سسٹم بھی کمزور ہے“۔

میں پینتالیس منٹ چیف جسٹس کے پاس بیٹھا‘ میں نے اس پونے گھنٹے میں محسوس کیا چیف جسٹس جمہوریت

کے حامی ہیں' یہ اس نظام کو چلتا ہوا' حکومت کو پانچ سال پورے کرتے ہوئے اور پارلیمنٹ کو اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں' یہ کسی ایسی غیر جمہوری مہم جوئی کا ساتھ نہیں دیں گے جس سے پارلیمنٹ یا نظام کو نقصان پہنچے۔ میں نے چیف جسٹس کے خیالات سے اندازا لگایا چیف جسٹس جمہوریت اور نظام کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں اور اس نظام کو کم از کم افتخار محمد چودھری کی ذات سے کوئی خطرہ نہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی محسوس ہوا' چیف جسٹس قانون اور آئین کے معاملے میں بھی کسی سے رعایت نہیں کریں گے' یہ نظام کو بھی بچائے رکھیں گے اور ملزموں اور مجرموں کا احتساب بھی کرتے رہیں گے' یہ کسی کو سسٹم کے اندر بیٹھ کر اس کا فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے۔ میں نے سرکاری اداروں میں موجود کرپشن کی بات کی تو ان کا کہنا تھا ''کرپشن بلا شبہ موجود ہے لیکن اب اس کرپشن کو چھپانا ممکن نہیں رہا' یہ سات پردوں کے پیچھے بھی ہو تو بھی راز راز نہیں رہتا چنانچہ آج کے دور میں حکومت چاہے تو کرپشن بڑی آسانی سے ختم ہو سکتی ہے'' میں دو بجے چیف جسٹس کے کمرے سے نکلا تو مجھے باہر اور اندر کے ٹمپریچر میں بڑا فرق محسوس ہوا' سپریم کورٹ کے اندر سکون بھی تھا' ٹھنڈک بھی اور خاموشی بھی جبکہ باہر شور بھی تھا گرمی بھی اور ہنگامہ بھی۔ میں نے سوچا اندر اور باہر اتنا فرق کیوں ہے؟ سپریم کورٹ کے پھیلتے ہوئے سایوں نے جواب دیا اندر بیٹھے لوگ اپنی سوچ میں واضح اور کھرے ہیں جبکہ باہر موجود لوگ کھرے بھی نہیں ہیں اور واضح بھی چنانچہ ان کا کنفیوژن ان کا ٹمپریچر بڑھاتا چلا جا رہا ہے اور یہ خود آرام میں ہیں اور نہ ہی ان کے لواحقین۔
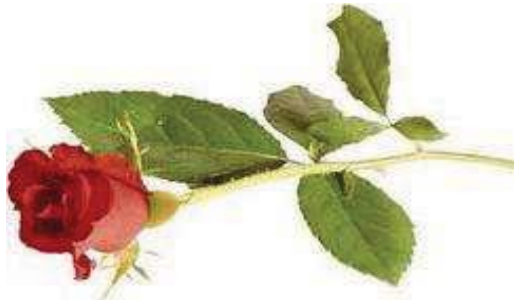
مولوی صاحب جلوس لے کر تھانے کی طرف چل پڑے' لوگوں نے ہاتھوں میں پتھر' ڈنڈے' تیل کے کنستر اور بوتلیں اٹھا رکھی تھیں' مولوی صاحب غیض و غضب کا گولہ بن کر جلوس کے آگے چل رہے تھے اور سینکڑوں لوگ تھانے دار مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھے' یہ ہجوم آہستہ آہستہ تھانے کی طرف بڑھ رہا تھا' لوگوں کا خیال تھا ہجوم تھانے پہنچ کر عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا' تھانے دار پر تیل چھڑک کر اسے آگ لگا دی جائے گی اور یوں ظلم' زیادتی اور رشوت ستانی کا یہ مرکز ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا لیکن تھانے دار تمام اندیشوں سے آزاد کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھا تھا' اس کے پاؤں میز پر تھے اور وہ اطمینان سے پاؤں ہلا رہا تھا' اس کے عملے کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' وہ بار بار تھانے دار کو جلوس کی آمد' لوگوں کی وحشت اور غصے کی اطلاع دے رہے تھے مگر تھانے دار کا کہنا تھا "تم لوگ اطمینان سے اپنا کام کرتے رہو' گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں' یہ لوگ تھانے کے دروازے سے واپس چلے جائیں گے" ماتحت اپنے افسر کی بات ماننے پر مجبور تھے لیکن انہیں اس کی بات پر یقین نہیں تھا کیونکہ ہجوم کی نفرت کی تپش تھانے کی دیواروں تک محسوس ہو رہی تھی' ہجوم آگے بڑھتا رہا' آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ تھانہ آ گیا' مولوی صاحب نے تھانے کے دروازے پر پہنچ کر میگا فون اٹھایا اور ہجوم سے کہا "میں آخری مذاکرات کیلئے تھانے کے اندر جا رہا ہوں' میرے بھائیو تم لوگ میرا انتظار کرو' اگر تھانے دار نے ہمارے مطالبات نہ مانے تو ہم دہشت کا یہ قلعہ گرا دیں گے" مولوی صاحب نے اعلان کیا اور تھانے کے اندر داخل ہو گئے' تھانے کا عملہ تھر تھر کانپ رہا تھا لیکن تھانے دار اسی طرح میز پر پاؤں رکھ کر بیٹھا تھا' مولوی صاحب تھانے دار کے پاس پہنچے' سر سے ٹوپی اتاری اور عجز و انکساری سے بولے "حضور اب بتایئے ہم کیا کریں" تھانے دار نے قہقہہ لگایا' میز سے پاؤں اٹھائے' کرسی سے اٹھا اور مولوی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا "اب یہ تماشا بند کرو' میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا ہوں' میں دوسری مسجد بھی خالی کرا دوں گا" مولوی نے سلام کیا' تھانے سے باہر آیا اور ہجوم سے مخاطب ہو کر بولا "بھائیو' تھانے دار نے شہر سے ایک ہفتے میں بے حیائی' فحاشی' رشوت ستانی اور ظلم ختم کرنے کا وعدہ کیا ہے' ہم ان لوگوں کو ایک ہفتے کا ٹائم دیتے ہیں" ہجوم نے مولوی صاحب زندہ باد کے نعرے لگائے اور واپس چل پڑا' ہجوم کے چھٹنے کے بعد چھوٹے تھانے دار نے بڑے تھانے دار سے پوچھا "جناب آپ کو مولوی اور اس کے جلوس سے ڈر کیوں نہیں لگا تھا" تھانے دار نے قہقہہ لگا کر جواب دیا "ڈر کس بات کا' مولوی کو میں نے ہی جامع مسجد کا خطیب بنایا تھا' میں اگر پرانے مولوی کو نہ بھگاتا' مولوی کو مسجد کا حجرہ خالی کر کے نہ دیتا تو یہ آج بھی گاؤں میں لوگوں سے روٹیاں مانگ رہا ہوتا' مولوی میری طاقت سے واقف تھا چنانچہ اس نے کبھی مجھ پر حملہ نہیں کرنا تھا" چھوٹے تھانے دار نے پوچھا "لیکن پھر مولوی نے جلوس کیوں نکالا؟" تھانے دار بولا "مولوی شہر کی دوسری مسجد اپنے بھتیجے کو دلانا چاہتا ہے اور یہ سارا ڈرامہ اس نے اس مسجد کیلئے کیا' میں نے وعدہ کر لیا چنانچہ فحاشی اور ظلم کے خلاف نکلا جلوس واپس گھروں کو لوٹ گیا"۔

مولوی صاحب اور تھانے دار کے اس تعلق کو انگریزی میں اسٹیبلشمنٹ کہتے ہیں' معاشرے کا کوئی طاقتور گروپ طاقت کے ذریعے کسی شخص کو بڑے عہدے پر بٹھاتا ہے اور بعد ازاں یہ شخص مولوی کی طرح جلوس نکال کر

طاقت کے اس مرکز کو دھمکاتا ہے اور طاقت کا مرکز اس کی مراعات میں اضافہ کر دیتا ہے' اس طاقتور گروپ کو اردو میں بادشاہ گر اور انگریزی میں اسٹیبلشمنٹ کہا جاتا ہے' پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ کا مطلب فوج' سول بیوروکریسی اور امریکا ہوتا ہے' یہ تینوں مل کر کسی کے اقتدار کا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ اقتدار اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اسے اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل رہتی ہے۔ آپ اس تناظر میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے اس بیان کو دیکھئے جس میں انہوں نے کھٹمنڈو میں کھڑے ہو کر بڑے فخر سے فرمایا ''پاکستان پیپلز پارٹی کو اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل ہے'' اس بیان کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے وزیراعظم عوام کے ووٹ' الیکشن' پارلیمنٹ' اپنی متفقہ وزارت عظمیٰ' آئین اور اٹھارہویں ترمیم کو کمال نہیں سمجھتے' یہ اسٹیبلشمنٹ کی حمایت کو اپنا اصل کریڈٹ گردانتے ہیں اور یہ وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے پاکستان میں جمہوریت اور سیاست اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو رہی۔ اب سوال یہ ہے ہماری حکومتیں' ہمارے حکمران اتنے کمزور کیوں ہیں؟ بات سیدھی اور سچی ہے جب حکمران اسٹیبلشمنٹ کی حمایت سے حکمران بنیں گے یا ان کے اشاروں پر اپنے وزراء کا فیصلہ کریں گے تو ان میں اسٹیبلشمنٹ کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت کیسے ہو گی؟ اب سوال پیدا ہوتا ہے ہمارے سیاستدان اسٹیبلشمنٹ سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں؟ یہ لوگ تاریخ کے طاقتور ترین وزیراعظم بننے کے بعد بھی اسٹیبلشمنٹ کی طرف کیوں دیکھتے ہیں' اس کا جواب جاوید ہاشمی' سعد رفیق اور پرویز رشید کی مثالوں میں چھپا ہے' مخدوم جاوید ہاشمی نے گزشتہ روز ہمارے پروگرام ''کل تک'' میں آن ریکارڈ بتایا' 1999ء کے ''ملٹری کو'' کے بعد اس وقت کے کرنل ندیم اعجاز اور میجر سیف نے انہیں بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ جاوید ہاشمی کا کہنا تھا' وہ کوٹ لکھپت جیل میں ہتھکڑیوں میں بندھے تھے' انہوں نے جیل کے عملے کو محترمہ تہمینہ دولتانہ اور ان کے مرحوم شوہر زاہد واہلہ کو ننگی گالیاں دیتے سنا تو انہوں نے جیل کے عملے سے پوچھا تم لوگ بدتمیزی کیوں کر رہے ہو' عملے نے بتایا کرنل ندیم اعجاز اور میجر سیف سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور یہ ہمارے ذریعے انہیں گالیاں دلا رہے ہیں۔ جاوید ہاشمی کے بقول انہوں نے دروازے کو ٹھڈا مارا اور ہتھکڑیوں سمیت کرنل ندیم اعجاز کی طرف دوڑے' انہیں دیکھ کر ندیم اعجاز ڈر گیا' وہ کرسی سے اٹھا' بھاگ کر باتھ روم میں داخل ہوا اور اندر سے کنڈی لگالی جبکہ میجر سیف میز کے نیچے دبک گیا۔'' ان لوگوں نے بعد ازاں مجھے جیل سے نکالا' پانچ دن تک میری آنکھوں پر پٹی باندھے رکھی اور مجھے الٹا لٹا کر اتنا خوفناک تشدد کیا کہ میرا پورا جسم سیاہ ہو گیا' خواجہ سعد رفیق کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا جبکہ یہ لوگ بلال یاسین بٹ کو روزانہ بارڈر پر لے جاتے تھے اور اس سے کہتے تھے تم نے اگر ہماری بات نہ مانی تو ہم تمہیں گولی مار کر یہاں پھینک جائیں گے' یہ لوگ جہانگیر بدر کو توڑنے کیلئے اس کے ساتھی میاں ارشد کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے اور اس پر بعد ازاں اتنا تشدد کیا کہ وہ مر گیا''۔ جاوید ہاشمی کا کہنا تھا ندیم اعجاز نے پرویز رشید پر تشدد کے ریکارڈ توڑ دیئے' آپ اگر پرویز رشید کی کہانی سنیں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے' یہ شخص بعد ازاں تیزی سے میجر جنرل کے عہدے تک پہنچا اور پرویز مشرف نے اسے ملٹری انٹیلی جنس کا ڈی جی بنا دیا' یہ جب ڈی جی ایم آئی بنا تھا تو میں نے اپنے لواحقین کو وصیت کی ''میں اگر مر گیا تو اس کا ذمہ دار میجر جنرل ندیم اعجاز ہو گا'' یہ شخص اس وقت بھی فوج میں ہے اور یہ بے نظیر بھٹو کے قتل کیس میں اس وقت انکوائری کے عمل سے گزر رہا ہے۔ جاوید ہاشمی کا کہنا تھا ''

کا کہنا تھا ”میں میجر جنرل ندیم اعجاز کے خلاف مقدمے کی پیروی کا اور گواہی کا اور میں اسے کیفر کردار تک پہنچا ہوا
دیکھنا چاہتا ہوں“۔

جاوید ہاشمی مضبوط اعصاب کے مالک انسان ہیں‘ اللہ تعالیٰ نے انہیں برے کو برا اور اچھے کو اچھا کہنے کی توفیق دے رکھی ہے چنانچہ یہ اسٹیبلشمنٹ کا تشدد بھی سہہ گئے اور آج یہ اس کے خوف اور ترغیب دونوں سے آزاد بھی ہیں‘ یہ میجر جنرل ندیم اعجاز کی مار کے بعد بھی اسٹیبلشمنٹ کی حمایت لینے کیلئے تیار نہیں ہیں لیکن ہمارے وزیراعظم شاید اتنے مضبوط اعصاب کے مالک نہیں ہیں اور یہ اپنی استقامت کا امتحان دینے کیلئے تیار نہیں ہیں لہٰذا یہ زمینی حقائق بھانپ چکے ہیں اور انہوں نے اسٹیبلشمنٹ سے ٹکرانے‘ اس کی فطرت بدلنے یا خود کو مضبوط بنانے کی بجائے اسٹیبلشمنٹ کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن سوال یہ ہے کیا اسٹیبلشمنٹ اور حکمرانوں کے اس گٹھ جوڑ سے یہ ملک ترقی کر سکے گا؟ اور کیا اسٹیبلشمنٹ کی حمایت گیلانی صاحب کو اقتدار میں رکھ سکے گی؟

ان دونوں کا جواب نہیں ہے‘ دنیا میں آج تک میجر جنرل ندیم اعجاز جیسے لوگوں کی اسٹیبلشمنٹ کی حمایت سے کسی ملک نے ترقی کی اور نہ ہی ایسی اسٹیبلشمنٹ کسی کو زیادہ دیر تک اقتدار میں رکھ سکی اگر یہ لوگ کسی کو برسر اقتدار رکھ سکتے تو آج پرویز مشرف پاکستان میں صدر ہوتے کیونکہ پرویز مشرف اس اسٹیبلشمنٹ کے چیف بھی تھے‘ میجر جنرل ندیم اعجاز کے رشتے دار بھی تھے اور انہیں انٹرنیشنل اسٹیبلشمنٹ کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن اقتدار کے یہ تینوں ستون پرویز مشرف کا بوجھ برداشت نہ کر سکے اور جنرل صاحب آج لندن میں بھیک میں ملی ہوئی زندگی گزار رہے ہیں چنانچہ میرا ذاتی خیال ہے وہ اسٹیبلشمنٹ جو اپنے چیف پرویز مشرف کو نہیں بچا سکی یہ یوسف رضا گیلانی جیسے سویلین کو کتنی دیر سہارا دے سکے گی‘ میری گیلانی صاحب سے درخواست ہے آپ اپنے قدموں‘ عوام کے کندھوں اور اللہ کے کرم پر بھروسہ کریں‘ یہ تینوں چیزیں ساتھ ہوں تو انسان کو کسی اسٹیبلشمنٹ کی ضرورت نہیں رہتی‘ یہ جاوید ہاشمی کی طرح اسٹیبلشمنٹ کی بھٹی سے زندہ سلامت باہر آ جاتا ہے اور لوگ اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔
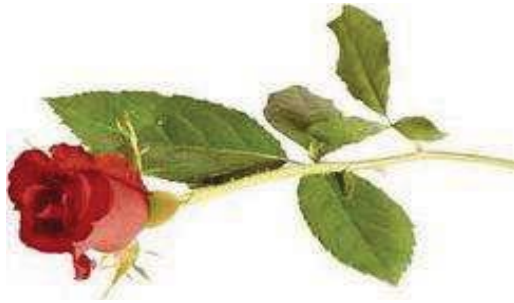
لکڑی کا تختہ

خوش قسمتی اور بدقسمتی میں لکڑی اور لوہے جیسا فرق ہوتا ہے ٬لکڑی پانی میں تیرتی ہے جبکہ لوہا فوراً ڈوب جاتا ہے۔
خوش قسمت انسان لکڑی کی طرح مصائب ٬ مسائل اور پریشانیوں میں تیرتا رہتا ہے ٬ مسائل اور پریشانیاں اس کے اردگرد ٬اس کے دائیں بائیں ٬اوپر نیچے بہتی رہتی ہیں لیکن یہ ان کی سطح پر تیرتا رہتا ہے ٬ یہ ان کی اتھاہ گہرائیوں میں نہیں ڈوبتا جبکہ بدقسمت شخص لوہے کی کیل کی طرح چند لمحوں میں مسئلوں کے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ بدقسمت شخص کے بارے میں عربی کی بڑی شاندار کہاوت ہے ٬عرب کہتے ہیں انسان پر جب بدقسمتی کے سائے آتے ہیں تو یہ اونٹ پر بھی بیٹھا ہو تو اسے کتا کاٹ لیتا ہے۔ اسی طرح ہندی میں بدقسمت شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ سونے کو بھی ہاتھ لگائے تو وہ مٹی ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں محاورے درست ہیں کیونکہ بدقسمتی کے دور میں ہر خوشی ٬ہر کامیابی اور ہر اچھائی الٹ ہو جاتی ہے ٬ بدقسمت شخص کا چاند تک جوہڑ سے طلوع ہوتا ہے اور اس کے گلابوں سے بھی گوبر کی بو آتی ہے ٬وہ بے چارہ حدیث بھی سنائے تو لوگ منہ پھیر لیتے ہیں ٬اس کا اپنا سایہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور وہ مسائل اور پریشانیوں کے لق ودق صحرا میں خشک ٹہنی کی طرح یک و تنہا کھڑا ہوتا ہے ٬اس کے اوپر اور نیچے دونوں طرف آگ دہک رہی ہوتی ہے اور اس لمحے وہ دائیں بائیں ٬اوپر نیچے دیکھ کر قدرت سے صرف ایک سوال کرتا ہے "یا پروردگار میں کیا کروں؟" یہ دنیا کا قیمتی ترین سوال ہے اور ہم میں سے ہر انسان زندگی میں کبھی نہ کبھی اس نقطے پر ضرور آتا ہے۔ بعض لوگوں کی زندگی میں یہ سوال بجلی کے شعلے کی طرح آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور بعض کی زندگی میں یہ سوال سکینڈے نیوئن ملکوں کی راتوں کی طرح طویل ہو جاتا ہے اور انسان کی سانسیں امید اور ناامیدی کی منڈیر سے لٹکی رہتی ہیں۔ سوال یہ ہے بدقسمتی کے اس لمحے انسان کیا کرے؟ اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں قدرت کے نظام کو سمجھنا ہو گا۔

قدرت کے نظام میں ہر چیز دوسری چیز سے توانائی حاصل کرتی ہے ٬ جانداروں کے زندہ رہنے کیلئے آکسیجن اور پانی ضروری ہے ٬ پانی اور آکسیجن کیلئے سورج کی روشنی ضروری ہے ٬ سورج کی روشنی پیدا کرنے کیلئے جلنے والی گیسیں چاہئیں اور گیسوں کی پیدائش کیلئے کسی ان دیکھی کہکشاں کے کیمیائی ری ایکشن ضروری ہوتے ہیں۔ اسی طرح پودوں کو جانور کھاتے ہیں ٬ جانوروں کو انسان کھاتا ہے ٬انسان کا جسد خاکی کیڑے مکوڑے کھا جاتے ہیں اور کیڑے مکوڑوں کی باقیات پودے چٹ کر جاتے ہیں۔ غرض کائنات کی تمام اکائیاں ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ ہمارا مقدر بھی کسی نہ کسی دوسرے شخص سے جڑا ہوتا ہے۔ ہماری خوش قسمتی اور بدقسمتی دونوں دوسرے لوگوں سے وابستہ ہوتی ہیں چنانچہ انسان جب بھی بدقسمتی کے گرداب میں پھنسے تو اسے چاہئے یہ کسی دوسرے خوش قسمت شخص کا سہارا لے لے بالکل لوہے کی اس کیل کی طرح جو ڈوبنے سے بچنے کیلئے لکڑی کے تختے میں پیوست ہو جاتی ہے۔
بدقسمت انسان کیل کی طرح لکڑی کے تختے کا حصہ بن کر مسائل کے سمندر میں تیر سکتا ہے ٬ہم سب کو بدقسمتی کے دور میں تین حقیقتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ ایک ٬ دنیا میں کوئی چیز ٬کوئی صورتحال اور کوئی حالت مستقل نہیں ہوتی ٬ دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی آتی ہے ٬ رات خواہ کتنی ہی لمبی اور دن خواہ کتنا ہی چمکدار کیوں نہ ہو یہ دونوں بالآخر ختم ہو جاتے ہیں اور بدبو خواہ کتنی ہی ناقابل برداشت کیوں نہ ہو ٬ یہ بھی ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

خوش قسمتی کی طرح بدقسمتی بھی عارضی ہوتی ہے اور یہ بالآخر ختم ہو جاتی ہے لیکن سوال یہ ہے اس کا دورانیہ کتنا لمبا ہو سکتا ہے؟۔ ہندی نجومیوں کے مطابق بدقسمتی کا دورانیہ عموماً اڑھائی سال سے ساڑھے سات سال تک ہوتا ہے اور بدقسمتی کے نوے فیصد کیسوں میں ساڑھے سات سال بعد صورتحال تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ یورپین ماہرین انسان کی زندگی کو اٹھائیس' اٹھائیس برسوں کے تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں' ان کے مطابق دنیا کے ہر انسان (اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو) کی زندگی میں اٹھائیس سال بعد بڑی نمایاں تبدیلی آجاتی ہے' یہ تبدیلی بعض اوقات اگلی نسل میں منتقل ہو جاتی ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں ایک نسل کسمپرسی میں زندگی گزارتی ہے اور اگلی نسل کی شروعات ہی خوشحالی اور کامیابی سے ہوتی ہے' اگلی نسل اسے اپنی کامیابی سمجھتی ہے لیکن حقیقت میں یہ پچھلی نسل کی بدقسمتی کا ''ریوارڈ'' ہوتا ہے چنانچہ انسان کو چاہئے یہ اس عارضی بدقسمتی کو عارضی ہی سمجھے۔ دو' انسان کو چاہئے یہ لوہے کی کیل کی طرح کسی لکڑی کا سہارا لے لے' یہ خوش قسمت لوگ تلاش کرے' اپنا زیادہ تر وقت ان کی صحبت میں گزارے' ان کے ساتھ پارٹنر شپ کر لے' انہیں اپنا حصہ دار بنا لے یا پھر ان کی ملازمت اختیار کر لے اور یہ سوچ لے حالات خواہ کتنے ہی گھمبیر اور خوفناک کیوں نہ ہو جائیں میں نے اس شخص کا ساتھ نہیں چھوڑنا' یہ شخص مجھے روز دھکے دے کر نکالے لیکن میں اگلے دن دوبارہ اس کے پاس پہنچ جاؤں گا' یہ تکنیک مشکل ہے کیونکہ بدقسمتی کے دور میں انسان کی تذلیل معمول ہوتی ہے لیکن انسان اگر صبر کر لے اور اس سلوک کو چند برسوں کیلئے اپنا مقدر مان لے تو اس کی زندگی میں سکون کے چند لمحے آ سکتے ہیں اور تین' خوش قسمتی اور بدقسمتی دونوں صورتیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہوتی ہیں چنانچہ انسان کو کثرت سے اللہ سے رجوع کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہئے' اس سے مہربانی کی درخواست کرنی چاہئے اور اللہ کے ساتھ پارٹنر شپ کر لینی چاہئے۔ یہ انسان کی دس ہزار سالہ تحریری تاریخ کا فیصلہ ہے' چیرٹی کے منصوبے پھیلتے پھولتے بھی ہیں اور ان سے انسان کو سکون بھی ملتا ہے لہٰذا انسان کو اگر کاروبار میں نقصان ہو رہا ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کو کاروبار میں شریک کر لے' اپنی آمدنی سے چیرٹی کیلئے رقم نکالنا شروع کر دے تو بھی اللہ تعالیٰ کرم کرتا ہے۔ اسی طرح مقدر کا خواتین کے ساتھ بھی بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے' ہمارے گھروں میں ہماری کوئی نہ کوئی بہن' کوئی نہ کوئی بیٹی خوش قسمت ہوتی ہے۔ خوش قسمتی کے آثار ان کی پیدائش کے ساتھ ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ اپنی بدقسمتی کے دور میں اس بیٹی' اس بہن پر شفقت کریں' اس سے اپنی قربت بڑھا لیں تو بھی ہماری بدقسمتی کی شدت میں کمی آ سکتی ہے۔

میں نے زندگی میں بے شمار لوگوں کو خوش قسمت لوگوں کی پارٹنر شپ' چیرٹی کے کاموں میں حصہ لینے' اللہ تعالیٰ سے توبہ کرنے' اپنے گھر کی خواتین سے شفقت برتنے اور صبر اور شکر کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے سے بدقسمتی کے دور سے نکلتے دیکھا ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو ساری زندگی بدقسمتی کے گرداب میں چکر کھاتے رہے لیکن ان کی اگلی نسل کو اللہ تعالیٰ نے مٹی کو سونا بنانے کا فن دے دیا اور لوگ اس خوش قسمت نسل کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے اور میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو پوری زندگی سونے کے چمچ سے کھاتے رہے لیکن ان کی اگلی نسل کو مٹی کا پیالہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ یہ کیا ہے؟ یہ سب مقدر کا ہیر پھیر ہے' دنیا میں بنیادی طور پر ایک انسان کی بدقسمتی دوسرے انسان کی خوش بختی ہوتی ہے۔ مقدر گیند کی طرح ہوتا ہے' جس طرح گیند ایک ہاتھ

سے دوسرے ہاتھ [illegible] ہوتی رہتی ہے یا کسی اور [illegible] مقدر کی ہاتھ اور جھولیاں بدلتا رہتا ہے چنانچہ آپ اگر ٹیم کا حصہ ہیں تو یہ گیند کبھی نہ کبھی واپس آپ کے پاس ضرور آئے گی اور اگر نہیں آئے گی تو بھی آپ "لوزر" نہیں ہونگے کیونکہ آپ اس خوش قسمت ٹیم کا حصہ ہیں جس کے کسی نہ کسی ممبر کے پاس اس وقت خوش نصیبی کی گیند موجود ہے اور یہ ساتھی آپ کی اگلی نسل کو یہ گیند ضرور دے جائے گا چنانچہ ٹیم کو نہ چھوڑیں' صبر کریں اور انتظار کریں' مقدر کا پیالہ کبھی نہ کبھی گردش کرتا ہوا آپ کے ہاتھ تک ضرور آئے گا۔ آپ اس وقت موجود نہ ہوئے تو آپ کے بیٹے یا آپ کے کسی عزیز کا ہاتھ اس تک ضرور پہنچے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نظام میں راتیں زیادہ طویل نہیں ہوتیں۔

میڈیا آپ کا دشمن نہیں

حکومت اور اپوزیشن کے درمیان کس قسم کا رشتہ ہوتا ہے' اس کی نوعیت اس نوجوان سے ملتی جلتی ہے جو ہوا میں اڑنے کا فن جانتا تھا' یہ نوجوان نوکری کیلئے کسی سرکاری دفتر میں گیا' انٹرویو کے دوران اس نے اپنی فرسٹ کلاس فرسٹ ڈگریاں دکھائیں' اپنا کمپیوٹر "نو ہو" کے بارے میں بتایا' تین زبانیں فرفر بول کر دکھائیں' اپنا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کیا اور آخر میں عرض کیا "جناب میں ان کے علاوہ ہوا میں بھی اڑ سکتا ہوں" انٹرویو لینے والے صاحب نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا' وہ نوجوان کرسی سے اٹھا' اس نے چیل کی طرح بازو پھیلائے اور کمرے میں اڑنا شروع کر دیا' اس نے پورے کمرے کا چکر لگایا' نیچے اترا' کرسی پر بیٹھا اور مسکرا کر بولا "جناب آپ نے میری اڑان دیکھی" انٹرویو لینے والے نے نخوت سے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے بولا "ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' تمہیں اڑنے کے علاوہ کوئی کام آتا ہے تو وہ کر کے دکھاؤ" یہ لطیفہ یہاں پر ختم نہیں ہوتا' نوجوان نے اس کے بعد بھی بے شمار کرتب دکھائے لیکن وہ صاحب کو متاثر نہیں کر سکا کیونکہ صاحب اپوزیشن تھا اور دنیا کی بہترین اپوزیشن وہ ہوتی ہے جو سفید کو سفید تسلیم نہ کرے' جسے پیلا ہمیشہ نیلا اور نیلا ذرا سا سبز دکھائی دے۔

حکومت' ہماری حکومت آج کل اپوزیشن کو اپوزیشن نہیں سمجھتی کیونکہ اپوزیشن کو اپوزیشن کیے ہوئے دو سال گزر چکے ہیں چنانچہ حکومت نے یہ فریضہ میڈیا کو سونپ دیا ہے اور میڈیا نے بھی یہ فرض بخوشی اپنے کندھوں پر اٹھا لیا ہے' پاکستان میں روزانہ شام کے وقت حکومت اور میڈیا کے درمیان جنگ شروع ہوتی ہے اور جب تک لوگ سو نہیں جاتے یہ لڑائی جاری رہتی ہے لہٰذا اس جنگ کی وجہ سے ہمیں حکومت کی "پرواز" بھی متاثر نہیں کر پاتی اور ہم حکومت کے عہدیداروں سے کہتے ہیں "ٹھیک ہے آپ ہوا میں اڑ رہے ہیں لیکن اب کوئی کام شام بھی کر کے دکھائیں" اس کے جواب میں حکومت کو ہماری اچھی اور سیدھی سادی بات بھی دشمنی لگتی ہے' یہ "لو ہیٹ' ریلیشن شپ" اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت ہے موجودہ حکومت نے چند اچھے کام بھی کیے ہیں اور غیر جانبداری اور وسعت قلبی کا تقاضا ہے ہم ان کاموں کو نہ صرف تسلیم کریں بلکہ ان کی تعریف بھی کریں مثلاً حکومت کا پہلا کارنامہ این ایف سی ایوارڈ تھا' یہ ایوارڈ قریباً بیس سال سے زیر التواء تھا' حکومت نے اپوزیشن اور صوبائی قیادت کے ساتھ مل کر نہ صرف این ایف سی ایوارڈ جاری کیا بلکہ بلوچستان کو اس کے حق کے مطابق حق بھی دیا' حکومت کا یہ کارنامہ قابل ستائش بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ حکومت نے سوات اور مالاکنڈ کی صورتحال کو سنجیدگی سے لیا' وہاں آپریشن شروع کیا اور آج وہاں امن قائم ہے' گو اس آپریشن کے دوران عام لوگوں کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑا' بے شمار معصوم اور بے گناہ لوگ بھی مارے گئے' لوگوں کی املاک کو بھی نقصان پہنچا اور سیکورٹی ایجنسیوں کے ہاتھوں عام لوگوں کی تذلیل کے واقعات بھی سامنے آئے لیکن اس آپریشن کا اختتام بہر حال اچھا ہوا اور آج سوات بھی باقی پاکستان کے ساتھ جڑا ہے۔ حکومت کا ایک کارنامہ ججز کی بحالی بھی تھا' یہ کارنامہ بہر حال عوامی دباؤ' وکلاء کی تحریک' پاکستان مسلم لیگ ن کی اٹل پوزیشن اور میڈیا کے دوٹوک موقف کے باعث پایہ تکمیل تک پہنچا لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے حکومت بالخصوص وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کا گروپ ججز کو بحال کرنا چاہتا تھا اور ہم اگر وزیراعظم ہاؤس کو اس کا کریڈٹ نہ دیں تو یہ زیادتی ہو گی۔ اس حکومت کا چوتھا بڑا

کارنامہ اٹھارہویں ترمیم تھا' گو اس ترمیم میں بے شمار نقائص موجود ہیں' ترمیم کے ذریعے پارٹیوں کے اندر آمریت قائم کر دی گئی' عوامی نمائندوں کی اہلیت کا معیار نرم کر دیا گیا' عدلیہ کو پارلیمنٹ کے تابع اور ملک میں نئے صوبوں کی بحث کو ہوا دے دی گئی لیکن اس کے باوجود اس ترمیم میں بے شمار خوبیاں ہیں اور تاریخ میں پہلی بار چھوٹے صوبوں کے مسائل اور مطالبات کو آئین میں جگہ دی گئی' حکومت کے اس کارنامے کو بھی نہ صرف تسلیم کرنا چاہیے بلکہ اس کی تعریف بھی کرنی چاہیے۔

یہ حکومت کے وہ کارنامے ہیں جنہیں ماننا بھی چاہیے اور ان کی کھل کر تعریف بھی کرنی چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی ان مسائل کی نشاندہی بھی ہونی چاہیے جن کی طرف حکومت کی نظر نہیں جا رہی یا پھر حکومت جان بوجھ کر اس کی طرف توجہ نہیں دے رہی مثلاً پاکستان میں سٹیٹ کی گرفت تیزی سے ڈھیلی پڑ رہی ہے' ملک میں اداروں کا احترام اور خوف ختم ہو چکا ہے' لوگوں نے پولیس کو پولیس اور واپڈا کو واپڈا ماننے سے انکار کر دیا ہے' حکومتی اداروں کی کمزوری کی یہ حالت ہے حکومت نے آٹھ بجے دکانیں بند کرنے کا حکم جاری کیا لیکن تاجر اس حکم کو ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں' یہ لوگ حکومت پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں اور حکومت پولیس کے ذریعے اس حکم کے نفاذ پر مجبور ہے مثلاً حکومت عام آدمی کو ضروریات زندگی فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے' مہنگائی ''آؤٹ آف کنٹرول'' ہو چکی ہے' ملک میں تاجروں' صنعت کاروں اور بزنس مینوں نے مافیاز بنا رکھے ہیں' ان مافیاز کو پارلیمنٹ میں موجود نمائندوں اور حکومتی عہدیداروں کی سرپرستی حاصل ہے' یہ لوگ اس قدر طاقتور ہیں کہ یہ سپریم کورٹ اور حکومت کے فیصلے کے باوجود چینی کی قیمت اسی روپے کلو تک لے گئے اور حکومت ہاتھ ملتی رہ گئی' یہ صورتحال دوسری اشیاء ضروریہ کے معاملے میں بھی درپیش ہے' ٹرانسپورٹ کے کرائے مافیاز بڑھا رہے ہیں' گندم' چاول اور سبزیوں کے نرخ مافیاز طے کر رہے ہیں' پٹرول کی قیمتوں اور بجلی اور گیس کے نرخوں کا فیصلہ مافیاز کر رہے ہیں' دالوں' گوشت اور گھی کی قیمتیں راتوں رات بڑھ جاتی ہیں اور حکومتی ادارے خاموشی سے یہ اضافہ دیکھتے رہتے ہیں' مثلاً پاکستان کی معیشت آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے پنجے میں منتقل ہو چکی ہے' پرویز مشرف اور شوکت عزیز کے دور میں پاکستان نے ان سود خوروں سے جان چھڑا لی تھی لیکن موجودہ حکومت نے ملک کو دوبارہ ان کی گود میں بٹھا دیا اور آج حالت یہ ہے ہمارے نوٹ کے سائز تک کا فیصلہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کر رہا ہے' یہ بین الاقوامی ادارے ہمارے وزیراعظم اور صدر کو براہ راست حکم جاری کرتے ہیں اور پٹرولیم ٹیکس تک ان کے اشارے پر لگایا جاتا ہے مثلاً حکومتی سطح پر کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کی کہانیاں عام ہیں' وزراء کی کرپشن کے کیس سامنے آتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اپنے عہدوں پر قائم رہتے ہیں' بابر اعوان کی کہانی کس کو معلوم نہیں؟ لیکن یہ نہ صرف عہدے پر قائم ہیں بلکہ خورشید شاہ جیسے جید وزراء اور پرانے سیاستدانوں کے مقابلے میں زیادہ پروٹوکول اور زیادہ سیکورٹی لے رہے ہیں' حکومت کی موجودہ لاٹ میں صرف فرحت اللہ بابر واحد مشیر ہیں جو اپنی گاڑی خود چلاتے ہیں اور ان کے ساتھ پولیس کی کوئی جیپ نہیں ہوتی جبکہ ان کے برعکس ایسے ایسے لوگ پولیس کی درجن درجن گاڑیوں کے نرغے میں شہر میں نکلتے ہیں جن کے نام اور شکل تک سے بے نظیر بھٹو واقف نہیں تھیں' مثلاً حکومت بے نظیر بھٹو کے قاتلوں کے معاملے میں سنجیدہ دکھائی

[illegible]
رحمٰن ملک اور بابر اعوان کی انکوائری بھی چاہتے ہیں۔ لوڈ شیڈنگ ' مہنگائی ' لاقانونیت اور بے روزگاری کے معاملات میں حکومت کی مس مینجمنٹ اندھوں کو بھی دکھائی دے رہی ہے لیکن کسی سطح پر ان مسائل کے حل کیلئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی جا رہی لہٰذا یوں محسوس ہوتا ہے حکومتی عہدیدار مراعات کو انجوائے کر رہے ہیں اور عوام کو مہنگائی ' بے روزگاری اور لوڈ شیڈنگ کے عفریتوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

ہم میڈیا کے لوگ حکومت کے مخالف نہیں ہیں کیونکہ یہ حکومت گئی تو اس کا میڈیا کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا ' بابر اعوان ' قمر زمان کائرہ ' رحمٰن ملک ' نوید قمر اور فرزانہ راجہ کی جگہ اینکر پرسنز ' کالم نگار یا ایڈیٹرز وزیر نہیں بنیں گے اور نہ ہی کوئی میڈیا ٹائی کون وزیراعظم یا صدر کی کرسی پر بیٹھے گا ' ہم لوگوں کا کام تو اقتدار کے بادلوں پر اڑنے والوں کی پرواز دیکھنا ہے ' آج ان کی پرواز کو حیرت سے دیکھ رہے ہیں اور کل دوسروں کے پر ماپتے رہیں گے چنانچہ حکومت کو چاہیے یہ ہمیں اپنا دشمن نہ سمجھے ' حکومت کے اصل دشمن کرپشن ' مہنگائی ' بے روزگاری ' لاقانونیت ' لوڈ شیڈنگ اور بے نظیر بھٹو کے قاتل ہیں ' حکومت کو چاہیے یہ ان کے خلاف جنگ کرے میڈیا خود بخود خاموش ہو جائے گا کیونکہ جس طرح جمہوریت بہترین انتقام ہے بالکل اسی طرح پرفارمنس میڈیا کو خاموش کرنے کا بہترین ٹول ہے ' جس دن آپ عوام کے مسائل حل کر لیں گے اس دن کسی صحافی کا قلم آپ کے خلاف اٹھے گا اور نہ ہی کوئی مائیکروفون اور کوئی کیمرہ آپ کے خلاف استعمال ہو گا کیونکہ سچائی کا سورج طلوع ہونے کے بعد کوئی زبان روشنی کے وجود سے انکار نہیں کر سکتی۔ آپ بس سچائی کا کوئی سورج تراشیں ' ہم خود بخود خاموش ہو جائیں گے۔

صدر زرداری کیوں نہیں کر سکتے!
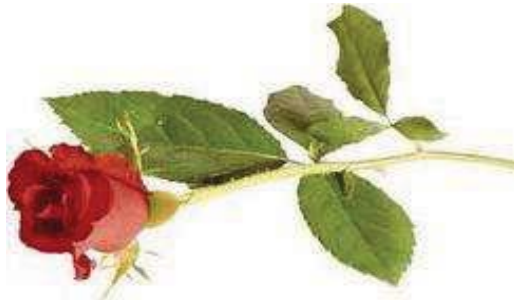
لولاڈی سلوا کے چہرے پر سنجیدگی تھی‘اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور وہ کیمرے کی طرف دیکھنے کی بجائے کھڑکی سے شہر کی طرف دیکھ رہا تھا‘اس کے سامنے شہر کی سینکڑوں‘ ہزاروں چھتیں بکھری تھیں اور وہ ان چھتوں پر خوابوں‘ خواہشوں اور تمناؤں کی لہلہاتی فصلیں گن رہا تھا‘کیمرے کی کلک ہوئی اور اس کے بعد دیر تک کلک کلک کی آوازیں اور فلش کے کوندے اس کے اردگرد لہراتے رہے‘دنیا کے جدید ترین کیمرے نے لولا ڈی سلوا کی دو سو تصویریں کھینچ لیں‘ فوٹو گرافروں کی ٹیم ان میں سے بہترین تصویر منتخب کرے گی‘ یہ تصویر ٹائم میگزین میں شائع ہو گی اور پوری دنیا کے پڑھے لکھے لوگ لولاڈی سلوا کے سینے پر بندھے ہاتھ اور چہرے کی سنجیدگی دیکھیں گے اور مزدور کے اس بیٹے کے عزم کی داد دیں گے۔ فوٹو گرافروں کی ٹیم نے لولاڈی سلوا کا شکریہ ادا کیا‘ وہ آگے بڑھا‘اس نے دروازہ کھولا اور ٹیم کے تمام لوگوں کو جھک کر رخصت کیا‘صدر کا سٹاف باہر کھڑا تھا‘ ان لوگوں کو سختی سے ہدایت تھی صدر کے تمام مہمانوں کو ان کا ذاتی مہمان سمجھا جائے اور جب تک وہ مہمان صدارتی دفتر‘ڈرائنگ روم یا صدارتی سٹڈی سے رخصت نہیں ہو جاتے اس وقت تک سرکاری سٹاف کسی سے مل سکتا ہے اور نہ ہی اسے چائے کافی یا پانی پیش کر سکتا ہے۔یہ سب صدر لولاڈی سلوا کی ذمہ داری ہے۔برازیل کے مزدور صدر لولاڈی سلوا کی یہ تصویر میں نے ٹائم میگزین کے تازہ ترین شمارے میں دیکھی‘ٹائم میگزین ہر سال دنیا کی سو انتہائی بااثر شخصیات کی رپورٹ شائع کرتا ہے‘ دنیا کا جو شخص اس رپورٹ میں شامل ہو جاتا ہے اس کی صلاحیت‘ خدمت اور کارناموں پر تصدیق کی مہر لگ جاتی ہے۔اس سال کی رپورٹ برازیل کے صدر لولاڈی سلوا سے شروع ہوتی ہے‘یہ اس رپورٹ کی پہلی شخصیت ہے۔64 سال کا لولاڈی سلوا آج سے چالیس پہلے سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہ کبھی برازیل جیسے ملک کا صدر بنے گا‘اس کی تصویر دنیا کی سو بااثر ترین شخصیات کی فہرست میں شائع ہو گی اور مائیکل مور جیسا صحافی امریکی انتظامیہ کو ہدایت کرے گا امریکی قیادت کو برازیل اور برازیلی صدر لولاڈی سلوا سے حکومت اور سیاست سیکھنی چاہیے۔یہ واقعی معجزہ ہے لیکن لولاڈی سلوا اس معجزے کو "ڈیزرو" کرتا ہے۔ لولاڈی سلوا مزدور کے بیٹے ہیں‘پانچویں جماعت کے بعد ان کی تعلیم کا سلسلہ رک گیا اور یہ خاندان کی پرورش کیلئے لوگوں کے جوتے پالش کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ گلے میں جوتے پالش کرنے کی پیٹی لٹکا کر گلی گلی پھرتے تھے‘ پالش کی آمدنی گھر چلانے کیلئے ناکافی ہو گئی تو یہ دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو گئے مثلاً لولا نے مونگ پھلی بیچنا شروع کر دی‘اس سے بھی گزارا نہ ہوا تو یہ لوہے کی ایک مل میں بھرتی ہو گئے‘ یہ سارا سارا دن لوہا کوٹتے لوہے کی سرخ سلاخیں بھٹی سے کھینچتے‘انہیں کاٹتے اور پھر اٹھا کر ٹرکوں پر لاد دیتے‘اسی دوران لولاڈی سلوا کی ایک انگلی کٹ گئی لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری‘ پچیس سال کی عمر میں لولاڈی سلوا کے ساتھ خوفناک واقعہ پیش آیا‘ ان کی اہلیہ ماریا حاملہ تھیں‘ حمل کے آٹھویں مہینے زنانہ پیچیدگی پیدا ہوئی‘ یہ اہلیہ کو لے کر ہسپتال پہنچے لیکن ان کے پاس علاج کیلئے مناسب رقم نہیں تھی چنانچہ ان کی اہلیہ اور بچہ دونوں انتقال کر گئے۔اس واقعے نے لولاڈی سلوا کو اندر سے ہلا کر دکھ دیا اور انہیں محسوس ہوا برازیل میں غریب طبقہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے‘ان لوگوں کو دوا اور تعلیم کی بنیادی سہولت تک حاصل نہیں چنانچہ لولاڈی سلوا نے ہسپتال کے کوریڈور میں

کھڑے ہو کر طبقاتی تقسیم کے اس قلعے میں نقب لگانے کا فیصلہ کیا' انہوں نے اس نظام کو تبدیل کرنے کا عزم کر لیا۔ لولاڈی سلوا نے ٹریڈ یونین سے سیاست کا آغاز کیا' انہوں نے جلوس بھی نکالے' پولیس کے ڈنڈے بھی کھائے اور حوالات اور جیلیں بھی دیکھیں لیکن یہ ڈٹے رہے۔ برازیل کے معاشرے نے آہستہ آہستہ ان کی سنجیدگی اور اخلاص بھانپ لیا' لوگ ان کے گرد جمع ہوئے' لولا نے 1980ء میں اپنی سیاسی جماعت ''ورکرز پارٹی'' بنائی' یہ ملک کے مزدور اور غریب طبقے کی سیاسی جماعت تھی جس کا ایک ہی منشور تھا' برازیل کے غریب اور محروم طبقوں کو زندگی کی سہولتیں فراہم کرنا۔ لولاڈی سلوا نے تین صدارتی الیکشن لڑے' وہ ان الیکشنوں میں ہار گئے لیکن ان کی ہمت نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ وہ یکم جنوری 2003ء کو برازیل کے صدر بن گئے۔ لولاڈی سلوا کا صدر بن جانا جہاں دنیا بھر کے لیڈروں کیلئے حیران کن تھا وہاں ان کی کامیابی نے برازیل کے روایتی سیاستدانوں اور اشرافیہ کو جڑوں سے ہلا دیا اور یہ لوگ ملک سے فرار ہونا شروع ہو گئے۔

لولاڈی سلوا کے صدر بننے سے پہلے برازیل میں لاء اینڈ آرڈر کی یہ صورتحال تھی کہ پولیس رات کے وقت ریوڈی جینرو کی سڑکوں پر نکلتی تھی اور فٹ پاتھ پر سوئے لاوارث بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیتی تھی' ان بچوں کی نعشیں بعدازاں اجتماعی قبروں میں دفن کر دی جاتی تھیں۔ لولاڈی سلوا نے برازیل کی غریب کلاس کو حوصلہ' ہمت اور اعتماد دیا' انہوں نے سب سے پہلے ''بھوک صفر'' کا منصوبہ شروع کیا' ان کا خیال تھا ملک میں جب تک بھوک رہے گی اس وقت تک لوگ اپنی صلاحیتوں سے پورا کام نہیں لے سکیں گے' لولا کی پالیسیوں کے نتیجے میں آج برازیل کا شمار دنیا کے ان چند ممالک میں ہوتا ہے جن میں کوئی شخص رات کو بھوکا نہیں سوتا' اس کے بعد انہوں نے ''ایجوکیشن فار آل'' پر کام شروع کیا اور تعلیم کو ان تمام گھرانوں تک پہنچا دیا جن کے بچے سکول کا صرف خواب دیکھ سکتے تھے اور آج کل یہ صحت پر کام کر رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے دو سال بعد ملک کے کسی مزدور کی بیوی ہسپتال' ڈاکٹر اور دوا کی کمی کے باعث نہیں مرے گی۔ لولاڈی سلوا کی اصلاحات اس کامیابی سے چل رہی ہیں کہ عوام نے 2006ء میں انہیں دوسری بار صدر منتخب کر لیا اور یہ تیسری بار بھی صدر بن جائیں گے چنانچہ ٹائم میگزین نے انہیں دنیا کی سو انتہائی باا‌ثر شخصیات کی فہرست میں پہلے نمبر پر جگہ دی' لولاڈی سلوا اس اعزاز کے مستحق بھی ہیں۔

ہمارے صدر آصف علی زرداری کیلئے لولاڈی سلوا کی داستان میں بہت بڑا سبق چھپا ہے' جس طرح لولاڈی سلوا نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر برازیل کا ظالمانہ نظام تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا بالکل اسی طرح قدرت نے بے نظیر بھٹو کی شہادت کے بعد صدر آصف علی زرداری کو بھی موقع فراہم کیا۔ آپ 27 دسمبر 2007ء کے سانحہ کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے' محترمہ کو شہادت کے دن مناسب سیکورٹی فراہم نہیں کی گئی تھی۔ دوسرا' سانحے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کو زخمی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا لیکن ہسپتال میں آلات' ادویات اور ڈاکٹروں کا مناسب بندوبست نہیں تھا۔ محترمہ کو ایسی جگہ لٹایا گیا جس کی طرف وہ عام حالات میں دیکھنا بھی پسند نہ کرتیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے مخدوم امین فہیم' صفدر عباسی' ناہید خان اور شیری رحمان کو ہسپتال کے کوریڈور میں زمین اور سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھا کیونکہ ہسپتال میں بیٹھنے کیلئے مناسب جگہ ہی نہیں تھی۔ ہسپتال کے اندر کی حالت یہ تھی کہ

ڈاکٹروں کو محترمہ کے پوسٹ مارٹم تک کی ہمت نہیں ہوئی اور یوں محترمہ کا کیس ''گولی سے جاں بحق ہوئی یا لیور سے''جیسی کنٹروورسی کا شکار ہو گیا۔ پولیس نے جائے حادثہ کو بھی دھو دیا جس کی وجہ سے تمام شواہد ختم ہو گئے لہٰذا یہ حادثہ جہاں پولیس کے کمزور نظام کی نشاندہی کرتا ہے وہاں یہ ہمارے ہسپتالوں کی حالت زار کو بھی ظاہر کرتا ہے ۔اللہ تعالیٰ نے محترمہ کے بعد صدر آصف علی زرداری اور مخدوم یوسف رضا گیلانی کو اقتدار سے نوازا' یہ لوگ آج محترمہ کی تصویر کی بنیاد پر ملک پر حکومت کر رہے ہیں' یہ لوگ اگر محترمہ کے ساتھ واقعی مخلص ہیں اور یہ عوام کی حالت بدلنا چاہتے ہیں تو ان کے سامنے برازیل کے صدر لولاڈی سلوا کی مثال موجود ہے۔ صدر آصف علی زرداری صدر لولاڈی سلوا کی طرح اپنی اہلیہ کی ٹریجڈی کو مشعل راہ بنا لیں اور کم از کم اس ملک میں پولیس اور ہسپتالوں کا نظام ہی بہتر بنا دیں' یہ پولیس کو ہر قسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد کر دیں تا کہ آنے والے وقت میں کسی جرنیل کی ہدایت پر کسی لیڈر کی سیکورٹی نرم ہو اور نہ ہی جائے حادثہ دھوئی جائے اور کوئی بے نظیر خواہ اس کا تعلق بھٹو فیملی سے ہو یا یہ بھٹہ خاندان سے تعلق رکھتی ہو' یہ طبی سہولتوں کی کمی کے باعث ہسپتال کے کوریڈور میں نہ مرے۔ پاکستان کے ہسپتال یورپ اور امریکا کے سٹینڈرڈ کے برابر ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کا معیار برازیل کے برابر تو ہو کیونکہ اگر لولاڈی سلوا اپنی اہلیہ کے لئے ایسا کر سکتا ہے تو صدر آصف علی زرداری اپنی مرحومہ بیوی کیلئے ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ وہ بیوی کے نام پر سارے سسٹم کو ہلا سکتے ہیں تو یہ ایسا کیوں نہیں کر سکتے' آخر ان میں کیا کمی ہے۔۔!

ڈیڑھ انچ کی سوئی
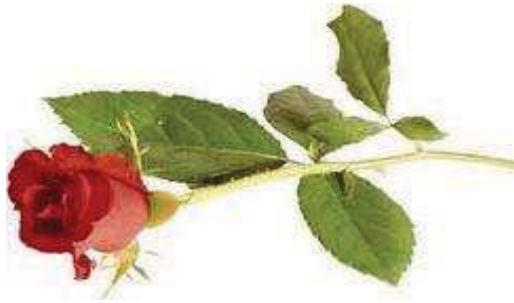
پاکستانی سیاست کے بدبودار پانیوں میں خوشبو کے چھوٹے چھوٹے جزیرے بھی ہیں' یہ جزیرے اصل پاکستان ہیں اور ہمیں جہاں ان جزیروں کی حفاظت کرنی چاہیے وہاں ہمیں ان جیسے نئے جزیرے بھی تعمیر کرنے چاہئیں کیونکہ یہ جزیرے ہمیں آگے چل کر اس پاکستان تک لے جائیں گے جس کا خواب اس ملک کے بانیوں نے دیکھا تھا' اس قسم کا ایک جزیرہ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے تین طالب علموں نے تعمیر کیا تھا۔ ان تین طالب علموں اظہر محمود' ندیم رشید اور ساجدہ منظور نے پنجاب یونیورسٹی سے سوشل ورک میں ایم اے کیا اور دوران تعلیم انہوں نے ایک ادارہ بنایا جس کا مقصد یتیم بچوں کو تعلیم کی مفت سہولت فراہم کرنا تھا' یہ لوگ ضرورت مند بچوں کو کتابیں' کاپیاں' سکول بیگ' جوتے' یونیفارم اور سردیوں میں گرم کپڑے فراہم کرتے ہیں' یہ تینوں نوجوان ضرورت مند بچوں کو پرائیویٹ سکولوں میں داخلہ بھی لے کر دیتے ہیں' ان نوجوانوں نے داخلے کیلئے بڑا دلچسپ طریقہ اختیار کیا' یہ ضرورت مند بچے کو قریب ترین پرائیویٹ سکول میں لے جاتے ہیں' اپنا اور اپنے ادارے کا تعارف کراتے ہیں اور بعد ازاں پرنسپل کو قائل کرتے ہیں کہ وہ اس بچے کی فیس پانچ سو روپے ماہانہ کر دے' یہ فیس بھی یہ لوگ خود ادا کرتے ہیں' ان کے پاس شروع میں 40 بچے تھے لیکن اب یہ 80 بچوں کی کفالت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ شروع میں بچے اور اس کی فیملی کے متعلق جانچ پڑتال کرتے ہیں اور اس کے بعد اس کی ذمہ داری اٹھالیتے ہیں' اس کام میں انہیں چار سال ہو چکے ہیں اور لاہور کے ایک صاحب فہیم محمد اکرم اس کام میں ان کی بھرپور مالی مدد کر رہے ہیں۔ فہیم محمد اکرم ایک بزنس مین ہیں اور انہوں نے نہ صرف ان لوگوں کو آفس میں علیحدہ جگہ دے رکھی ہے بلکہ یہ اس آفس کا خرچ بھی خود برداشت کرتے ہیں۔ سکول کی فیسوں کا 60 فیصد فہیم محمد اکرم برداشت کرتے ہیں جبکہ باقی رقم یہ لوگ سوسائٹی اور اپنے جاننے والوں سے حاصل کرتے ہیں' ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے ذمے کچھ بچوں کی سکول فیس اور اخراجات لے رکھے ہیں جس کی پراگریس رپورٹ یہ ان کو ہر مہینے فراہم کر دیتے ہیں۔ ان کے پاس بچے بڑھ گئے ہیں اور اب ان بچوں کا بوجھ اٹھانا ان کے بس کی بات نہیں رہی' اس وقت سو کے قریب بچے ویٹنگ لسٹ میں ہیں' یہ بچے باپ کے سائے سے محروم ہیں اور ان کی مائیں ان سے آس لگائے بیٹھی ہیں کہ یہ ان بچوں کی ذمہ داری اٹھالیں گے لیکن یہ اس قابل نہیں ہیں کہ مزید بچوں کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اظہر محمود نے پچھلے دنوں مجھے خط لکھا جس میں اس نوجوان نے کہا" میرے پاس روزانہ ان سو بچوں کی مائیں آتی ہیں' ان کی بات سن کر ہماری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں' ہم بچوں کے چہرے دیکھ کر بھی دکھ میں چلے جاتے ہیں' میری آپ سے گزارش ہے آپ اپنے کالم کے ذریعے مخیّر حضرات کو قائل کریں کہ یہ ان بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری اٹھالیں' ہم ان کو بچوں کا تمام ڈیٹا فراہم کر دیں گے" اظہر محمود کا موبائل نمبر: 0332-4190929 ہے' ایڈریس: 5۔ سن فلاور' ہاؤسنگ سوسائٹی' J-1' جوہر ٹاؤن' نزد ٹھوکر نیاز بیگ' لاہور ہے جبکہ فون نمبر :042-35304607 اور فیکس نمبر 042-35312503 ہیں۔ اظہر محمود اور ان کے ساتھی اس ملک کے بدبودار پانیوں میں خوشبو کا ایک جزیرہ ہیں' میری آپ سے التماس ہے آپ بھی اس جزیرے کے بانیوں میں شامل ہو جائیں' آپ کی معمولی سی مدد سے

سینکڑوں ہزاروں بچوں کو کتابیں' یونیفارم اور کاپیاں مل جائیں گی اور یوں ان پر ترقی اور علم کے راستے کھل جائیں گے۔

راولپنڈی کی ایک بزرگ خاتون رضیہ بی بی بھی پاکستان بیت المال کے سربراہ زمرد خان کی مدد کی منتظر ہیں' رضیہ بی بی کا کہنا ہے ''میرا خاوند گزشتہ سال 3 فروری کو فوت ہو گیا' میں کرائے کے مکان میں رہتی ہوں جس کا کرایہ 4300روپے ہے' بجلی اور سوئی گیس کا بل بھی برداشت سے زیادہ ہے' میرا کمائی والا کوئی نہیں' ایک جوان بیٹی ہے اور دو بیٹے ہیں' ایک بیٹا مزدوری کرتا ہے' کبھی اس کو کام ملتا ہے' کبھی نہیں ملتا' بیٹے کے پاس ڈرائیونگ لائسنس ہے' وہ گاڑی چلا سکتا ہے' گاڑی کیلئے بھی ہم نے بہت کوشش کی لیکن کوئی ضمانت دینے والا نہیں' اس لئے ہم گھر کی چیزیں بیچ بیچ کر گھر کے اخراجات چلا رہے ہیں اور گھر میں اب فاقے ہیں' گھر میں فاقوں کی وجہ سے بچی کا رشتہ ٹوٹ گیا' میرے تینوں بچوں کے پاس تعلیم بھی زیادہ نہیں' مڈل پاس ہیں اور انہیں کوئی ہنر بھی نہیں آتا' مجھے سلائی کا کام تھوڑا بہت آتا ہے لیکن میرے پاس سلائی کی مشین نہیں' میرے مرحوم خاوند حکیم تھے' میرے بچوں اور مجھے حکمت کا کام آتا ہے لیکن اس کیلئے بھی پیسے نہیں ہیں' میرا چھوٹا بیٹا ذہنی مریض ہے' اس کے علاج معالجے کیلئے بھی میرے پاس پیسے نہیں ہیں' میں چاہتی ہوں حکومت بیت المال سے میرا وظیفہ مقرر کر دے' مجھے سلائی کی ایک مشین مل جائے' میرے بچے کا علاج ہو جائے' میری وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف سے اپیل ہے یہ بچی کی شادی کیلئے میری مدد کریں۔ میرے لئے ایک چھوٹے سے گھر کا بندوبست ہو جائے جس میں ذکر و عبادت کر سکوں۔ میرے بیٹے کیلئے کوئی نوکری سرکاری یا غیر سرکاری لگوا دی جائے تو میرا بڑھاپا اچھا گزر جائے گا' رضیہ بی بی' زوجہ مرحوم حکیم یونس' موبائل نمبر: 0321-5327537' مکان نمبر 236۔ آر' اصلاحی کمیٹی جھنگی محلہ' مالک مکان مبین احمد''۔

اگر زمرد خان یا میاں شہباز شریف یہ کالم پڑھیں تو میری ان سے التماس ہے آپ اس خاتون کی مدد کر دیں' اگر وسیلہ حق کے کان اور آنکھیں کھلی ہیں اور انہیں ابھی تک اس ملک میں غربت دکھائی دے رہی ہے تو مہربانی فرما کر اس خاتون کیلئے بھی وسیلے کا بندوبست کر دیا جائے کیونکہ یہ وسیلہ حق کی اصل حق دار ہیں' یہ خاتون چند ہزار روپے سے اپنی اور اپنے خاندان کی ٹوٹتی سانسیں بحال کر سکتی ہے اگر میاں صاحب یا زمرد خان صاحب یا پھر فرزانہ راجہ صاحبہ کے پاس وقت نہ ہو تو میری اہل خیر سے درخواست ہے آپ ہی مہربانی فرمایئے کیونکہ غربت پھٹے ہوئے کپڑوں کی طرح ہوتی ہے' انہیں قابل استعمال بنانے کیلئے کسی بڑی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں ہوتی' اس کیلئے ڈیڑھ انچ کی سوئی اور ایک میٹر دھاگہ چاہیے ہوتا ہے' کوئی ہاتھ سوئی اور دھاگے کے ذریعے یہ کپڑے رفو کر دے تو غربت کے سارے عیب چھپ جاتے ہیں' آپ ایک میٹر دھاگے اور ڈیڑھ انچ کی سوئی کا بندوبست کر کے اپنے اردگرد موجود رضیہ بی بی جیسے سینکڑوں ہزاروں لوگوں کی غربت رفو کر سکتے ہیں' ان کی باہر جھانکتی انا کو چھپا سکتے ہیں' آپ اظہر محمود جیسے نوجوان جزیروں کی مدد کر کے بھی اس معاشرے کو رہنے کے قابل بنا سکتے ہیں کیونکہ بہرحال یہی وہ نوجوان ہیں جو بدبودار پانیوں میں خوشبو کے جزیرے بنا رہے ہیں' جو اپنے ہاتھوں میں ڈیڑھ انچ کی سوئیاں اٹھا کر اس معاشرے کے چیتھڑے سی رہے ہیں۔
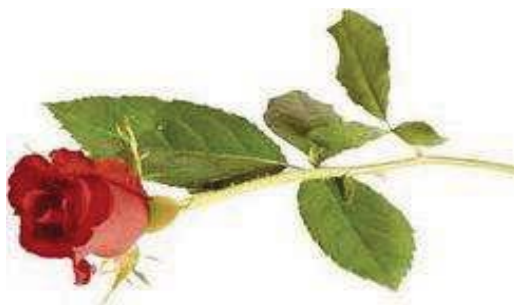
مہنگائی نعمت ہے

’’مہنگائی کتنی عظیم نعمت ہے اس کا اندازا تم اس چھوٹے سے واقعے سے لگالو‘ یہ پاکستان کے ایک ارب پتی تاجر کی کہانی ہے‘‘۔

انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور اس کے بعد گویا ہوئے ’’یہ تاجر کبھی کسی دکاندار کے پاس ملازم تھا‘ دکاندار اسے دو ہزار روپے ماہانہ دیتا تھا اور یہ دو ہزار روپوں کیلئے بارہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا دور تھا‘ اس وقت دو ہزار روپے مناسب رقم تھی اور اس رقم سے درمیانے درجے کے گھرانے کا ٹھیک ٹھاک گزارا ہو جاتا تھا لیکن پھر ملک میں مہنگائی کا ریلا آیا‘ ضروریات کی تمام چیزوں کے ریٹس بڑھ گئے‘ اس کے گھر تین بچے بھی پیدا ہو گئے‘ ان بچوں کی ضروریات بھی بڑھ گئیں‘ والد اور والدہ بھی بیمار رہنے لگے اور مالک مکان نے بھی کرایہ بڑھا دیا‘ سائیکل پرانی ہو گئی اور اس کے خرچے بھی نکلنے لگے‘ بجلی کے ریٹس میں بھی اضافہ ہو گیا‘ ملک میں ٹی وی‘ واشنگ مشین اور فریجوں کا رواج بھی ہو گیا اور بیوی نے ان سہولتوں کیلئے ضد بھی شروع کر دی‘ مہمانوں کی آمد میں بھی اضافہ ہو گیا اور عزیز رشتے داروں کے بچے بھی شادیوں کی عمر میں پہنچ گئے چنانچہ دو ہزار روپے قلیل ہو گئے اور مسائل کثیر۔ اس نے مالک سے تنخواہ بڑھانے کی درخواست کی لیکن مالک نے صاف انکار کر دیا یوں خاندان مسائل کے دباؤ میں آ گیا۔ اس وقت اس کی بیوی نے ایک نیا راستہ نکالا‘ اس نے گھر میں ردی کاغذوں اور اخبارات کے لفافے بنانا شروع کر دیئے‘ وہ اپنے بچوں کے ساتھ سارا دن لفافے بناتی‘ اس کا شوہر کام پر جاتے ہوئے یہ لفافے ساتھ لے جاتا اور بازار میں مختلف دکانوں پر بیچ دیتا۔ یہ کام چل نکلا جس کے نتیجے میں خاندان میں خوشحالی آ گئی‘ فریج بھی آ گیا‘ واشنگ مشین بھی اور بارہ انچ کا بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن بھی۔ یہ سہولتیں آئیں تو ان سہولتوں کا خرچ بھی آیا چنانچہ خاندان کو اب ماہانہ آٹھ‘ دس ہزار روپے چاہیے تھے‘ اس نے اس کا حل بھی دریافت کر لیا‘ یہ لوگ منوں کے حساب سے ردی کاغذ اور اخبارات خرید کر محلے کے مختلف گھروں میں تقسیم کر دیتے‘ محلے کی عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں میں لفافے بناتے‘ یہ شخص لفافے جمع کرتا‘ یہ لفافے مارکیٹ میں بیچ دیتا‘ اپنی کمیشن اور ردی کاغذ کی قیمت جیب میں ڈالتا اور محلے کی عورتوں کو لفافے بنانے کا معاوضہ دے دیتا۔ اس سے یہ لوگ بھی خوش حال ہو گئے اور محلے کی عورتوں کی معاشی حالت میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اس شخص نے چند ماہ بعد نوکری چھوڑ دی اور فل ٹائم لفافہ انڈسٹری کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ یہ کام چل نکلا تو اس نے دوستوں‘ عزیزوں اور رشتے داروں سے قرض لیا اور گھر میں پلاسٹک کے شاپنگ بیگز بنانے کا چھوٹا سا یونٹ لگا لیا‘ یہ کام بھی چل نکلا اور وہ کاغذ کے لفافوں کے ساتھ ساتھ چھوٹے شاپنگ بیگز کا سپلائر بھی بن گیا‘ خوشحالی آئی تو یہ اپنے ساتھ اخراجات بھی لائی‘ یہ لوگ چھوٹے گھر سے بڑے گھر میں منتقل ہو گئے‘ یہ موٹر سائیکل سے گاڑی پر آ گئے‘ انہوں نے بچوں کو مہنگے سکولوں میں داخل کرا دیا اور ان کے فریج‘ ٹیلی ویژن اور واشنگ مشین کا سائز بھی بڑا ہو گیا‘ بڑے خرچے چلانے کیلئے زیادہ رقم چاہیے تھی چنانچہ شاپنگ بیگز کا یونٹ چھوٹی سی فیکٹری بن گیا‘ فیکٹری میں ملازم رکھے گئے تو ملازموں کی تنخواہوں کا ایشو بھی آیا چنانچہ تنخواہیں پوری کرنے کیلئے مارکیٹنگ کی ٹیم رکھی گئی‘ مارکیٹنگ کی ٹیم نے نئے گاہک تلاش کئے‘ نئے گاہکوں نے نئی مصنوعات کا تقاضا کیا‘ نئی مصنوعات کیلئے نئی ٹیکنالوجی خریدی

ٹی' نئی ٹیکنالوجی مسابقت (میچ میتن) لے کر آئی' میچ میتن نے ایڈورٹائزنگ کا دروازہ کھولا' ایڈورٹائزنگ معاشرے میں کلچرل چینج کا باعث بنی اور یوں غفورا' عبدالغفور' محمد عبدالغفور' شیخ محمد عبدالغفور' سیٹھ محمد عبدالغفور اور جی ایم برادرز بنتا چلا گیا۔ یہ اب پاکستان کے چند بڑے ارب پتی بزنس مینوں میں شمار ہوتا ہے"۔

انہوں نے لمبی سانس لی اور بولے "تم ایک لمحے کیلئے سوچو' اگر 1974ء میں اس کا دو ہزار روپے میں گزارا ہوتا رہتا' مہنگائی کا ریلا نہ آتا' مالک مکان کرایہ نہ بڑھاتا یا پھر اس کا مالک اس کی تنخواہ میں پانچ سو یا ہزار روپے کا اضافہ کر دیتا تو یہ آج کہاں ہوتا؟ کیا یہ ابھی تک اسی دکان پر جھاڑو نہ مار رہا ہوتا اور اس کے بچے شہر میں ریڑھیاں نہ لگا رہے ہوتے لہٰذا تم دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کیا مہنگائی اس کیلئے نعمت ثابت نہیں ہوئی" وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔

میں نے واقعی مہنگائی کو کبھی اس زاویے سے نہیں دیکھا تھا' میں اسے ہمیشہ برا بھلا کہتا رہا لیکن مہنگائی نعمت بھی ہوتی ہے مجھے اس سے پہلے اس کا اندازا نہیں تھا۔ وہ بولے "مہنگائی بنیادی طور پر فائر الارم ہوتی ہے' یہ آپ کو بتاتی ہے آپ کی آمدنی کے ذرائع کم ہیں اور آپ اگر ایک مطمئن' پرسکون' شاندار اور خوشحال زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنی آمدنی کے وسائل بڑھانا ہوں گے' آپ اپنا فالتو وقت پیسے کمانے میں صرف کریں' بزنس کے نئے آئیڈیاز سوچیں' ان آئیڈیاز کو عملی شکل دیں' خاندان کا مالی بوجھ اگر ایک شخص پر ہے تو دوسرے افراد بھی میدان میں آئیں' بیوی گھر میں کوئی یونٹ لگا لے' آپ ملازمت کے ساتھ ساتھ بزنس شروع کر دیں تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ آج کل کمپیوٹر پر لاکھوں قسم کے بزنس ہو رہے ہیں' آپ کمپیوٹر مارکیٹ میں چلے جائیں' ٹیوشنز بھی آج کل بزنس کی شکل اختیار کر چکی ہیں' آپ کے بچے فالتو وقت میں ہوم ٹیوٹر بن سکتے ہیں' آپ دس' بیس' پچاس لوگوں کا گروپ بنا کر کوئی چھوٹا موٹا بزنس شروع کر سکتے ہیں' کوئی ہوم انڈسٹری قائم کر سکتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو آپ ٹیلی فون یا موبائل پر مختلف کمپنیوں کی مارکیٹنگ کر سکتے ہیں' سینکڑوں' ہزاروں آپشنز موجود ہیں بس آپ نے مہنگائی کو نعمت یا فائر الارم سمجھنا ہے اور اس الارم کے ذریعے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے" انہوں نے لمبا سانس لیا اور بولے "دنیا میں آج تک مہنگائی کم نہیں ہوئی' یہ بوتل کا ایسا جن ہے جو ایک بار باہر آ جائے تو واپس بوتل میں نہیں جاتا چنانچہ ہمیں اسے بوتل میں بند کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے' ہمیں اس کا مقابلہ کرنا چاہئے' اگر ہماری تعلیم کم ہے تو ہمیں اپنی تعلیمی استعداد بڑھانی چاہئے تاکہ ہمیں چار پانچ ہزار کی بجائے پچاس ساٹھ ہزار کی نوکری مل سکے' ہم اکیلے کام کر رہے ہیں تو ہمیں گھر کے دوسرے افراد کو بھی کام پر رضامند کرنا چاہئے' ہم اگر نوکری کے دوران سستی' کام چوری' چغل بازی اور نمک حرامی کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو ہمیں اسے فوراً ترک کر دینا چاہئے اور آج سے اپنی جاب پر اتنی توجہ دینی چاہئے کہ ہمارے مالکان ہمیں ترقی دینے پر مجبور ہو جائیں اور اگر مالکان ہماری کارکردگی کی قدر نہیں کرتے تو دوسرے ادارے ہمیں منہ مانگے معاوضے پر ملازمت دے دیں۔ ہماری دکان' ہماری کمپنی اور ہماری فیکٹری میں گاہک نہیں آتے تو ہم آج سے گاہکوں کو متوجہ کرنے کا سلسلہ شروع کر دیں' ان کی عزت کریں' انہیں دہلیز پر خوش آمدید کہیں اور گلی میں واپس چھوڑ کر آئیں' منافع کم کر کے سیل بڑھائیں اور گاہکوں کے حقوق کو پرافٹ پر فوقیت دیں' نئی ورائٹی لے کر آئیں اور ملازمین کو اپنے بچے سمجھنا شروع کر دیں تو ہماری آمدنی میں اضافہ ہو سکتا ہے" ان کا کہنا تھا "دنیا میں کوئی چیز مہنگی یا سستی نہیں

بھی شروع کر دیں تو ہماری آمدنی میں واضح تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ان کا کہنا تھا دنیا میں کوئی چیز مہنگی یا سستی نہیں ہوتی‘ معاملہ صرف افورڈ ایبلٹی یا قوت خرید کا ہوتا ہے‘ میں اگر افورڈ نہیں کر سکتا تو چینی دس روپے کلو ہو جائے تو بھی یہ میرے لئے مہنگی ہو گی اور اگر میں افورڈ کر سکتا ہوں تو میرے لئے چھ انجن کا جیٹ جہاز بھی بہت سستا ہے۔ بھوک سے نڈھال بچے جس ریستوران کے کچرے سے روٹی کے ٹکڑے چنتے ہیں اسی ریستوران پر لوگ دس دس ہزار روپے بل دے رہے ہوتے ہیں‘ یہ کیا ہے‘ یہ صرف اور صرف افورڈ ایبلٹی کا فرق ہے۔ یہ بے حسی‘ طبقاتی تقسیم یا مہنگائی کا ایشو نہیں یہ زیادہ کام کرنے‘ بہتر کام کرنے اور اپنی آمدنی کے وسائل بڑھانے کا ایشو ہے۔ کچھ لوگوں نے اپنی غربت کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے‘ یہ لوگ اچھی زندگی کیلئے مہنگائی کی کمی کا انتظار کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف کے لوگوں نے مہنگائی کا مقابلہ کیا‘ انہوں نے اپنی آمدنی کے ذرائع بڑھائے اور آج خوشحالی ان کی دہلیز پر بیٹھ کر جگالی کر رہی ہے“۔

وہ درست فرما رہے تھے مجھے اچھی طرح یاد ہے آج سے دس سال پہلے پورے امریکا میں یہ مہم چل رہی تھی کہ حکومت کو مزدوروں کی تنخواہ سات ڈالر فی گھنٹہ سے بڑھا کر آٹھ ڈالر کر دینی چاہئے اور اسی سال امریکا کا ایک شخص 60 ملین ڈالر سالانہ تنخواہ لے رہا تھا۔ اس میں اور ان لوگوں میں کیا فرق تھا۔ ان دونوں میں صرف اپروچ کا فرق تھا‘ اس شخص نے مہنگائی کو نعمت سمجھا اور آمدنی کے وسائل بڑھانے میں جت گیا جبکہ باقی آٹھ کروڑ لوگ مہنگائی میں کمی کا انتظار کرنے لگے چنانچہ وہ شخص ترقی کی بلندی پر پہنچ گیا اور باقی لوگ ہائے ہائے کے نعرے لگاتے رہے۔ ہمیں بھی مہنگائی کو عذاب کی بجائے نعمت سمجھنا چاہئے اور اسے چیلنج بنا کر اپنے لئے ترقی کے راستے کھول لینے چاہئیں۔

قید بھی نعمت ہوتی ہے
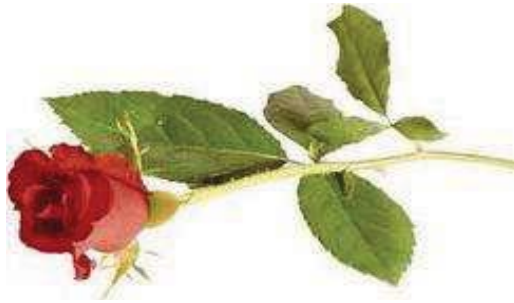
یہ ولیم کی زندگی کے برے دن تھے‘ وہ شمالی کیرولینا میں شاندار زندگی گزار رہا تھا‘ وہ ہفتے میں ساڑھے چار دن کام کرتا تھا اور اڑھائی دن موج مستی۔ اسے شکار کا بھی شوق تھا‘ کتابیں پڑھنے کا بھی‘ ڈسکو میں ڈانس کرنے کا بھی اور جھیل کے کنارے بیٹھ کر کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے کا بھی اور وہ اپنی اس زندگی سے مطمئن تھا لیکن پھر اس کے برے دن شروع ہو گئے۔ یہ 1921ء کی جولائی تھی‘ وہ رائفل لے کر شمالی کیرولینا کے مضافات میں گھوم رہا تھا‘ فضا میں اچانک فائر کی آواز گونجی اور وہ فائر کے مقام کی طرف چل پڑا‘ راستے میں اسے ایک شخص کی تازہ لاش ملی‘ لاش میں زندگی کے آثار تلاش کرنے کیلئے وہ اس پر جھکا‘ اس دوران وہاں پولیس آ گئی اور اس نے ولیم کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا‘ ولیم کے خلاف مقدمہ چلا اور عدالت نے اسے تیس سال قید بامشقت کی سزا دے دی‘ ولیم جیل میں پہنچ گیا۔

ولیم کے پاس اب تین آپشن تھے۔ وہ امریکا کے پولیس اور جسٹس سسٹم کو کوستا رہتا اور جیل میں تیس سال نفسیاتی مریض بن کر گزار دیتا‘ ساٹھ سال کی عمر میں جیل سے رہا ہوتا اور باقی زندگی دنیا کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاتے ہوئے گزار دیتا۔ دو‘ یہ اپیلوں اور درخواستوں کے چکر میں پڑ جاتا‘ یہ دنیا بھر کے قیدیوں کی طرح عدالتوں‘ گورنرز‘ وزراء اور صدر کو رحم کی اپیلیں بھجواتا رہتا‘ جیل میں اپنا رویہ اچھا رکھتا اور قید میں رعایت لے کر تیس سال کو پچیس سال میں بدل لیتا یا پھر امریکن صدر یا سپریم کورٹ کے کسی جج کو اس پر ترس آ جاتا‘ اس کا کیس دوبارہ کھلتا‘ یہ بے گناہ ثابت ہو جاتا اور عدالت اسے رہا کر دیتی اور تیسرا اور آخری آپشن‘ ولیم جیل کے ان برے دنوں کو فرصت کے لمحات سمجھ لیتا‘ یہ اپنے آپ کو کسی تخلیقی سرگرمی میں مصروف کر لیتا اور یہ دن اسے دنیا میں دائمی شہرت دے جاتے۔ ولیم نے تیسرے آپشن کا انتخاب کیا‘ اس نے ان برے دنوں کو نعمت بنانے کا فیصلہ کیا‘ اس نے سوچا وہ ان دنوں کو کسی تخلیقی کام میں صرف کرے گا اور دنیا میں کوئی ایسا کام کر جائے گا جس سے اس کی شہرت اور نیک نامی آفاقی شکل اختیار کر جائے۔

ولیم کو اسلحے میں خصوصی دلچسپی تھی‘ اس نے دس سال کی عمر میں لکڑی کی رائفل بنائی تھی اور وہ اس رائفل سے چڑیوں اور طوطوں کا شکار کیا کرتا تھا‘ وہ ہمیشہ یہ رائفل لے کر گھر سے باہر نکلتا تھا‘ اس وقت رائفلوں میں بے شمار خامیاں تھیں‘ ولیم نے سوچا وہ جیل میں رہ کر دنیا کی جدید اور بہترین رائفل ایجاد کرے گا‘ ولیم نے جیل حکام سے کاغذ‘ مختلف قسم کی پنسلیں اور ربڑ لئے اور کاغذ پر جدید ترین رائفل کے خاکے بنانا شروع کر دیئے۔ وہ دو سال تک مسلسل کام کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے جدید رائفل کا ڈیزائن تیار کر لیا۔ وہ یہ ڈیزائن لے کر جیل وارڈن ایچ ٹی پیپلز کے پاس گیا‘ جیل میں اسلحہ بنانے پر پابندی تھی لیکن وارڈن اس کا ڈیزائن دیکھ کر حیران رہ گیا‘ اسے محسوس ہوا ولیم میکینکل جینئس ہے اور اسے سپورٹ دینی چاہئے چنانچہ اس نے ولیم کو رائفل بنانے کی اجازت دے دی۔

ولیم نے جیل میں چھ رائفلوں کے ڈیزائن بنائے‘ یہ حیران کن رائفلیں تھیں‘ ولیم نے "شارٹ سٹروک پسٹن" بھی ایجاد کیا‘ یہ پسٹن آج ریوالورز سے لے کر بڑی بڑی توپوں تک میں استعمال ہوتا ہے‘ یہ پسٹن فائر کے بعد گولی کی طاقت سے قوت لیتا ہے اور اس قوت سے اگلی گولی کو چیمبر میں چڑھا دیتا ہے اور یوں فائرنگ کرنے والا ٹرائیگر دباتا

چلا جاتا ہے اور گولیاں بارش کی طرح برستی چلی جاتی ہیں۔ یہ شارٹ سٹروک پسٹن اسلحہ کی دنیا میں انقلاب تھا۔
یہ ایجاد جب جیل سے باہر پہنچی تو شمالی کیرولینا کے گورنر نے ولیم کی سزا معاف کر دی' وہ آٹھ سال بعد رائفلوں کے چھ نئے ڈیزائن اور شارٹ سٹروک پسٹن کے ساتھ جیل سے باہر نکلا تو امریکا کی بڑی بڑی اسلحہ ساز کمپنیوں کے نمائندے ہار لے کر گیٹ پر کھڑے تھے۔ ولیم باہر نکلا' اس نے چھوٹی سی ورک شاپ بنائی اور رائفلیں اور مشین گنیں ڈیزائن کرنا شروع کر دیں۔ وہ نیا اسلحہ بنا کر امریکن فوج کو بیچتا تھا۔ 1941ء میں امریکی فوج نے ہلکی پھلکی سیمی آٹو میٹک رائفل کا مقابلہ کروایا' فوج نے پورے امریکا کے ماہرین کو دعوت دی کہ وہ اپنے اپنے ڈیزائن مقابلے میں بھجوائیں اور جس شخص کا ڈیزائن منظور ہو گا اسے صدارتی اعزاز دیا جائے گا۔ ولیم نے بھی شارٹ سٹروک پسٹن لگا کر اپنا ایک ڈیزائن مقابلے میں بھجوا دیا۔ آپ قسمت کا کمال دیکھئے ولیم کا ڈیزائن پہلے نمبر پر آ گیا' اس ڈیزائن کا نام ایم ون کاربین تھا' اسلحہ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ کاربین سے واقف ہیں' یہ ایک ہلکی پھلکی مشین گن ہوتی ہے جو بارش کی طرح گولیاں برساتی ہے اور اپنے ہدف کو دائیں بائیں ہونے کا موقع نہیں دیتی۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا' امریکی فوج جنگ میں کود چکی تھی چنانچہ فوج نے ولیم کو کاربین بنانے کا سودا دے دیا' ولیم نے مختلف کمپنیوں سے چار سال میں 6 کروڑ کاربین بنوائیں' آپ اگر دوسری جنگ عظیم کی فلمیں اور تصویریں دیکھیں تو آپ کو تمام امریکی فوجیوں کے کندھوں پر کاربین لٹکتی دکھائی دے گی اور یہ کاربین ولیم کے ٹیلنٹ کا اعزاز تھی۔ ولیم بڑھاپے تک رائفلیں بناتا رہا' اس نے ساٹھ کے قریب رائفلیں بنائیں اور یہ رائفلیں آج تک دنیا میں بک رہی ہیں۔

آپ اگر ولیم کی زندگی کا تجزیہ کریں تو چند چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی' ایک ولیم کم پڑھا لکھا انسان تھا' وہ اگر مصیبت میں نہ پھنستا تو وہ گمنام زندگی گزار کر مر جاتا اور لوگ اس کا نام' اس کی شکل تک بھول جاتے۔ دو' یہ مصیبت اس میں چھپا ہوا ٹیلنٹ باہر لے آئی' ولیم کو معلوم ہوا قدرت نے اسے میکینکل جینئس بنایا ہے' وہ قدرتی طور پر رائفلوں کے سسٹم کو سمجھتا ہے اور وہ چند ماہ کی کوشش سے اسلحہ کی دنیا میں انقلاب لا سکتا ہے۔ تین' اس نے جیل میں اپنا وقت ضائع کرنے' خود کو اور ملک کے انصاف کے نظام کو کوسنے کی بجائے اپنا وقت تعمیری سرگرمی میں خرچ کرنے کا فیصلہ کیا' اس نے برے دنوں کو نعمت سمجھا اور اپنی یکسوئی اپنے ٹیلنٹ پر لگا دی اور یوں یہ رہتی دنیا تک مشہور ہو گیا۔ چار' یہ اگر گورنر یا چیف جسٹس سے اپیلیں کرتا رہتا تو چیف جسٹس یا گورنر نے کبھی اس کی اپیل پر غور نہیں کرنا تھا کیونکہ انہیں اس قسم کی سینکڑوں درخواستیں روزانہ ملتی ہیں اور یہ لوگ جیل میں محبوس لوگوں پر کبھی رحم نہیں کرتے لیکن ولیم اپنے ٹیلنٹ کے ذریعے گورنر تک پہنچا اور گورنر ولیم کی اپیل کے بغیر اس کی سزا معاف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چار' اس کہانی میں جیل کے وارڈن ایچ ٹی پیپلز کا کردار بڑا شاندار ہے' دنیا بھر کی جیلوں میں کسی قیدی کو اسلحہ بنانے کی اجازت نہیں دی جاتی لیکن وارڈن نے ولیم کے ٹیلنٹ کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ اسے خصوصی رعایت بھی دی اور یوں ایک جینئس دنیا کے سامنے آ گیا اور پانچ' ولیم نے دنیا کو برے دنوں سے نبٹنے کا ایک نیا فارمولا دے دیا' اس نے رائفلیں بنا کر ثابت کر دیا برے دن دراصل برے نہیں ہوتے' یہ قدرت کی طرف سے فرصت کے دن ہوتے ہیں اور کوئی بھی انسان اس فرصت کو استعمال کر کے اپنے آنے والے کل کو روشن کر سکتا ہے۔ ولیم کی زندگی میں آٹھ برے سال تھے' اس نے آٹھ سال [illegible] صورت جیل میں

گزارنے تھے' وہ سارا دن روتا رہتا' دیواروں کے ساتھ ٹکریں مارتا رہتا' جیل کے عملے کی منتیں کرتا رہتا یا پھر کورٹ میں روزانہ ایک اپیل دائر کرتا رہتا' یہ آٹھ سال آٹھ سال ہی رہتے چنانچہ اس نے یہ آٹھ سال تعمیری کام پر لگا دیئے اور جب اس کے برے دن ختم ہوئے تو وہ "مین آف امریکا" بن کر جیل سے نکلا۔

پاکستان کی جیلوں میں اس وقت لاکھوں لوگ بند ہیں' ان میں نصف سے زائد ولیم کی طرح بے گناہ ہیں' یہ لوگ صرف جسٹس سسٹم کی خامیوں کی وجہ سے سلاخوں کے پیچھے بند نہیں ہیں بلکہ یہ اپنے برے وقت کی وجہ سے قید میں ہیں۔ یہ لوگ بھی اگر ولیم کی تقلید کریں' یہ اپنے اپنے ٹیلنٹ کو پہچانیں' اس کے مثبت استعمال کا فیصلہ کریں' جیلوں کو لیبارٹری' سکول' کالج اور یونیورسٹی سمجھ لیں اور اس فرصت کو ولیم کی طرح یکسوئی میں بدل دیں تو یہ لوگ بھی کمال کر سکتے ہیں' اپنے برے وقت کو بہلا بھی سکتے ہیں اور انصاف فراہم کرنے والے اداروں کے دلوں میں اپنے لئے رحم بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اگر کچھ بھی نہ کریں تو بھی یہ جیل میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کر سکتے ہیں۔ یہ اپنی انگریزی "امپرو" کر سکتے ہیں' یہ ٹیبل ٹینس اور بیڈ منٹن کے چیمپئن بن سکتے ہیں اور یہ جیل میں ایل ایل بی کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ ہزاروں کام کر سکتے ہیں بس انہوں نے ولیم کی طرح خود کو یہ سمجھانا ہے انسان کیلئے قید بھی نعمت ہو سکتی ہے۔

جمہوریت کا انتقام
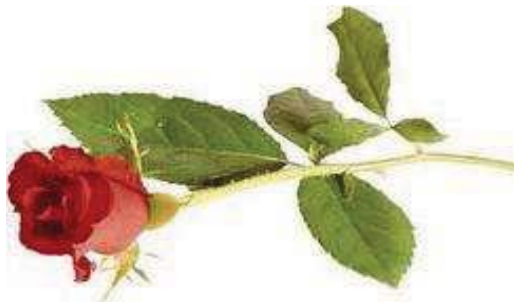
ڈاکٹر جمشید دستی عوامی عدالت سے پی ایچ ڈی کی ڈگری وصول کر چکے ہیں' مظفر گڑھ کے عوام نے 15 مئی 2010ء کو انہیں 53 ہزار 8 سو 17 ووٹ دے کر کامیاب قرار دے دیا اور یہ اب جعلی ڈگری کے ساتھ دوسری بار قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں چنانچہ حکومت کو چاہئے یہ اب فوراً انہیں مذہبی امور' تعلیم یا قانون کی وزارت پیش کر دے۔ ڈاکٹر اول بابر اعوان قانون اور پارلیمانی امور کی وزارت سے فراغت کے قریب ہیں' بابر اعوان کے بعد ڈاکٹر جمشید دستی اس وزارت کیلئے قابل ترین امیدوار ہیں' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو چاہئے یہ ان کی قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں فوراً قانون' انصاف اور پارلیمانی امور کا قلم دان سونپ دیں' اس سے جمشید دستی بھی خوش ہو جائیں گے اور عدالتوں میں بھی رونق لگ جائے گی۔ آپ تصور کیجئے ڈاکٹر جمشید دستی جب ان تمام ججوں کے باس بن جائیں گے جنہوں نے بھری عدالت میں انہیں سورۃ فاتحہ اور تیسرا کلمہ سنانے کا حکم دیا تھا تو کیا خوبصورت منظر ہو گا؟۔ آپ تصور کیجئے وہ ڈاکٹر جمشید دستی جو عدالت میں سورۃ فاتحہ اور تیسرا کلمہ نہیں سنا سکے تھے وہ سیکرٹری لاء اور اٹارنی جنرل کی تعیناتی کے احکامات جاری کریں گے اور عدالتوں کے آرڈرز پر عملدر آمد کی سمریوں پر دستخط کیا کریں گے تو ملک میں کیا شاندار ماحول پیدا ہو جائے گا۔ آپ تصور کیجئے جب نیب بھی ڈاکٹر جمشید دستی کے ماتحت ہو گا اور ڈاکٹر (اول) بابر اعوان کے بعد ڈاکٹر (ثانی) جمشید دستی صدر آصف علی زرداری کے سوئس کیسز کے سامنے سپیڈ بریکر بن کر بیٹھ جائیں گے تو ملک میں کتنی رونق لگ جائے گی اور آپ تصور کیجئے جب ڈاکٹر (اول) بابر اعوان کے برعکس ڈاکٹر ثانی جمشید دستی ٹیلی ویژن چینل پر عدلیہ اور اس کے فیصلوں کے خلاف کھل کر اپنا مافی الضمیر بیان کریں گے تو چینلز کا گدلا ماحول کتنا شفاف اور رنگین ہو جائے گا چنانچہ میری درخواست ہے وزیراعظم صاحب فوراً جمشید دستی کو قانون' انصاف اور پارلیمانی امور کا قلم دان سونپ دیں' اگر یہ فوراً ممکن نہ ہو تو بھی کم از کم انہیں مہرین انور راجہ کی جگہ قانون اور پارلیمانی امور کا وزیر مملکت بنا دیا جائے کیونکہ مہرین انور راجہ کی کارکردگی بڑی مایوس کن جا رہی ہے' ان کے منصب کا تقاضا تھا یہ صدر مملکت کی وفاداری میں عدلیہ کے قلعے پر تابڑ توڑ حملے کرتیں لیکن یہ اس کی بجائے میڈیا سے بچنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ وزیراعظم مہرین انور راجہ کو صمصام بخاری کی جگہ اطلاعات و نشریات کا منسٹر آف سٹیٹ بنا دیں اور قانون اور انصاف کے کھلے میدان میں جمشید دستی کو چھوڑ دیں کیونکہ صمصام بخاری نے پچھلے دنوں جعلی ڈگریوں کے خلاف بیان دے کر پارٹی اور حکومتی پالیسی کی خلاف ورزی کی ہے اور اس خلاف ورزی پر ان کی وزارت بھی تبدیل ہونی چاہئے اور انہیں میاں رضا ربانی کی طرح کھڈے لائن بھی لگا دینا چاہئے۔ صمصام بخاری کی وجہ سے پارٹی اور حکومت کی سبکی ہو رہی ہے' آج کے دور میں صمصام بخاری سے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک جیسی حماقت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی لیکن شائد گرمی اور لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ان کا سادات خون جوش مار گیا اور یہ اپنے ہی جابر سلطان کے خلاف کلمہ حق کہہ گئے لہٰذا انصاف کا تقاضا ہے انہیں اس کلمہ حق کی سزا دی جائے' انہیں جلد سے جلد کھڈے لائن لگا دیا جائے' اگر یہ ممکن نہ ہو تو سردار نبیل احمد گبول کی طرح صمصام بخاری کا حقہ پانی بند کر دیا جائے' حکومت آج تک سردار نبیل احمد گبول پر اپنے نام کے ساتھ سردار لگانے' عدلیہ کی حمایت کرنے' یہ بیان دینے

کہ میں اگر این آر او سے فائدہ لینے والے لوگوں میں شامل ہوتا تو میں آج استعفیٰ دے دیتا اور بابر اعوان کی شان میں گستاخی کے جرائم میں ٹیلی ویژن پروگراموں میں شرکت پر کئی بار پابندی لگا چکی ہے۔ حکومت کی طرف سے پابندیوں کا سلسلہ بھی جاری ہے اور صمصام بخاری کی طرح گبول صاحب کا کلمہ حق بھی چنانچہ یہ آئے دن ٹیلی ویژن چینلز سے غائب ہوتے رہتے ہیں۔ حکومت کو صمصام بخاری کو بھی کم از کم یہ سزا ضرور دینی چاہئے لیکن شائد صمصام بخاری کیلئے یہ سزا سزا ثابت نہ ہو کیونکہ یہ ٹیلی ویژن چینلز پر آنا زیادہ پسند بھی نہیں کرتے لہٰذا حکومت کو چاہئے یہ انہیں کھڈے لائن ہی لگا دیں۔

صدر آصف علی زرداری اگر ابھی تک ذوالفقار کھوسہ ہی کو بابر اعوان کی جگہ دینا چاہتے ہیں تو پھر میرا مشورہ ہے جمشید دستی کو وزیر تعلیم بنا دیا جائے۔ آپ تصور کیجئے وہ ڈاکٹر جمشید دستی جنہوں نے اسلامیات کی جعلی ڈگری پر الیکشن لڑا' ان کا کیس سپریم کورٹ میں پیش ہوا' انہوں نے عدالت کے سامنے غلطی تسلیم کی' قومی اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دیا' پارٹی نے انہیں دوبارہ ٹکٹ دیا' یہ مظفر گڑھ کے حلقے 178 سے دوبارہ جیتے' یہ قومی اسمبلی میں ایک بار پھر تشریف لے آئے اور حکومت نے انہیں تعلیم کا وفاقی وزیر بنا دیا اور یہ اس بار پورے ملک کیلئے تعلیم کی پالیسی بناتے ہیں تو ملک میں کیا شاندار ماحول ہو گا۔ آپ تصور کیجئے ڈاکٹر صاحب پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر کی میٹنگ کی صدارت بھی کر رہے ہیں اور انہیں معیار تعلیم کی پستی کی وجہ سے ڈانٹ بھی پلا رہے ہیں' یہ پنجاب یونیورسٹی' قائداعظم یونیورسٹی اور کراچی یونیورسٹی کے کانووکیشن میں گاؤن اور پھندے والی کیپ پہن کر نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو ڈگریاں بھی دیتے ہیں اور یہ تعلیم کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں اور تیسری دنیا میں تعلیم کے زوال کی وجوہات پر پیپر بھی پڑھتے ہیں تو تصور کیجئے دنیا بھر میں کتنی رونق لگ جائے گی' عالمی فورمز پر پاکستان کیلئے کتنی تالیاں بجائی جائیں گی اور پاکستان کے اندر بھی طلبہ وطالبات کا سر فخر سے کتنا بلند ہو جائے گا۔ آپ ذرا خوشی کے شاندار لمحات کا تصور کیجئے اور اس شاندار آئیڈیا پر مجھے اور حکومت دونوں کو داد دیجئے' حکومت ڈاکٹر جمشید دستی کو مذہبی امور کا وفاقی وزیر بھی بنا سکتی ہے۔ آپ تصور کیجئے وہ جمشید دستی جو کل تک ایم اے اسلامیات کی جعلی ڈگری کے الزام میں قومی اسمبلی کی نشست سے فارغ ہوئے تھے یہ اب حج کی نئی پالیسی بنا رہے ہیں' یہ لوگوں کو حج اور عمرے پر حجاز مقدس بھجوا رہے ہیں' یہ خادمین حرمین شریفین سے ملاقاتیں کر رہے ہیں' یہ امام کعبہ کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر اور توسیع پر مذاکرات کر رہے ہیں' یہ قرآن مجید کی اشاعت کے بارے میں قومی پالیسی بنا رہے ہیں اور یہ مختلف مذاہب کے درمیان بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے کے فارمولے بھی تجویز کر رہے ہیں تو آپ تصور کیجئے پاکستان میں مذہبی فضا کتنی خوبصورت اور شاندار ہو جائے گی' لوگ کتنے خوش ہوں گے اور ٹریول ایجنٹوں کو حج اور عمروں کے کتنے کوٹے ملیں گے اور حکومت جمشید دستی کو اسلام آباد میں بننے والی نئی ہائی کورٹ کا چیف جسٹس بھی لگا سکتی ہے' یہ چیف جسٹس اٹھارہویں ترمیم کا پہلا شاہکار ہو گا اور ڈاکٹر جمشید دستی اس شاہکار کیلئے کوالی فائی کرتے ہیں کیونکہ عوام نے انہیں دوسری بار منتخب کر کے ایوان میں بھجوایا ہے اور یہ پاکستان کی موجودہ اسمبلی کا پہلا جمہوری واقعہ ہے کہ ایک ایم این اے جعل سازی کے الزام میں مستعفی ہوا اور عوام نے اسے دوبارہ منتخب کر کے ایوان میں بھجوا دیا ہو لہٰذا یہ اس

عہدے لیے قربانیاں کرتے ہیں۔

حکومت کیلئے اگر یہ ممکن نہ ہو' اگر تمام عہدوں پر ڈاکٹر جمشید دستی سے زیادہ اہل لوگ تعینات ہوں تو پھر میرا مشورہ ہے حکومت ڈاکٹر جمشید دستی کیلئے ایک نئی وزارت تشکیل دے دے' اس وزارت کا نام جمہوریت یا عوام کی عدالت ہونا چاہئے اور ڈاکٹر جمشید دستی کو اس وزارت کا قلمدان سونپ دینا چاہئے تاکہ ہم دنیا کو یہ بتا سکیں ہمارے عوام اس جمہوریت کو "ڈیزرو" کرتے ہیں۔ ہمارے عوام کو ڈاکٹر جمشید دستی جیسے متحرک اور شاندار نمائندے درکار ہیں چنانچہ ان نمائندوں کی ڈگریاں جعلی ہوں یا یہ بینک فراڈ' رسہ گیری' بدمعاشی' جوابازی' بداخلاقی' زمینوں پر قبضے اور رشوت ستانی جیسے جرائم ہی میں کیوں نہ ملوث ہوں' عوام انہیں کندھوں پر بیٹھا کر ایوانوں میں پہنچا دیتے ہیں اور یہ لوگ اقتدار میں آ کر عوام کی اس طاقت کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ یہ "کلے ٹھونکنے" اور پلوں پر عوام کو مرغا بنا کر چھتربازی کا ٹھیک ٹھاک مظاہرہ کرتے ہیں' عوام چیختے رہتے ہیں' دہائیاں دیتے رہتے ہیں' ترلے' منتیں اور دعائیں کرتے رہتے ہیں لیکن جب ان لوگوں کے دوبارہ انتخابات کا وقت آتا ہے تو عوام اپنے زخموں پر ٹکور کر کے انہیں لوگوں کو دوبارہ منتخب کر دیتے ہیں اور یوں جمہوریت کے انتقام کا سلسلہ جاری رہتا ہے لہٰذا میری درخواست ہے حکومت ڈاکٹر جمشید دستی کو جمہوریت یا عوام کی عدالت کا وزیر بنا دے تاکہ عوام اس وزارت کے آئینے میں اپنا منہ دیکھ سکیں۔

راہنمائی
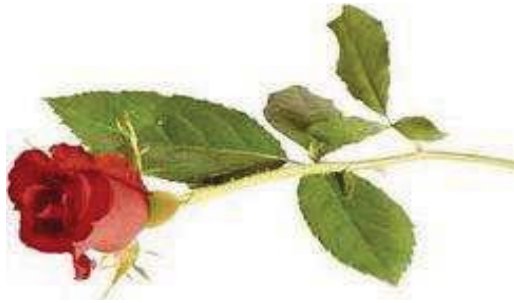
سردار محمد لطیف کھوسہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کیلئے وزیراعظم کے مشیر ہیں‘ ان کا عہدہ وفاقی وزیر کے برابر ہے اور یہ اس سے قبل اٹارنی جنرل آف پاکستان تھے لیکن پھر کسی نے ان پر 30 لاکھ روپے رشوت کاالزام لگادیا‘ سپریم کورٹ نے اس الزام کانوٹس لے لیااور یوں وزیراعظم کھوسہ صاحب کواٹارنی جنرل کے عہدے سے ہٹاکر اپنے سائے میں لے گئے اور کھوسہ صاحب اس دن سے انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ٹیلی کام سیکٹر میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں۔ لطیف کھوسہ صاحب نے چند دن قبل ایک دلچسپ بیان دیا‘ کھوسہ صاحب کا کہنا تھا ”شہید بے نظیر بھٹو قبر سے ہماری راہنمائی کر رہی ہیں“۔

کھوسہ صاحب کے اس بیان نے میرے سارے فکری مغالطے دور کر دیئے ہیں اور جس دن کھوسہ صاحب نے یہ بیان دیا میں اس دن سے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں کیونکہ میں اس سے پہلے یہ سمجھ رہا تھا سپریم کورٹ سے لے کر ایف بی آر تک میں جو کچھ ہو رہا ہے یہ حکومت کی اپنی ”راہنمائی“ کا کمال ہے لیکن محترم مشیر صاحب نے اسے مرحومہ بے نظیر بھٹو کے کھاتے میں ڈال کر تمام ناقدین کا منہ بند کر دیا اور یہ ثابت ہو گیا محترمہ بے نظیر بھٹو نے قبر سے راہنمائی فرمائی تھی جس کے نتیجے میں مارچ 2008ء میں بھوربن ڈکلیریشن کو سیاسی بیان اور وعدے قرآن و حدیث نہیں ہوتے قرار دیا گیا تھا اور اس کے بعد سیاسی اتحاد ٹوٹ گیا‘ یہ محترمہ نے راہنمائی فرمائی تھی کہ جب تک سو پیاز پورے نہ ہوں اس وقت تک عدلیہ کو بحال نہ کیا جائے۔ جسٹس ڈوگر کو آخری وقت تک چیف جسٹس کی کرسی پر بحال رکھنے کی راہنمائی بھی محترمہ ہی نے فرمائی تھی‘ جسٹس ڈوگر کی صاحبزادی کو 20 نمبر اضافی دینے کا حکم بھی محترمہ ہی نے جاری کیا تھا اور پھر اس غلطی کا تحفظ بھی محترمہ ہی کی راہنمائی سے ہو تا رہا۔ محترمہ ہی نے حکومت کو ہدایت کی تھی آئی ایس آئی کو وزارت داخلہ کے ماتحت کرنے کا حکم جاری کیا جائے اور پھر آدھ گھنٹے میں یہ حکم واپس لے لیا جائے‘ یہ محترمہ ہی کی ہدایت تھی کہ صدر آصف علی زرداری بھارت کے وزیر خارجہ پرناب مکھرجی کی جعلی ٹیلی فون کال سنیں۔ یہ بھی محترمہ نے کہا تھا آپ قومی اسمبلی کی قومی سلامتی کی قرارداد پر عمل نہ کریں‘ آپ امریکا کو ڈرون حملے روکنے کی ہدایت نہ کریں‘ یہ محترمہ ہی کی ہدایت تھی کہ آپ انڈیا کے مطالبے پر آئی ایس آئی کے ڈی جی کو بھارت بھجوانے کا حکم دے دیں اور بعدازاں یہ حکم واپس لے لیں‘ یہ بھی محترمہ ہی کی راہنمائی تھی کہ آپ این آر او توثیق کیلئے سٹینڈنگ کمیٹی میں لے جائیں‘ ایم کیو ایم اور دوسرے اتحادی اس کی مخالفت کریں تو آپ این آر او سے پیچھے ہٹ جائیں‘ آپ سپریم کورٹ میں لکھ کر دے دیں حکومت عدالت میں این آر او کے حق میں دلائل نہیں دے گی اور جب عدالت کا تفصیلی فیصلہ آجائے تو آپ اسے سازش قرار دے دیں‘ یہ بھی محترمہ ہی کی راہنمائی تھی کہ آپ سوئس کورٹس کے مقدمے کھولنے کیلئے سوئٹزرلینڈ کی حکومت کو خط نہ لکھیں‘ یہ بھی محترمہ ہی کا مشورہ ہے کہ آپ حکومت کو سپریم کورٹ کے سامنے کھڑا کر دیں‘ اٹارنی جنرل استعفیٰ دے دیں‘ سیکرٹری قانون آپ کا ساتھ چھوڑ دے اور وزیر قانون کو عدالت طلب کر لے لیکن آپ ڈٹے رہیں۔ یہ بھی محترمہ ہی کی تجویز تھی آپ اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے پارٹیوں کو الیکشن کی علت سے پاک کر دیں‘ آپ سیاسی جماعتوں کو گدی یا بادشاہت کی شکل دے دیں اور آپ

جوڈیشل میٹنگ اور پارلیمانی میٹنگ کے نام پر عدلیہ کو سیاستدانوں کے ماتحت بنانے کی کوششیں شروع کر دیں‘ یہ بھی محترمہ ہی کی راہنمائی تھی کہ آپ پارلیمنٹ کو سپریم کورٹ سے ٹکرا دیں اور پورے نظام کو خطرے کا نشانہ بنا دیں۔

مجھے کھوسہ صاحب کا یہ بیان پڑھ کر محسوس ہوا یہ بھی محترمہ ہی نے مشورہ دیا ہو گا کہ آپ خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے 54 جونیئر افسروں کو گریڈ بائیس دے دیں‘ یہ بھی محترمہ ہی نے کہا ہو گا کہ آپ ملک چلانے کیلئے پارٹی کی کور کمیٹی بنائیں اور وزیراعظم سے لے کر کابینہ تک ساری سرکاری مشینری اس کور کمیٹی کی ماتحت بنا دیں‘ یہ بھی محترمہ ہی کا مشورہ ہو گا کہ جمشید دستی کی ڈگری جعلی نکلنے کے بعد آپ اسے دوبارہ ٹکٹ دے دیں‘ وزیراعظم اس کے جلسے سے خطاب کریں اور ووٹروں کو سوا ارب روپے کا پیکیج دے دیں‘ ملک میں بلیک واٹر کے سینکڑوں کمانڈو کھلے عام پھرتے رہیں‘ سفارتخانوں میں اسلحہ کا ڈھیر لگ جائے‘ سفارتی گاڑیوں میں غیر متعلقہ لوگ گھوم رہے ہوں‘ سفارت کاروں کی گاڑیوں سے اسلحہ برآمد ہو اور حکومت اس پر نا صرف خاموش رہے بلکہ سفارت کاروں کی مدد بھی کرے۔ یہ بھی محترمہ ہی کی راہنمائی ہو گی کہ حیدر آباد ضلع کو پرانی شکل میں بحال کرنے کا اعلان کیا جائے اور اگلے ہی دن اس اعلان کی واپسی ہو جائے۔ رینٹل پاور پلانٹس اور اس میں بھاری کک بیک کی رپورٹس بھی محترمہ ہی کی ہدایت پر سامنے آئی ہوں گی۔ یہ مشورہ بھی محترمہ ہی نے دیا ہو گا کہ وفاقی وزراء کھلے عام اتنی کرپشن کریں کہ ٹرانس پیرنسی انٹر نیشنل بھی چیخ اٹھے‘ وفاقی وزیر راجہ پرویز اشرف سے 31 دسمبر 2009ء تک لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کا اعلان بھی محترمہ ہی نے کروایا ہو گا‘ ملک میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے لوڈ شیڈنگ اور بجلی کی قیمتوں میں 45 فیصد تک اضافہ بھی محترمہ ہی کروا رہی ہوں گی اور گیس اور پٹرول کے نرخ بھی محترمہ ہی کی راہنمائی سے بڑھ رہے ہوں گے۔ ملک میں مہنگائی میں 22 فیصد اضافہ بھی محترمہ ہی کی خواہش پر ہوا ہو گا‘ محترمہ ہی کی خواہش پر پاکستانی تاریخ کی سب سے بڑی کابینہ بنائی گئی اور وزراء کو بلٹ پروف گاڑیاں فراہم کی گئیں‘ یہ بھی محترمہ کی راہنمائی ہے کہ حکومت عافیہ صدیقی کی واپسی کیلئے کوئی خاص سرگرمی نہیں دکھا رہی۔ یہ بھی محترمہ کا مشورہ تھا کہ پارلیمنٹ اور عوام کی بھرپور مخالفت کے باوجود کیری لوگر بل کی شرائط مان لی جائیں اور یہ بھی محترمہ بے نظیر بھٹو قبر سے راہنمائی کر رہی ہوں گی کہ حکومت اس بجٹ میں ہر چیز پر دس فیصد ”ویٹ ٹیکس“ لگا دے تاکہ ملک میں ہر چیز سترہ فیصد مہنگی ہو جائے۔ اور یہ بھی محترمہ بے نظیر بھٹو ہی کا مشورہ ہو گا کہ آپ ملک کی معیشت کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی جیب میں ڈال دیں اور یہ نو آبادیاتی نظام کی طرح اس ملک کے عوام کا رہا سہا خون بھی چوس لیں اور یہ بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کی راہنمائی ہو گی کہ ملک میں مس مینجمنٹ‘ نان گورننس‘ لاقانونیت‘ بے روزگاری‘ مہنگائی اور بے چینی آسمان کو چھونے لگے اور حکومت سیکرٹریٹ تک محدود ہوتی چلی جائے۔

میں اعتراف کرتا ہوں میں لطیف کھوسہ صاحب کے اس بیان سے پہلے حکومت کو ان تمام سیاسی غلطیوں کا بانی سمجھتا تھا لیکن سردار صاحب نے پوری قوم کو اس مغالطے سے نکال دیا اور ہم اب چیزوں کا بہتر انداز سے مطالعہ کر سکیں گے۔ ہم پوری دنیا کو یہ بتا سکیں گے اس ملک پر روحوں کی حکمرانی ہے اور جہاں بھی کوئی خرابی ہے اسکے پیچھے

[illegible]
دے رہیں اور یہ ہمیں نئے ڈیم اور کوئلوں کی کانوں سے کوئلہ نکالنے سے بھی روک رہی ہیں اور جب تک ان مقدس روحوں کا سایہ موجود ہے ہماری راہنمائی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا اور ہم دنیا کو صدارتی معافیوں جیسے شاہکار پیش کرتے رہیں گے۔ میں لطیف کھوسہ صاحب کے اس سنہری بیان پر صرف یہی نعرہ لگا سکتا ہوں 'بی بی کی روح کھپے اور آپ کا اقتدار تا قیامت قائم رہے تاکہ قبروں کی راہنمائی جاری رہے۔

''ہو جائے گا''
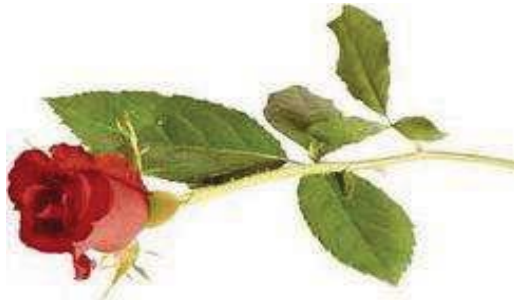
اعجاز قادری میرے آرکی ٹیکٹ دوست ہیں' قادری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے فن تعمیر کے ساتھ ساتھ بات کرنے اور بات سمجھانے کا آرٹ بھی دے رکھا ہے' آپ ان کی گفتگو کے دوران بور نہیں ہوتے' میری قادری صاحب سے پہلی ملاقات 2000ء میں کوئٹہ میں ہوئی تھی اور اس ملاقات کا ذریعہ اوریا مقبول جان بنے تھے' اوریا بھی اس وقت کوئٹہ میں تھے اور قادری ان کے ''بیسٹ فرینڈ'' تھے' قادری صاحب نے اوریا کا گھر بھی ڈیزائن کیا تھا' 2000ء سے 2010ء تک قادری کے ساتھ رفاقت کا لمبا سلسلہ جاری رہا' کوئٹہ میں غیر بلوچوں کی ٹارگٹ کلنگ شروع ہوئی تو میں قادری صاحب کو سمجھا بجھا کر اسلام آباد لے آیا اور آج کل قادری صاحب اسلام آباد میں خوبصورت گھر ڈیزائن کر رہے ہیں' یہ قد کاٹھ' شکل و شباہت اور حرکات و سکنات میں نوجوان دکھائی دیتے ہیں لیکن کام میں پورے پورے نوے سالہ بنگالی بابا ہیں' میں اس وقت 40 ہزار فٹ کی بلندی پر اسلام آباد سے پیرس کی طرف محو پرواز ہوں' میں پیرس میں ایک رات رک کر مخدوم عباس کے ساتھ مراکش چلا جاؤں گا' وہاں سے شاید ایک دو دن کیلئے نیپلز چلا جاؤں اور ہفتے بعد واپس پاکستان آ جاؤں گا انشاءاللہ' مجھے 40 ہزار فٹ کی بلندی پر اعجاز قادری کی ایک بات بڑی شدت سے یاد آ رہی ہے' میں نے چند دن قبل قادری سے کہا تھا ''یار قادری ہم لوگ جھوٹے وعدوں کے ماہر ہیں' آپ حکومت کے کسی وزیر کی تقریر سن لیں وہ ایک آدھ سال میں ملک کے سارے مسائل حل کرتا دکھائی دے گا' لوڈ شیڈنگ چند ماہ میں ختم ہو جائے گی' ڈیم چند سالوں میں بن جائیں گے' غربت کو دور ہوتے دیر نہیں لگے گی' چینی' آٹا' دالیں' چاول اور گھی اس سال سستا ہو جائے گا اور حتیٰ کہ پاکستان آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے چنگل سے بھی نکل جائے گا وغیرہ وغیرہ' تم حکومت کے ہر عہدیدار کے منہ پر یہ دعویٰ دیکھو گے' یہ لوگ حقیقت کو حقیقت کیوں نہیں کہتے' یہ قوم کو کیوں نہیں بتاتے مسائل گھمبیر ہیں اور ہمیں ان مسائل کے حل کیلئے جدوجہد کا ایک لمبا دور چاہیے'' قادری صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے ''ہم میں سے کسی کو سچ بولنے کی ٹریننگ ہی نہیں دی گئی' ہم سب لوگ لاروں' وعدوں اور دعوؤں کے پنگوڑے میں پل کر جوان ہوتے ہیں چنانچہ ہم جب بڑے ہوتے ہیں تو ہم سب راجہ پرویز اشرف سے لے کر حفیظ شیخ تک سب دوسروں کو لاروں کا لولی پاپ دینا شروع کر دیتے ہیں''۔ میں نے قادری کی طرف حیرت سے دیکھا' وہ بولے ''آپ بتایئے' آپ کے بچے جب آپ سے کوئی فرمائش کرتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں'' مجھے اس کا سوال سمجھ نہیں آیا' وہ بولے ''کیا آپ بچوں کی ہر فرمائش پر یہ نہیں کہتے بیٹا ہو جائے گا' ہاں بیٹا میں آپ کو یہ چیز لے دوں گا' ہاں میں پہنچ جاؤں گا وغیرہ وغیرہ'' وہ میری طرف دیکھنے لگے' میں نے دل ہی دل میں جمع تفریق کی اور ہاں میں سر ہلا دیا' وہ بولے ''اور آپ بچوں کے ساتھ کئے ہوئے وعدے کتنے فیصد پورے کرتے ہیں؟'' میں نے دوبارہ جمع تفریق کی اور جواب دیا ''ففٹی پرسنٹ'' وہ بولے ''آپ جب آدھے وعدے پورے کر سکتے ہیں تو آپ باقی آدھے وعدوں کے وقت انکار کیوں نہیں کرتے' آپ اپنے بچوں کو یہ حقیقت کیوں نہیں بتاتے آپ انہیں فلاں چیز لے کر دے سکتے ہیں اور فلاں نہیں' آپ فلاں کام کر سکتے ہیں اور فلاں نہیں اور آپ اس وقت تک گھر واپس نہیں پہنچ سکتے'' میں نے ایک لمحہ سوچا اور اس کے بعد جواب دیا ''میں بچوں کا دل نہیں توڑنا چاہتا اس لئے ان کے ساتھ جھوٹے وعدے

کر بیٹھتا ہوں" قادری صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے "اور یہ وہ خرابی ہے جس نے پورے ملک کو لاروں کی قوم بنا دیا' ہمارے بچے کیونکہ بچپن میں انکار سنتے ہی نہیں ہیں چنانچہ یہ بڑے ہو کر انکار کر پاتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں' یہ جھوٹ کو اپنی بقا بنا لیتے ہیں' میں نے اکثر والدین کو دیکھا ہے ان کا بچہ کسی دوسرے بچے کا کھلونا پسند کر بیٹھتا ہے تو ماں یا والد فوراً کہتا ہے بیٹا آپ فکر نہ کریں' میں آپ کو کل یہ لے دوں گا' بچہ یقین کر لیتا ہے لیکن پھر کل نہیں آتا' یہ کیا ہے' یہ غلط ٹریننگ ہے! ہمیں اپنے بچوں کو شروع سے یہ ٹریننگ دینی چاہیے کہ یہ چیز آپ کی نہیں ہے' یہ فلاں بچے کی ہے اور میں آپ کو یہ نہیں لے کر دے سکتا اور اس کی یہ یہ وجہ ہے' اس سے بچے کے دماغ میں آپ بھی ایک ایماندار' کھرے اور سچے شخص کے طور پر ڈیویلپ ہوں گے اور وہ بھی دوسروں کی چیزوں کے آسرے کے بغیر زندہ رہنا سیکھ لے گا' وہ زندگی میں خود لاروں میں آئے گا اور نہ ہی دوسروں کو لارے دے گا"۔

مجھے اعجاز قادری کا تھیسس اچھا لگا کیونکہ واقعی ہم بنیاد کا پتھر ہی غلط رکھ رہے ہیں' ہمارے بچے ہو جائے گا' کر دوں گا' فکر نہ کرو' مل جائے گا اور میں آ جاؤں گا قسم کی فضا میں آنکھ کھولتے ہیں' اسی فضا میں بڑے ہوتے ہیں اور پھر ان لاروں کے ساتھ عملی زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں چنانچہ جب ان میں سے کوئی بچہ موٹر مکینک بنتا ہے' یہ پلمبر' پینٹر' کار پینٹر' الیکٹریشن یا کک بن جاتا ہے تو یہ ہر گاہک کو کہتا ہے آپ گھنٹے بعد آ جائیے گا آپ کا کام مکمل ہو چکا ہو گا' گاہک گھنٹے بعد آتا ہے تو یہ دیکھ کر سر پیٹ لیتا ہے کہ استاد نے ابھی تک اس کے کام کو ہاتھ تک نہیں لگایا' آپ ہر روز تمام ہنر مندوں کی ورکشاپس پر اس قسم کے منظر دیکھتے ہوں گے کہ گاہک چیخ رہے ہیں اور استاد جی دانت نکال رہے ہیں' یہ کیا ہے؟ یہ جھوٹے وعدوں کی اس ٹریننگ کا نتیجہ ہے جو استاد نے شروع میں والدین سے لی تھی اور بعد ازاں اپنے استادوں سے لاروں کا آرٹ سیکھا' آپ کسی سرکاری دفتر بھی چلے جائیں' آپ کلرک سے لے کر سیکرٹری تک سب سے مل لیں' آپ کو ہر شخص ناممکن سے ناممکن کام پر بھی "کل آ جائیے آپ کا کام ہو جائے گا" کہتا دکھائی دے گا' آپ کل آئیں گے تو آپ کی فائل اسی طرح میز پر پڑی ہو گی' آپ بابو جی کو اپنی فائل اور ان کا وعدہ یاد کروائیں گے تو وہ چونک کر جواب دے گا "اوہاں' سوری میں مصروف ہو گیا تھا' آپ کل آ جائیے گا' آپ کا کام ہو جائے گا" صاحب جانتا ہو گا وہ آپ کا کام نہیں کر سکے گا لیکن اس میں آپ کو انکار کرنے کی اخلاقی جرأت نہیں ہو گی اور یوں آپ دفتر کے چکر لگا لگا کر تھک جائیں گے یہاں تک کہ صاحب کی ٹرانسفر ہو جائے گی اور اس کی جگہ کوئی نیا صاحب آ کر آپ کو کل آنے کا لارا دینا شروع کر دے گا' آپ کسی سیاستدان کے پاس چلے جائیں' آپ اس سے کوئی کام کہہ دیں وہ آپ کو ناں نہیں کہے گا' آپ اگر اس کے قریبی دوست ہیں تو وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ یہ کام نہیں کر سکے گا وہ آپ کیلئے بھاگ دوڑ شروع کر دے گا' ہمارے لاروں کی یہ حالت ہے کہ آپ کسی بانجھ عورت کو کسی ڈاکٹر' کسی طبیب حتیٰ کہ کسی پیر' فقیر یا عامل کے پاس لے جائیں تو وہ اس کی گود ہری کرنے کا وعدہ فرما دے گا' آپ میڈیکل رپورٹس کی بات کریں گے تو وہ آسمانی کتابوں سے ایسے ایسے حوالے سنائے گا کہ آپ کو یقین ہو جائے گا آپ ایک آدھ سال میں بچے کے باقاعدہ والد ہو جائیں گے' ہماری اس قومی علت کا نتیجہ ہے کہ ہمارے علماء کرام گناہ گاروں میں جنت کے پرمٹ تقسیم کر رہے ہیں' حاذق حکیم کینسر' ہیپاٹائٹس اور ایڈز کے مریضوں کو گل قند کھلا رہے ہیں اور جعلی پیر ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی امراض کے تعویز

جاری کر رہے ہیں اور لوگ [illegible] لوگوں میں ان کے جھانسوں میں آ جاتے ہیں کیوں؟ کیونکہ جھانسہ دینا اور جھانسے میں آ جانا ہم سب کی ٹریننگ ہے‘ ہم بچپن سے یہ کام ہوتا دیکھتے ہیں اور چالیس پچاس سال کی عمر تک پہنچ کر ہم اس کے ٹھیک ٹھاک ایکسپرٹ ہو جاتے ہیں‘ یہ ہماری اسی قومی ٹریننگ کا حصہ ہے کہ ہمارے حکمران‘ ہمارے سیاستدان اور ہمارے لیڈرز روزانہ پتوکی جیسے شہروں کو پیرس بنانے کا اعلان کرتے ہیں‘ یہ ویٹ زدہ بجٹ کو عوام دوست بجٹ قرار دیتے ہیں‘ یہ بغیر ہاتھ ہلائے لوڈ شیڈنگ کے خاتمے‘ ڈیمز اور سڑکوں کی تعمیر اور غربت کے خاتمے کے دعوے فرما دیتے ہیں۔ آپ آج سے پاکستان کے تمام مسائل کا مطالعہ کیجئے‘ آپ کو محسوس ہو گا یہ سب ہماری ’’ہو جائے گا‘‘ فلسفی کا نتیجہ ہے اور ہمارے بچوں سے لے کر وزیراعظم گیلانی تک سب لوگ یہی کر رہے ہیں ’’ہو جائے گا‘‘۔

اچھا مسلمان
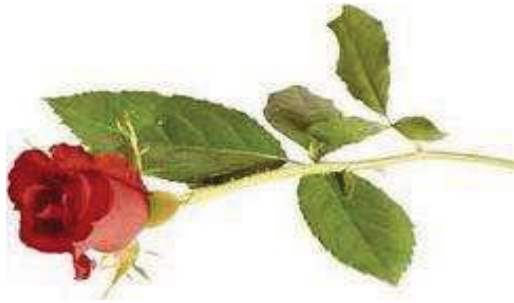
عاطف نیپلز میں بزنس کرتا ہے‘ یہ چودھری شبیر کے ساتھ فیصل آباد سے ٹیکسٹائل مصنوعات نیپلز منگواتا ہے اور یہ لوگ یہ مصنوعات پورے اٹلی میں سپلائی کرتے ہیں‘ عاطف کی زندگی کا ابتدائی حصہ دوبئی میں گزرا اور جوانی اب اٹلی میں گزر رہی ہے‘ میں اور مخدوم عباس اتوار کے دن نیپلز پہنچ گئے‘ اگلے دن جہانزیب نے بھی ناروے سے ہمیں جوائن کر لیا‘ یوں کورم پورا ہو گیا اور ہم نے یہ تین دن املفی‘ کیپری اور سورنتو میں پھر کر گزار دیئے‘ یہ میری کیپری اور سورنتو کی دوسری وزٹ تھی‘ یہ علاقے حقیقتاً قدرت کا شہکار ہیں‘ سورنتو مری جیسا پہاڑی علاقہ ہے‘ ویسی ہی بل کھاتی سڑکیں‘ سڑکوں کے کنارے پام کے درخت اور ان درختوں کے درمیان لکڑی کے خوبصورت گھر اور گھروں کے صحنوں میں چیری‘ لوکاٹ اور خوبانی کے درخت لیکن سورنتو کو سمندر مری سے مختلف بناتا ہے‘ یہ پہاڑی علاقہ تین اطراف سے سمندر میں گھرا ہے‘ آپ ڈرائیو کرتے ہیں اور دور گہرائی میں نیلا سمندر آپ کے ساتھ ساتھ چلتا اور آپ سمندر میں ہلکورے لیتی کشتیاں اور جہاز دیکھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں‘ سڑک کے دونوں اطراف ہوٹل ہیں‘ یہ ہوٹل پہاڑ کی ڈھلوان پر بنے ہیں اور ہوٹل کے مالکان نے پہاڑ کاٹ کر سیڑھیاں بنا رکھی ہیں اور یہ سیڑھیاں نیچے سمندر تک جاتی ہیں‘ سمندر کے کنارے ہوٹلوں نے پرائیویٹ بیچز بنا رکھی ہیں‘ ہم سورنتو سے املفی گئے‘ چودھری شبیر اور مخدوم عباس میرے ساتھ تھے‘ املفی دو ہزار سال پرانا قصبہ ہے‘ یہ قصبہ بھی سمندر کے کنارے پہاڑ پر بنا ہے‘ اس کی گلیاں چیونٹیوں کے بلوں کی طرح تنگ اور ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں‘ مکان تین تین‘ چار چار منزلہ ہیں اور سب کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہیں‘ یہ گلیاں اور یہ مکان قدیم دور میں مقامی لوگوں کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھتی تھیں‘ املفی کے لوگوں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر 20 چوبرجیاں بنا رکھی تھیں‘ ان چوبرجیوں میں چوبیس گھنٹے محافظ بیٹھے رہتے تھے‘ یہ دور سے دشمن کو دیکھ لیتے تھے اور چوبرجیوں پر آگ جلا کر عوام کو دشمنوں کے بارے میں اطلاع دے دیتے تھے‘ جس کے بعد یہ لوگ بچوں اور خواتین کو غاروں میں چھپا دیتے تھے اور دشمنوں کا گلیوں میں کھل کر مقابلہ کرتے تھے‘ یہ گلیاں اس قدر تنگ اور آنتوں کی طرح اتنی گنجلک ہیں کہ دشمن کیلئے ان سے بچ نکلنا ناممکن تھا‘ املفی کی ایک اور یادگار اس کا ہزار سال پرانا چرچ اور پہاڑ کی ڈھلوان پر قائم قدیم قبرستان ہے‘ یہ چرچ اپنی بلند سیڑھیوں اور چھت کے اندرونی حصوں میں سونے کے کام کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے‘ املفی کا قبرستان پہاڑ کی ڈھلوان پر بنا ہے اور مردوں کو اس تک پہنچانا خاصا مشکل ہوتا ہے لیکن اس قبرستان کا ”ویو“ اس قدر خوبصورت ہے کہ ہزاروں لوگ اس قبرستان میں تدفین کی خواہش میں مرنے کیلئے تیار رہتے ہیں‘ ہم نے املفی سے فیری لی اور ہم ایک ایسے پہاڑ کے دامن میں پہنچ گئے جس کے نیچے فیروزی رنگ کی جھیل تھی‘ ہم غار میں داخل ہوئے اور ہمارے سامنے فیروزی رنگ کا پانی ہلکورے لے رہا تھا‘ غار کے اندر کشتیوں کا بندوبست تھا‘ یہ اپنی نوعیت کا انوکھا تجربہ تھا آپ تصور کیجئے‘ آپ کے سر پر پہاڑ ہے‘ پہاڑ کی چھت سے برف کی سلاخوں کی طرح پتھروں کی شاخیں لٹک رہی ہیں اور ان سنگی شاخوں کے بالکل نیچے آپ کی کشتی فیروزی پانی میں تیر رہی ہے اور چپوؤں کی شڑاپ شڑاپ اور اطالوی ملاح کا گیت پانی کی سروں میں گھل رہا ہے‘ یہ واقعی ایک لائف ٹائم تجربہ تھا۔

ہم دوسرے دن کیپری چلے گئے‘میں پہلی بار 2005ء میں کیپری گیا تھا‘کیپری سمندر کے عین درمیان ایک بلند پہاڑ ہے اور اس پہاڑ پر پورا شہر آباد ہے‘یہ شہر یونانیوں اور رومن نے قبل مسیح میں آباد کیا تھا‘ملغی کی طرح کیپری میں بھی پہاڑ کی اترائیوں پر پتلی پتلی گلیاں ہیں اور ان گلیوں میں تین تین‘چار چار مرلے کے خوبصورت مکان ہیں‘کیپری کے ہر مکان کی بالکونی میں پھولوں کے گملے ہیں اور نوے فیصد مکانوں کے پچھواڑے میں دس بیس گز کا گارڈن بھی ہے اور ان گارڈنز میں انگوروں کی بیلیں اور زیتون کے درخت لہلہا رہے ہیں‘شہر کے اسی فیصد مکانوں کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی ہیں اور آپ اس شہر کی صفائی اور رومانوی فضا پر عاشق ہو جاتے ہیں اور میں ان عاشقوں میں سے ایک ہوں‘یہ دنیا کا واحد شہر ہے میں جس میں رہنا چاہتا ہوں‘عاطف‘مخدوم‘جہانزیب اور چودھری شبیر چاروں نے میری پسند پر پسندیدگی کی مہر لگا دی‘تیسرے دن میں‘جہانزیب اور مخدوم روم آ گئے‘ روم سے ہم نے میڈرڈ کی فلائٹ لی‘ہم نے میڈرڈ سے کرائے پر گاڑی لی اور ہم سپین کے جنوبی ساحل کی طرف چل پڑے‘ سپین کے شمال میں قرطبہ اور غرناطہ کے شہر واقع ہیں‘میں تین بار غرناطہ‘قرطبہ‘سی ویا اور مالگا جا چکا ہوں لیکن جنوبی ساحل کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا‘مخدوم نے بھی یہ علاقہ نہیں دیکھا تھا چنانچہ ہم اس طرف چل پڑے‘لاکرونیا جنوبی سپین بلکہ یورپ کا آخری شہر ہے‘اس کے بعد سمندر ہے اور یہ سمندر یورپ کو دوسری دنیا سے الگ کرتا ہے‘ہم نے رات وایا دولت میں بسر کی‘یہ میڈرڈ اور لاکرونیا کے درمیان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے‘لوگ مطمئن اور رواں زندگی کے عادی ہیں‘ پچھلے دس برسوں میں سپین میں بھاری پیمانے پر تعمیرات ہوئی ہیں‘تمام شہروں میں کھلی کھلی سڑکیں بن گئی ہیں‘شاپنگ سنٹر اور پارکس تعمیر ہو چکے ہیں اور ان تعمیرات نے سپین کو نئی ’’لک‘‘ دے دی ہے اور وایا دولت بھی اس نئی لک کا شہکار ہے‘ہم اس شہر میں گھومتے ہوئے ایک لمحے کیلئے بھول گئے ہم سپین کے کسی دور دراز قصبے میں پھر رہے ہیں‘لاکرونیا وایا دولت سے چار گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے‘یہ شہر سوات جتنی بلندی پر آباد ہے‘آپ میدانی علاقے سے پہاڑوں پر آتے ہیں‘پہاڑوں کی اترائی پر سرخ چھتوں کے مکان دکھائی دیتے ہیں اور یہ مکان چیڑھ کے جنگلوں میں آسمان کے ستاروں کی طرح چمکتے ہیں‘ پہاڑوں کی بلندی پر اچانک لاکرونیا آ جاتا ہے‘لاکرونیا کے تین اطراف میں سمندر ہے‘سمندر کے کنارے پر پہلی صدی عیسوی کا لائٹ ہاؤس ہے‘آپ اس لائٹ ہاؤس کی تین سو چونتیس سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچتے ہیں تو آپ کو دور دور شہر بکھرا ہوا دکھائی دیتا ہے‘یہ صاف شفاف فضا کا خوبصورت اور دھلا ہوا قصبہ ہے اور آپ اس قصبے میں پھرتے ہوئے خود کو کسی فیری ٹیل کا حصہ محسوس کرتے ہیں‘یہ شہر قدیم اور جدید کا خوبصورت شہکار بھی ہے‘شہر کا اندرونی حصہ قدیم لاکرونیا کو ظاہر کرتا ہے جس کی گلیاں چھوٹے چھوٹے پتھر جوڑ کر بنائی گئی ہیں اور تمام گھروں کے ماتھے پر تین تین فٹ کے کنٹر لیور ہیں‘یہ کنٹر لیورز جنوبی سپین کے تمام قصبوں‘شہروں اور دیہات میں نظر آتے ہیں اور ان کی وجہ سے پورے شہر میں سمڑی دکھائی دیتی ہے‘سپین کی حکومت نے ملک کی تمام قدیم عمارتوں‘پرانے قلعوں‘حویلیوں اور محلات کو ہوٹلز میں تبدیل کر دیا ہے‘یہ ان ہوٹلوں کو ’’پیرا ڈور‘‘ کہتے ہیں‘ ہم شام کو لاکرونیا سے تیس منٹ کی ڈرائیو کے فاصلے پر موجود قصبے ’’فرول‘‘ چلے گئے‘ہم نے فرول کے پیرا ڈور میں کمرے لے لئے‘یہ پیرا ڈور 1928ء کی عمارت میں قائم تھا اور فیرول کی پورٹ کے کنارے تھا‘عمارت شاہی محل جیسی تھی‘فرش ... [illegible]

[illegible]

گاہوں جیسے تھے جبکہ پیرا ڈور کی بالکونیوں سے سمندر اور پورٹ کی گودیاں دکھائی دیتی تھیں‘ فیرول بھی پرانا قصبہ تھا‘ وہی لاکرونیا اور وایا دولت جیسی گلیاں اور ان گلیوں میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مکان اور مکانوں کے سفید کنٹرلیور‘ میں نے جمعہ کے دن سنتیاگو سے پیرس کی فلائٹ لے لی جبکہ جہانزیب اور مخدوم عباس میڈرڈ چلے گئے‘ یہ دونوں ہفتے کی صبح ناروے اور سویڈن واپس چلے گئے اور میں اتوار کے دن پیرس سے واپس پاکستان آ گیا۔

میرے اس سفر کے دوران لاہور کا واقعہ پیش آ گیا‘ لاہور شہر میں 28 مئی جمعہ کے دن گڑھی شاہو اور ماڈل ٹاؤن میں احمدیوں کی عبادت گاہوں پر دہشتگردوں نے فائرنگ کی جس کے نتیجے میں 88 افراد ہلاک جبکہ 200 سے زائد زخمی ہو گئے۔ میں الحمد للہ سنی العقیدہ مسلمان ہوں‘ میں ختم نبوت پر ایمان بھی رکھتا ہوں اور عشق رسول ؐ بھی میری رگوں میں لہو کی طرح دوڑتا ہے لیکن اس کے باوجود ان واقعات پر میرا دل ملول تھا‘ ہمارے قانون کے مطابق احمدی غیر مسلم ہیں اور دین کے مطابق غیر مسلموں کی جان‘ مال‘ عزت اور عبادت گاہوں کی حفاظت مسلمانوں کا فرض ہوتا ہے‘ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی عبادت گاہوں پر حملے اور ان حملوں میں ان لوگوں کی ہلاکت افسوسناک ہے‘ ہمیں ماننا پڑے گا ہم غیر مسلموں کو قتل کر کے اسلام کی کوئی خاص خدمت نہیں کر رہے‘ ہم اگر سچے عاشق رسول ؐ ہیں اور اچھے مسلمان ہیں تو پھر ہمیں اسلام اور عشق رسول ؐ کے اصل تقاضوں پر پورا اترنا ہو گا‘ ہمیں تلوار کے جہاد سے قبل علم‘ عقل‘ ہنر‘ سائنس اور تجارت کی جنگ لڑنا ہو گی‘ ہمیں پہلے ان میدانوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی ثابت ہونا ہو گا اور اس کے بعد ہم خواہ پوری دنیا کو تباہ کر دیں ہم امریکا کی طرح حق بجانب ہوں گے‘ آپ امریکا کو دیکھ لیجئے‘ امریکا علم‘ ٹیکنالوجی اور اکانومی میں سپر پاور ہے چنانچہ آج یہ صرف شک کی بنیاد پر پورے عراق اور افغانستان کو تباہ کر دیتا ہے تو کوئی ٹیڑھی آنکھ سے اس کی طرف نہیں دیکھتا جبکہ امریکا کے مقابلے میں ہم لوگ جہالت‘ غربت‘ بے ایمانی اور بے عقلی میں ورلڈ چیمپئن ہیں لیکن پوری دنیا کو گولی‘ بم اور تلوار کے ذریعے فتح کرنا چاہتے ہیں‘ یہ کیسے ممکن ہے! ہمیں تلوار سے پہلے علم‘ سائنس اور تجارت میں بھی اپنی سچائی منوانا ہو گی اور اگر ہمارا عشق رسول ؐ سچا ہے تو پھر ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اس قول پر بھی عمل کرنا ہو گا جس میں رسول اللہ ﷺ اور اللہ نے علم کو مومن کی کھوئی ہوئی میراث قرار دیا تھا‘ ہم دوسروں کی عبادت گاہوں پر حملے کر کے دنیا میں اپنا مذاق تو اڑوا سکتے ہیں لیکن خود کو اچھا مسلمان ثابت نہیں کر سکتے اور یہ میری ان نو دنوں کی صحر انوا ٗ کا سبق تھا۔
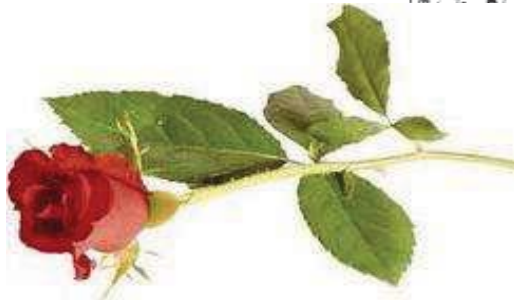
برطانوی معیار

ہم برطانیہ نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے سیاستدان برطانوی معیار پر پورے اتر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود کیا خواب دیکھنے پر پابندی ہے؟ کیا ہم آئیڈل ازم میں مبتلا نہیں ہو سکتے اور کیا ہم اچھائی‘ خوبی اور ایمانداری کی خواہش نہیں کر سکتے! یہ سوال ڈیوڈ لاز کے واقعے کا پہلا رد عمل تھا اور میں پچھلے تین دنوں سے اس رد عمل کا شکار ہوں۔ ڈیوڈ لاز لبرل ڈیموکریٹ ہے‘ یہ برطانیہ کے علاقے یوول سے رکن پارلیمنٹ منتخب ہوا‘ یہ مالیاتی امور کا ماہر ہے‘ اس نے اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز 2001ء میں کیا تھا‘ ڈیوڈ لاز نے 11 مئی 2010ء کو وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون کی حکومت بنانے میں اہم کردار ادا کیا‘ نئی حکومت بننے کے بعد لاز کو وزیر خزانہ بنا دیا گیا‘ اسے یہ قلم دان برطانیہ کا مالیاتی خسارہ کم کرنے کیلئے سونپا گیا تھا‘ برطانیہ کو اس وقت 156 بلین پاؤنڈ کے خسارے کا سامنا ہے‘ ماہرین کا خیال ہے اگر یہ خسارہ کم نہ ہوا تو برطانیہ شدید معاشی بحران کا شکار ہو جائے گا۔ ڈیوڈ لاز مالیاتی امور کا ماہر ہے اور ڈیوڈ کیمرون کا خیال تھا یہ برطانیہ کی معیشت کو اس نازک وقت میں سہارا دے سکتا ہے۔ ڈیوڈ لاز نے وزیر بننے کے بعد کام شروع کر دیا لیکن ابھی اسے وزیر خزانہ کا قلمدان سنبھالے دو ہی ہفتے ہوئے تھے کہ برطانیہ کے مشہور اخبار ڈیلی ٹیلی گراف نے ڈیوڈ لاز کے بارے میں ایک دلچسپ خبر شائع کر دی۔ خبر کے مطابق ڈیوڈ لاز نے پچھلے دور میں اپنے ایک دوست جیمز لنڈی کو فائدہ پہنچانے کیلئے اس کی ایک عمارت ساڑھے نو سو پونڈ ماہانہ کرائے پر لی تھی‘ ڈیوڈ لاز نے یہ عمارت قریباً چار سال اپنے قبضے میں رکھی اور سرکاری خزانے سے اس کا چالیس ہزار پاؤنڈ کرایہ ادا کیا‘ ڈیوڈ لاز اور جیمز لنڈی ہم جنس پرست ہیں اور یہ لوگ اس عمارت کو ہم جنس پرستی کیلئے استعمال کرتے رہے‘ برطانیہ میں ہم جنس پرستی کی اجازت ہے لہٰذا قانون اور آئین کو ڈیوڈ لاز کی اس ذاتی ”سرگرمی“ پر کوئی اعتراض نہیں تھا تاہم قانون کسی شخص کو اس نوعیت کی ذاتی سرگرمیوں کیلئے سرکاری خزانہ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ خبر 28 مئی کو شائع ہوئی جس کے بعد ڈیوڈ لاز نے نہ صرف قوم سے معافی مانگ لی بلکہ چالیس ہزار پاؤنڈز سرکاری خزانے میں جمع کرانے کا اعلان بھی کر دیا لیکن اس کے باوجود اس کے خلاف خبروں‘ تجزیوں اور تبصروں کا سلسلہ جاری رہا‘ ان تبصروں نے ڈیوڈ لاز کو بری طرح ”ہرٹ“ کیا یہاں تک کہ اس نے 29 مئی کو وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ مستعفی ہوتے وقت ڈیوڈ لاز کا کہنا تھا ”میرے لئے آخری چوبیس گھنٹے بہت مشکل تھے لیکن میں نے سوچا میں مالیاتی خسارہ کم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اور میری ہی ذات پر مالیاتی کرپشن کا دھبہ لگ گیا ہے‘ میں اب اس عظیم عہدے کیلئے ڈیزرو نہیں کرتا چنانچہ میں نے استعفیٰ دے دیا“ ڈیوڈ لاز کے اس فیصلے پر وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے اسے برطانیہ کا معزز ترین شخص قرار دیا۔

میں ڈیوڈ لاز کی اس غیر سیاسی‘ غیر پارلیمانی اور غیرہ سنجیدہ حرکت پر ”جیلسی“ محسوس کر رہا ہوں اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس قسم کا واقعہ ہمارے ملک یعنی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کیوں نہیں ہوتا‘ ہم دو سو سال تک انگریز کے غلام رہے ہیں‘ ہمارا انتظامی نظام باسٹھ سال گزرنے کے بعد بھی برطانوی ہے‘ ہم دنیا کے ان تمیں ممالک میں بھی شمار ہوتے ہیں جن کی سرکاری زبان انگریزی ہے‘ ہماری رولنگ ایلیٹ پاکستان کے ساتھ ساتھ برطانیہ کی شہری بھی ہے‘ محترمہ بے نظیر بھٹو‘ میاں نواز شریف‘ آصف علی زرداری اور رحمان ملک جلاوطنی کے

دوران برطانیہ میں مقیم رہے تھے‘ جنرل پرویز مشرف آج کل برطانیہ میں خود ساختہ جلاوطنی کے مزے لوٹ رہے ہیں‘ ہمارے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور صدر آصف علی زرداری کے بچے برطانیہ میں پڑھ رہے ہیں جبکہ سابق وزیراعظم شوکت عزیز‘ چودھری شجاعت حسین‘ چودھری پرویزالٰہی‘ الطاف حسین اور پاکستان کی تمام دیگر بڑی سیاسی قیادتیں بھی برطانیہ سے گہرے رہائشی‘ تجارتی اور ثقافتی روابط رکھتی ہیں‘ ہمارے لاکھوں شہری برطانیہ میں مقیم ہیں‘ ہمارے ہزاروں طالب علم برطانیہ کے تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہیں اور ہم ہر سال برطانیہ سے کروڑوں‘ اربوں پونڈ کی مصنوعات بھی امپورٹ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارے سیاسی نظام میں برطانیہ کی سیاسی غیرت‘ سیاسی اخلاقیات اور سیاسی جرات دور دور تک دکھائی نہیں دیتی‘ ہمارے ملک میں حالت یہ ہے کہ ہمارے صدر پر کرپشن کے چارجز ہیں‘ سپریم کورٹ این آر او کے خلاف فیصلہ دے چکی ہے اور پچھلے ساڑھے پانچ ماہ سے حکومت کو سوئس کیسز کھولنے کے احکامات جاری کر رہی ہے لیکن ہماری حکومت نہایت ڈھٹائی سے عدالت کے حکم پر عملدرآمد سے انکار کر رہی ہے‘ حکومت نے عدالت کو شکست دینے کیلئے استعفوں کو حکمت عملی بنالیا ہے‘ عدالت فیصلے پر عملدرآمد کا مطالبہ کرتی ہے تو کبھی اٹارنی جنرل مستعفی ہو جاتا ہے اور کبھی لاء سیکرٹری اور کبھی نیب کے اعلیٰ حکام استعفے دینا شروع کر دیتے ہیں۔ حکومت کی کوشش ہے یہ ان استعفوں کی آڑ میں سال دو سال نکال لے تاکہ اس دوران سوئٹزرلینڈ کے مقدموں کو ”ری اوپن“ کروانے کا وقت گزر جائے یا پھر جرائم کے شواہد دھو دیئے جائیں‘ ملک میں کرپشن کی یہ حالت ہے کہ لوگ اب ناجائز کاموں کیلئے باقاعدہ بولیاں دیتے ہیں‘ ٹرانس پیرنسی انٹرنیشنل نے کل کی رپورٹ میں صوبہ خیبر پختونخواہ کو کرپٹ ترین صوبہ قرار دے دیا اور موجودہ دور کو پچھلے دور کے مقابلے میں زیادہ کرپٹ ڈکلیئر کیا‘ وفاقی وزراء پر بھی کرپشن کے کیسے کیسے کیس نہیں بنے لیکن کیا کسی کے کانوں پر جوں رینگی؟۔ حالت یہ ہے پچھلے دنوں ایک نامور وفاقی وزیر نے ایک کارپوریشن کے ایم ڈی کو کراچی سے اسلام آباد بلوایا اور اسے ایک پرائیویٹ کمپنی کے ساتھ ایگریمنٹ کا حکم دیا‘ ایم ڈی نے عرض کیا ”جناب میں اندر ہو جاؤں گا‘ مہربانی فرمائیں“ وزیر صاحب نے قہقہہ لگا کر جواب دیا ”کچھ نہیں ہوتا‘ میں بھی دو سال جیل میں رہا ہوں لیکن آج وزیر ہوں‘ تم بھی ترقی کرو گے“ یہ ہے ہمارا اخلاقی معیار‘ اس فضا میں صرف دو وفاقی وزراء نے اخلاقی جرات کا مظاہرہ کیا‘ شوکت ترین وزیر خزانہ تھے‘ انہیں حکومت کی بعض پالیسیوں پر اختلافات تھا‘ یہ رینٹل پاور پلانٹس کے خلاف تھے‘ یہ بے جا سرکاری اخراجات پر بھی انگلی اٹھاتے تھے اور یہ امریکیوں کے سامنے جواب دہ ہونے کیلئے بھی تیار نہیں تھے‘ یہ برے حالات سے بچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو شوکت ترین نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ میں شوکت ترین کا بہت احترام کرتا تھا لیکن ان کی اس جرات کے بعد میں ان کا مداح ہو گیا ہوں۔

دوسرے وفاقی وزیر عبدالقیوم جتوئی ہیں‘ عبدالقیوم جتوئی اپنی سادگی کی وجہ سے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں ایشو بنتے رہتے ہیں لیکن یہ سرائیکی صوبے اور حلقہ این اے 180 میں اپنے امیدوار سمیع اللہ لغاری کی شکست کے بعد دوبارہ وفاقی کابینہ سے استعفیٰ دے چکے ہیں‘ ہم عبدالقیوم جتوئی کی سیاسی ناپختگی‘ سادگی اور ”کرپشن پاکستان پیپلز پارٹی کا حق ہے“ جیسے بیانات سے لاکھ اختلاف کریں لیکن جہاں تک ان کی سیاسی جرات اور فکری ایمانداری کا تعلق [illegible]

[illegible] جبکہ ان کے مقابلے میں ہماری کابینہ میں ایسے ایسے لوگ بیٹھے ہیں جن کے اکاؤنٹس سے سرکار کے اٹھائیس اٹھائیس کروڑ بر آمد ہوئے لیکن استعفیٰ تو رہا دور کی بات ان لوگوں نے معذرت تک کی زحمت گوارہ نہیں کی۔ ہماری کابینہ میں ایسے وزراء بھی شامل ہیں جن کے خلاف ساڑھے تین کروڑ روپے وصول کرنے اور سرکاری ملازموں سے تیس لاکھ روپے لینے کے تحریری الزامات موجود ہیں لیکن یہ لوگ آج بھی کابینہ میں بیٹھے ہیں۔ یہ درست ہے استعفے مسائل کا حل نہیں ہوتا اور ان سے ملک و قوم کی خاص خدمت نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود یہ معاشرے میں ایمانداری کے ٹوکن ہوتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں معاشرے کا ایمان کتنے فیصد زندہ ہے' سیاستدان معاشرے کے امام ہوتے ہیں اور اگر امام ہی کرپٹ' بے ایمان اور دھوکے باز ثابت ہو جائیں تو پھر آپ معاشرے کی اخلاقی قدروں کا اندازا خود لگا لیجئے۔ ہمارے اندر بھی ڈیوڈلاز جیسے لوگ ہونے چاہئیں جو کرپشن' اختیارات سے تجاوز اور لوٹ کھسوٹ کے چھوٹے بڑے واقعات پر استعفیٰ پیش کر دیں تاکہ معاشرہ ''فلٹر'' ہوتا رہے اور آنے والے دنوں میں صرف وہی لوگ سیاست کا رخ کریں جن کے دامن کرپشن کے داغوں سے پاک ہوں۔

میں جانتا ہوں ہم برطانیہ نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے سیاستدان برطانوی معیار پر پورے اترتے ہیں لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی خواب دیکھنے کو دل چاہتا ہے اور اندر سے دعا نکلتی ہے ہم اگر اسلامی معیار پر پورے نہیں اتر سکتے تو نہ اترین کم از کم ہم برطانوی معیار کے برابر تو آ جائیں۔ ہم حضرت عمر فاروقؓ یا حضرت علیؓ کی پیروی نہیں کر سکتے تو نہ کریں لیکن ہم جدید دنیا کے آج کے حکمرانوں کے معیار پر تو پورے اتر آئیں' ہم کسی جگہ تو اپنے ضمیر کے زندہ ہونے کا ثبوت پیش کریں' ہم کسی سٹیج پر تو سرخرو ہو جائیں۔

ٹیکس یورپی' مسائل پاکستانی
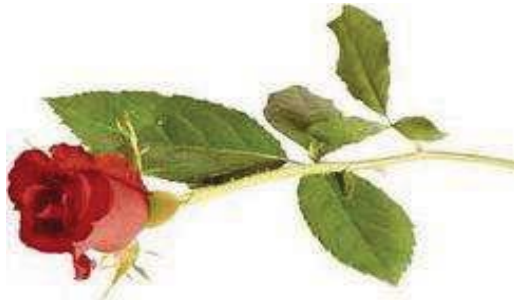
محمد بشیر فیصل آباد میں رکشہ چلاتا ہے اور یہ پچھلے دو ہفتوں سے شدید ڈپریشن کا شکار ہے۔اس کا خیال ہے ملک کے تمام شعبوں' تمام خرید و فروخت اور ہر قسم کی سروسز پر پندرہ فیصد ''ویٹ'' لگانے کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں' محمد بشیر کو اندیشہ ہے حکومت ویٹ کا اعلان بجٹ میں کر دے گی۔اگر حکومت نے پارلیمنٹ میں بدمزگی سے بچنے کیلئے بجٹ میں اعلان نہ کیا تو بجٹ کے فوراً بعد اس کا اعلان کر دیا جائے گا جس کے بعد یہ جولائی میں پورے ملک میں نافذ ہو جائیگا۔بشیر کا کہنا ہے ویٹ کا اعلان بجٹ کے دوران ہوتا ہے یا بجٹ کے بعد یہ اتنا اہم نہیں جتنا اہم ویٹ اور اس کے نتائج ہیں۔ بشیر کا کہنا ہے ویٹ کس قدر خوفناک چیز ہے اور اس کے نتائج کتنے سنگین ہوں گے اس کا اندازا آپ صرف دو' تین باتوں سے لگا لیجئے' آپ ہر ماہ بچوں کے سکول کی فیس دیتے ہیں' یکم جولائی سے اس فیس میں پندرہ فیصد اضافہ ہو جائے گا۔پاکستان میں ایک چیز چھ کمپنیوں' فیکٹروں یا اداروں سے ہو کر صارف تک پہنچتی ہے' یکم جولائی کے بعد ان چھ اداروں یا کمپنیوں پر ایک ترتیب سے پندرہ فیصد ویٹ لگنا شروع ہو جائے گا جس کے نتیجے میں وہ پراڈکٹ صارف تک پہنچنے سے پہلے بیس' بائیس فیصد مہنگی ہو چکی ہو گی۔ ملک کے تمام ڈاکٹر' انجینئر' الیکٹریشن' پلمبر' مکینک اور سروسز فراہم کرنے والے لوگوں کی فیس میں بھی پندرہ فیصد اضافہ ہو جائے گا۔ بجلی' گیس اور پٹرولیم مصنوعات پر بھی ویٹ لگے گا اور ان کے ذریعے پیدا ہونے والی مصنوعات کے نرخ بھی بڑھ جائیں گے چنانچہ الف سے لے کر ی تک ملک میں موجود تمام اشیاء یکدم مہنگی ہو جائیں گی اور یوں مہنگائی' بے روزگاری' لاقانونیت اور بیماری کے شکار لوگوں کی ہڈیاں بھی تڑخ جائیں گی۔ بشیر کا خیال ہے یکم جولائی کے بعد پورے ملک میں احتجاج' ہڑتالوں' پہیہ جام اور جلوسوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا' معاشرے کی رہی سہی رونق بھی ختم ہو جائے گی اور یوں محمد بشیر کے طبقے کے لوگ مزید مسائل کا شکار ہو جائیں گے۔بشیر جوں جوں آنے والے وقت کے بارے میں سوچتا ہے اس کی نیند اڑ جاتی ہے۔

حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں سے جب بھی ''ویٹ'' کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو یہ لوگ دو دلیلیں دیتے ہیں' ان کی پہلی دلیل امریکا اور یورپ ہوتی ہے' یہ لوگ بتاتے ہیں یہ ٹیکس امریکا اور یورپ سمیت تمام ترقی یافتہ ممالک میں لاگو ہے لیکن سوال یہ ہے کیا پاکستان یورپ اور امریکا ہے؟ کیا ہم پاکستان کو ترقی یافتہ ملک سمجھتے ہیں؟ آپ پاکستان اور یورپ کی معیشت کا تقابل کر کے دیکھ لیجئے' برطانیہ کا مالیاتی خسارہ 156 بلین پاؤنڈ ہے جبکہ ہمارا کل بجٹ پندرہ سے بیس بلین پاؤنڈ ہوتا ہے' یورپ اور امریکا سمیت پوری ترقی یافتہ دنیا کے کسی شہری کو ڈاکٹر کی فیس ادا کرنا پڑتی ہے اور نہ ہی یہ لوگ ذاتی جیب سے ادویات خریدتے ہیں' وہاں سردرد سے لے کر کینسر تک تمام امراض کا علاج مفت کیا جاتا ہے اور وزیراعظم سے لے کر چپڑاسی تک سب کو یکساں طبی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں' وہاں کسی والد یا والدہ کو اپنے بچے کی سکول فیس ادا نہیں کرنا پڑتی' وہاں یوٹیلٹی بلز (پانی' بجلی' گیس) صارف کی کل آمدنی کے دس فیصد کے برابر ہوتے ہیں' وہاں پہاڑ کی چوٹی سے لے کر سمندر کے ساحل تک حکومتیں تمام شہریوں کو سڑکیں' بجلی' گیس' پانی اور سیوریج فراہم کرتی ہیں' وہاں کے ہر شہری کو انشورنس کی سستی سہولت بھی حاصل ہوتی ہے' وہاں غریب شہری کو کچہریوں اور عدالتوں میں مفت قانونی امداد بھی ملتی ہے اور بے روزگار

اور معذور لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق ماہانہ خرچ بھی دیا جاتا ہے جبکہ ہمارے ملک میں ڈاکٹر سے لے کر دوا تک' پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک اور قانونی امداد سے لے کر ذاتی تحفظ تک عوام کو سب کچھ خود سہنا پڑتا ہے۔ ہم سب سر درد سے لے کر کینسر تک تمام امراض کا علاج ذاتی جیب سے کراتے ہیں' ہمارے یوٹیلٹی بلز اکثر ہماری ماہانہ آمدنی سے باہر نکل جاتے ہیں۔ بجلی' گیس' پانی اور سیوریج بھی اس ملک کے نوے فیصد لوگ خود اپنے گھروں تک لے کر جاتے ہیں' اس ملک میں کسی بے روزگار شخص کو گزارہ الاؤنس نہیں ملتا اگر کوئی بیوہ' معذور یا بے آسرا شخص وسیلہ حق جیسی سہولتوں سے فائدہ اٹھانا بھی چاہے تو اس رقم سے اس کی چائے کی پتی تک پوری نہیں ہوتی۔ امریکا اور یورپ کی کرنسی کی شرح بھی پاکستان سے کہیں بلند ہے' امریکی ڈالر' پاکستان کے 85 روپے کے برابر ہے اور یورو سو سے ایک سو دس روپے کے برابر۔ کرنسی کے اس تفاوت کے ساتھ ساتھ ہماری اور یورپی آمدنی میں بھی فرق ہے' یورپ میں بے ہنر مزدور کی تنخواہ پندرہ سو یورو کے قریب ہوتی ہے' ہم اسے اگر پاکستانی روپے میں تبدیل کر کے دیکھیں تو یہ ڈیڑھ لاکھ سے ایک لاکھ 65 ہزار روپے بنتے ہیں۔ امریکا میں بھی بے ہنر لوگ پندرہ سو ڈالر کماتے ہیں اور یہ رقم ایک لاکھ تیس ہزار روپے بنتی ہے جبکہ پاکستان میں حکومت نے یکم مئی سے کم ترین تنخواہ سات ہزار روپے طے کی تھی اور یہ تنخواہ بھی ملک میں کسی کو نہیں مل رہی۔ چھ ہزار روپے کو یورو یا ڈالرز میں تبدیل کیا جائے تو یہ 60 یورو یا 80 ڈالر بنتے ہیں۔ آپ اب خود فیصلہ کیجئے اگر امریکا کا غریب شہری ایک لاکھ تیس ہزار روپے کما کر پندرہ سولہ فیصد ویٹ دے دیتا ہے یا یورپ کے شہری ڈیڑھ پونے دو لاکھ روپے کما کر انیس' بیس یا اکیس فیصد "ویٹ" دیتے ہیں تو یہ ان کیلئے مشکل نہیں لیکن پاکستان کے وہ لوگ جن کی فی کس آمدنی دو ڈالر روزانہ ہے کیا ویٹ ان کیلئے زندگی مشکل نہیں بنا دے گا؟ کیا یہ پاکستان کے ان 45 فیصد لوگوں کے ساتھ ظلم نہیں ہو گا جو خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں یا پھر یہ ان ستر اسی فیصد لوگوں کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی جن کی گردنوں پر مہنگائی کا قافیہ پہلے ہی تنگ ہو چکا ہے۔ امریکا' یورپ اور پاکستان میں معاشی کلچر کا فرق بھی موجود ہے' وہاں لوگوں کی نوے فیصد آمدنی دستاویزی ہے جبکہ ہماری پچانوے فیصد معیشت غیر دستاویزی ہے چنانچہ یہاں اس قسم کے ٹیکسوں کا براہ راست شکار عام شہری بنتا ہے اور اس سے اس کی زندگی مشکلات کا شکار ہو جاتی ہے۔

پاکستان کی حکومت کا دوسرا دعویٰ آئی ایم ایف کی شرائط ہیں' یہ درست ہے ہم نے آئی ایم ایف سے قرضہ لیتے وقت آئی ایم ایف کو ویٹ لگانے کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن کیا اس سمجھوتے میں یہ بھی طے تھا کہ حکومت یکم جولائی 2010ء سے ویٹ لگائے گی؟ نہیں ہم نے آئی ایم ایف کو کوئی حتمی تاریخ نہیں دی تھی چنانچہ ہم اس ٹیکس کو بڑی آسانی سے معیشت کی بہتری کے ساتھ نتھی کر سکتے تھے۔ ہم آئی ایم ایف سے یہ کہہ سکتے تھے ہم ملک کی معیشت بہتر ہونے کے بعد "ویٹ" لگا دیں گے کیونکہ یہ ٹیکس اس وقت ظلم عظیم ہو گا جب اقوام متحدہ بھی یہ تسلیم کر رہی ہے کہ پاکستان میں آٹا بھی عام لوگوں کی دسترس سے باہر نکل چکا ہے اور آئی ایم ایف بھی یہ مان رہا ہے "پاکستان میں مہنگائی سے غربت بڑھ گئی ہے" ہم "ویٹ" کو ایک دو برسوں تک ٹال سکتے تھے' ہماری معیشت بہتر ہو جاتی' لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہونا شروع ہو جاتیں تو ہم ویٹ لگا دیتے لیکن حکومت نے انتظار کی

[illegible]
''ویٹ'' آنے والے دنوں میں حکومت کی تبدیلی کا باعث بن جائے گا کیونکہ جب پورے ملک میں ہڑتالیں ہوں گی اور سپریم کورٹ ان ہڑتالوں پر سوموٹو ایکشن لینے پر مجبور ہو جائے گی تو عدلیہ حکومت تصادم نقطہ انجام تک پہنچ جائے گا اور یوں گرتی دیوار کو آخری دھکا لگ جائے گا یہاں پر یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ پاکستان مسلم لیگ ن بالخصوص اپوزیشن لیڈر چودھری نثار علی ''ویٹ'' کی مخالفت کر رہے ہیں لیکن پنجاب میں پاکستان مسلم لیگ ن کی حکومت ''ویٹ'' پر اپنی رضامندی دے چکی ہے اور یہ سیاسی چالاکی بھی آگے چل کر پاکستان مسلم لیگ ن کی شہرت کو نقصان پہنچائے گی کیونکہ آپ بیک وقت موسیٰ اور فرعون دونوں کے لشکر میں شامل نہیں ہو سکتے۔
محمد بشیر کا خیال ہے حکومت اسے پاکستانی مسائل میں رکھ کر اس سے ٹیکس یورپی اور امریکی وصول کرنا چاہتی ہے اور یہ اس کی قبر میں کھونٹا ٹھوکنے کے مترادف ہو گا۔

تین ٹیلی فون کالز

''میں اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گی' میں حشر کے دن اللہ تعالیٰ کو کیا بتاؤں گی' میں اپنی ماں کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری نہیں کر سکی'' خاتون کی آواز ہچکیاں لے رہی تھی اور لفظوں میں آنسوؤں کی برسات تھی' میں اس کے آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گیا' ہم مسلمان لوگ خواہ کتنے ہی لبرل' ماڈرن اور پریکٹیکل کیوں نہ ہو جائیں' ہم رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس اور اللہ تعالیٰ کے نام پر فوراً مومن ہو جاتے ہیں' ہمارے اندر کا مسلمان فوراً انگڑائی لے کر جاگ جاتا ہے۔ میں نے زندگی میں نشے میں دھت بے شمار شرابیوں کو رسول اللہ ﷺ کے نام پر جام نیچے رکھتے اور خانہ کعبہ کی تصویر دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتے دیکھا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذات ایسی ذاتیں ہیں جہاں پہنچ کر سنگ دل سے سنگ دل مسلمان بھی موم ہو جاتا ہے اور یہ ہماری وہ عادت ہے جس سے مغرب انتہائی خائف ہے۔ اہل یورپ اور امریکا نے بے شمار سروے کروائے کہ مسلمان شراب پی لے گا' جوا کھیل لے گا' بداخلاقی کے انتہائی نچلے درجے تک چلا جائے گا' یہ فراڈ کر لے گا' ڈاکے ڈال لے گا' چوری بھی کر گزرے گا اور یہ غصے کے عالم میں دوسرے کو قتل بھی کر دے گا لیکن جونہی رسول اللہ ﷺ کا نام آئے گا یا اس کے سامنے اللہ کا نام لیا جائے گا تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جائے گی' اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے' اس کا حلق نمکین ہو جائے گا اور یہ دنیا بھر کی خرافات چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ دست وگریبان ہو جائے گا۔ اہل مغرب نے مسلمانوں کی اس عادت کی وجوہات تلاش کرنے کیلئے سینکڑوں سروے کرائے' انہوں نے ہزاروں نفسیات دانوں سے ریسرچ کروائی لیکن یہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ میں جذباتیت سے ''رواں'' ہوں' میں لوگوں کو روتے ہوئے دیکھ کر سائیڈ پر ہو جاتا ہوں' اس کی وجہ میری حساسیت ہے۔ میں دکھی لوگوں کو دیکھ کر مزید دکھی ہو جاتا ہوں اور یوں میری روٹین ڈسٹرب ہو جاتی ہے لیکن اس خاتون کی آواز نے میرے کان پکڑ لئے اور میں سکتے کے عالم میں اس کی بات سنتا چلا گیا۔ خاتون کا کہنا تھا وہ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی ہے' اس کی ضعیف والدہ حج کرنا چاہتی ہے' یہ پچھلے پانچ سال سے پیسے جمع کر رہی ہے لیکن جونہی پیسے پورے ہوتے ہیں تو حکومت حج کے ریٹ میں اضافہ کر دیتی ہے' اس نے اس سال بھی رقم جمع کر لی مگر حکومت نے اچانک حج کے نرخ 38 ہزار روپے (انیس فیصد) بڑھا دیئے۔ یہ خبر سننے کے بعد اس کی نیند اڑ گئی اور یہ پچھلے دو دنوں سے جھولی پھیلا کر حکمرانوں کو بددعائیں دے رہی ہے۔ اس کا کہنا تھا یہ حکومت اور اس حکومت کے حکمران برباد ہو جائیں گے کیونکہ یہ لوگ اس جیسی خواتین اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے درمیان حائل ہو رہے ہیں' یہ لوگوں سے رسول اللہ ﷺ کی چوکھٹ پر بیٹھنے اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے گناہوں سے توبہ کا حق چھین رہے ہیں' اللہ تعالیٰ انہیں اس جیسے مظلوم لوگوں کا دل دکھانے پر ضرور سزا دے گا۔ خاتون کا کہنا تھا ''میں اپنے اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گی' میں حشر کے دن اللہ تعالیٰ کو کیا بتاؤں گی کہ میں اپنی ماں کی آخری خواہش پوری نہیں کر سکی' میں اسے حج نہیں کرا سکی''۔ اس کا کہنا تھا اگر اس کی والدہ حج کے بغیر انتقال کر گئی تو یہ حج کی رقم وزیراعظم کو بھجوا دے گی اور ان سے درخواست کرے گی وہ یہ رقم بھی اپنے پروٹوکول پر خرچ کر لیں تاکہ بہترین جمہوریت کا انتقام مکمل ہو سکے' میں خاتون کی بات سن کر لرز گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ مظلوم اور غریبوں کے دل کے انتہائی قریب ہوتا ہے اور یہ ان جیسے

لوگوں کی کوئی آہ مسترد نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ وزیر مذہبی امور حامد سعید کاظمی' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور صدر آصف علی زرداری پر کرم کرے۔

مجھے اس ہفتے دوسری ٹیلی فون کال مانسہرہ سے موصول ہوئی' خالد محمود مانسہرہ شہر میں لکڑی کا کام کرتے ہیں' ان کا کہنا تھا انہوں نے 1991ء میں قسطوں پر سائیکل لی تھی' انہوں نے 95-1994ء میں ہاؤس بلڈنگ فنانس سے قرضہ لیا' قرضے کی قسط 720 روپے تھی اور وہ اس قدر غریب تھے کہ وہ یہ قسط بھی ادا نہیں کر پاتے تھے لیکن پھر 2000ء میں پرویز مشرف کا دور آیا اور خوشحالی نے ان کے دروازے پر دستک دی' ان کا کاروبار چل پڑا' انہوں نے اپنے بچوں کو اچھے سکولوں میں داخل کرایا' انہوں نے گاڑی بھی خرید لی اور یہ لوگ اچھا کھانے اور پہننے بھی لگے' یہ خوش حالی کی پیک پر پہنچ گئے' ان کو پھر بتایا گیا پرویز مشرف آمر ہے' اس نے لوگوں کے بنیادی جمہوری حقوق غصب کر رکھے ہیں' یہ امریکا کا ایجنٹ ہے اور یہ اسلام اور پاکستان کے خلاف ہے' وغیرہ وغیرہ۔ یہ سن کر یہ بھی دوسروں کے ساتھ گو مشرف گو کے نعرے لگانے لگے' صدر پرویز مشرف 2008ء میں رخصت ہو گیا اور اس کی جگہ جمہوری حکومت اور جمہوری لیڈرز نے لے لی لیکن اس جمہوری حکومت کا کیا نتیجہ نکلا' خالد کا کاروبار سو سے دس پر آ گیا' اس کے گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال دیئے' اس کا چولہا ٹھنڈا ہو گیا' بچوں کی فیس ادا کرنا مشکل ہو گیا' گاڑی میں پٹرول ڈالنا ممکن نہیں رہا' بجلی کے بل دینا محال ہو گیا' بازار سے آٹا' دالیں' چاول' گھی اور گوشت خریدنا ممکن نہ رہا اور آج یہ 1991ء کی پوزیشن پر واپس چلا گیا۔ خالد صاحب کا کہنا تھا "مجھے اس جمہوریت نے کیا دیا' کیا میں اس جمہوریت کو اس آمریت سے اچھا قرار دوں جس نے میرے اور میرے بچوں کے منہ سے نوالا چھین لیا' جس کی مہربانی سے میرے گھر میں غربت نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور میں گھر کے برتن بیچ کر بچوں کی فیس دے رہا ہوں"۔ خالد صاحب کا کہنا تھا "میری نظر میں دنیا کی بدترین آمریت اس نوعیت کی بہترین جمہوریت سے ہزار درجے اچھی ہے' آپ یہ جمہوریت اپنے پاس رکھئے اور مجھے میری آمریت واپس کر دیجئے کیونکہ اس سے کم از کم میرے بچوں کو تعلیم تو مل رہی تھی' اس سے میرا چولہا تو جل رہا تھا" میں خالد صاحب کے استدلال سے بھی لرز گیا' میں نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو سڑکوں پر گو مشرف گو کے نعرے لگاتے دیکھا تھا' میں نے لوگوں کو میاں نواز شریف' محترمہ بے نظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کا استقبال کرتے بھی دیکھا تھا اور میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے بدترین جمہوریت کو بہترین آمریت سے ہزار درجے بہتر سمجھتا ہوں اور میں ببانگ دہل کہتا ہوں آج کے روشن دور میں پرویز مشرف جیسے لوگوں کا مطلب معاشرتی خودکشی ہو گا لیکن خالد محمود جیسے لوگ اس طرح نہیں سوچ رہے' غریب اور بھوکا شخص ہمیشہ پیٹ سے سوچتا ہے اور پیٹ کی حقیقت یہ ہے کہ اسے آج کے مقابلے میں پرویز مشرف کے دور میں زیادہ سہولت ملی تھی' ہماری جمہوریت بدقسمتی سے اپنے وہ رنگ عوام کو نہیں دکھا سکی جس کی اس سے توقع کی جا رہی تھی۔

اور تیسری اور آخری فون کال دوسری دونوں سے مختلف بھی تھی اور دلچسپ بھی۔ یہ کراچی کے کوئی صاحب تھے جن کا کہنا تھا پاکستان میں چار فوجی آمر آئے' جنرل ایوب خان' جنرل یحییٰ خان' جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف۔ یہ چاروں آمر پورے پروٹوکول کے ساتھ ایوان اقتدار اور ایوان زیست سے رخصت ہوئے' ایوب

خان اور پرویز مشرف کو گارڈ آف آنر دے کر ایوان صدر سے بھجوایا گیا ایوب خان نے آخری زندگی اپنے لان میں ایزی چیئر پر جھول کر گزاری' پرویز مشرف آج کل لندن میں آرام دہ زندگی گزار رہے ہیں' رہ گئے یحییٰ خان اور ضیاء الحق تو یحییٰ خان کو پاکستان کے پرچم میں لپیٹ کر باقاعدہ سلامی دے کر دفن کیا گیا تھا' جنرل ضیاء الحق کو پوری قوم نے اشک بار آنکھوں کے ساتھ رخصت کیا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں جمہوری لیڈرز کا انجام برا ہوا۔ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو پھانسی لگے' ان کا جنازہ دو درجن قیدیوں نے پڑھا اور انہیں رات کے اندھیرے میں دفن کر دیا گیا' محترمہ بے نظیر بھٹو کی دو حکومتیں ذلت آمیز طریقے سے ختم کی گئیں اور ان کے حق میں کوئی شخص باہر نہیں آیا۔ میاں نواز شریف 12 اکتوبر 1999ء کو خاندان سمیت گرفتار ہوئے' جلاوطن ہوئے اور ان کی پارٹی کے نوے فیصد لوگوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو افسوسناک موت کا شکار ہوئیں اور سنٹرل ہسپتال راولپنڈی میں ان کے سر پر دوپٹہ تک نہیں تھا اور انہیں سخت کھردرے اور گندے چبوترے پر لٹا کر طبی امداد دینے کی کوشش کی جا رہی تھی اور چودھری شجاعت حسین اور پرویز الٰہی آج اس ملک میں عزت بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔ کیوں؟ ان صاحب کا کہنا تھا پاکستان میں آمروں کا انجام اتنا اچھا کیوں ہوتا ہے اور جمہوری لیڈر عبرت ناک انجام کا شکار کیوں ہوتے ہیں؟ اس کی واحد وجہ غریب عوام ہیں' آمروں کے دور میں عام آدمی کی زندگی اچھی گزرتی رہی' ان کے دکھ کم ہو گئے تھے' انہیں روٹی اور دوا ملتی رہی تھی جبکہ جمہوری ادوار اور جمہوری لیڈروں نے عام آدمی سے روٹی' کپڑا اور مکان چھین لیا تھا' ان کے دور میں غریبوں کے دکھ بڑھ گئے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے غریبوں کی دعاؤں کے صدقے آمروں کی آخرت ٹھنڈی کر دی جبکہ مفلوک الحال لوگوں کی بددعاؤں کی وجہ سے جمہوری لیڈر افسوسناک انجام کا شکار ہوئے۔ ان کا کہنا تھا آج کے حکمرانوں نے بھی اگر یہ نقطہ نہ سمجھا' انہوں نے غریبوں کے آنسو نہ پونچھے تو ان کا انجام بھی یہی ہو گا۔

اس کے ساتھ ہی تیسری کال ڈراپ ہو گئی۔

ویٹ کی جگہ جی ایس ٹی

آپ اگر سننے کے عادی ہوں تو آپ کو تمام سوال سقراط محسوس ہوتے ہیں' آپ کو ان سوالوں میں تاریخ' مذہب' ثقافت' ادب' دکھ' درد اور آزمائش ہر چیز ریشم کی بھیگی ہوئی قمیص سے جھانکتے ہوئے بدن کی طرح صاف دکھائی دیتی ہے۔اسی قسم کا سقراطی سوال کل مجھ سے راولپنڈی کے ایک شخص نے پوچھا تھا' یہ شخص راولپنڈی' اسلام آباد میں ٹیکسی چلاتا ہے' یہ شخص تیرہ سال کی عمر میں سکول سے براہ راست زندگی کی یونیورسٹی میں داخل ہو گیا اور یہ اب تک اس شہر کی سڑکوں' گلیوں' بازاروں اور اندھے کوچوں سے پی ایچ ڈی کی کئی ڈگریاں لے چکا ہے' اس نے مجھ سے پوچھا "حکومت ہر سال بجٹ کیوں پیش کرتی ہے" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا' وہ بولا "نہیں ویسے ہی پوچھ رہا ہوں' یہ اگر قومی راز ہے تو آپ بے شک جواب نہ دیں" میں شرمندہ ہو گیا اور میں نے اس سے کہا "نہیں' مجھے آپ کا سوال عجیب محسوس ہوا تھا' مجھ سے آج تک کسی نے یہ سوال نہیں پوچھا شائد اس لئے ذرا سا پریشان ہو گیا تھا" وہ بولا "میں نے یہ سوال اس لئے کیا کہ یہ ملک کی واحد سرکاری سرگرمی ہے جو ہمیشہ وقت پر ہوتی ہے اور اگر حکومت ختم بھی ہو رہی ہو تو بھی حکومت دشمن عناصر بجٹ پاس ہونے تک اپنی سرگرمیاں ملتوی کر دیتے ہیں' اپوزیشن جلسے جلوس اور تقریریں بند کر دیتی ہے' سپریم کورٹ بجٹ سے بعد کی تاریخیں دینے لگتی ہے اور دہشت گرد بھی بجٹ کے نزدیک پہنچ کر اپنی سرگرمیاں معطل کر دیتے ہیں' ایسا کیوں ہے؟ بجٹ اتنا اہم کیوں ہوتا ہے" میں نے مسکرا کر جواب دیا "اس لئے کہ ریاست کا سارا دارومدار بجٹ پر ہوتا ہے' اگر بجٹ پاس نہیں ہوگا تو ملازموں کو تنخواہیں کیسے ملیں گی' سرکاری ادارے کام کیسے کریں گے' ٹیکسوں اور محصولات کا نظام کیسے چلے گا' درآمدات اور برآمدات میں توازن کیسے ہوگا اور ترقیاتی منصوبے پایہ تکمیل تک کیسے پہنچیں گے؟" اس نے میری بات سن کر قہقہہ لگایا اور بولا "اس کا یہ مطلب ہوا بجٹ کے ساتھ حکومت' اپوزیشن' بیوروکریسی' فوج' بزنس مینوں' صنعت کاروں اور جاگیرداروں کا مشترکہ مفاد وابستہ ہے چنانچہ جب بھی بجٹ کا وقت آتا ہے تو یہ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں" میں نے انکار میں سر ہلایا اور پورے یقین سے کہا "نہیں' اس میں عوام کا مفاد بھی شامل ہوتا ہے" اس نے دوبارہ قہقہہ لگایا اور بولا "نہیں جناب نہیں' ہمارے ملک میں ہر وہ منصوبہ جس میں عوام کا مفاد شامل ہو وہ کبھی وقت پر پورا نہیں ہوتا' پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ' پاکستان کی بیوروکریسی' پاکستان کی اپوزیشن اور پاکستان کی حکومت اس کیلئے کبھی اکٹھی نہیں ہوتی' یہ بڑے لوگوں کا مشترکہ مفاد ہے جس کی وجہ سے یہ لوگ بجٹ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور جونہی بجٹ سیشن ختم ہوتا ہے یہ لوگ دوبارہ تلواریں لے کر میدان میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں"۔یہ بات تھی بہت "کروڈ" لیکن اس سے مکمل انکار ممکن نہیں' ہمارے ملک کی 62 سالہ تاریخ سے ثابت ہے پاکستان میں اصل حکومت مفادات کے ہاتھ میں ہے' مفادات ہوں تو وہ جنرل پرویز مشرف جو کبھی محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کے بارے میں کہتے تھے "یہ دونوں میری نعش سے گزر کر پاکستان آئیں گے" وہ نا صرف میاں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ گفتگو پر مجبور ہو جاتے ہیں بلکہ یہ محترمہ اور زرداری صاحب کے ساتھ این آر او بھی کر گزرتے ہیں' مفاد ہو تو جمہوری حکومت آمر جنرل پرویز مشرف کو گارڈ آف آنر دے کر لندن بھجوا دیتی ہے اور اسے وہاں سابق

صدر کی ساری سہولتیں ملتی ہیں اور اگر مفاد ہو تو پرویز مشرف کے مشیر اور وزیر حفیظ شیخ کو پاکستان پیپلز پارٹی اپنا وزیر خزانہ بھی بنا لیتی ہے اور ان سے 11-2010ء کا بجٹ بھی پیش کرا دیا جاتا ہے۔ ہم تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے اس ملک میں اگر بجٹ میں حکمران طبقے کا مفاد نہ ہو تو یہ کبھی وقت پر پیش ہو اور نہ ہی اسے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر تمام پارٹیوں اور سٹیک ہولڈرز کی حمایت حاصل ہو۔

آپ مفاد کا کمال ملاحظہ کیجئے وزیر خزانہ حفیظ شیخ نے بجٹ سے ایک دن بعد پریس کانفرنس کی اور اس میں فرمایا ''ہم جی ایس ٹی (جنرل سیلز ٹیکس) کم کر کے پندرہ فیصد پر لائیں گے'' وزیر خزانہ کا یہ دعویٰ بظاہر شاندار اور دلفریب محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ انتہائی خوفناک بلکہ سفاکانہ ہے' یہ کس طرح خوفناک ہے اس طرف جانے سے پہلے میں آپ کو تھوڑا سا پس منظر میں لے جانا چاہتا ہوں' پاکستان میں جی ایس ٹی 1990ء میں لگا تھا' بجٹ 11-2010ء پیش ہونے سے پہلے اس کی شرح سولہ فیصد تھی' ہماری سابق حکومتیں ملکی تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض اہم شعبوں کو جی ایس ٹی سے مستثنٰی کرتی رہی تھیں مثلاً پاکستان میں ہر قسم کی مشینری کی درآمد پر جی ایس ٹی نہیں لیا جاتا' اس کی وجہ صنعتوں کو سہولت فراہم کرنا ہے' ملک میں ظاہر ہے مشینری آئے گی تو صنعتیں لگیں گی' لوگوں کو روزگار ملے گا' مقامی منڈیوں میں مقامی مصنوعات آئیں گی اور اس سے درآمدات میں کمی ہو گی چنانچہ حکومتوں نے مشینری کی درآمد پر جی ایس ٹی زیرو کر دیا تھا' حکومت تیل اور گیس تلاش کرنے والی مشینری پر بھی جی ایس ٹی وصول نہیں کر رہی تھی' حکومت بجلی پیدا کرنے والی مشینری اور آلات پر بھی جی ایس ٹی نہیں لے رہی تھی اور حکومت خوراک اور ادویات کے خام میٹریل کی درآمد پر بھی جی ایس ٹی وصول نہیں کرتی تھی چنانچہ اگر دیکھا جائے تو ملک میں ساٹھ فیصد جی ایس ٹی معاف تھا' موجودہ بجٹ میں حکومت نے جی ایس ٹی کی شرح سولہ فیصد سے سترہ فیصد کر دی اور ویٹ کے ایشو کو اکتوبر تک موخر کر دیا جس سے یوں محسوس ہوتا ہے اصل کھیل ستمبر' اکتوبر میں شروع ہو گا۔ ''ویٹ'' پچھلے دو مہینوں میں متنازعہ ہو گیا تھا' صوبوں نے بھی اس کے نفاذ پر عدم اعتماد کر دیا تھا چنانچہ حکومت نے جی ایس ٹی کو ''ویٹ'' کا نام دینے کا فیصلہ کیا' حکومت اب ستمبر کے آخر میں تین اہم اعلان کرے گی۔ ایک' یہ ''ویٹ'' کو ناقابل نفاذ قرار دے دے گی۔ دو' یہ جی ایس ٹی کی شرح سترہ سے کم کر کے پندرہ فیصد کر دے گی اور تیسرا اور اہم اعلان حکومت جی ایس ٹی کے تمام استثنیٰ واپس لے لے گی جس کے بعد ہر قسم کی مشینری' تیل اور گیس کی تلاش کے آلات اور بجلی پیدا کرنے والی مشینوں پر بھی پندرہ فیصد جی ایس ٹی لگ جائے گا اور اس کے تین خوفناک نتائج نکلیں گے۔ اول' صنعتوں کیلئے منگوائی جانے والی مشینری' آلات' فاضل پرزے اور خام مال پندرہ فیصد مہنگا ہو جائے گا۔ دوم' تیل اور گیس کی تلاش کے منصوبے التواء کا شکار ہو جائیں گے اور سوم' بجلی کی پیداوار کو بھی دھچکا لگے گا اور یوں ملک میں مہنگائی کی نئی لہر آ جائے گی' صنعتیں زوال کا شکار ہوں گی اور بے روزگاری میں اضافہ ہو جائے گا۔

ہم اب یہ جائزہ لیتے ہیں حکومت ایسا کیوں کر رہی ہے؟ اس کی واحد وجہ انٹر نیشنل ایجنڈا ہے' دنیا پاکستان کو کنزیومر سوسائٹی بنانا چاہتی ہے' پاکستان اٹھارہ کروڑ صارفین کی ایک بڑی منڈی ہے' دنیا کی ملٹی نیشنل کمپنیاں اس منڈی پر نظریں گاڑھ کر بیٹھی ہیں اور مقامی صنعت ان عزائم کے راستے میں بڑی رکاوٹ ہے' عالمی طاقتیں ہماری مقامی

انڈسٹری کو بند کرنا چاہتی ہیں اور حفیظ شیخ جہاں ان کمپنیوں کے راستے کے کانٹے چن رہے ہیں وہاں یہ
پرویز مشرف کے دور کو پاکستان کی گولڈن ایج ثابت کرنے کی کوشش بھی کر رہے ہیں کیونکہ یہ پرویز مشرف کے پرانے دوست ہیں۔ میری یہ بات غلط ہے تو آپ حفیظ شیخ سے دو سوال پوچھ لیں۔ کیا یہ غلط ہے سی بی آر نے بجٹ سے پہلے لوکل انڈسٹری کے تحفظ کیلئے 114 تجاویز پیش کی تھیں لیکن وزیر خزانہ نے ان میں سے صرف گیارہ کی منظوری دی اور 103 تجاویز مسترد کر دیں' کیوں؟ اور دو' پاکستان انجینئرنگ ڈویلپمنٹ بورڈ کو یہ پیغام کیوں دیا گیا ''آپ صنعت اور صنعت کاروں کی بجائے صارف پر توجہ دیں'' مجھے یہ دونوں حقائق پاکستان انجینئرنگ ڈویلپمنٹ بورڈ کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے بتائے' اس کا کہنا تھا'' بورڈ کا کام ملک میں نئی اور پرانی صنعتوں کو سپورٹ دینا ہے تا کہ ملک میں روزگار اور پیداوار میں اضافہ ہو لیکن موجودہ وزیر خزانہ کا کہنا ہے صارف کو مصنوعات ملنی چاہئیں خواہ مقامی انڈسٹری بند ہی کیوں نہ ہو جائے'' ان صاحب کا کہنا تھا'' ہم نے ان سے عرض کیا'' جناب اس سے بے روزگاری میں اضافہ ہو جائے گا'' وزیر خزانہ نے جواب دیا'' فکر نہ کریں' قدرت انسان کو روزگار کے نئے نئے مواقع فراہم کرتی رہتی ہے'' اور یہ وہ ایجنڈا ہے جو اس بجٹ کے ذریعے طے ہوگا' یہ واقعی مفادات کا معاملہ ہے ورنہ شائد ملک کی کوئی حکومت بجٹ پیش نہ کرتی۔
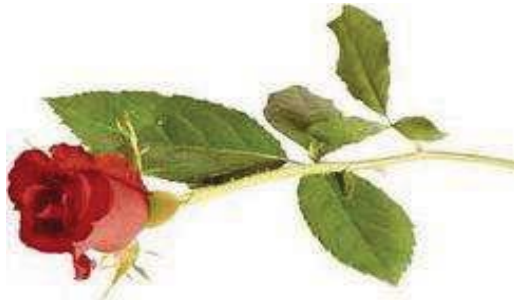
آمر کامیاب اور جمہوری لیڈر ناکام کیوں ہوتے ہیں

ڈاکٹر محمد اسلم میرے قریبی دوست ہیں' ڈاکٹر صاحب پولٹری کے بزنس سے وابستہ ہیں' یہ راولپنڈی کے پولیس سیفٹی کمیشن کے چیئر مین بھی رہے ہیں اور یہ دنیا بھر کے دورے اور بڑی بڑی بزنس ایمپائرز کا مطالعہ بھی کر چکے ہیں' صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز کے دور میں میری ڈاکٹر اسلم کے ساتھ بڑی خوفناک بحث ہوتی تھی' میں اس دور کو معاشی' سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے ناکام ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا جبکہ ڈاکٹر اسلم کا کہنا تھا یہ پاکستان کی تاریخ کا خوشحال ترین دور ہے' اس دور میں ملک میں ترقی بھی ہوئی' خوشحالی بھی آئی اور لوگوں کے معیار زندگی میں اضافہ بھی ہوا' میں اس بحث کے دوران اکثر ڈاکٹر صاحب سے لڑ پڑتا تھا اور ہماری بحث جب ''پوائنٹ آف نو ریٹرن'' تک پہنچ جاتی تھی تو ڈاکٹر صاحب آخر میں دو باتیں کہتے تھے' ایک' پرویز مشرف اور شوکت عزیز کاریگر لوگ ہیں' یہ دنیا بھر سے مانگ تانگ کر' عالمی طاقتوں کی منت کر کے یا پھر کسی نہ کسی بڑے سرمایہ کار کو جھانسہ دے کر ہر مہینے ایک دو بلین ڈالر لے آتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں معاشی رونق ہو جاتی ہے' جس دن یہ لوگ چلے جائیں گے اس دن یہ رونق ماند پڑ جائے گی اور دو' سرمایہ لوگ اور ان کی ٹیم کتنی اچھی ہے اس کا اندازہ تمہیں ان کے جانے کے بعد ہو گا۔ میں ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کے یہ دونوں دعوے مسترد کر دیتا تھا لیکن میں آج جمہوری حکومت کے اڑھائی سال پورے ہونے اور تیسرا بجٹ آنے کے بعد ڈاکٹر محمد اسلم سے اتفاق پر مجبور ہو گیا ہوں' میں تسلیم کرتا ہوں ڈاکٹر اسلم کا دعویٰ درست تھا اور میرے خیالات غلط۔ میں یہاں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ میں شوکت عزیز اور پرویز مشرف کی وکالت نہیں کر رہا' یہ لوگ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود آمر تھے اور آج کے دور میں کسی بھی شخص کیلئے آمر اور آمریت کی حمایت گناہ کا درجہ رکھتی ہے مگر اس کے باوجود ہمیں تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے اور ہمیں پاکستان کی 64ویں سالگرہ سے پہلے پہلے اس نتیجے پر پہنچ جانا چاہیے کہ تیسری دنیا کے ممالک میں آمروں کی پرفارمنس جمہوری ادوار کے مقابلے میں بہتر کیوں ہوتی ہے' ہمارے سیاستدانوں کو فیلڈ مارشل ایوب خان سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک تمام ڈکٹیٹروں کے ادوار کی غیر جانبدارانہ سٹڈی کرانی چاہیے اور ان کے ادوار کی خوبیوں کو اپنی گورننس کا حصہ بنا لینا چاہیے کیونکہ ہم اب صرف اور صرف اسی طریقے سے ملک کو مسائل کے گرداب سے نکال سکتے ہیں۔

ہم اور ہمارے جمہوری حکمران تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے پاکستان کے تین آمرانہ ادوار میں ملک میں بے تحاشا ترقی ہوئی تھی' ہمارے تمام بڑے ڈیمز' اسی فیصد نہری نظام' سڑکیں' ریل نیٹ ورک' ٹیلی ویژن' بینکس' کارپوریشنز اور زرعی اصلاحات ڈکٹیٹر ایوب خان کے دور کا کمال تھا' ایوب خان کے بعد بھٹو کا دور آیا تو ہماری صنعتی گروتھ کا پہیہ الٹا ہو گیا اور آٹے' گھی اور چینی کیلئے ڈپوؤں کے سامنے عوام کی قطاریں لگ گئیں' جنرل ضیاء الحق کا دور آیا تو ملک میں امریکی ڈالر بھی آئے' لوگوں کی راشن کارڈز سے بھی جان چھوٹی' صنعتی ترقی کا دور بھی شروع ہوا' نئی یونیورسٹیاں' سکول اور کالج بھی بنے' سڑکیں' پل اور بینک بھی بنے اور پاکستان ایٹمی طاقت بھی بنا۔ جنرل ضیاء الحق کے بعد بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کی دو' دو حکومتیں آئیں اور ان ادوار میں ملک ڈیفالٹ کے قریب پہنچ گیا' ترقیاتی منصوبے رک گئے' ملک پر اقتصادی پابندیاں نافذ ہو گئیں' کرپشن کا بازار گرم ہو گیا

اور قریباً گیارہ برسوں میں چار حکومتیں ختم ہوئیں' جنرل پرویز مشرف کے دور میں ایک بار پھر ملکی معیشت نے انگڑائی لی' فارن کرنسی ریزرو میں اضافہ ہوا' پورے ملک میں ترقیاتی سرگرمیاں شروع ہوئیں اور لوگوں کو روزگار اور روٹی ملنے لگی' آج مورخین اس نقطے پر متفق ہیں کہ پرویز مشرف اگر پانچ غلطیاں نہ کرتے تو شاید ان کا دور آج جاری رہتا' یہ پاکستان مسلم لیگ ق نہ بناتے' یہ نیب کو "سیاسی بھرتیوں" کیلئے استعمال نہ کرتے' یہ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو نہ نکالتے' یہ لال مسجد پر حملہ نہ کرتے اور یہ این آر او جاری نہ کرتے تو یہ آج لندن میں جلاوطنی نہ کاٹ رہے ہوتے۔ پرویز مشرف کے بعد جمہوری دور آیا تو اس دور نے ہر چیز الٹ پلٹ دی اور آج ملک اور ملکی معیشت کی حالت سب کے سامنے ہے' لوگ سر پر ہاتھ رکھ کر جمہوریت کو بددعائیں دے رہے ہیں' جمہوریت کا یہ بحران ہمارے آج کا سب سے بڑا سوال ہے اور ہم نے اگر آگے بڑھنا ہے تو ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہوگا۔

دنیا بھر کے آمر کامیاب کیوں ہوتے ہیں اور آمریت کے بعد آنے والے جمہوری حکمران ناکام کیوں ہو جاتے ہیں یہ جاننے کیلئے ہمیں کسی بڑی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں' اس کی وجہ آمروں کی سیاسی کمزوری ہوتی ہے' آمروں کی کوئی سیاسی جماعت نہیں ہوتی چنانچہ یہ لوگ طاقت اور صلاحیت دونوں کو اپنی پارٹی بنا لیتے ہیں' یہ ان تمام اداروں کو اپنے "ہولڈ" میں لے لیتے ہیں جن سے ان کے اقتدار کو خطرہ ہو سکتا ہے' یہ فوج میں اپنے ہم خیال جرنیلوں کو ترقی دیتے ہیں' پولیس چیف اپنے ہم پیالہ لوگوں کو تعینات کر دیتے ہیں اور چیف سیکرٹریز' گورنرز اور وزرائے اعلیٰ اپنی مرضی کے لوگوں کو لگا دیتے ہیں اور یہ لوگ چن چن کر باصلاحیت' ماہر اور تجربہ کار لوگوں کو کابینہ میں لے لیتے ہیں' یہ باصلاحیت اور تجربہ کار لوگ تمام وزارتوں کا ماحول عملی بنا دیتے ہیں جس سے وزارتوں کے اندر کام ہوتا دکھائی دیتا ہے' یہ لوگ بین الاقوامی وژن اور عالمی رابطے کے حامل بھی ہوتے ہیں لہٰذا یہ ملٹی نیشنل کمپنیوں' غیر سرمایہ کاروں اور مالدار قوموں کو ملک میں سرمایہ کاری پر راغب کر لیتے ہیں اور یوں ملک میں معاشی بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے' آمر کے طاقتور ساتھی اس کے اقتدار کو درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں' یہ جمہوری جماعتوں' ان کی لیڈر شپ اور ان کے کارکنوں کو دبائے رکھتے ہیں اور یوں آمر کا اقتدار آگے بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن اس کے بعد جب جمہوری حکومتیں آتی ہیں تو یہ ان دونوں صلاحیتوں سے محروم ہوتی ہیں' یہ تجربہ کار اور باصلاحیت ٹیکنو کریٹس کی بجائے اپنے ذاتی وفاداروں' پارٹی کے پرانے کارکنوں' جاگیرداروں اور سرمایہ کاروں کو کابینہ میں شامل کر لیتی ہیں' یہ لوگ مفادات کی لمبی چوڑی فہرست لے کر وزارت کی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں' ان لوگوں کو اپنی وزارت اور اس کے ذیلی اداروں کے بارے میں بھی زیادہ معلومات نہیں ہوتیں چنانچہ یہ لوگ جلد ہی بیوروکریسی اور ذاتی مفاد کے ہاتھوں یرغمال بن جاتے ہیں' ان لوگوں پر آمروں کے مقابلے میں کرپشن اور اقربا پروری کے الزامات بھی جلد لگ جاتے ہیں جس سے ان کی کریڈیبلٹی متاثر ہوتی ہے اور یوں طاقت کے اصل محور ان کے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں' آئی ایس آئی حکومت کے کنٹرول سے باہر ہو جاتی ہے' وزارت خارجہ اور داخلہ دونوں جی ایچ کیو کا ذیلی ادارہ بن جاتی ہیں' عدالتیں آزادی کے ساتھ ساتھ خود مختاری کے راستے پر گامزن ہو جاتی ہیں' صوبائی خود مختاری کا جن بوتل سے باہر آ جاتا ہے' وزارت خزانہ وزیراعظم کی بجائے آئی ایم ایف کو رپورٹ کرنے لگتی ہے' سینٹ' ایم این اے اور ایم پی اے سوداگر بن جاتے ہیں اور تاجر'

کی بجائے ان ایم این ایز کو سپورٹ کرنے لگتی ہے' غیر ایم این اے اور ایم پی اے وزیر بن جاتے ہیں اور تاجر صنعت کار اور سرمایہ دار کارٹل بنا کر عوام کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں اور یوں جمہوری حکومت دواڑھائی سال میں پوری طرح ناکام ہو جاتی ہے۔

آپ کو یہ ساری صورتحال اس وقت بھی صاف دکھائی دے رہی ہے' سوال یہ ہے ہم اس گمبھیر صورتحال سے باہر کیسے نکل سکتے ہیں' اس کے صرف اور صرف دو حل ہیں۔ ایک' ہماری سیاسی جماعتیں وفاداری کی بجائے صلاحیت کو اپنا معیار بنا لیں' یہ ذاتی ملازموں کو وزارتیں دینے کی بجائے امریکا اور یورپ کی طرح صرف باصلاحیت ٹیکنوکریٹس کو وزیر بنائیں' اعلیٰ عہدے شفاف دامن' ایماندار' سچے' غیر جانبدار اور کھرے لوگوں کے حوالے کریں۔ سیاسی قیادت ایمانداری اور شفافیت کو اپنا سیاسی ایمان بنا لے۔ آپ خود سوچیے جب وزیراعظم اور صدر کا ماضی صاف' وژن کلیئر اور نیت شفاف ہو گی تو کیا کسی شخص میں ان کے حکم کے خلاف دم مارنے کی جرات ہو گی؟ نہیں ہو گی چنانچہ سچ تو یہ ہے کہ ہم اس ملک کو اب صاف ستھری' شفاف اور باصلاحیت قیادت کے ذریعے ہی بحران سے نکال سکتے ہیں اور ہم نے اگر آمروں کی یہ اچھی تکنیکس استعمال نہ کیں تو یقین کیجئے ایک دو سال بعد اس ملک کے لوگ سڑکوں پر نکل آئیں گے اور دنیا کی تاریخ میں پہلی بار عام لوگ مارشل کا مطالبہ کریں گے اور اگر یہ وقت آ گیا تو پھر آپ سوچیے اس ملک میں جمہوریت کا مستقبل کیا ہو گا؟

''پوزیشن ذرا ٹائیٹ ہے''
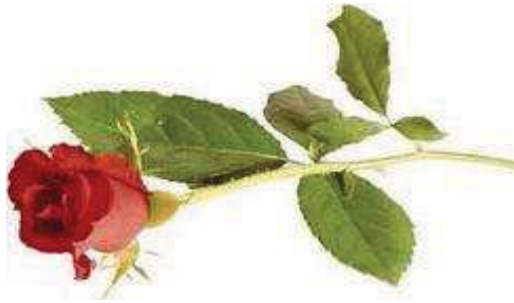
ہمیں 11-2010ء کے بجٹ کا تجزیہ کرنے کیلئے سیٹھ اور ملازم کا تعلق سمجھنا ہو گا' ہمارے سیٹھوں کے پاس اپنی گاڑیوں' فیکٹریوں' غیر ملکی دوروں' بڑی بڑی پارٹیوں' دوست احباب کے تحائف اور بیوروکریٹس اور سیاستدانوں کی خدمت کیلئے کروڑوں اربوں روپے ہوتے ہیں' یہ لوگ ہر سال اپنے ذاتی اخراجات میں اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں لیکن جونہی چوکیدار' گارڈ' چپڑاسی' ڈرائیور' خانساماں اور ویٹر کی تنخواہ میں پانچ سو روپے بڑھانے کا وقت آتا ہے تو انہیں دس سال پرانا خسارہ یاد آ جاتا ہے اور یہ ''پوزیشن ذرا ٹائیٹ ہے'' کا نعرہ لگا کر ملازموں سے معذرت کر لیتے ہیں۔ پاکستان کے نوے فیصد سیٹھوں' شیخوں' چودھریوں اور سرداروں کا یہی وطیرہ ہے ان کی نظر میں ذاتی اخراجات کیلئے اربوں روپے بھی کم ہوتے ہیں جبکہ یہ لوگ چھوٹے ملازمین کو پانچ سو روپے دیتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔

آپ اب اس مخصوص ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے موجودہ بجٹ کا جائزہ لیجئے' ہمارے سیٹھ اعظم جناب یوسف رضا گیلانی اور شیخ اعظم عبدالحفیظ شیخ نے ملک کی ٹائیٹ پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے تمام ترقیاتی منصوبوں اور وزارتوں کے اخراجات پر کٹ لگا دیا' تعلیم بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے بجٹ میں 7 ارب کی کمی کر دی گئی' صحت جیسی سہولت جو معاشرے کیلئے آکسیجن ٹینٹ کی حیثیت رکھتی ہے اس کے بجٹ میں 6 ارب یعنی 27 فیصد کمی کر دی گئی' عوام کو حاصل نو سہولتوں آٹا' گھی' چائے' دال' چاول' بے نظیر ٹریکٹر سکیم' بلوچستان میں ٹیوب ویلوں' ٹیکسٹائل سیکٹر' موٹر سائیکل مینو فیکچرنگ اور درآمد شدہ کھادوں پر سبسڈیز ختم کر دی گئیں جس سے حکومت 102 ارب 32 کروڑ روپے بچائے گی' حکومت نے پوزیشن ٹائیٹ ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بجٹ میں 685 ارب روپے خسارے کا اعلان بھی کر دیا اور قوم کو یہ خوش خبری بھی سنا دی کہ یہ خسارہ آئی ایم ایف جیسے بین الاقوامی اداروں سے قرضے لے کر پورا کیا جائے گا' حکومت نے یہ اعتراف بھی کر لیا کہ ملک میں مہنگائی ہے اور اس مہنگائی میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے لیکن ساتھ ہی جدی پشتی سیٹھوں کی طرح حکمرانوں نے اپنے اخراجات میں چپ چاپ اضافہ کر لیا' پچھلے سال سینٹ کا سالانہ بجٹ 81 کروڑ 80 لاکھ روپے تھا' اس سال اس میں 8 کروڑ 90 لاکھ روپے کا اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد یہ 90 کروڑ 76 لاکھ 10 ہزار روپے ہو گیا' ہم اگر اس رقم کو سال کے 365 دنوں پر تقسیم کریں تو یہ روزانہ 25 لاکھ روپے بنتے ہیں' گویا یکم جولائی سے ہمارے سینٹ پر روز 25 لاکھ روپے خرچ ہوں گے' پچھلے سال تک یہ رقم 22 لاکھ 42 ہزار روپے روزانہ بنتی تھی۔ قومی اسمبلی کے بجٹ میں اس سال 37 کروڑ 90 لاکھ روپے کا اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد یہ ایک ارب 69 کروڑ 38 لاکھ 56 ہزار ہو گیا' ہم اس کو 365 دنوں پر تقسیم کریں تو یہ 46 لاکھ روپے روزانہ بنتے ہیں' ایوان صدر کا بجٹ پچھلے سال قریباً 39 کروڑ تھا' اس سال اس میں تین کروڑ 60 لاکھ روپے اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد یہ 42 کروڑ 72 لاکھ روپے ہو گیا' ہم اس کو 365 دنوں پر تقسیم کریں تو یہ 11 لاکھ 70 ہزار روپے روزانہ بنتے ہیں' پچھلے سال تک یہ اخراجات دس لاکھ روپے روز تھے' صدر صاحب کے غیر ملکی دوروں کا پچھلا بجٹ ساڑھے 29 کروڑ 20 لاکھ روپے تھا' اس میں اس سال ایک کروڑ 58 لاکھ اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد یہ 30 کروڑ 78 لاکھ روپے بن گیا۔

یہ روزانہ کے 8لاکھ 43ہزار روپے بنتے ہیں' وزیراعظم کے غیر ملکی دوروں کا بجٹ پچھلے سال ایک ارب 21کروڑ روپے تھا' اس سال اس میں ساڑھے 26کروڑ روپے اضافہ کر دیا گیا جس کے بعد یہ ایک ارب 47کروڑ اور پچاس لاکھ روپے ہو گیا' ہم اگر اسے بھی سال کے کل دنوں پر تقسیم کریں تو یہ روزانہ 41لاکھ روپے بنتے ہیں گویا غریب پاکستان کے غریب اعظم غیر ملکی دوروں پر روزانہ 41لاکھ روپے خرچ کر سکتے ہیں اور اسی طرح وزیراعظم سیکرٹریٹ کا بجٹ بھی 5کروڑ 60لاکھ روپے بڑھا دیا گیا جس کے بعد یہ 42کروڑ 81لاکھ روپے ہو گیا' یہ روز کے ساڑھے تیرہ لاکھ روپے بنتے ہیں۔

آپ اب وزیراعظم ہاؤس کے لوئر سٹاف کی تعداد بھی ملاحظہ کیجئے' وزیراعظم ہاؤس میں 73مالی' 175سرونٹس اور ہاؤس کیپنگ کے 263ملازمین ہیں' ان کی کل تعداد 411بنتی ہے' اس کے مقابلے میں آپ دنیا کی واحد سپر پاور امریکا کے صدر کی سرکاری رہائش گاہ وائٹ ہاؤس کے ملازمین کی تعداد 168' برطانیہ کے وزیراعظم کی رہائش گاہ 10۔ڈاؤننگ سٹریٹ میں 82' جاپان کے وزیراعظم ہاؤس میں 42اور انڈیا کے وزیراعظم ہاؤس میں 26ملازمین ہیں' آپ انٹرنیٹ پر ایرانی صدر محمود احمدی نژاد کے لائف سٹائل کی جھلکیاں بھی دیکھ سکتے ہیں' آپ احمدی نژاد کو فٹ پاتھ پر نماز پڑھتے' فرش پر سوتے' گھر کے چھوٹے سے ڈرائینگ روم میں قالین پر بیٹھ کو لوگوں سے ملاقات کرتے اور 1977ء کی ذاتی گاڑی میں سفر کرتے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور یہ وہ لائف سٹائل ہے جو صدر احمدی نژاد کو امریکا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ دے رہا ہے۔امریکا نے کل اقوام متحدہ کے ذریعے ایران پر اقتصادی اور سفارتی پابندیاں لگوائیں' اس کے جواب میں صدر احمدی نژاد نے بیان دیا "ہم ان پابندیوں کو کچرے کی ٹوکری میں پھینک رہے ہیں" احمدی نژاد کو یہ حوصلہ ان کی قوم نے دیا اور قوم کے اعتماد کی بنیاد اپنی لیڈر شپ کا لائف سٹائل تھا جبکہ اس کے مقابلے میں غریب پاکستان کے غریب اعظم کے ہاؤس میں 411چھوٹے ملازمین کام کر رہے ہیں۔ آپ اگر ایوان صدر میں بھی جھانک کر دیکھیں تو آپ کو وہاں بھی ہزار سے زائد عملہ دکھائی دے گا' آپ جب اس عملے کو دیکھتے ہیں' دونوں ایوانوں کے بجٹ میں اضافہ دیکھتے ہیں' صدر اور وزیراعظم کے اخراجات میں اضافہ ملاحظہ کرتے ہیں' سینٹ اور قومی اسمبلی کے بجٹ کو بڑھتا اور وزیراعظم اور صدر کے غیر ملکی دوروں کے بجٹ کو اوپر جاتا دیکھتے ہیں تو آپ بے اختیار سوال کرتے ہیں اگر ملک کے معاشی حالات خراب ہیں' ہم اگر مشکل دور سے گزر رہے ہیں تو پھر بڑی سرکار اور چھوٹی سرکار کے ذاتی اخراجات میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ ان کی ذات' ان کے دفتر اور ان کی رہائش گاہ میں کفایت شعاری دکھائی کیوں نہیں دیتی؟ اور یہ اپنے اخراجات کم کیوں نہیں کرتے؟ یہ عجیب بات ہے ملک میں صدر' وزیراعظم' کابینہ اور دوروں کیلئے اربوں روپے موجود ہیں لیکن غریب' مسکین' نادار' بیمار اور مفلوک الحال عوام کیلئے ایک پائی نہیں' حکومت عوام کو کفایت شعاری اور سادگی کا درس دے رہی ہے مگر ساتھ ہی اپنے اللے تللوں میں بھی اضافہ کر رہی ہے' کیوں؟ شائد اس کی وجہ ہمارا مرتا ہوا سیاسی ضمیر ہے' ہم سیاسی لحاظ سے اس قدر تنگ دل اور بے حس ہو چکے ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہم کیا کر رہے ہیں' ہم عام شہری کو کیا پیغام دے رہے ہیں' یہ درست ہے بڑے ملکوں میں دس' بیس لاکھ روپے بڑی رقم نہیں ہوتی اور ہم اگر ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کا بجٹ نصف کر دیں تو بھی ملکی معیشت پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا' ہماری اقتصادی حالت نہیں سنبھلے گی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی

حقیقت ہے قومیں جب بحرانوں کا شکار ہوتی ہیں تو وہ اپنی لیڈر شپ سے پیٹ پر دو پتھر باندھنے کی توقع رکھتی ہیں۔ شہد حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں اسلامی ریاست کے ایک حصے میں قحط پڑا تو آپ نے مدینہ منورہ میں گھی اور کھانا بند کر دیا تھا جس سے آپ شدید نقاہت کا شکار ہو گئے' آپ نے یہ فیصلہ اس وقت تک برقرار رکھا تھا جب تک قحط ختم نہیں ہو گیا۔ سوال یہ ہے کیا حضرت عمرؓ کے فاقوں سے قحط ٹل گیا تھا؟ نہیں ٹلا۔ قحط اپنے وقت پر ختم ہوا تھا لیکن بات قحط کی نہیں تھی' بات اصول' ضابطے اور ضمیر کی تھی۔ آپؓ کے ضمیر نے گوارا نہیں کیا تھا کہ ریاست کے دس' پندرہ' بیس لاکھ لوگ بھوکے سوئیں اور ان کا امیر مرغن کھانا کھا کر خراٹے لے رہا ہو چنانچہ آپ قحط زدہ لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور قیادت کا یہ وہ اصول تھا جس کو آگے چل کر اہل مغرب نے اپنا سیاسی مقصد بنا لیا چنانچہ آج جب معاشی حالات خراب ہوتے ہیں تو یہ لوگ قوم سے قربانی مانگنے سے پہلے وائٹ ہاؤس' 10 ڈاؤننگ سٹریٹ' چانسلر ہاؤس اور وزیراعظم ہاؤس کا بجٹ کم کر دیتے ہیں اور پھر قوم سے مدد کی درخواست کرتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں جب ہمارا بجٹ تیار ہوتا ہے تو اس میں سیٹھوں کی طرح قوم کو یہ نوید سنائی جاتی ہے پوزیشن ذرا ٹائیٹ ہے لہٰذا آپ کو کچھ نہیں مل سکتا' یہ کیسی پوزیشن ہے جو صرف اور صرف غریبوں کیلئے ٹائیٹ ہوتی ہے۔
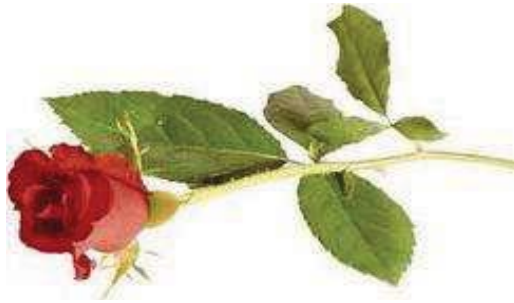
کیا میاں نواز شریف کوئی فیصلہ کن فیصلہ کریں گے

میاں نواز شریف نے چند دن قبل اسلام آباد کے صحافیوں اور اینکر پرسنز کو گفتگو کی دعوت دی تھی' یہ دعوت بنیادی طور پر طلعت حسین کی آبرومندانہ واپسی پر دی گئی تھی لیکن یہ جلد ہی موجودہ سیاسی صورتحال کی طرف مڑ گئی۔

طلعت حسین کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے' یہ ملک میں سیاسی پروگراموں کے موجد ہیں' آپ روز شام کو ٹیلی ویژن سکرینز پر بے شمار سیاسی ٹاک شوز دیکھتے ہیں' ان ٹاک شوز کی بنیاد طلعت حسین نے رکھی تھی' طلعت حسین کو تین زبانوں پر عبور ہے' یہ پنجابی' اردو اور انگریزی رواں لہجے میں بول سکتے ہیں' انہیں الفاظ پر بھی مکمل دسترس ہے' یہ خوبی ملک کے کسی دوسرے اینکر پرسن میں نہیں' ان کے چہرے پر ٹھوس اعتماد بھی ہوتا ہے اور یہ اعتماد کسی بھی غیر متوقع صورتحال میں ''شیک'' نہیں ہوتا' یہ موسیٰ سے فرعون تک سب سے یکساں اعتماد کے ساتھ سوال پوچھ سکتے ہیں' یہ خوبی بھی کسی دوسرے اینکر میں نہیں اور ان کی چوتھی انفرادیت ان کی جرأت مندانہ صحافت ہے' دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران ایک نیا طلعت حسین سامنے آیا' یہ طلعت حسین ہمیں سوات کے جنگ زدہ میدانوں سے لے کر وزیرستان کی خودکش فیکٹریوں تک رپورٹنگ کرتا اور حالات کو ٹیلی ویژن سکرین پر منتقل کرتا دکھائی دیا' یہ طلعت حسین ہر اس جگہ پہنچا جہاں بکتر بند گاڑیاں بھی جاتے ہوئے گھبراتی ہیں' یہ ان جگہوں تک بھی پہنچا جہاں ابھی تک ڈرون بھی نہیں پہنچ پائے' میں 1996ء سے طلعت حسین کا ''فین'' ہوں' میں اسے اس دور سے نوجوان صحافیوں کی رہنمائی کرتا ہوا دیکھ رہا ہوں' یہ ہمیشہ کوچہ صحافت میں آنے والے نئے خون کا لیڈر ثابت ہوا' اس کی آخری (اب تک) مہم جوئی بحری جہاز فریڈم فرٹیلا پر فلسطین جانے کی کوشش کی تھی جس پر راستے میں اسرائیلی کمانڈوز نے حملہ کر دیا اور طلعت حسین ساڑھے چھ سو لوگوں کے ساتھ اسرائیل کی قید میں چلا گیا' اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور یوں طلعت حسین 3 جون کو واپس پاکستان پہنچ گیا' صحافتی برادری طلعت حسین کی اس جرأت پر فخر کرتی ہے۔

میاں نواز شریف نے طلعت حسین کے اعزاز میں کالم نگاروں اور اینکر پرسنز کو چائے کی دعوت دی تھی' یہ دعوت بہت جلد سیاسی اکھاڑے میں تبدیل ہو گئی' میاں صاحب نے اس نشست کے دوران بے شمار واقعات سنائے لیکن ان میں سے تین بہت اہم تھے' میاں صاحب نے پچھلے دنوں لاہور میں احمدیوں کی عبادت گاہوں پر حملے کے حوالے سے ایک دلچسپ انکشاف کیا' میاں صاحب کا کہنا تھا یہ حملے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پلان کئے گئے تھے' ان لوگوں کو ٹریننگ بھی وہیں دی گئی تھی' حملے کے دوران دو لوگ گرفتار ہوئے' ان میں سے ایک سترہ اٹھارہ سال کا نوجوان تھا جبکہ دوسرا ذرا بڑی عمر کا تھا' نوجوان کو شدید زخمی حالت میں جناح ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا' دوسرے دن دہشت گردوں نے ہسپتال پر حملہ کر دیا' یہ لوگ اس لڑکے کو چھڑانا یا قتل کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ پولیس کو ان کے بارے میں اطلاع نہ دے سکے لیکن ان کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکا' بعدازاں تفتیش کے دوران پورے نیٹ ورک کے بارے میں معلومات مل گئیں' یہ لوگ کہاں سے چلے تھے' انہوں نے کہاں سے ٹریننگ لی اور کس کس نے ان کا ساتھ دیا تھا۔ میں نے میاں شہباز شریف سے کہا' آپ قوم کے ساتھ یہ

معلومات تیئر کریں تاکہ قوم کو اصل حقائق کا علم ہو سکے تاکہ پنجابی طالبان کا پروپیگنڈا ختم ہو جائے۔ میاں شہباز شریف نے پریس کانفرنس کی منصوبہ بندی کی لیکن انہیں مختلف تحقیقاتی اور تفتیشی اداروں نے روک دیا' ہماری ایجنسیوں کا خیال تھا میاں صاحب کی پریس کانفرنس سے وہ لوگ محتاط ہو جائیں گے اور یوں انہیں گرفتار کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میاں صاحب کا کہنا تھا تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں پنجابی طالبان کی تھیوری سو فیصد غلط ہے اور یہ کام بھی انہیں لوگوں نے کیا ہے جو ملک کے دوسرے حصوں میں دہشت گردی کر رہے ہیں۔ ہمارے ایک ساتھی نے میاں نواز شریف سے عرض کیا "جناب آپ فوج کے ساتھ بھی ہیں' آپ حکومت کے ساتھ بھی فرینڈلی ہیں اور آپ اپوزیشن کا کردار بھی ادا کر رہے ہیں' کیا یہ تضاد نہیں؟" میاں نواز شریف نے اس الزام کی بھرپور تردید کی' ان کا کہنا تھا "میرا آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی سے کوئی رابطہ نہیں" میاں صاحب نے اس ضمن میں 16 مارچ 2009ء کا ایک واقعہ بھی سنایا' میاں صاحب کا کہنا تھا وہ لانگ مارچ کے دن قافلہ لے کر جب کالا شاہ کاکو پہنچے تو انہیں چودھری اعتزاز احسن نے فون کیا' وہ مرید کے کے قریب کسی پٹرول پمپ پر کھڑے تھے' چودھری صاحب نے ان سے کہا آپ راستے میں چند لمحوں کیلئے میرے پاس رک جائیے' ہم جب وہاں پہنچے تو ہم ایک گاڑی میں سوار ہو گئے' اس دوران چیف آف آرمی سٹاف نے چودھری اعتزاز احسن کو فون کیا اور انہیں بتایا حکومت چیف جسٹس کو بحال کرنے پر تیار ہو گئی ہے اور وزیراعظم تھوڑی دیر بعد قوم سے خطاب کریں گے اور یوں یہ مسئلہ حل ہو جائے گا' چودھری صاحب نے آرمی چیف کو ہولڈ کرا کر مجھ سے پوچھا میاں صاحب کیا آپ آرمی چیف سے ہیلو ہائے کریں گے' میں نے فوراً معذرت کر لی اور ان سے کہا میں ان سے کیا ہیلو ہائے کروں گا بس آپ خود دیکھ لیجئے' میاں صاحب کا کہنا تھا میں نے تو اس وقت بھی آرمی چیف سے بات نہیں کی تھی چنانچہ میرے رابطے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میاں صاحب کا کہنا تھا وہ سسٹم کو بچانا چاہتے ہیں تاہم حکومت کے عزائم درست نہیں ہیں' یہ اٹھارہویں ترمیم کو جواز بنا کر ہمیں عدلیہ کے ساتھ کھڑا کرنا چاہتی ہے اور یہ ظاہر ہے ہمارے لئے ممکن نہیں ہو گا"۔

میاں نواز شریف نے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے ساتھ اپنی ایک ٹیلی فون گفتگو کا ذکر بھی کیا' میاں صاحب کا کہنا تھا ہائی کورٹ نے جس دن وزیر داخلہ رحمٰن ملک کی ضمانت خارج کی تھی اور صدر نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے رحمٰن ملک کو "پارڈن" کیا تھا اس دن وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے انہیں لندن فون کیا' وہ اس دن گھر سے باہر تھے چنانچہ انہوں نے دوسرے دن وزیراعظم کو "رنگ بیک" کیا' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے ان سے کہا' میاں صاحب حالات بہت خراب ہیں' ہمیں اب مل کر کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے' میاں صاحب کے بقول "میں نے وزیراعظم سے عرض کیا گیلانی صاحب جب آپ بابر اعوان جیسے لوگوں پر اتنا اعتماد کریں گے' آپ ان کے ذریعے حکومت چلائیں گے تو یہ نتائج تو نکلیں گے' آپ نے رحمٰن ملک کے معاملے میں بھی کیا کیا' عدالت نے ان کی ضمانت خارج کی تو صدر نے انہیں معافی دے دی' اس قسم کے اقدامات آپ کی شہرت کو شدید نقصان پہنچا رہے ہیں' آپ نے "پارڈن" کر کے بڑی سیاسی غلطی کی" ہمارے ایک ساتھی نے میاں نواز شریف سے پوچھا "وزیراعظم یوسف رضا گیلانی آپ کے ساتھ ملاقاتوں میں صدر آصف علی

بتاؤں؟" بعد ازاں وہ سنجیدہ ہوئے اور کہا "وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے آج تک میرے سامنے صدر آصف علی زرداری کے خلاف کوئی بات نہیں کی" میاں صاحب نے میڈیا کی کارکردگی پر بھی تنقید کی' میاں صاحب کا کہنا تھا "پرویز مشرف کے دور میں میڈیا ان کے خلاف خاموش رہا لیکن آج اس نے ہم جیسے یتیم' مسکین اور بے بس لوگوں پر یلغار کر رکھی ہے" میاں صاحب کے اس تبصرے پر تمام اینکرز نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور زیر لب مسکرا کر خاموش رہے' میاں صاحب نے یہ الزام دوسری مرتبہ دوہرایا تو طلعت حسین نے جواب دیا "میاں صاحب صدر پرویز مشرف کے دور میں آپ تو جلاوطن تھے اور یہ ہم لوگ ہی تھے جو اس وقت بھی پرویز مشرف کا مقابلہ کر رہے تھے' آپ میڈیا کو مکمل طور پر الزام نہیں دے سکتے" میاں صاحب کے جواب سے پہلے ہی بحث دوسری طرف چلی گئی' اس گفتگو کے دوران ہم نے میاں نواز شریف کے پرانے موقف میں لچک محسوس کی' میاں صاحب نے اس بار مڈٹرم الیکشن کی بھرپور مخالفت نہیں کی' میاں صاحب کا کہنا تھا ملک میں لاء اینڈ آرڈر کے اتنے مسائل نہیں ہیں کہ الیکشن نہ ہو سکیں اور انہوں نے اچھے اور جامع ایجنڈے کے ساتھ قومی حکومت کے آپشن کو بھی مکمل طور پر مسترد نہیں کیا' میاں صاحب بار بار کہہ رہے تھے حکومت انہیں اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے عدلیہ کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے لیکن وہ استعمال نہیں ہوں گے' اس نشست کے دوران طلعت حسین نے اعتراف کیا میڈیا کے دل میں عدلیہ کا وہ امیج قائم نہیں ہو رہا جو لانگ مارچ کے وقت تھا' اب عدلیہ کے بعض فیصلوں اور رویوں پر بھی سوالیہ نشان لگ گئے ہیں؟۔

یہ نشست ختم ہوئی تو میں نے محسوس کیا میاں نواز شریف بڑی تیزی سے کسی فیصلہ کن مرحلے کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن یہ ابھی کسی نئے حادثے' حکومت کی کسی نئی حماقت یا پھر کسی نئی تبدیلی کا انتظار کر رہے ہیں' یہ تبدیلی' یہ حماقت یا حادثہ کیا ہو گا اس کے بارے میں سردست کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ اب زیادہ دور نہیں کیونکہ میاں صاحب نے اس نشست کے دوران تسلیم کیا تھا ملک کے مسائل کو حل کرنا اب کسی ایک جماعت کے بس کی بات نہیں رہی' تمام سیاسی جماعتوں کو مل کر جدوجہد کرنا ہو گی چنانچہ شاید اس حادثے' اس حماقت یا اس تبدیلی کے بعد تمام سیاسی جماعتیں اکٹھی ہو جائیں اور ایک ایسی قومی حکومت بن جائے جس میں عمران خان اور منور حسین سمیت تمام سیاستدان شامل ہوں۔
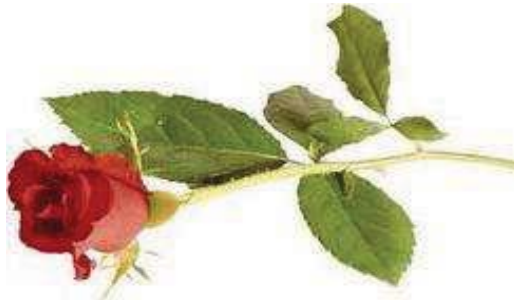
نعشوں کے منتظر

یہ جھولا ٹوٹنے کا بظاہر ایک چھوٹا سا واقعہ تھا لیکن یہ ہمارے اجتماعی رویوں کی انتہائی کرب ناک مثال ہے۔ اسلام آباد کی راول لیک کے کنارے بچوں کی تفریح کیلئے بجلی کے جھولے لگے ہیں' جمعہ 11 جون 2010ء کو آندھی کی وجہ سے ایک جھولا ٹوٹ گیا جس کے نتیجے میں دس سال کا ایک بچہ جاں بحق اور چار زخمی ہو گئے۔ یہ واقعہ تمام ٹیلی ویژن چینلز پر دکھایا گیا تو حسب دستور وزیر داخلہ رحمان ملک' کمشنر اسلام آباد' ڈی سی اسلام آباد' آئی جی اسلام آباد' چیئرمین سی ڈی اے اور ڈائریکٹر پارکس سی ڈی اے نے واقعے کا فوری نوٹس لے لیا' وزیر داخلہ نے اسلام آباد کے تمام پارکس کے جھولے بند کر دیئے' ''ملزموں'' کو گرفتار کر لیا گیا اور سانحے کی اعلیٰ سطحی انکوائری شروع کر دی گئی۔ چیئرمین سی ڈی اے نے اگلے دن پارکوں کے جھولے ایک ہفتے کیلئے بند کر دیئے اور ان جھولوں کے معائنے کیلئے کمیٹی تشکیل دے دی' یہ کمیٹی اسلام آباد کے تمام جھولوں کا معائنہ کرے گی' ان کا جائزہ لے گی اور اگر جھولے محفوظ پائے گئے تو انہیں چلانے کی اجازت دے دی گی بصورت دیگر بیمار جھولوں کو پارکوں سے اٹھا دیا جائے گا۔

یہ کارروائی پاکستانی معیار کے مطابق شاندار ہے' چیئرمین سی ڈی اے اور وزیر داخلہ دونوں کو یہی کرنا چاہئے تھا لیکن سوال یہ ہے' کیا یہ کمیٹی اس حادثے سے پہلے نہیں بن سکتی تھی؟ اور کیا اس حادثے سے پہلے ان جھولوں کا معائنہ نہیں ہو سکتا تھا؟ سی ڈی اے' اسلام آباد کی انتظامیہ اور وزیر داخلہ جھولوں کے معائنے کیلئے جھولا ٹوٹنے' معصوم بچے کے مرنے اور چار بچوں کے زخمی ہونے کا انتظار کیوں کرتے رہے؟ اس کا جواب واضح ہے' ہم بنیادی طور پر مردہ فروش اور مردہ پرست قوم ہیں' ہماری کارکردگی اس وقت تک آنکھ نہیں کھولتی جب تک نعش ہمارے صحن میں نہیں پہنچتی' ہم مرگ پر واویلا کرنے والی قوم ہیں' ہمارے پاس زندوں کیلئے ایک لمحہ نہیں ہوتا جبکہ ہم مردوں کیلئے دس دس سال انکوائریاں کرتے رہتے ہیں۔ دوسرا ہمارے ملک میں جان کی کوئی قدر نہیں رہی چنانچہ ہم حادثوں سے بچنے کیلئے کچھ نہیں کرتے' ہم یہ سمجھتے ہیں سترہ' اٹھارہ کروڑ لوگوں میں سے ہزار' دو ہزار لوگ بھی مر جائیں گے تو کوئی قیامت نہیں آئے گی چنانچہ جب تک موسیٰ ورک کے ریلوے کراسنگ پر بچوں کی بس نہیں پھنستی اور ٹرین سے ٹکرا کر 11 بچے جاں بحق نہیں ہوتے ہمیں اس وقت تک ملک کے وہ ساڑھے تین ہزار ریلوے کراسنگ دکھائی نہیں دیتے جن پر پھاٹک نہیں ہیں اور جہاں سے موت روزانہ ایک سو بیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتی ہے اور سینکڑوں ہزاروں لوگ دن میں بیس' بیس مرتبہ اس کی دھک دھک سنتے ہیں۔ ہماری حکومت' ہمارے وزیراعظم کو بھی اس وقت تک جاوید ماچھی اور ممتاز ماچھن کی مجبوری' غربت اور دکھ سنائی نہیں دیتے جب تک یہ لاہوریاں والا کے ریلوے کراسنگ پر ٹرین کے سامنے نہیں کود جاتے۔ ہمارے وزیر اعلیٰ پنجاب بھی جاوید ماچھی اور اس کی بیوی ممتاز ماچھن کی آہیں اور سسکیاں سننے کیلئے ان دونوں کے ریل کے سامنے کودنے کا انتظار کرتے ہیں۔ میاں شہباز شریف بھی اس وقت تک ڈسکہ میں قدم نہیں رکھتے جب تک فاطمہ کی عزت نہیں لٹ جاتی اور ان کا خاندان انصاف کیلئے جھولی پھیلا کر آسمان کے نیچے کھڑا نہیں ہو جاتا۔ آپ سرکاری سنگ دلی کی انتہا دیکھئے ہماری حکومت اس وقت تک ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھی رہتی ہے جب تک عطا آباد کی جھیل کا

پانی ساڑھے تین سو فٹ تک بلند نہیں ہو جاتا اور اس سے ہزاروں لاکھوں دیہات کے ڈوبنے کا اندیشہ پیدا نہیں ہو جاتا۔ ہم لوگ اس وقت تک دسویں منزل تک اونچی سیڑھی نہیں خریدتے جب تک اسلام آباد کے شہید ملت سیکر ٹریٹ میں آگ نہیں لگتی اور ہم اس وقت تک فائر بریگیڈ کے پائپ چیک نہیں کرتے جب تک کراچی کی بولٹن مارکیٹ جل کر راکھ نہیں ہو جاتی۔ آپ ہماری بے حسی ملاحظہ کیجئے' ہم اس وقت تک امریکا کو برا نہیں کہتے جب تک اس کے ڈرون تربیلا تک نہیں پہنچ جاتے اور ہمیں اس وقت تک جیل کی خرابیاں بھی دکھائی نہیں دیتیں جب تک ہمارے سیاستدان جیل تک نہیں پہنچتے۔ آپ اپنے سسٹم کا ایک بار مطالعہ کر لیجئے' آپ کو معلوم ہو گا ہم حقیقتاً ایک مردہ پرست قوم ہیں اور ہمیں اپنی اپنی ڈیوٹی دینے کیلئے کوئی نہ کوئی مردہ چاہئے ہوتا ہے۔ ہم تو اس وقت تک چینی اور آٹے کی قلت کو بھی سیریس نہیں لیتے جب تک لوگ مال روڈ کی دکانوں پر حملہ نہیں کرتے یا پھر آٹے کیلئے ڈنڈے لے کر سڑکوں پر نہیں نکل آتے۔ پاکستان میں ہر سال سینکڑوں لوگ قحط سالی سے مرتے ہیں اور ہزاروں' لاکھوں سیلابوں میں بہہ جاتے ہیں لیکن سیلاب سے پہلے کبھی کوئی سرکاری افسر ہنگامی سائرن تک بجا کر نہیں دیکھتا اور کسی نے آج تک چولستان کے باسیوں کیلئے تالاب کھودنے کا بندوبست نہیں کیا' یہ سب لوگ' یہ سب ادارے لوگوں کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں اور جونہی لوگ قحط سے تنگ آکر شہروں کا رخ کرتے ہیں ہمارے سرکاری ادارے چولستان اور تھرپارکر میں تالاب بنانے کی فیزیبلٹی پر کام شروع کر دیتے ہیں اور جب سیلاب کا مونگی سے ٹھٹھہ تک لاکھوں گھر اجاڑ دیتا ہے تو ہماری حکومت سیلابوں کا رخ موڑنے کی منصوبہ بندی شروع کر دیتی ہے۔ یہ ہے ہماری کارکردگی' یہ ہیں ہم! اکیسویں صدی کے پاکستانی' اکیسویں صدی کی حکومت اور اکیسویں صدی کے سرکاری ادارے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ بڑی اہم ہے کہ ہمارے احساس کی شمع کتنی دیر جلتی رہتی ہے؟ کیا ہم نعشوں سے سبق سیکھ لیتے ہیں یا پھر ہمارا احساس صرف اس وقت تک آنکھ کھول کر جاگتا ہے جب تک نعش پر مٹی نہیں ڈال دی جاتی۔ ہم دوسری نوعیت کے لوگ ہیں' ہمارے احساس کی شمع صرف چند گھنٹوں کیلئے جلتی ہے' ہم اس وقت تک ریلوے کراسنگ پر پھاٹک لگانے کا سوچتے ہیں جب تک حادثے کی خبریں میڈیا میں زندہ رہتی ہیں اور جوں ہی میڈیا حادثوں سے شعیب اور ثانیہ کی شادی جیسے اہم ایشو کی طرف مڑتا ہے ہماری حکومت بھی ریلوے کراسنگ پر پھاٹکوں جیسی فضول فائل بند کر دیتی ہے' جوں ہی پانی اترتا ہے اس کے ساتھ ہی سیلاب سے نمٹنے کی منصوبہ بندی بھی فارغ ہو جاتی ہے' جوں ہی چولستان میں پہلی بارش ہوتی ہے ہماری حکومت اسی دن قحط جیسے ایشو سے لاتعلق ہو جاتی ہے' جوں ہی آگ بجھ جاتی ہے ہم لمبی سیڑھی' بڑے فائر بریگیڈ اور آگ بجھانے کی جدید ٹیکنالوجی کی ضرورت سے بھی آزاد ہو جاتے ہیں اور جس دن آبروریزی کی شکار لڑکی کی نعش دفن ہو جاتی ہے ہماری پولیس' ہماری عدالت بھی اس کیس سے بری ہو جاتی ہے لہٰذا مجھے یقین ہے جس دن اسلام آباد کے جھولے سے گرنے والے اس بچے کا کفن میلا ہو جائے گا' ہمارا سی ڈی اے' دارالحکومت کی انتظامیہ اور ہماری وزارت داخلہ بھی جھولوں کے معائنے جیسے فضول کام سے آزاد ہو جائے گی اور یہ جھولے انہیں نقائص کے ساتھ دوبارہ بحال ہو جائیں گے اور بچے موت کے ان چکروں پر جھولتے رہیں گے۔ ہمیں ماننا پڑے گا ہم ایک ایسے ملک کے باسی ہیں جس میں

[illegible] دو مرتبہ اقتدار میں آنے کے بعد بھی اپنے والد [illegible] کراسکے اور پاکستان پیپلزپارٹی اقتدار کے اڑھائی برسوں میں اپنی لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کی ذمہ داری ''فکس'' نہیں کر سکتی چنانچہ ہم اس ملک میں حکومت سے توقع کریں یہ جھولوں کا معائنہ کرے گی اور پاکستان میں کسی ایسے جھولے کی اجازت نہیں دے گی جس کے کیل قبضے یا نٹ بولٹ ٹھیک نہیں ہوں گے' یہ خیال بھی باطل ہے اور یہ خواہش بھی اندھی۔ جس ملک میں وزارت خارجہ کو کر غزستان میں فسادات کے بعد پتہ چلے وہاں ہمارے پندرہ سو طالب علم موجود ہیں اور یکم جون کی دوپہر تک وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کو یہ تک معلوم نہ ہو افریڈم فروٹیلا کس بلا کا نام ہے اور اس میں طلعت حسین سمیت تین پاکستانی سوار ہیں' ہم اس ملک میں توقع کریں حکومت بچوں کے جھولوں کی مرمت کا تسلی بخش انتظام کرے گی' یہ کیسے ممکن ہے' ہم نعشوں کے منتظر لوگوں کے درمیان کھڑے ہیں اور ان میں سے کسی شخص' کسی ادارے کی آنکھ اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک یہ کسی معصوم شخص کی چیخ نہ سن لے۔

میڈیا آپ کا دشمن نہیں
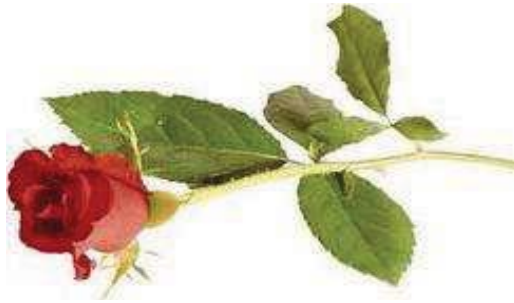
میں دو مثالیں پیش کرتا ہوں' آپ سب سے پہلے کرغزستان میں محصور طالب علموں کی مثال لیجئے' کرغزستان کے شہر اوش میں نسلی فسادات پھوٹ پڑے جس کے نتیجے میں ہمارے اڑھائی سو طالب علم کرغزستان کے متاثرہ علاقوں میں پھنس گئے' ایک طالب علم علی رضا فسادات کے دوران جاں بحق بھی ہو گیا' کرغزستان میں محصور طالب علموں نے ای میل' موبائل فونز اور اپنے لواحقین کے ذریعے پاکستانی صحافیوں اور میڈیا سے رابطہ کیا جس کے بعد ٹیلی ویژن چینلز پر ان طالب علموں کے بارے میں خبریں نشر ہونے لگیں' رپورٹر اور کیمرہ مین طالب علموں کے گھروں تک پہنچے' ان کے بہن بھائیوں اور والدین کی صورتحال پر "پیکیج" بنائے اور یہ نیوز پیکیج خبر ناموں میں نشر ہوئے' اس کارروائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہمارا دفتر خارجہ متحرک ہو گیا۔ وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے کرغزستان میں پاکستان کے سفیر تنویر خاصخیلی اور کرغز حکومت کی وزارت خارجہ سے رابطہ کیا' اسلام آباد میں مقیم کرغزستان کے قائم مقام سفیر نور عین نیاز علی کو بھی دفتر خارجہ طلب کر کے علی رضا کی ہلاکت پر شدید احتجاج کیا گیا' یہ سلسلہ دو دن تک جاری رہا یہاں تک کہ کرغزستان کی حکومت نے پاکستان کے طالب علموں کو جمع کیا' انہیں بکتر بند گاڑیوں میں بیٹھا کر ائر پورٹ پہنچایا' ہمارے ہوائی جہاز کرغزستان پہنچے اور 267 طالب علموں کو لے کر پاکستان آ گئے۔ اس ساری کارروائی پر وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی اور وزارت خارجہ مبارک باد کی مستحق ہے کیونکہ پاکستان پہلا ملک ہے جس نے اس بحران میں اپنے طالب علموں کو کرغزستان سے نکالا' ہم اس کامیابی پر شاہ محمود قریشی کیلئے جتنی دیر تالیاں بجائیں یہ کم ہوں گی لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے حکومت اگر میڈیا کی خبروں کو سنجیدگی سے نہ لیتی' یہ اسے حکومت کو بدنام کرنے کا پروپیگنڈا سمجھتی اور وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات قمر زمان کائرہ' پاکستان پیپلز پارٹی کی سیکرٹری اطلاعات فوزیہ وہاب یا پھر ایوان صدر کے ترجمان فرحت اللہ بابر حسب روایت یہ اعلان کر دیتے "کرغزستان میں کوئی پاکستانی طالب علم محصور نہیں' ہم دیکھ رہے ہیں' ہم غور کر رہے ہیں' ہم نے کمیٹی بنا دی ہے' ہم نے کرغزستان حکومت کو حقائق معلوم کرنے کیلئے لکھ دیا ہے اور یہ چند لوگ ہیں جو حکومت کو بدنام کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے' وغیرہ وغیرہ" تو کیا ہوتا؟ کیا 267 پاکستانی طالب علم کرغزستان میں بھوکے پیاسے نہ پڑے رہتے؟ کیا کرغزستان سے علی رضا کی طرح مزید دس' پندرہ' بیس نعشیں پاکستان نہ آتیں؟ کیا یہ 267 خاندان بھی شاہراہ دستور پر دھرنا نہ دے دیتے اور حکومت کیلئے انہیں سنبھالنا مشکل نہ ہو جاتا؟ اور اس سے حکومت کی بدنامی میں اضافہ نہ ہوتا؟ حکومت نے مہربانی کی اس بار میڈیا کی خبروں اور رپورٹوں پر یقین کیا' مثبت قدم اٹھایا اور اس سے نہ صرف 267 جانیں بچ گئیں بلکہ 267 خاندان بھی ذلت' پریشانی اور دکھ سے بچ گئے اور حکومت کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہوا۔ آپ دوسری مثال بھی لے لیجئے' 31 مئی کو اسرائیل کی فوج نے ترکی سے روانہ ہونے والے فریڈم فلوٹیلا پر قبضہ کر لیا تھا' اس میں طلعت حسین اور ان کے پروڈیوسر آغا رضا اور خبیب فاؤنڈیشن کے ندیم احمد بھی شامل تھے۔ طلعت حسین پاکستان کے نامور صحافی ہیں چنانچہ اس دن دوپہر تک میڈیا نے آہ و بکا شروع کر دی' حکومت کا رویہ شروع میں سنگدلانہ تھا لیکن جب میڈیا پیچھے نہ ہٹا تو ہماری وزارت خارجہ نے انگڑائی لی' وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی متحرک

ہوئے‘ انہوں نے ترکی کی حکومت اور امریکائی وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن سے رابطہ کیا‘ ان رابطوں کے نتیجے میں یہ تینوں پاکستانی دو دن بعد رہا ہو گئے اور یوں تمام اینکر پرسنز اور پرائیویٹ ٹیلی ویژن چینلز حکومت اور وزیر خارجہ کا شکریہ ادا کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس سے بھی ظاہر ہے حکومت کی نیک نامی میں اضافہ ہوا۔ آپ ایک لمحے کیلئے سوچیے اگر اس ایشو پر بھی حکومت کا رویہ حسب دستور ''کولڈ'' ہوتا‘ یہ مسلسل یہ کہتی رہتی ''ہم نے تو انہیں نہیں کہا تھا آپ اسرائیل چلے جائیں‘ ہم رابطہ کر رہے ہیں‘ ہم نے ٹیلی فون کر دیا ہے‘ ہم اپنا وفد اسرائیل بھجوا رہے ہیں یا پھر ہم اسرائیل کو مجبور نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات نہیں ہیں‘ وغیرہ وغیرہ'' تو کیا ہوتا؟ کیا صحافی تنظیمیں حکومت کا ناطقہ بند نہ کر دیتیں؟ کیا انٹرنیشنل جرنلسٹ فورمز حکومت پاکستان کو برا بھلا نہ کہتے؟ اور کیا اینکر پرسنز‘ کالم نگار اور ٹیلی ویژن چینلز حکومت کے خلاف محاذ نہ کھولتے؟ جی ہاں یقیناً یہی ہوتا لیکن حکومت بالخصوص وزارت خارجہ نے بروقت اقدام کیا‘ اسرائیل میں پھنسے تینوں پاکستانی رہا ہوئے اور حکومت کی نیک نامی میں اضافہ ہوا۔

آپ اب ان دونوں مثالوں کو سامنے رکھ کر حکومت اور میڈیا کے تعلقات کا نئے سرے سے جائزہ لیجئے‘ میڈیا یا اینکر پرسنز حکومت سے کیا مطالبات کر رہے ہیں‘ یہ حکومت سے کہہ رہے ہیں ملک میں کرپشن میں اضافہ ہو گیا ہے‘ وزراء پر لوٹ کھسوٹ اور رشوت کے کھلے الزام لگ رہے ہیں‘ سپریم کورٹ نے این آر او کے خلاف واضح فیصلہ دے دیا لیکن وزارت قانون اس فیصلے پر عملدرآمد نہیں کر رہی‘ اٹھارہویں ترمیم پاس ہونے کے باوجود ایوان صدر بدستور طاقت کا سرچشمہ ہے‘ اگر سپریم کورٹ جوڈیشل کمیشن اور پارلیمانی بورڈ کو ججوں کی تقرری کا اختیار نہیں دینا چاہتی آپ سپریم کورٹ کا فیصلہ مان لیں ضد نہ کریں‘ عدالت اگر کسی وزیر کی ضمانت منسوخ کرتی ہے تو آپ اسے صدارتی معافی نہ دیں‘ وزراء کو عدالتوں کے فیصلوں کا سامنا کرنے دیں‘ آپ گورننس بہتر بنا لیں‘ آپ حکومتی رٹ اسٹیبلش کریں‘ آپ رینٹل پاور پلانٹس کی بجائے ڈیموں کے آپشن پر جائیں‘ آپ ایوان صدر اور وزیراعظم ہاؤس کے بجٹ کم کریں‘ آپ سادگی اور کفایت شعاری اختیار کریں‘ آپ وزراء سے بھاری پروٹوکول‘ سیکورٹی اور پولیس سکواڈ واپس لیں‘ آپ کسی کو بلٹ پروف گاڑی نہ دیں‘ آپ تعلیم‘ اعلیٰ تعلیم اور سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کو ترجیح دیں‘ آپ ان ڈائریکٹ ٹیکسوں کی بجائے براہ راست ٹیکس بڑھائیں‘ آپ اعلیٰ سطح پر انصاف قائم کریں اور اگر آپ کا قریبی ترین ساتھی بھی کسی غلط کام میں ملوث پایا جائے تو آپ اس کا کڑا احتساب کریں‘ آپ امریکا کے سامنے جھکنا بند کر دیں‘ آپ غیر ملکی طاقتوں کو ملک کی ''کاسٹ'' پر مراعات نہ دیں‘ آپ آئی ایم ایف کی ظالمانہ شرائط تسلیم نہ کریں‘ آپ غیر ملکی ایجنڈے کے تحت ''ویٹ'' نہ لگائیں‘ آپ بے روزگاری‘ غربت‘ جہالت اور بے انصافی کے خاتمے کیلئے کوئی جامع منصوبہ بنائیں‘ آپ چھوٹی پارٹیوں کی بلیک میلنگ میں نہ آئیں۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کیا ان میں کوئی مطالبہ غلط ہے؟ اور کیا میڈیا اس کے علاوہ حکومت سے کوئی اور مطالبہ کر رہا ہے؟ کیا میڈیا حکومت سے اتنا نہیں پوچھ رہا کہ آپ نے آمر پرویز مشرف کو گارڈ آف آنر دینے کی اجازت کیوں دی تھی؟ آپ پرویز مشرف کو انٹرپول کے ذریعے واپس کیوں نہیں منگواتے‘ آپ اس کا پاسپورٹ کینسل کیوں نہیں کرتے؟ آپ بھارتی وزیر خارجہ کی جعلی ٹیلی فون کال صدر پاکستان کے ساتھ کیوں

[illegible]
نہیں کی، اور وزیراعظم اور صدر صاحب کے غیر ملکی دوروں کا بجٹ بالترتیب ڈیڑھ ارب روپے اور 31 کروڑ روپے کیوں ہے؟۔

آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے اس میں کون سی بات غلط ہے اور کیا حکومت کیلئے بہتر نہیں کہ یہ یہ ان خامیوں کی نشاندہی پر بھی وہی رویہ اختیار کرے جو اس نے کرغزستان اور اسرائیل میں محصور پاکستانیوں کے وقت کیا تھا اور اس کے نتیجے میں اس نے نیک نامی نہیں کمائی تھی ۔ حکومت کو یہ غلط فہمی دور کرنا ہوگی کہ میڈیا پاکستان پیپلز پارٹی کا مخالف ہے‘ اس کا کوئی ایجنڈا ہے‘ یہ پاکستان مسلم لیگ ن کے ہاتھوں بکا ہوا ہے یا پھر یہ فوج کو واپس لانا چاہتا ہے۔ ہم لوگ اگر جمہوریت کے خلاف ہوتے تو ہم کبھی اس وقت جنرل پرویز مشرف پر تنقید نہ کرتے جب میاں نواز شریف جدہ میں خاموش بیٹھے تھے اور محترمہ بے نظیر بھٹو لندن اور دوبئی میں 12 اکتوبر کے اقدام کی مذمت سے گریز کر رہی تھیں۔ یہ میڈیا تھا جس نے اس وقت بھی آمریت کا مقابلہ کیا تھا جب محترمہ کے بھائی پیٹریاٹ کے نام پر پرویز مشرف کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور میاں نواز شریف کے انتہائی قریبی ساتھیوں نے ان کا ساتھ چھوڑ کر پاکستان مسلم لیگ ق بنالی تھی۔ پاکستان کے صحافی اس دور میں واحد گروپ تھے جو اس وقت بھی بولتے تھے جب میاں صاحب پاکستان ٹیلی فون کرنے سے پہلے بھی سعودی عرب کی حکومت سے اجازت لیتے تھے، چنانچہ آپ اگر میڈیا کو اپنا ایسا دوست سمجھیں گے جو آپ کے منہ پر آپ کی غلطیوں کی نشاندہی کر سکتا ہے تو آپ کا اقتدار بھی قائم رہے گا اور آپ کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہوگا۔ ہم لوگ اگر کرغزستان اور اسرائیل کے ایشو پر آپ کی نیک نامی کا باعث بنے ہیں تو آپ باقی معاملات میں بھی ہماری بات مان کر دیکھ لیں‘ آپ فائدے میں رہیں گے۔

پلیز سر میری مرنے میں ہیلپ کریں
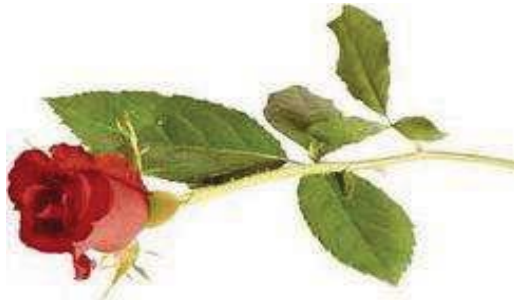
میں کبھی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا تھا' کبھی اس کے ہاتھ میں پکڑے اخبار کو دیکھتا تھا' کبھی اس کے گرد جمع ہجوم پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی پریشانی کے عالم میں دائیں بائیں بھاگنے کا راستہ تلاش کرتا تھا لیکن میرے پاس اس کی بات سننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ نیچے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا' اس نے اخبار کھول کر سامنے بچھایا' جیب سے مارکر نکالی اور ایک تین کالمی خبر پر نشان لگا کر بولا "میں مرنا چاہتا ہوں' زہر کھا کر' ٹرین کے نیچے کود کر یا دریا میں چھلانگ لگا کر مرنا چاہتا ہوں' کیا آپ میری مدد کریں گے" میرے لئے اس کا یہ مطالبہ حیران کن تھا' میں بھی نیچے فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا' اس نے اخبار میری طرف کھسکا دیا' یہ کل کی خبر تھی اور میں سارا دن ٹیلی ویژن چینلز پر یہ خبر سنتا رہا تھا۔ یہ لاہور شہر کے علاقے شاہ پور کانجراں کے رکشہ ڈرائیور اکبر علی کی خبر تھی' اکبر علی شدید معاشی بحران کا شکار تھا' یہ قرضوں میں جکڑا ہوا تھا اور محنت مزدوری سے اس کا گزارا نہیں ہوتا تھا چنانچہ وہ حالات سے دلبرداشتہ ہو گیا' اس نے زہر خریدا' یہ اپنی بیوی اور پانچ بچوں کے ساتھ کمرے میں بند ہوا' اس نے سب سے پہلے خود زہر کھایا اور اس کے بعد اپنی بیوی اور بچوں کو زہر کھلانا شروع کر دیا' یہ ابھی اپنی بیوی اور تین بچیوں کو زہر کھلانے میں کامیاب ہوا تھا کہ اس کی طبیعت بگڑ گئی اور اس نے قے کرنا شروع کر دی' اکبر علی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے اس کے دو بچے زہر خورانی سے بچ گئے' اکبر علی' اس کی دس سال کی بیٹی نادیہ اور سات سال کی ایمن فوری طور پر جاں بحق ہو گئیں جبکہ اس کی بیوی مزمل بی بی اور سولہ سال کی بیٹی بینش کو تشویشناک حالت میں ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں ان کی حالت نازک ہے۔ یہ کل 16 جون 2010ء کے دن ٹیلی ویژن چینلز کی "ہاٹ نیوز" تھی' تمام چینلز سارا دن متاثرہ خاندان کو دکھاتے رہے تھے' میں خبر دیکھتے ہی سارا ماجرا سمجھ گیا اور میں نے اس سے پوچھا "آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں" اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا اور بولا "میں آج کا اکبر علی ہوں' میرے بھی پانچ بچے ہیں' میں بھی اکبر علی کی طرح راولپنڈی میں رکشہ چلاتا ہوں' میں بھی اکبر علی کی طرح اپنے بھائی کے ساتھ مکان شیئر کرتا ہوں اور ہم بھی اکبر علی کی طرح دو کمروں کے مکان میں تیرہ' چودہ لوگ رہتے ہیں' میں بھی بارہ گھنٹے رکشہ چلاتا ہوں لیکن اس کے باوجود گھر چلانے' بجلی' گیس اور پانی کے بل دینے' بچوں کی سکول فیس ادا کرنے' والدین کیلئے دواؤں کا بندوبست کرنے' کیبل کی فیس دینے اور بچوں کی کتابیں خریدنے سے معذور ہوں۔ میں نے یہ خبر پڑھی' مجھے اکبر علی کے مرنے کا بہت افسوس ہوا لیکن رات کو یہ افسوس خوشی میں تبدیل ہو گیا چنانچہ میں نے اکبر علی جیسی موت مرنے کا فیصلہ کر لیا"۔

میری حیرت پریشانی میں تبدیل ہو گئی' میں نے اس سے پوچھا "اکبر علی کی موت میں خوشی کا پہلو کہاں ہے؟" اس نے قہقہہ لگایا اور سنگل کالم کی ایک دوسری خبر پر بھی سرکل لگا دیا' میں نے آگے جھک کر خبر دیکھی' یہ وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کی طرف سے متاثرہ خاندان کیلئے دس لاکھ روپے امداد کا اعلان تھا۔ میں نے خبر کی تفصیل پڑھی تو پتہ چلا میاں شہباز شریف اکبر علی کی بیوی اور بچی سے ملاقات کیلئے ہسپتال پہنچے' ان کی خیریت معلوم کی اور واپس جاتے ہوئے انہوں نے پنجاب حکومت کی طرف سے متاثرہ خاندان کیلئے دس لاکھ روپے نقد' بچوں کی تعلیم اور علاج کا خرچ برداشت کرنے کا اعلان کر دیا۔ میں نے خبر پڑھ کر اس کی طرف دیکھا' وہ زہریلے

انداز سے بولا ”اکبر علی جیتے جی اپنی بیوی‘ اپنے بچوں کو خوشحال زندگی نہیں دے سکا‘ یہ انہیں علاج اور تعلیم کی سہولت بھی فراہم نہیں کر سکا لیکن اس نے جونہی خودکشی کی پاکستان بھر کا میڈیا اس کے گھر پہنچ گیا‘ وزیراعلیٰ پنجاب خود چل کر اس کی بیوی اور بچوں کے پاس گئے‘ انہوں نے ان کو دس لاکھ روپے بھی دیئے اور تعلیم اور علاج کی سہولت بھی۔ مجھے یقین ہے آج کل میں وفاقی حکومت کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جائے گا اور یہ بھی اکبر علی مرحوم کے زندہ بچ جانے والے بچوں کو پانچ‘ دس لاکھ روپے دے دے گی اور یوں اکبر علی مرنے کے بعد بیس‘ پچیس لاکھ روپے کا مالک ہو جائے گا“ وہ رکا‘ اس نے لمبی آہ بھری اور بولا ”آپ کرغزستان میں مرنے والے پاکستانی طالب علم علی رضا کا معاملہ بھی دیکھئے‘ علی رضا کی نعش واپس آئی تو ہمارے وزیر خارجہ نے نعش کو کندھا دیا‘ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے شور کوٹ میں علی رضا کے گھر فون کیا‘ اس کے والدین کے ساتھ تعزیت کی اور علی رضا کی بہن اور بھائیوں کے تعلیمی اخراجات وفاقی حکومت کی طرف سے ادا کرنے کی یقین دہانی کرائی“ وہ رکا اور دوبارہ بولا ”میں کل سے سوچ رہا ہوں کاش میں علی رضا ہوتا اور میں کرغزستان میں مر گیا ہوتا تو میری نعش بھی جہاز پر واپس آتی‘ وزیر خارجہ میرے تابوت کو کندھا دیتے اور وزیراعظم میرے گھر فون کر کے میرے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری اٹھا لیتے“ مجھے اس کی بات سن کر بڑی تکلیف ہوئی اور میں وہاں سے اٹھنے لگا لیکن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا‘ میں دائیں بائیں کھڑے لوگوں کی وجہ سے چپ چاپ بیٹھ گیا‘ وہ بولا ”میں علی رضا نہیں بن سکا لیکن میں اکبر علی تو بن سکتا ہوں‘ آپ بس میری اتنی مدد کر دیں کہ میں جب خودکشی کر لوں تو آپ اپنی کیمرہ ٹیم میرے گھر بھجوا دیں‘ آپ میری نعش کو بار بار ٹیلی ویژن پر دکھائیں‘ آپ اپنے پروگرام میں‘ اپنے کالم میں بھی میری محروم زندگی کا نقشہ کھینچ دیں‘ مجھے یقین ہے میں آپ کی مدد سے اس ملک کے حکمرانوں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا‘ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور وزیراعلیٰ شہباز شریف میرے گھر پہنچ جائیں گے اور یوں میری نعش کے صدقے میرے بچوں کو دس بیس لاکھ روپے‘ پانچ مرلے کا مکان‘ تعلیم کیلئے فیس اور علاج کی سہولت مل جائے گی چنانچہ وہ تمام سہولتیں جو میں اپنے بچوں کو فراہم نہیں کر سکا وہ ساری نعمتیں انہیں میرے مرنے کے بعد مل جائیں گی۔ آپ مہربانی کریں ”پلیز میری مرنے میں مدد کریں“ میری ہمت جواب دے گئی‘ میں نے نفرت سے اس سے ہاتھ چھڑایا اور بھاگ کھڑا ہوا‘ وہ زور زور سے چلا رہا تھا ”پلیز سر‘ سر پلیز مرنے میں میری مدد کریں‘ میں اکبر علی کی طرح مہنگی موت مرنا چاہتا ہوں“۔

میں دفتر پہنچا‘ میں نے اے سی آن کیا‘ کمرے کے اندر ائر فریشنر کا چھڑکاؤ کیا‘ میز پر رکھی ہوئی پانی کی ٹھنڈی بوتل کھولی‘ ایزی چیئر پر بیٹھا‘ کرسی کا ایک لمبا جھولا لیا اور لمبی سانس کھینچ کر چھت کی طرف دیکھنے لگا‘ میرے اندر اس شخص کیلئے شدید نفرت تھی‘ مجھے محسوس ہو رہا تھا وہ شخص مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کر رہا تھا‘ میں پڑھا لکھا‘ سمجھدار‘ عاقل اور باشعور شخص ہوں اور مجھے جلد سے جلد اس کی جذباتی بلیک میلنگ سے نکل جانا چاہئے‘ میرے سامنے دن بھر کی مصروفیات کی لمبی فہرست تھی‘ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا‘ میرے پاس وقت بھی بہت کم تھا چنانچہ میں نے کام شروع کر دیا لیکن ہر دو منٹ بعد میرے پیٹ کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک آہ سی اٹھتی تھی اور میرے ہونٹوں پر آ کر رک جاتی تھی‘ میں اس آہ سے جان چھڑانے کیلئے کرسی کو پیچھے دھکیلتا‘ کمرے میں

[illegible]
اور مجھے محسوس ہوتا میں ''پلیز سر' سر پلیز'' کی ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں آوازوں کے درمیان کھڑا ہوں اور ان ساری آوازوں نے میرے کپڑے تھام رکھے ہیں' کوئی اکبر علی میرے دامن سے لٹک رہا ہے' کسی نے میرا گریبان پکڑ رکھا ہے' کوئی میرے کف' میری جیب اور میری بیلٹ سے لٹک رہا ہے اور کسی نے میری پتلون کے پائینچے دبوچ رکھے ہیں۔ یہ سب آوازیں' یہ سب لوگ مجھ سے مرنے کیلئے ہیلپ مانگ رہے ہیں' ان سب کی ایک ہی خواہش ہے یہ لوگ جب زہر کھالیں' یہ جب کسی پٹڑی پر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تو میں ان کی چیخ کو وزیر اعلیٰ ہاؤس یا وزیراعظم سیکرٹریٹ تک پہنچادوں تاکہ ان کے لواحقین کی زندگی آسان ہو جائے' انہیں تعلیم' دوا' پلاٹ اور دس' بیس لاکھ روپے مل جائیں' مجھے محسوس ہوا میں ایک ایسے معاشرے میں کھڑا ہوں جس میں ہر دوسرے شخص نے اپنی موت کو بیمہ پالیسی بنالیا ہے' جس میں ہر دوسرا شخص اکبر علی ہے اور ہماری حکومت کو صرف نعشوں کی آوازیں آتی ہیں' اس کے پاس صرف اس بچے کیلئے تعلیم کی سہولت ہے' یہ صرف اس عورت کو علاج کی سہولت دے سکتی ہے اور یہ صرف اس خاندان کیلئے نان نفقے کا بندوبست کر سکتی ہے جس کا والد' جس کا خاوند یا جس کا بیٹا زہر کھا کر کسی ٹیلی ویژن چینل کو فون کر دیتا ہے اور اس کے گھر کیمرہ پہنچ جاتا ہے' ہم سب نعش فروش ہیں۔

خودکشی سے پہلے
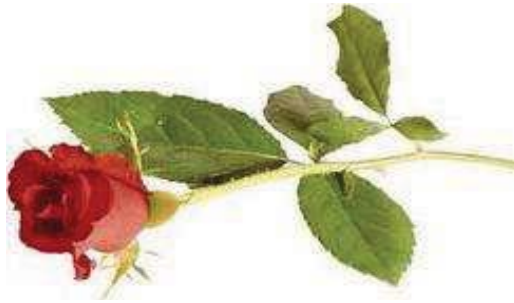
مجھے واپسی پر جہاز میں فیصل آباد کے ایک صاحب مل گئے' یہ ملک کے مشہور صنعت کار تھے' یہ نیم خواندہ تھے لیکن کاروبار کی وجہ سے انگریزی بولنا سیکھ گئے تھے تاہم ان کی حرکات وسکنات' طرز گفتگو اور لوگوں سے مخاطب ہونے کے سٹائل میں ''پینڈو پن'' کی واضح جھلک تھی۔ میرا تجربہ ہے انسان اپنی بیک گراؤنڈ اپنی شکل' اپنے لباس اور اپنے کریڈٹ کارڈ کے پیچھے چھپا سکتا ہے لیکن اس کی زبان اس کے تمام بھید کھول دیتی ہے' انسان کے منہ سے نکلے ہوئے دو لفظ اس کی سات نسلوں تک کی تاریخ بیان کر دیتے ہیں' یہ صاحب بھی جہاز میں اپنے لفظوں سے اپنی خاندانی تاریخ کا اشتہار لگا رہے تھے' میں ان کے ساتھ بیٹھا تھا' میں شروع شروع میں بے انتہا بیزار ہوا لیکن پھر سوچا سات گھنٹے کا سفر اذیت میں گزارنے کی کیا ضرورت ہے' ان کے ساتھ فری ہو کر دیکھتا ہوں چنانچہ میں ان کے ساتھ فری ہو گیا۔ میں بات آگے بڑھانے سے پہلے آپ کو یہ بھی بتا تا چلوں یہ آج سے سات آٹھ سال پرانی بات ہے اور میں فرینکفرٹ سے پاکستان آ رہا تھا' حاجی صاحب مجھے اپنے کاروبار کی نوعیت بتاتے رہے' انہوں نے کاروبار کیسے سٹارٹ کیا' یہ کاروبار کو آگے لے کر کیسے بڑھے' آج کل ٹیکسٹائل انڈسٹری کو کیا کیا چیلنجز در پیش ہیں' گورے پاکستانی صنعت کاروں سے کیا چاہتے ہیں' چین اور انڈیا کس تیزی سے اس فیلڈ میں آگے آ رہے ہیں اور حکومت کو ٹیکسٹائل انڈسٹری کیلئے کیا کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ' وہ تکنیکی' صنعتی اور معاشی گفتگو کرتے چلے گئے اور میں بور ہوتا رہا' اس گفتگو کے دوران اچانک حاجی صاحب نے ایک دلچسپ فقرہ پھینکا' انہوں نے کہا ''میں اگر خودکشی نہ کرتا تو میں آج اتنا کامیاب نہ ہوتا'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا کیونکہ یہ میری زندگی کے پہلے کامیاب شخص تھے جو اپنی کامیابی کا کریڈٹ خودکشی کو دے رہے تھے' میں حاجی صاحب کی کہانی کی طرف جانے سے پہلے آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں دنیا میں نبیوں' ولیوں اور ظالموں کے سوا ہر شخص خودکشی کی کوشش کرتا ہے' ہم اگر اپنے چوبیس گھنٹوں کا تجزیہ کریں تو ہم یہ جان کر حیران رہ جائیں گے ہم چوبیس گھنٹے میں کم از کم دس بار موت کو یاد کرتے ہیں اور اس دوران ایک یا دو مرتبہ خودکشی کے بارے میں بھی سوچتے ہیں' ہم روز خودکشی کی پلاننگ کرتے ہیں لیکن پھر زندگی کی رعنائیاں' زندگی کی خوبصورتیاں اور زندگی کے رنگ ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں اور یوں ہم واپس اپنی ڈگر پر چل پڑتے ہیں تاہم اللہ تعالیٰ نبیوں' ولیوں اور ظالموں کو موت اور خودکشی کے خوف سے آزاد کر دیتا ہے' اس کی وجہ بھی خودکشی ہوتی ہے' نبی اور ولی اپنی ذات کو اللہ کی ذات میں تحلیل کر چکے ہوتے ہیں چنانچہ زندگی اور موت ان کیلئے برابر ہو جاتی ہیں' اسی طرح ظالم اپنے آپ کو ظلم میں اس قدر غرق کر دیتا ہے کہ یہ بھی خودکشی کے بارے میں سوچنا بند کر دیتا ہے' یہ موت کو کسی دوسرے زاویے سے دیکھنے لگتا ہے۔

میں واپس حاجی صاحب کی طرف آتا ہوں' حاجی صاحب نے اپنی زندگی کے ابتدائی ورق پلٹنا شروع کر دیئے' ان کا کہنا تھا' وہ انتہائی غریب تھے' وہ لمبے چوڑے خاندان کے ساتھ 1947ء میں مشرقی پنجاب سے لائل پور (فیصل آباد) پہنچے' انہیں پانچ مرلے کا گھر الاٹ ہوا جس میں یہ تین بھائی' ان کے بارہ بچے' چار بہنیں اور والدین رہتے تھے' بازار اور کارخانے بند تھے' کام تھا نہیں اور گھر میں کھانے پینے کی اشیاء کی شدید قلت تھی' بچے دودھ کی وجہ سے روتے تھے اور ان کی جیب میں دودھ کیلئے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ حاجی صاحب کا کہنا تھا ''میں اس وقت دس

سال کا بچہ تھا‘ میرے بھائیوں اور والد نے کاروبار کی کوشش کی لیکن ناکام رہے‘ ہم سب نے نوکریاں اور مزدوریاں تلاش کیں لیکن ہم کامیاب نہیں ہوئے‘ میں نے دس سال کی عمر میں مزدوری شروع کی اور بیس بائیس سال کی عمر تک اینٹیں‘ روڑی‘ بجری اور سیمنٹ ڈھوتا رہا‘ اس دوران میری شادی بھی ہو گئی‘ مجھے اللہ تعالیٰ نے دو بیٹے بھی دے دیئے لیکن میرے حالات ٹھیک نہ ہوئے‘ غربت کی وجہ سے ہمارے گھر میں لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے‘ ہم سب بہن بھائی اور ہماری بیویاں آٹے‘ دال‘ چاول اور دہی کے لئے ایک دوسرے سے لڑتی تھیں‘ ہمارے بچے بھی ایک دوسرے سے الجھتے رہتے تھے اور ہمارے والدین بھی ہمیں برا بھلا کہتے رہتے تھے‘ میں ان حالات کے ہاتھوں بری طرح تنگ آ گیا چنانچہ ایک دن میرا بیوی کے ساتھ جھگڑا ہوا اور میں نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا‘ میں نے بازار سے زہر خریدا اور یہ زہر لے کر گھر کی چھت پر چڑھ گیا‘ میرا خیال تھا میں زہر پیوں گا اور گھر کی چھت پر کھلے آسمان کے نیچے چپ چاپ دنیا کے غموں سے آزاد ہو جاؤں گا‘ میں نے زہر کی بوتل سامنے رکھی‘ ڈھکن کھولا اور بوتل کو دیکھنا شروع کر دیا‘ یہ نومبر کی ٹھنڈی شام تھی‘ سورج غروب ہو رہا تھا اور میں چھت پر آلتی پالتی مار کر بوتل کے سامنے بیٹھا تھا‘ میری موت دو فٹ اور آدھ گھنٹے کے فاصلے پر تھی‘ میں نے اس کیمیکل کے تین گھونٹ بھرنے تھے اور میں آدھ گھنٹے میں دنیا اور اس کے دکھوں سے آزاد ہو جاتا‘ میں نے بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن بوتل کو چھونے سے پہلے میرے دماغ میں ایک عجیب خیال آیا‘ میں نے سوچا میں کیوں ناں یہ تصور کر لوں کہ میں مر چکا ہوں‘ میں مردوں کی طرح ہر قسم کے دکھ‘ تکلیف‘ افسوس‘ پریشانی‘ اذیت اور بے عزتی سے آزاد ہو چکا ہوں‘ مجھے اب مردوں کی طرح گرمی کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی سردی‘ دھوپ اور دھواں ڈسٹرب کرتا ہے‘ میں یہ سمجھ لوں میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں اور آج سے باقی زندگی بھوت کی طرح گزار دوں گا‘ ایک ایسا بھوت جسے تھکن ہوتی ہے‘ نیند آتی ہے‘ تکلیف ہوتی ہے اور نہ ہی اذیت۔ جو صرف اور صرف کام کرتا ہے‘ چوبیس گھنٹے کام“۔

حاجی صاحب کی کہانی دلچسپ تھی‘ انہوں نے بتایا میں نے زہر کی بوتل چھت پر الٹ دی اور اسی وقت گھر سے نکل کھڑا ہوا‘ میں نے بیوی کے زیور‘ گھر کے برتن اور اپنے کپڑے بیچے‘ مارکیٹ سے کپڑے کے تھان خریدے‘ سائیکل کے کیریئر پر رکھے اور گھنٹہ گھر چوک میں کھڑے ہو کر کپڑا بیچنا شروع کر دیا‘ میں نے کیونکہ دکان کا کرایہ اور سیلز مین کی تنخواہ نہیں دینا تھی چنانچہ میرا کپڑا بازار سے سستا ہوتا تھا لہٰذا گاہک میرا انتظار کرنے لگے‘ اس دوران دکانداروں نے میری توہین کی‘ پولیس نے مجھے ڈنڈے مارے‘ ملوں نے مجھے کپڑا دینے سے انکار کر دیا اور میں سارا سارا دن آوازیں لگانے کے بعد خالی ہاتھ گھر بھی آیا لیکن مجھے کسی تکلیف نے تکلیف نہ دی کیونکہ میں ہر تکلیف یہ سوچ کر سہہ جاتا تھا کہ میں مردہ ہوں‘ میں بھوت ہوں اور بھوتوں اور مردوں کو تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ میرا کام چل نکلا‘ میں سائیکل کے کیریئر سے دکان میں شفٹ ہو گیا‘ دکان سے میں سادہ کپڑے کو رنگ کرانا کے شعبے میں آ گیا‘ میں فیکٹریوں سے کپڑا خریدتا‘ یہ کپڑا رنگ ساز کارخانوں میں لے جاتا‘ وہاں سے اس پر مختلف ڈیزائن بنواتا اور یہ کپڑا بعد ازاں مختلف دکانوں پر بیچ دیتا۔ یہ کام کامیاب ہو گیا‘ میں نے بعد ازاں کپڑے کو رنگ کرنے کا کارخانہ لگا لیا‘ میں بیرون ملک سے کپڑا منگواتا‘ اس کپڑے کا ڈیزائن دیکھتا اور یہ

اور میں نے تیار کپڑا ایکسپورٹ بھی کرنا شروع کر دیا' اللہ نے کرم کیا اور میرا کاروبار پھیلتا چلا گیا' میں چھوٹے گھر سے بڑے گھر اور پرانے محلے سے اچھی ہاؤسنگ سکیم میں آ گیا' میں نے تین چار گاڑیاں بھی خرید لیں' نوکر چاکر بھی رکھ لئے اور آج میں پاکستان کے چند بڑے بزنس مینوں میں شمار ہوتا ہوں۔ حاجی صاحب کا کہنا تھا وہ اگر اس دن خودکشی کا فیصلہ نہ کرتے یا پھر خودکشی سے دو سیکنڈ پہلے خود کو بھوت تسلیم نہ کرتے اور مردہ بن کر اندھی محنت کا فیصلہ نہ کرتے تو وہ آج کامیاب نہ ہوتے۔

حاجی صاحب اسلام آباد اتر کر فیصل آباد روانہ ہو گئے لیکن وہ جاتے ہوئے مجھے سوچ کا ایک نیا زاویہ دے گئے' میں آج جب بھی خودکشی کی کوئی خبر پڑھتا ہوں تو مجھے حاجی صاحب یاد آ جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں اس شخص اور حاجی صاحب میں بس ایک فرق تھا' حاجی صاحب نے زہر پینے کی بجائے محنت کے دریا میں کود کر آسان خودکشی کر لی جبکہ اس شخص نے زہر' پٹڑی' دریا اور گولی جیسا مشکل راستہ منتخب کیا۔ دنیا کا ہر انسان مر جاتا ہے' کوئی بیس سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے' کوئی چالیس' پینتالیس سال کی عمر میں اور کوئی ساٹھ' ستر' اسی سال کی عمر میں انتقال کر جاتا ہے' کوئی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے اور کوئی کسی دوسرے کے انتقام کا نشانہ بن جاتا ہے۔ دنیا میں حضرت موسیٰؑ ہوں یا فرعون دونوں بالآخر اپنے رب کی طرف لوٹ جاتے ہیں' دنیا میں مصائب' مشکلات اور مسائل بھی بہت بڑی حقیقت ہیں' دنیا کا ہر شخص موت کی طرح مسائل کے عمل سے بھی گزرتا ہے لیکن کچھ نا سمجھ' بے وقوف لوگ ان مسائل کو موت کی وجہ بنا لیتے ہیں اور وقت سے پہلے مر جاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر زہر پینے کی بجائے مسائل کا زہر پی لیں' یہ دریا میں کودنے کی بجائے محنت کے دریا میں چھلانگ لگا دیں اور یہ اگر ٹرین سے ٹکرانے کی بجائے حالات سے ٹکرا جائیں تو یہ حاجی صاحب کی طرح کامیاب ہو جائیں' یہ وقت کی چٹان پر اپنے قدم کے نشان چھوڑ جائیں' یہ لوگ خودکشی سے پہلے یہ سوچ لیں آج سے ان کی زندگی ختم ہو گئی ہے اور ان کی باقی زندگی اب حاجی صاحب کی طرح لڑتے لڑتے گزرے گی تو تصویر کے سارے رنگ بدل جائیں۔ میں جب بھی خودکشی کی کوئی خبر پڑھتا ہوں تو سوچتا ہوں کاش اس شخص نے ایک لمحے کیلئے حاجی صاحب کی طرح سوچا ہوتا' کاش اس نے محنت کے دریا میں چھلانگ لگا دی ہوتی تو آج یہ بھی پاکستان کا سب سے بڑا صنعت کار ہوتا کیونکہ محنت بہر حال خودکشی سے آسان کام ہے۔

یہ کیسی عقیدت ہے
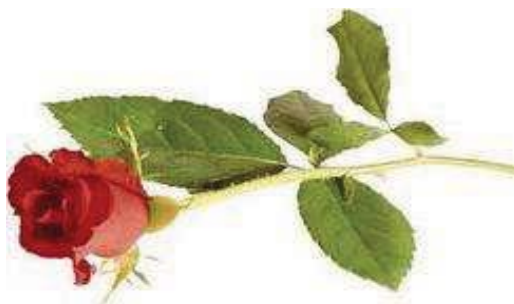
محترمہ بے نظیر بھٹو 27 دسمبر 2007ء کو راولپنڈی میں شہید ہوئی تھیں اور یہ 21 جون 1953ء کو پیدا ہوئی تھیں‘ اس طرح 21 جون 2010ء کو محترمہ کی 57 ویں سالگرہ کا دن تھا‘ قومی اسمبلی کا جاری سیشن ایک دن کیلئے ملتوی کیا گیا اور گڑھی خدا بخش سے اسلام آباد تک محترمہ کی سالگرہ کی سینکڑوں تقریبات منعقد کی گئیں۔ وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی نے اس دن شکرپڑیاں کے مقام پر محترمہ کی یادگار کا سنگ بنیاد رکھا‘ یہ یادگار آرکیٹکٹ یاور جیلانی کی ڈیزائن کردہ ہے اور اس یادگار کے لئے سی ڈی اے نے 10 ایکڑ زمین کا قطعہ دیا جس پر قریباً ایک ارب روپے کی لاگت سے شاندار کمپلیکس بنایا جائے گا‘ یہ کمپلیکس باب بے نظیر‘ دیوار عوام‘ ایوان بے نظیر اور مینار بے نظیر چار حصوں پر مشتمل ہو گا‘ بے نظیر بھٹو کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے یادگار کی دیواروں میں طاقچے بنائے جائیں گے جن میں بعدازاں چراغ جلائے جائیں گے‘ یادگار کی دیواروں پر محترمہ کے اقوال بھی کندہ کئے جائیں گے‘ یادگار میں نرگس کے پھول جیسا ایک تالاب ہو گا‘ یہ تالاب چھوٹے چھوٹے درختوں اور نشستوں میں گھرا ہو گا‘ اس تالاب سے چار چھوٹی چھوٹی ندیاں نکلیں گی اور پانی کے ایک بڑے حوض میں جاگریں گی‘ اس یادگار میں مینار بے نظیر کے نام سے ایک چہار پہلو مینار بھی ہو گا‘ یہ مینار چاروں صوبوں کی نمائندگی کرے گا‘ یہ مینار رات کے وقت ”مینارہ نور“ ہو جائے گا اور اسلام آباد کے باسیوں کو دور سے دکھائی دے گا‘ یہ منصوبہ دو سال میں مکمل ہو گا اور اس کے تمام اخراجات حکومت پاکستان ادا کرے گی۔

میں نے اس منصوبے کی تفصیلات پڑھیں تو میں یادگار کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور میں بے چینی سے اس کی تکمیل کا منتظر ہوں‘ محترمہ بے نظیر بھٹو حقیقتاً دنیا کی عظیم لیڈر تھیں‘ انہوں نے نہ صرف پاکستانی سیاست پر گہرے نقش چھوڑے بلکہ ان کی طلسماتی شخصیت نے پوری دنیا کو بھی متاثر کیا‘ محترمہ کا سیاسی پروفائل اتنا شاندار ہے کہ میری تجویز ہے اس نوعیت کی یادگاریں پاکستان کے چاروں صوبوں اور تمام شہروں میں بننی چاہئیں تاکہ ہماری آئندہ نسلیں یہ یادگاریں دیکھیں‘ محترمہ کی قربانیوں کا احساس کریں اور بعدازاں محترمہ کی زندگی کو اپنے لئے چراغ حیات بنائیں لیکن ساتھ ہی مجھے یہ یادگار محترمہ بے نظیر بھٹو کے اقوال اور فلسفے کی توہین بھی محسوس ہوتی ہے‘ محترمہ بے نظیر بھٹو اور ان کے والد ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کا محور اس ملک کے وہ غریب‘ وہ ہاری اور وہ مزدور تھے جو 50 ڈگری سینٹی گریڈ کی تپتی دوپہروں میں بارہ بارہ گھنٹے کام کرتے ہیں اور شام کو خالی ہاتھ اور خالی دامن اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں‘ محترمہ کی سیاست کا محور اس ملک کے وہ لوگ تھے جن کی نسلیں روٹی‘ کپڑا اور مکان کو چھونے کی آرزو میں دنیا سے گزر جاتی ہیں لیکن ان کی تمام حسرتیں امیروں کی قبر میں دفن ہو جاتی ہیں‘ محترمہ نے پوری زندگی ان لوگوں کو اپنی سیاست کا محور بنائے رکھا جنہیں اس ملک میں 62 سال گزرنے کے بعد بھی صف اول کے شہریوں کا سٹیٹس نہیں ملا‘ جو آج بھی اس ملک میں اپنی شناخت ڈھونڈ رہے ہیں اور جنہیں اکثر اوقات اپنے انسان ہونے پر بھی شک ہو جاتا ہے‘ یہ لوگ صدیوں سے اپنے انسان ہونے کا حق طلب کر رہے ہیں اور اس ملک کا کوئی حکمران انہیں انسانیت کا شرف تک لوٹانے کیلئے تیار نہیں‘ محترمہ اور ان کے والد نے ہمیشہ ان لوگوں کی سیاست کی اور ایسے لیڈروں کی یادگار کے نام پر اس ملک جس کے

75 فیصد عوام غربت کے سینس کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں' جس کے 6 کروڑ 20 لاکھ لوگ خط غربت سے نیچے جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اس ملک کے سرکاری خزانے سے ایک ارب روپے خرچ کر دینا کیا یہ محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی معجزاتی لیڈر شپ کے ساتھ مذاق نہیں ہوگا؟ کیا یہ سیاسی منافقت نہیں ہوگی؟

آپ محترمہ بے نظیر بھٹو کی سینکڑوں یادگاریں بنائیں' وفاقی دارالحکومت کے ساتھ ساتھ چاروں صوبوں اور ملک کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں محترمہ کے نام سے مینار تعمیر کرائیں لیکن اس کیلئے ان لوگوں کے فنڈز پر ڈاکا نہ ڈالیں جن کے لئے محترمہ نے جان دی تھی' آپ اس کیلئے سرکاری وسائل استعمال نہ کریں' آپ محترمہ کی یادگار کیلئے سب سے پہلے پارٹی کے ان عہدیداروں سے چندہ لیں جنہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام پر اربوں روپے کمائے' اس کے بعد آپ پارٹی میں موجود ان تمام گیلانیوں' جیلانیوں' سیدوں' مزاریوں' زرداریوں' بھٹوؤں اور جتوئیوں سے مدد کی درخواست کریں جو پوری زندگی محترمہ کے ٹرکوں میں سوار رہے' جو جئے بھٹو کے نعرے لگاتے رہے اور ان نعروں کے صدقے کروڑوں' اربوں روپے کماتے رہے' اس کے بعد آپ ان سے رابطہ کریں جن پر سرکاری خزانہ لوٹنے یا لٹانے کے الزامات ہیں' اس کے بعد آپ ان خواتین سے رابطہ کریں جن کی انگلیوں میں اچانک لاکھ' ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی ہیرے کی انگوٹھیاں سج گئیں' اس کے بعد آپ ان وزیروں کی جیبیں بھی کھنگالیں جو چھ چھ سرکاری گاڑیوں کے قافلوں میں شہر میں نکلتے ہیں اور ان کی اس ''شرم ناک'' حرکت پر حکومت کے اپنے وزیر خزانہ عبدالحفیظ شیخ 22 جون کو قومی اسمبلی میں چیخ اٹھتے ہیں ''چھ' چھ گاڑیاں رکھنے والے وزیروں کو شرم آنی چاہئے'' اور اس کے بعد آپ پاکستان پیپلز پارٹی کے ان کارکنوں' ان جیالوں اور ان پارٹی ورکروں سے رابطہ کریں جو ذوالفقار علی بھٹو کو اپنا والد اور محترمہ کو اپنی بہن قرار دیتے تھے' مجھے یقین ہے محترمہ بے نظیر بھٹو کا ان لوگوں پر حق ہے اور یہ محترمہ کیلئے ایسی سینکڑوں یادگاریں بناتے دیر نہیں لگائیں گے کیونکہ یہ ظلم ہوگا کہ ملک میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے کروڑوں بھائی موجود ہوں اور آپ غریب عوام کی کمائی یادگار میں جھونک دیں۔ میں نہیں چاہتا کل کا مورخ محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی عظیم لیڈر کی یادگار کے نیچے کھڑا ہو اور مینار بے نظیر کی طرف دیکھ کر پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو یہ طعنہ دے ''آپ کیسے لوگ ہیں' آپ محترمہ کو بہن کہتے رہے لیکن آپ اپنی بہن کو چند اینٹوں کا تحفہ نہ دے سکے''۔

میری دلی خواہش ہے ملک میں محترمہ کی طرح دوسرے لیڈروں کی یادگاریں بھی بنیں' پشاور میں باچا خان کی یادگار بھی بنی چاہئے' ملک کے بعض طبقوں کو ان کی سیاست اور زاویہ سیاست سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک ان کے سیاسی قد کاٹھ کا تعلق ہے ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے' باچا خان ملک کی تیسری چوتھی بڑی سیاسی جماعت کے بانی اور لیڈر تھے اور آج بھی لاکھوں لوگ انہیں اپنا راہنما سمجھتے ہیں۔ میاں محمد شریف میاں برادران کے والد تھے اور پاکستان کی دوسری بڑی سیاسی جماعت کی لیڈر شپ انہیں اپنا ''استاد'' سمجھتی ہے' یہ لوگ اپنے والد کا صرف احترام نہیں کرتے بلکہ ان سے عقیدت بھی رکھتے ہیں چنانچہ لاہور میں میاں محمد شریف کی یادگار بھی بنی چاہئے۔ اسی طرح ڈیرہ اسماعیل خان میں مولانا فضل الرحمان کے والد جناب مفتی محمود کا اعلیٰ شان مزار بھی تعمیر ہونا چاہئے۔ جماعت اسلامی کو اپنے سیاسی راہنما اور بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا مزار بھی تعمیر کرنا چاہئے' پاکستان

مسلم لیگ کو محمد خان جونیجو کی یادگار بنانی چاہیے۔ایم کیو ایم کو کراچی میں اپنے گم نام سپاہیوں کی یادگار تعمیر کرنی چاہیے اور پاکستان مسلم لیگ ق کو بھی چودھری ظہور الٰہی مرحوم کا عالی شان مزار بنانا چاہیے'اس ملک کے کسی شخص کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن اس کیلئے مہربانی فرما کر آپ لوگ اپنی ذاتی گرہ ڈھیلی کریں' آپ کو اگر اپنے لیڈروں سے اتنی ہی عقیدت اور محبت ہے تو آپ چند لاکھ اور چند کروڑ روپے کی قربانی دے کر اس محبت اور اس عقیدت کا عملی ثبوت دیں کیونکہ یہ اس محبت اور اس عقیدت کی توہین ہے کہ آپ اپنے عظیم لیڈروں کو خراج تحسین بھی اس رقم سے پیش کریں جس کیلئے اس ملک میں خودکشیاں ہو رہی ہیں' آپ اپنے عظیم لیڈروں کے مزاروں پر بیٹھے کبوتروں کیلئے عوام کے منہ سے نوالا نکالیں' آپ ان لیڈروں کی یادگاروں پر جھنڈے تک سرکاری خزانے سے لہرائیں اور آپ ان کی روحوں کے ایصال ثواب کیلئے بھی سرکاری قاریوں کا بندوبست کریں۔
یہ کیسی عقیدت ہے' یہ کیسی محبت ہے جو ہمیشہ سرکاری خزانے پر نظریں جمائے رکھتی ہے اور جو اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک سرکاری خزانے کے دروازے نہیں کھلتے۔

ہماری جمہوریت کو کریکٹر چاہیے

جنرل سٹینلے میک کرسٹل بدھ 23 جون 2010ء کی صبح تک افغانستان میں امریکی فوج کے کمانڈر تھے' یہ افغانستان میں بیٹھ کر پاکستان' افغانستان اور ایران کو ''ڈیل'' کر رہے تھے اور انہیں وہی اختیارات حاصل تھے جو نو آبادیاتی دور میں برطانیہ کے وائسراؤں کے پاس ہوتے تھے' جنرل میک کرسٹل کو صدر بارک حسین اوبامہ کی بھرپور حمایت بھی حاصل تھی لیکن پھر جنرل میک کرسٹل سے ایک معمولی سی غلطی ہو گئی' انہوں نے ''رولنگ سٹون'' نام کے ایک میگزین کو انٹرویو دے دیا' اس انٹرویو میں انہوں نے صدر اوبامہ اور ان کی ٹیم کی افغان پالیسی پر دبے دبے لفظوں میں تنقید کی' وائیٹ ہاؤس کی انتظامیہ نے جنرل سے باز پرس کی تو جنرل کو غلطی کا احساس ہو گیا' اس نے حکومت اور صدر اوبامہ سے غیر مشروط معافی مانگ لی لیکن صدر نے انہیں وائیٹ ہاؤس طلب کیا' آدھ گھنٹہ تک تنہائی میں ان کی کلاس لی اور بعد ازاں پوری دنیا کے سامنے برطرف کر دیا' میں آگے بڑھنے سے پہلے آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں افغانستان میں فوجی کامیابی بالخصوص دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکی کامیابیوں کا اسی فیصد کریڈٹ جنرل میک کرسٹل کو جاتا ہے اور ان کامیابیوں کی وجہ سے جنرل میک کرسٹل امریکہ سمیت دنیا بھر کے عسکری حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن ان کے منہ سے دو فقرے نکلنے کی دیر تھی کہ امریکہ کی جمہوریت نے ان کی تمام خدمات فراموش کر دیں اور صدر نے نہ صرف ذلت آمیز طریقے سے جنرل میک کرسٹل کو نوکری سے برطرف کر دیا بلکہ ان سے جہاز' سرکاری گاڑی اور پروٹوکول بھی واپس لے لیا گیا اور وہ ذاتی گاڑی پر وائیٹ ہاؤس سے گھر واپس گئے۔

ہم اگر اس واقعہ کا گہرائی میں جا کر جائزہ لیں تو ہمیں ماننا پڑے گا صدر اوبامہ کو یہ اختیار امریکا کی جمہوریت نے دیا تھا' امریکا کی جمہوریت امریکی نیوی' امریکی فضائیہ اور امریکی فوج سے ہزار گناہ طاقتور ہے جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان کے جمہوری لیڈر اذان تک دینے کیلئے جی ایچ کیو کی طرف دیکھتے ہیں' فوج این آر او اور چیف جسٹس کی بحالی جیسے ایشوز پر بھی اپنی رائے دیتی ہے اور حکومت کے پاس اس رائے کے ''احترام'' کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا' اس ملک میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی جمہوری حکومت ہو یا میاں نواز شریف کی' دونوں کی رخصتی میں فوج کا کردار موجود رہا' میاں نواز شریف کی دوسری ''برطرفی'' اس قدر خوفناک تھی کہ آج بھی جب اس کا تصور کیا جاتا ہے تو جمہوریت کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے' میاں نواز شریف نے 1999ء میں صدر اوبامہ بننے کی کوشش کی' انہوں نے جنرل پرویز مشرف کی برطرفی کا حکم جاری کر دیا' اس کے جواب میں جی ایچ کیو سے تین ٹرک نکلے اور میاں صاحب اپنی دو تہائی اکثریت کے ساتھ مری میں محبوس ہو گئے اور اس کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کے آٹھ سال جدہ اور لندن میں جلاوطنی میں گزار دیئے' ہم اس کے مقابلے میں امریکا کو دیکھتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے' امریکا میں اس وقت ایک ایسا نیم سیاہ فام شخص صدر ہے جس کا نام اسلامی بلکہ ایرانی ہے اور وہ میک کرسٹل جیسے طاقتور سفید فام جنرل کو کان سے پکڑ کر نوکری سے نکال دیتا ہے اور امریکا کا کوئی ادارہ اس پر اف تک نہیں کرتا' پاکستان اور امریکا کی جمہوریت میں اتنا فرق کیوں ہے؟ امریکا کی جمہوریت ہماری ڈیموکریسی کی طرح محتاط کیوں نہیں ہے اور ہماری جمہوریت میں امریکی جمہوریت جیسی جرأت کیوں نہیں؟ یہ آج کا سب سے بڑا سوال ہے اور ہم

جب تک اس کا جواب تلاش نہیں کریں گے ہم اپنی جمہوریت کو زرداری ڈیموکریسی سے اوبامہ ڈیموکریسی تک نہیں لے جا سکیں گے۔

صدر اوبامہ کی جمہوریت کی مضبوطی کی تین بڑی وجوہات ہیں' ایک اوبامہ کا ذاتی کردار' صدر اوبامہ پر آج تک کسی قسم کا کوئی الزام نہیں لگا۔ یہ ہزاروں سال کی مسلمہ حقیقت ہے ایماندار لیڈروں کے فیصلوں سے کوئی شخص' کوئی ادارہ انکار نہیں کر سکتا' دوسرا صدر اوبامہ حقیقتاً عوام کے نمائندے ہیں' یہ عوام کے اصلی ووٹ لے کر اقتدار میں پہنچے ہیں اور ان کے کسی ساتھی پر کرپشن' لوٹ کھسوٹ اور جعلی ڈگری کا کوئی کیس نہیں' دنیا کے کسی ادارے نے ان کے کسی وزیر پر کسی قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا' یہ کلیئر لوگوں کی ٹیم ہے جو دن رات امریکی عوام کے مفادات کی حفاظت کر رہی ہے چنانچہ عوام کی طاقت صدر اوبامہ کے ساتھ ہے اور فوج عوام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ ہے' فوج جانتی ہے اگر اس نے منتخب صدر کے کسی فیصلے سے سر تابی کی جرأت کی تو عوام اسے یونیفارم میں گلیوں میں گھسیٹیں گے اور تین امریکا میں جمہوریت نے عوام کو وہ تمام سہولتیں دے رکھی ہیں جو دنیا کا بڑے سے بڑا آمر بھی معاشرے کو نہیں دے سکتا' امریکا کے تمام شہریوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں' صدر ہو یا جنرل عام آدمی اس کے خلاف نہ صرف عدالت میں جا سکتا ہے بلکہ اسے وہاں سے پورا پورا انصاف بھی ملتا ہے' معاشرہ آزاد اور وسیع القلب ہے' ملک کے شہری جو چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں' وہ جو نظریہ جو فرقہ چاہیں اختیار کر سکتے ہیں اور امریکا کا کوئی قانون ان کی اس پسند کے راستے میں حائل نہیں ہوتا' جمہوریت کی وجہ سے لوگوں کو روٹی بھی مل رہی ہے' مکان بھی' کپڑا بھی' صحت کی سہولت بھی' تعلیم بھی اور روزگار بھی چنانچہ لوگ جانتے ہیں امریکا میں جمہوریت ہے سلب تو یہ ساری عیاشیاں موجود ہیں' جس دن ملک سے جمہوریت رخصت ہو گی اس دن ان کی یہ تمام آزادیاں ہو جائیں گی اور یہ لوگ بادشاہوں کے دور میں واپس چلے جائیں گے چنانچہ یہ اپنے جمہوری لیڈروں کے اس قسم کے تمام فیصلوں کو سپورٹ کرتے ہیں جبکہ امریکا کے مقابلے میں پاکستان جیسے ممالک میں اس سے بالکل الٹ ہوتا ہے' ہماری جمہوری لیڈر شپ پر کرپشن سے لے کر الیکشن میں دھاندلی تک بے شمار الزامات ہوتے ہیں اور یہ لوگ ان الزامات کے ساتھ نہایت ڈھٹائی سے حکومت کرتے چلے جاتے ہیں' یہ لوگ جان بوجھ کر کرپٹ اور بے ایمان لوگوں کی ٹیم بناتے ہیں اور یہ ٹیم حکومت میں پہنچ کر خود بھی خوب لوٹتی ہے اور اپنے لیڈر کی دولت میں بھی اضافہ کرتی چلی جاتی ہے۔

تیسرا ہمارے نمائندے عوام کے حقیقی نمائندے نہیں ہوتے' ہمارا انتخابی نظام اس قدر بدبودار ہو چکا ہے کہ اس سے صرف بدترین لوگ ہی باہر نکلتے ہیں' آپ جعلی ڈگریوں کا ایشو دیکھ لیجئے' ملک میں اس وقت 160 ارکان اسمبلی کی ڈگریاں جعلی ہیں' تعلیم کی سٹینڈنگ کمیٹی کے چیئرمین عابد شیر علی نے ارکان اسمبلی کی ڈگریوں کی تصدیق شروع کی تو حکومت نے ہائر ایجوکیشن کمیشن کو ڈگریوں کی تصدیق سے روک دیا' عدالت جعلی ڈگری ہولڈرز سے استعفے لیتی ہے تو سیاسی جماعتیں ان لوگوں کو دوبارہ پارٹی ٹکٹ دے دیتی ہیں' ملک کے تمام حلقوں میں منڈیاں لگی ہیں، چنانچہ لوگ ایسی جمہوریت کا کیسے احترام کریں گے اور تین پاکستان جیسے ملکوں میں عوام کو جمہوری ادوار کے مقابلے میں فوجی آمریتوں میں زیادہ آزادیاں اور زیادہ سہولتیں ملتی ہیں' آمریت میں کرپشن کی شرح بھی کم ہو جاتی ہے' اشیاء صرف کی بھی بہتات ہو جاتی ہے' ملک میں روپے پیسے کی ریل پیل بھی ہو جاتی ہے اور ترقیاتی

منصوبے بھی شروع ہو جاتے ہیں جبکہ جمہوری ادوار میں ترقیاتی منصوبے بھی رک جاتے ہیں' غیر ملکی سرمایہ کار بھی ملک سے بھاگ جاتے ہیں' اشیائے ضرورت کی قلت بھی ہو جاتی ہے اور عوام کی آزادی بھی کم ہو جاتی ہے چنانچہ اول ہمارے کرپٹ سیاستدان کسی جنرل کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتے اور دوم اگر یہ نواز شریف کی طرح ایسی جرأت کر بیٹھیں تو جنرل الٹا انہیں فارغ کر دیتے ہیں اور عوام اس واقعے پر مٹھائیاں بانٹنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ ہم اگر پاکستان کی جمہوریت کو امریکی جمہوریت کی طرح طاقتور دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی سیاست میں کریکٹر پیدا کرنا ہو گا' ہمیں اقتدار ان لوگوں کے حوالے کرنا ہو گا جو عوام کے صحیح نمائندے ہوں' جن کا دامن ہر قسم کے داغوں سے پاک ہو اور جن کا ایجنڈا ذات کی بجائے قوم ہو۔

ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا ہم کریکٹر کے بغیر اس جمہوریت کو بچا سکتے ہیں اور نہ ہی چلا سکتے ہیں اور جب تک ہماری جمہوریت میں کریکٹر پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک یہ جمہوریت آمریت کے خوف سے آزاد ہو گی اور نہ ہی یونیفارم کی محتاجی سے نکلے گی۔
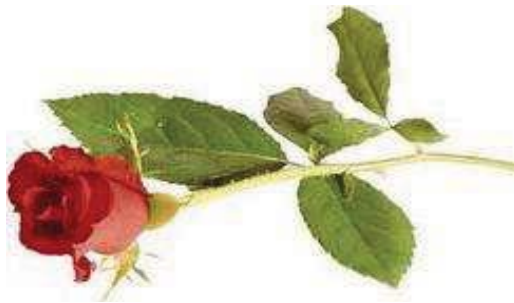
ساری پولیس بری نہیں

ہم پہلے گکھڑ منڈی پہنچے اور بعد ازاں گجرات شہر ‘گکھڑ منڈی کے تھانے کے صحن میں شہر کی ساری پولیس جمع تھی جبکہ ان سے دو فٹ کے فاصلے پر شہر کے سینکڑوں معززین بیٹھے تھے ‘ان معززین میں شہر کے علماء کرام بھی تھے ‘بزنس مین بھی اور اساتذہ ‘وکلاء ‘دانشور اور صحافی بھی ‘پروگرام کی نظامت کا فریضہ تھانے کا ایس ایچ او ادا کر رہا تھا ‘ایس ایچ او نے اپنی تقریر کے دوران یہ حلف دیا کہ میرے تھانے میں کوئی اہلکار آج سے رشوت نہیں لے گا اور اگر کسی اہلکار نے یہ حرکت کی تو اس کی ذمہ داری میرے اوپر عائد ہوگی ‘اس کے بعد تمام پولیس اہلکار اپنی اپنی نشستوں سے اٹھے ‘انہوں نے ہاتھ ہوا میں بلند کئے اور اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر جان کر عہد کیا کہ یہ رشوت لیں گے ‘کسی سے زیادتی کریں گے اور نہ ہی کسی کے ناجائز دباؤ میں آئیں گے ‘انہوں نے یہ حلف بھی اٹھایا کہ یہ اپنے بچوں کو رزق حلال کھلائیں گے ‘اس کے بعد عالم دین سٹیج پر آئے ‘انہوں نے رزق حلال کی افادیت بیان کی اور اس کے بعد تمام شہریوں سے یہ حلف لیا کہ یہ آج کے بعد تھانے کے کسی اہلکار کو رشوت نہیں دیں گے ‘یہ کسی کے خلاف جھوٹا مقدمہ بھی قائم نہیں کریں گے اور یہ کسی پولیس اہلکار پر سیاسی اور سماجی دباؤ ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے ‘میں یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا ‘گکھڑ منڈی کے بعد ہم گجرات شہر آ گئے ‘گجرات میں تھانہ سول لائنز کے اہلکار اور شہری جمع تھے ‘وہاں بھی حلف برداری کی تقریب ہوئی ‘گجرات کے ڈی پی او طارق قریشی بھی وہاں موجود تھے ‘یہ دونوں مناظر حیران کن تھے ‘میں اسلام آباد سے جاتے ہوئے ورلڈ ریکارڈ ہولڈر علی معین نوازش کو بھی ساتھ لے گیا تھا ‘علی بھی گوجرانوالہ ریجن کی پولیس کے اس "اپنی ٹیٹو" سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

یہ بنیادی طور پر گوجرانوالہ کے آر پی او ذوالفقار چیمہ کا منصوبہ ہے ‘میں ذوالفقار چیمہ کو چودہ پندرہ سال سے جانتا ہوں ‘یہ پولیس افسروں کے روایتی تصور سے مختلف انسان ہیں ‘یہ ایمانداری کے ساتھ ساتھ مہارت اور بہادری میں بھی مقبول ہیں چنانچہ یہ عموماً اس قسم کے اقدامات کر گزرتے ہیں جن کے بارے میں دوسرے پولیس افسر سوچتے رہ جاتے ہیں ‘پاکستان میں پولیس ‘رشوت اور بدتمیزی تینوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں ‘ہم میں سے کوئی شخص یہ یقین کرنے کیلئے تیار نہیں ہے کہ پولیس اہلکار ہو اور وہ رشوت نہ لے یا کوئی شخص پولیس سروس میں ہو اور وہ دوسرے شخص سے عزت اور تکریم کے ساتھ گفتگو کرے ‘پولیس کا یہ تصور قریباً سو سال پرانا ہے اور ان سو برسوں میں معاشرے نے اس کو حقیقت کی شکل دے دی ہے چنانچہ اس ملک کے پچانوے فیصد لوگوں کا خیال ہے جب تک کوئی پولیس اہلکار دو چار ہزار روپے نہ لے وہ اس وقت تک آپ کا جائز کام بھی نہیں کرتا اور دوسرا وہ پولیس اہلکار جو کھڑے ہو کر کسی عام شخص کا استقبال کرے ‘وہ اسے جی جناب اور سر کہہ کر مخاطب ہو یا اس کو انسان ہونے کا درجہ دے وہ یقیناً بیمار ہو گا اور اس کے دماغی توازن کا مشاہدہ ضروری ہو جائے گا ‘ذوالفقار چیمہ نے اپنی ٹیم کے ذریعے پولیس کا یہ تصور توڑنے کا فیصلہ کر لیا ‘انہوں نے تقریباً سال بھر سے گوجرانوالہ پولیس کی تربیت شروع کر رکھی ہے ‘انہوں نے شروع میں تمام ایس ایچ اوز کو رشوت کی لعنت سے پاک کرنے کا سلسلہ شروع کیا ‘ملک کے نامور علماء کرام کے لیکچر کروائے ‘نفسیات دانوں کے سیشنز کرائے اور سماجی دباؤ ڈالنے

لیلئے پولیس افسروں کے عزیزوں اور رشتے داروں کی مدد لی‘ ذوالفقار چیمہ نے رشوت خور افسروں کے خلاف خوفناک محکمانہ کارروائیاں بھی کیں‘ انہوں نے 703 راشی افسروں اور اہلکاروں کو سخت سزائیں دیں‘ ان میں سے بے شمار افسر نوکریوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے ‘ محکمانہ کارروائیوں کے دوران ”ملزم“ افسروں نے سیاستدانوں سے سفارشیں کرائیں تو آر پی او نے نہ صرف ان سیاستدانوں کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ انہوں نے سیاستدانوں کی بھرپور ”مذمت“ بھی کی یوں خوف ‘ تبلیغ اور ترغیب نے کام دکھایا اور گوجرانوالہ ریجن میں تبدیلی کے آثار دکھائی دینے لگے ‘اس تبدیلی کے آخری مرحلے پر معززین کی موجودگی میں پولیس اہلکاروں کی حلف برداری کی تقریبات شروع ہوئیں‘ تھانے سے وابستہ تمام اہلکار سینکڑوں شہریوں کی موجودگی میں رشوت نہ لینے کا حلف اٹھاتے ہیں‘ اس کے بعد شہریوں سے بھی یہ حلف لیا جاتا ہے کہ وہ بھی کسی اہلکار کو رشوت دینے کی کوشش نہیں کریں گے ‘ شہریوں اور پولیس اہلکاروں کے اس حلف کی باقاعدہ فلم بنائی جاتی ہے تاکہ کل کو اگر کوئی اہلکار رشوت لے یا کوئی شہری کسی اہلکار کو رشوت کی پیش کش کرے تو اسے شرمندگی کا احساس بھی ہو اور اس کے اعصاب پر ریکارڈنگ کا خوف بھی رہے۔

میں نے یہ دو تقریبات دیکھیں‘ مجھے معلوم ہوا اس نوعیت کی تقریبات گوجرانوالہ ریجن کے تمام تھانوں میں منعقد ہو رہی ہیں اور اس کے اچھے اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں‘ میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتا ان اقدامات سے گوجرانوالہ ریجن میں پولیس رشوت لینا بند کر دے گی یا ماحول صاف ستھرا ہو جائے گا لیکن اچھائی کی طرف بڑھنے کے تمام امکانات بھی مسترد نہیں کیے جا سکتے‘ ہو سکتا ہے اس اقدام سے دس فیصد پولیس اہلکار ہی سدھر جائیں اور یہ ایک بڑی کامیابی ہو گی‘ معاشروں میں سو فیصد لوگ اچھے ہوتے ہیں اور نہ ہی سو فیصد برے ‘ معاشروں کے زیادہ سے زیادہ بیس فیصد لوگ اچھے اور ایماندار ہوتے ہیں اور بیس فیصد بے ایمان اور برے ہوتے ہیں جبکہ باقی ساٹھ فیصد لوگوں کی کوئی رائے اور کوئی مزاج نہیں ہوتا‘ یہ لوگ نیوٹرل سٹیزن کہلاتے ہیں‘ اگر معاشرے کے بیس فیصد اچھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے تو یہ ساٹھ فیصد ”نیوٹرل“ لوگ بھی اچھے ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اگر بیس فیصد برے لوگوں کی تعداد بڑھ جائے تو ساٹھ فیصد نیوٹرل لوگ بھی برے ہونے لگتے ہیں اور یوں معاشرہ خراب ہونے لگتا ہے‘ کسی بھی معاشرے نے اپنے آپ کو صاف‘ ستھرا اور خوبصورت رکھنے کیلئے اپنے بیس فیصد اچھے لوگوں کو نہ صرف قائم رکھنا ہوتا ہے بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ بھی کرنا ہوتا ہے‘ اگر ان نیک اور اچھے لوگوں کی تعداد بڑھتی رہے تو اس کا اثر ساٹھ فیصد نیوٹرل لوگوں پر پڑنے لگتا ہے اور یوں معاشرہ پاک صاف‘ متحرک اور خوبصورت ہو جاتا ہے‘ ذوالفقار احمد چیمہ کا یہ اقدام بھی پولیس کے اندر اچھے کلچر کی ترویج ہے‘ یہ پولیس سروس میں موجود اچھے لوگوں کو نہ صرف قوت دے رہے ہیں بلکہ ان کی تعداد میں اضافے کی کوشش بھی کر رہے ہیں اور ظاہر ہے اس کا نتیجہ اچھا ہی نکلے گا‘ میری ذاتی رائے ہے یہ ایک اچھا اقدام ہے چنانچہ تمام صوبائی حکومتوں کو ”گوجرانوالہ ماڈل“ کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اپنے تمام آر پی اوز کو حکم دینا چاہیے وہ بھی اس ماڈل کے تحت اپنے اپنے علاقے میں پولیس ریفارمز کریں‘ اس سے پولیس کا کلچر بھی تبدیل ہو جائے گا اور شہریوں کا پولیس کے بارے میں رویہ بھی بدل جائے گا۔

انسان اللہ تعالیٰ کی حسین ترین تخلیق ہے اور آسان ترین بھی' آپ اگر ان کے جذبوں اور خواہشوں کو کھلا چھوڑ دیں تو یہ پوری دنیا کو آگ لگا دیتا ہے اور آپ اگر اس پر توجہ دیں' اس کو محبت اور پیار دیں' اس کی تربیت کر دیں اور اسے اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت دے دیں تو یقین کیجئے یہ پاکیزگی' طہارت اور نیکی میں وہاں تک چلا جاتا ہے جہاں فرشتے بھی اس کی بیعت پر مجبور ہو جاتے ہیں' پولیس بھی کیونکہ انسان ہوتی ہے چنانچہ اس کے بھی اچھے اور نیک ہونے کے اتنے ہی امکانات ہوتے ہیں جتنے دوسرے عام انسانوں کے ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں پولیس کو بھی سدھرنے کا موقع ضرور دینا چاہیے' ہمیں ان لوگوں کو بھی نیک ہونے کا موقع ضرور فراہم کرنا چاہیے بالکل اسی طرح جس طرح ذوالفقار احمد چیمہ گوجرانوالہ ریجن کی پولیس کو دے رہے ہیں۔

اصل طاقت بہر حال عوام ہوتے ہیں

خالد حسن مرحوم پاکستان کے نامور صحافی تھے' یہ سول سرونٹ تھے' انہوں نے سرکاری نوکری چھوڑی' صحافت کی کوچہ گردی کی' ذوالفقار علی بھٹو کے عشق میں مبتلا ہوئے' ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تو یہ ان کے پریس سیکرٹری بن گئے' انہوں نے بھٹو صاحب اور اقتدار دونوں کو قریب سے دیکھا' اقتدار کی نوکیلی راہ گزر پر چلتے چلتے جب وہ تھک گئے تو فارن سروس جوائن کر لی' لندن اور پیرس میں خدمات سرانجام دیں' وہ وہاں سے بھٹو صاحب کو کتابیں اور سوٹ خرید کر بھجواتے تھے' جنرل ضیاء الحق کا دور آیا تو یہ دوبارہ صحافت میں آ گئے اور اس کے بعد آخری سانس تک صحافت سے رشتہ جوڑے رکھا' میرا ان کے ساتھ نیاز مندی کا تعلق تھا' میں 2001ء میں امریکا گیا تو ملیحہ لودھی کے گھر ان سے ملاقات ہوئی' وہ جب بھی پاکستان آتے تھے میری ان سے ملاقات ضرور ہوتی تھی' میں نے اس نوعیت کی ایک ملاقات میں ان سے بھٹو صاحب کے آخری دنوں کے بارے میں پوچھا تو خالد حسن صاحب نے عجیب بات بتائی' ان کا کہنا تھا ذوالفقار علی بھٹو عوام کے کندھوں پر بیٹھ کر اقتدار میں آئے تھے' ان کے پاس ملک کے بہترین لوگوں کی ٹیم بھی تھی لیکن اقتدار میں پہنچ کر ان سے دو غلطیاں ہوئیں' ایک' وہ عوام کی بجائے فوج اور خفیہ ایجنسیوں کو اپنے اقتدار کا ماخذ سمجھ بیٹھے' وہ عوام سے دور اور اسٹیبلشمنٹ کے نزدیک ہو گئے' دو' انہوں نے اپنے مخلص ساتھیوں کو پارٹی سے نکال دیا اور جو باقی بچے انہیں پچھلے بنچوں پر دھکیل دیا اور ان کی جگہ ''واہ واہ گروپ'' نے لے لی' یہ وہ خوشامد پرست لوگ تھے جن کا ایک ہی کام تھا بھٹو صاحب کی ہر غلطی پر دل کھول کر داد دینا' یہ لوگ بھٹو صاحب کو ہمیشہ غلط مشورہ دیتے تھے لہٰذا وہ وقت آتے دیر نہ لگی کہ وہ شخص جو ملک کے ہر غریب شہری کا لیڈر تھا وہ جیل میں تھا اور لوگ اس کیلئے سڑکوں پر نکلنے کیلئے تیار نہیں تھے' خالد حسن کا کہنا تھا بھٹو صاحب جیل پہنچے تو تمام ابن الوقت فرار ہو گئے' بھٹو صاحب کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ بار بار کہتے تھے ''مجھے اگر دوبارہ موقع ملا تو میں اقتدار کے اصل ماخذ یعنی عوام کی طرف جاؤں گا' عوام کا اعتماد حاصل کروں گا اور اس ملک میں اصلی انقلاب لے کر آؤں گا'' خالد حسن صاحب کا کہنا تھا ''لیکن وقت کا پہیہ آگے جا چکا تھا' وقت کسی کی پرواہ نہیں کرتا' خواہ وہ شخص ذوالفقار علی بھٹو ہی کیوں نہ ہو''۔

خالد حسن مرحوم کی یہ بات پاکستان میں جمہوریت کا نوحہ ہے' جمہوریت میں اصل طاقت بہر حال عوام ہوتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کے جمہوری لیڈر منتخب ہونے کے بعد عوام سے دور ہو جاتے ہیں اور فوج' خفیہ ایجنسیوں اور خوشامدیوں میں گھر جاتے ہیں اور آخر میں جب اقتدار کا غبارہ پھٹتا ہے تو یہ حیرانی سے دائیں بائیں دیکھنے لگتے ہیں' اس وقت انہیں عوام کی طاقت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن وقت کا پہیہ بہت آگے جا چکا ہوتا ہے اور ذوالفقار علی بھٹو ہوں' بے نظیر بھٹو ہوں یا میاں نواز شریف ہوں وقت کسی کیلئے واپس نہیں پلٹتا' پاکستان پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے' پاکستان کی تاریخ میں صدر آصف علی زرداری ذوالفقار علی بھٹو کے بعد دوسرے خوش قسمت ترین لیڈر ہیں جنہیں حکومت کا آئیڈیل وقت ملا' صدر زرداری کے سامنے بھی بھٹو صاحب کی طرح کوئی چیلنج نہیں' فوج اپنی ساکھ کی بحالی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بری طرح مصروف ہے' میاں نواز شریف حکومت کو پورے پانچ سال دینا چاہتے ہیں' امریکا اور یورپ کو پاکستان میں لبرل

اور ماڈرن لوک چاہیں اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سوا کوئی سیاسی جماعت اس وقت اس ''کرائی ٹیریا'' پر پوری نہیں اترتی اور محترمہ کی شہادت کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی بھی قیادت کے شدید بحران میں مبتلا ہے اور اس بحران میں صدر آصف علی زرداری کے سوا پارٹی کے پاس کوئی آپشن نہیں لہٰذا پارٹی کے اندر بھی کسی قسم کی سازش کا امکان نہیں' ان حالات میں صدر آصف علی زرداری اور پاکستان پیپلز پارٹی نے چند ایسے اچھے اقدامات بھی کئے ہیں جو اس سے پہلے ملک میں نہیں ہوئے ہیں اور حکومت کا ناقد ہونے کے باوجود میرے جیسا شخص بھی ان اقدامات کے اعتراف پر مجبور ہے' اس میں کوئی شک نہیں صدر آصف علی زرداری نے تمام سیاسی جماعتوں کو اقتدار کا سٹیک ہولڈر بنا دیا' موجودہ دور میں جہاں پاکستان مسلم لیگ ن پنجاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کی اتحادی ہے وہاں سندھ میں ایم کیو ایم' بلوچستان میں پاکستان مسلم لیگ ق' خیبر پختونخواہ میں اے این پی اور وفاق میں جے یو آئی ایف پاکستان پیپلز پارٹی کی کولیشن پارٹنر ہے' اس قسم کا سیاسی اتحاد آج سے پہلے پاکستان کی تاریخ میں نظر نہیں آتا' پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار متشدد اسلامی گروپوں کا زور بھی ٹوٹ رہا ہے' ان لوگوں کی ''پبلک سپورٹ'' کم ہو رہی ہے' ہمیں حکومت کو اس کا کریڈٹ دینا ہو گا' اس حکومت نے این ایف سی ایوارڈ کیا' یہ بھی اس کی بڑی اچیومنٹ ہے' اٹھارہویں ترمیم کا کریڈٹ بھی ہمیں موجودہ حکومت کو دینا پڑے گا' پچھلے ہفتے سارک کے وزراء داخلہ کی کانفرنس ہوئی' یہ کانفرنس وزیر داخلہ رحمٰن ملک کی کوششوں کا نتیجہ تھی' ممبئی واقعات کے بعد یہ بھارت اور پاکستان کے درمیان پہلا بڑا بریک تھرو ہے اور ہمیں بھارتی وزیر داخلہ چدم برم کی پاکستان آمد اور خوش خوش واپس جانے کا کریڈٹ بھی حکومت اور رحمٰن ملک کو دینا ہو گا' حکومت کو مغربی ممالک اور امریکا کی بھرپور سپورٹ بھی حاصل ہے اور آج کے دور میں یہ سپورٹ بھی چھوٹی بات نہیں اور ان حالات میں امریکا اور مغربی ممالک کے دباؤ کے باوجود ایران کے ساتھ گیس پائپ لائن کا سمجھوتہ اور چین سے نیوکلیئر ڈیل بھی ایک کارنامے کی حیثیت رکھتی ہے اور ہمیں حکومت کو ان اقدامات کا کریڈٹ دینا ہو گا کیونکہ مستقبل کا مورخ موجودہ حکومت کی ان کوششوں اور کارناموں کے اعتراف پر مجبور ہو جائے گا لیکن ان بڑے بڑے کارناموں کے باوجود حکومت عوام کے دل تک نہیں پہنچ سکی' عوام اس سے خوش نہیں ہیں۔

عوام حکومت سے خوش کیوں نہیں ہیں' اس کی تین چار موٹی موٹی وجوہات ہیں' پہلی وجہ عوام سے دوری ہے' یہ حکومت عوام کے ووٹوں سے اقتدار میں آئی تھی اگر عوام 2008ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کے تابوت کو ووٹ نہ دیتے تو آج ملک میں چودھری پرویز الٰہی وزیراعظم ہوتے اور پرویز مشرف صدر اور پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان مسلم لیگ ن کے ساتھ اپوزیشن کے بنچوں پر بیٹھی ہوتی لیکن عوام نے 2008ء کے الیکشنوں میں مسلم لیگ ق اور پرویز مشرف کی ساری منصوبہ بندی الٹ دی لہٰذا پاکستان پیپلز پارٹی آج اقتدار کے ایوانوں میں براجمان ہے لیکن ملک کے سابق حکمرانوں کی طرح اقتدار کے تخت پر بیٹھ کر پاکستان پیپلز پارٹی کے وزراء نے عوام سے تعلق توڑ دیا' آج روزانہ ملک میں بچوں کے ساتھ خودکشی کی خبریں نکلتی ہیں مگر وزراء کو اس مسئلے سے کوئی غرض نہیں' عوام حکومت اور عدلیہ کے درمیان محاذ آرائی پر بھی خوش نہیں ہیں' عوام کا خیال ہے حکومت کو عدلیہ کے فیصلوں کا احترام کرنا چاہیے تاکہ ملک میں قانون اور انصاف کی حکمرانی ہو' عوام بڑھتی ہوئی مہنگائی' بے روزگاری' لوڈشیڈنگ' ٹیکسوں کے بھار اور امیر اور غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے پر بھی پریشان ہیں'

روزگاری ان ڈائریکٹ ٹیکسوں کی بھرمار اور امیر اور غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں پر بھی پریشان ہیں عوام حکومتی حلقوں سے نکلنے والی کرپشن کی کہانیوں پر بھی ناراض ہیں اور لوگوں کو لوڈ شیڈنگ ' پانی کی کمی اور ملک کے اندر غیر ملکی مداخلت پر بھی پریشانی ہے چنانچہ حکومت کو خوشامدیوں اور نالائق مشیروں سے باہر نکل کر عوام کی حالت زار پر توجہ دینی چاہیے ' یہ صحیح ہے حکومت کیلئے بڑی سیاسی کامیابیاں ضروری ہوتی ہیں لیکن ان کے ساتھ حکومت کی ترجیحات میں عوام بھی شامل ہونے چاہئیں کیونکہ جب عوام حکمرانوں سے دور ہوتے ہیں تو ذوالفقار علی بھٹو جیسی وہ کرشماتی شخصیت بھی مار کھا جاتی ہے جنہوں نے نہ صرف ملک کو آئین دیا تھا بلکہ عالم اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے پوری دنیا کے ایوانوں میں زلزلہ بھی برپا کر دیا تھا اگر سیاسی کامیابیاں سب کچھ ہوتیں تو بھٹو صاحب آج تک اس ملک کے حکمران ہوتے کیونکہ بھٹو صاحب نے اس ملک کی تاریخ میں سب سے زیادہ سیاسی کامیابیاں حاصل کی تھیں ' انہوں نے پاکستان کو نہ صرف پہلی اسلامی نیوکلیئر طاقت بنایا تھا بلکہ ملک کو متفقہ آئین بھی دیا تھا اور اقوام عالم میں اس کی توقیر بھی بلند کی تھی لیکن پھر کیا ہوا ' عوام کی سانسوں میں بسنے والا بھٹو اپنی اصل طاقت یعنی عوام سے دور ہو گیا ' فوج نے اس دوری کا فائدہ اٹھایا اور عوام فخر ایشیا کا جنازہ تک نہیں پڑھنے دیا ' صدر آصف علی زرداری نے بلاشبہ بے شمار سیاسی کامیابیاں حاصل کی ہیں ' یہ مزید کامیابیاں بھی حاصل کر سکتے ہیں لیکن انہیں سیاسی کامیابیوں کی اس واہ واہ کے درمیان عوام کو بھی یاد رکھنا چاہیے کیونکہ اصل طاقت بہر حال عوام ہوتے ہیں اور آپ عوام کو ناراض کر کے کامیابیوں کے انبار بھی لگا دیں تو بھی آپ اقتدار کی گرتی دیواروں کو نہیں سنبھال سکتے۔

ابھی یا کبھی نہیں
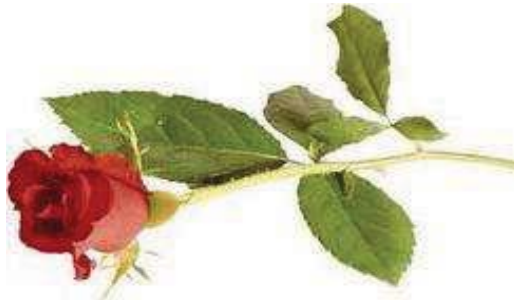
ہم بات آگے بڑھانے سے پہلے 2008ء کے الیکشن کا ایک پہلو ڈسکس کریں گے' میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف 25 نومبر 2007ء کو پاکستان پہنچے اور انہوں نے ان تمام امیدواروں کو پاکستان مسلم لیگ ن کے ٹکٹ دے دیئے جنہوں نے محض اپلائی کیا تھا' میاں برادران اس دور میں اپنے امیدواروں کے ناموں اور شکلوں تک سے واقف نہیں تھے' یہ جلد بازی میں کیا گیا فیصلہ تھا اور میاں برادران کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا' میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف الیکشن کا بائیکاٹ کرنا چاہتے تھے' ان کا خیال تھا یہ نو سال ملک سے باہر رہے' اس دوران پارٹی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی' پرانے ساتھی ساتھ چھوڑ گئے اور اوپر سے جنرل پرویز مشرف' چودھری پرویز الٰہی اور محترمہ بے نظیر بھٹو کا نیا سیاسی اتحاد بن گیا چنانچہ پاکستان مسلم لیگ ن کی کامیابی کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا' مجھے اس دور میں مسلم لیگ ن کے بڑے بڑے جید لیڈر بتاتے تھے "ہم بیس سے زیادہ سیٹیں نہیں لے سکیں گے" یہ لوگ یہ اعتراف بھی کرتے تھے "ہم پنجاب میں حکومت نہیں بنا سکیں گے" میں وجہ پوچھتا تھا تو یہ کہتے تھے "چودھریوں نے پنجاب کو توڑ مروڑ کر اپنی جیب میں ڈال رکھا ہے' یہ ہمیں کامیاب نہیں ہونے دیں گے" چنانچہ میاں برادران کی خواہش تھی الیکشن ملتوی ہو جائیں یا پھر تمام سیاسی جماعتیں الیکشن کا بائیکاٹ کر دیں۔ میاں صاحبان کا خیال تھا اگر الیکشن ملتوی ہوئے تو اس کا فائدہ پاکستان مسلم لیگ ن کو ہو گا' محترمہ بے نظیر بھٹو جنرل پرویز مشرف کے ساتھ اتحاد کر چکی ہیں' یہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اور ججوں کی برطرفی کے معاملے میں پرویز مشرف پر تنقید نہیں کریں گی' یہ دونوں ایشوز عوامی ہیں' عوام ججوں کی بحالی بھی چاہتے ہیں اور پرویز مشرف کے جنگی تصور سے بھی جان چھڑانا چاہتے ہیں' میاں صاحبان کو یہ بھی صاف دکھائی دے رہا تھا فوج اپنے چیف (پرویز مشرف) کے ساتھ نہیں رہی' یہ اب اس سے جان چھڑانا چاہتی ہے لہٰذا پاکستان مسلم لیگ ن کے لئے میدان خالی ہو گا' میاں برادران پارٹی کو آرگنائز کر لیں گے' یہ پرویز مشرف کے خلاف تقریروں اور ججوں کے ساتھ ہمدردی کے ذریعے عوامی پذیرائی بھی سمیٹ لیں گے اور یوں پاکستان مسلم لیگ ن پارلیمنٹ میں بڑی پارٹی بن کر ابھر آئے گی' محترمہ بے نظیر بھٹو بھی اس صورتحال کو سمجھتی تھیں' وہ جانتی تھیں وہ این آر او جیسے سمجھوتوں کے باعث پرویز مشرف کو ٹارگٹ نہیں کر سکیں گی اور اس کا فائدہ پاکستان مسلم لیگ ن اٹھائے گی چنانچہ محترمہ ہر حال میں الیکشن چاہتی تھیں' میاں برادران نے الیکشن سے بچنے کی دو کوششیں کیں' پہلی کوشش اے پی ڈی ایم کے پلیٹ فارم سے کی گئی اور دوسری کوشش محترمہ بے نظیر بھٹو کی شہادت کے دن کی گئی' میاں نواز شریف نے اس دن راولپنڈی کے جنرل ہسپتال کے سامنے کھڑے ہو کر الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا لیکن بہر حال یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی اور پاکستان مسلم لیگ ن کو اپنے وہ امیدوار میدان میں لانا پڑ گئے' پارٹی جن کے ناموں اور شکلوں تک سے واقف نہیں تھی۔

یہ حقیقت ہے پاکستان مسلم لیگ ن اپنی کامیابی کے بارے میں زیادہ پر امید نہیں تھی' یہ 2008ء کے الیکشن کو پارٹی کی شناخت کی واپسی قرار دے رہی تھی' اس کا خیال تھا یہ پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن بینچوں پر بیٹھے گی جبکہ یہ قومی اسمبلی میں رولر پاگروپ کا کردار ادا کرے گی' اس دوران محترمہ بے نظیر بھٹو شہید ہو گئیں اور پاکستان

پیپلز پارٹی کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو ئی جن سے عوام اور پارٹی دونوں مانوس نہیں تھے' فوج بھی اپنے جرنیل کے پیچھے سے ہٹ گئی' چودھری صاحبان کی سکیم بھی محترمہ کی شہادت کی وجہ سے فلاپ ہو گئی' ان حالات میں الیکشن ہوئے تو پاکستان مسلم لیگ ن کو غیر متوقع کامیابی حاصل ہو گئی' وفاق میں اس نے 68 نشستیں حاصل کیں اور پنجاب میں 170 ۔یوں پاکستان مسلم لیگ ن پنجاب میں حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئی جبکہ وفاق میں یہ اپوزیشن میں چلی گئی' ہمیں ماننا پڑے گا 2008ء کے الیکشن میں عوام نے پاکستان مسلم لیگ ن کے ان کھمبوں کو منتخب کرا کر اسمبلی میں بھجوادیا جن کے ناموں تک سے میاں صاحبان واقف نہیں تھے اور یہ ان کے جلسوں تک میں نہیں گئے تھے۔پاکستان مسلم لیگ ن کی یہ کامیابی بنیادی طور پر اس کے موقف کی کامیابی تھی' میاں صاحبان نے الیکشن سے قبل اپنے امیدواروں سے چیف جسٹس اور عدلیہ کی بحالی کا حلف لیا تھا' اس حلف نے پارٹی کی کامیابی میں بڑا رول ادا کیا' میاں صاحبان نے پرویز مشرف کی بھی کھل کر مخالفت کی' ن لیگ کو اس مخالفت کا ووٹ بھی ملا' اس کے برعکس پاکستان پیپلز پارٹی کی پالیسی واضح نہیں تھی' یہ عدلیہ سمیت امریکا اور فوج کے بارے میں کلیئر نہیں تھی' صدر پرویز مشرف کے ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو کا خفیہ معاہدہ بھی پارٹی کے حلق میں اٹک چکا تھا اور یوں پاکستان پیپلز پارٹی عوام کی بھر پور حمایت سے محروم رہی بہرحال قصہ مختصر پاکستان پیپلز پارٹی نے حکومت بنائی اور پاکستان مسلم لیگ ن ڈائریکٹ اور ان ڈائریکٹ اس حکومت کی حمایت کرتی رہی یہاں تک ڈھائی سال گزر گئے اور وہ دور آ گیا جب عوام کو پرویز مشرف اور شوکت عزیز کا دور سنہری دکھائی دینے لگا اور ملک میں بڑی سطح پر یہ بحث شروع ہو گئی کہ ہم جمہوریت کے متحمل بھی ہیں یا نہیں؟ کیا عوام ان سیاسی جماعتوں اور اس لیڈر شپ کے ساتھ جمہوریت کے ثمرات سے فائدہ اٹھا سکیں گے؟

ہم اگر گزشتہ اڑھائی سالوں کا تجزیہ کریں تو دو حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں' ایک' پاکستان پیپلز پارٹی بری طرح مار کھا گئی' یہ گڈ گورننس قائم نہیں کر سکی' یہ کرپشن' لوٹ کھسوٹ' مہنگائی' بے روزگاری اور لاقانونیت بھی نہیں روک سکی اور یہ اداروں کو بھی اس مقام پر لے آئی جہاں سپریم کورٹ اور حکومت ازلی دشمن کی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں۔دو' پاکستان مسلم لیگ ن کی مقبولیت میں بھی کمی آ گئی ہے' کہاں وہ وقت تھا کہ میاں صاحبان نے جس کھمبے کو ٹکٹ دیا وہ کامیاب ہو گیا اور کہاں آج کا یہ دور ہے کہ پاکستان مسلم لیگ ن کو پنجاب میں بھی ضمنی الیکشن جیتنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑ رہا ہے۔آپ این اے 55 کا وہ حلقہ دیکھ لیجئے جس میں شیخ رشید کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی لیکن اس ضمنی الیکشن میں شیخ رشید نے نا صرف ساڑھے بیالیس ہزار ووٹ حاصل کئے بلکہ الیکشن جیتنے کیلئے پاکستان مسلم لیگ ن کی قیادت کو میاں نواز شریف سمیت میدان میں کودنا پڑا' پاکستان مسلم لیگ ن مانسہرہ میں بھی اپنی پکی نشست مولانا فضل الرحمان کے کمزور امیدوار کے ہاتھوں ہار گئی' اس نشست کو بچانے کیلئے بھی میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف دونوں میدان میں اترے لیکن عوام نے میاں برادران کی اپیل کے باوجود میاں خاندان کے رشتے دار کو ووٹ نہیں دیئے' اسی طرح پنجاب میں جلال پور پیروالا' ڈیرہ غازی خان' لاہور' بورے والا' مظفر گڑھ' سرگودھا' لودھراں' گوجرانوالہ اور فیصل آباد میں ضمنی الیکشن میں بھی پارٹی کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا' یہ ضمنی الیکشن ثابت کرتے ہیں پاکستان مسلم لیگ ن کی مقبولیت

میں تیزی سے کمی آ رہی ہے۔اب سوال یہ ہے مقبولیت کی اس کمی کی وجوہات کیا ہیں؟ اس کی واحد وجہ میاں صاحب کا محتاط رویہ ہے' میاں نواز شریف اس نفسیاتی خوف کا شکار ہیں کہ اگر انہوں نے حکومت کے خلاف کوئی مہم شروع کی تو دونوں سیاسی جماعتوں کی لڑائی شروع ہو جائے گی اور اس لڑائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج اقتدار میں آ جائے گی۔

یہ نفسیاتی خوف میاں نواز شریف اور پاکستان مسلم لیگ ن دونوں کی مقبولیت کو گھن کی طرح کھا رہا ہے چنانچہ آج لوگ بہانگ دہل کہہ رہے ہیں یہ حکومت پانچ سال پورے کر گئی تو پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ساتھ پاکستان مسلم لیگ ن بھی فارغ ہو جائے گی کیونکہ عوام میاں صاحبان کو پاکستان پیپلز پارٹی کا شریک جرم سمجھیں گے۔ یہاں دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے سیاسی پارٹیاں عوامی مقبولیت کھو بیٹھیں تو کیا فوج کو اقتدار سے دور رکھا جا سکے گا؟نہیں'اس کا مطلب ہے دونوں صورتوں میں اب کٹنا خربوزے کا مقدر ہو چکا ہے۔ان حالات میں پاکستان مسلم لیگ ن کو کیا کرنا چاہئے' میرا خیال ہے ان حالات میں میاں صاحب کو یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ یہ پانچ سال پورے کرنے دیں کی پالیسی جاری رکھیں یا پھر وہ سیاسی رول ادا کریں جس کی اس وقت ان سے توقع کی جا رہی ہے۔

میاں صاحبان اس وقت شدید دباؤ میں ہیں' پارٹی کے سرگرم کارکن چودھری نثار علی خان' جاوید ہاشمی' خواجہ آصف' سردار مہتاب خان اور خواجہ سعد رفیق میاں صاحبان کی پالیسی سے متفق نہیں ہیں چنانچہ یہ میڈیا اور پبلک فورمز سے غائب ہو چکے ہیں اور یہ اب پارٹی پالیسی کو ڈیفنڈ نہیں کر رہے' یہ صورتحال پارٹی کے اندر بغاوت کی صورتحال کو ظاہر کرتی ہے' یہ ایک دباؤ ہے جبکہ میاں صاحبان ان بیرونی طاقتوں کی وجہ سے بھی پریشان ہیں جو موجودہ حکومت کو پانچ سال دینا چاہتی ہیں اور یہ وہ صورتحال ہے جس میں پاکستان مسلم لیگ ن کو بڑا فیصلہ کرنا ہو گا' یہ حکومت کو پانچ سال پورے کرنے دے اور 2013ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ فارغ ہو جائے یا پھر فوج کے خوف سے نکل کر سیاسی جدوجہد شروع کر دے اور اس کا جو بھی نتیجہ نکلے یہ اسے بھگتنے کیلئے تیار ہو جائے۔ میاں صاحب کیا فیصلہ کرتے ہیں ہم سردست کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یہ طے ہے پاکستان مسلم لیگ ن ناؤ آر نیور کے دور میں داخل ہو چکی ہے اور اس نے اگر اب کوئی فیصلہ نہ کیا تو یہ کبھی کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکے گی کیونکہ سیاست' جوئے اور کرکٹ میں وقت پر فیصلہ نہ کرنے والے کھلاڑی ہمیشہ مار کھا جاتے ہیں۔

''اٹ از فیئر کوسچن''
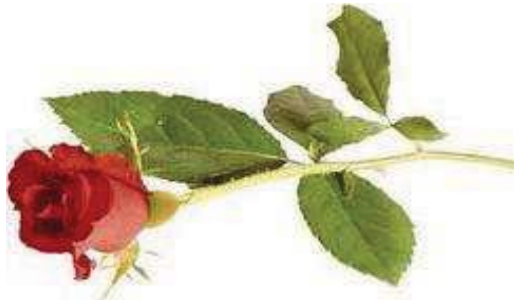
میاں نواز شریف بلاوجہ برامان گئے اور ان کی ناراضگی سے پھر ثابت ہو گیا سچ کڑوا ہوتا ہے اور اس کی کڑواہٹ بڑے لوگوں کو ہمیشہ بدمزہ کر دیتی ہے' میاں نواز شریف داتا دربار پر ہونے والی دہشت گردی کے خلاف لاہور میں تین جولائی 2010ء کو پریس کانفرنس کر رہے تھے' پریس کانفرنس کے دوران کسی ''گستاخ'' صحافی نے میاں نواز شریف سے پوچھ لیا'' آپ اور چودھریوں سمیت وی وی آئی پیز کی سیکورٹی کیلئے ایلیٹ فورس تعینات ہے' اس عالم میں عوام کی حفاظت کون کرے گا'' یہ سوال سن کر میاں نواز شریف غصے میں آگئے اور انہوں نے سخت لہجے میں جواب دیا'' لے لیں' لے لیں' مجھ سے ساری سیکورٹی واپس لے لیں' میری جان کو کوئی خطرہ نہیں'' اس کے بعد میاں نواز شریف نے اس ''گستاخ'' صحافی کو مخاطب کر کے فرمایا'' آپ ذاتیات پر اتر آئے ہیں' آپ کو ذاتیات پر سوال نہیں کرنے چاہئیں'' اس کے بعد میاں نواز شریف نے انگریزی میں کہا'' دس از ناٹ فیئر کوسچن''۔

میں نے یہ واقعہ' صحافی کا سوال اور میاں نواز شریف کا جواب اتوار چار جولائی کے اخبارات میں پڑھا اور میاں صاحب کی خفگی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ مجھے میاں صاحب کے جواب میں پاکستان مسلم لیگ ن کی پالیسی بھی صاف دکھائی دی اور پاکستان مسلم لیگ ن کا مستقبل بھی۔ آپ کو یاد ہو گا 2007ء میں جب صحافی جنرل پرویز مشرف اور شوکت عزیز سے اس قسم کے سوال پوچھتے تھے تو اپنے وقت کے یہ عظیم لیڈر بھی ان سوالوں کو ''ناٹ فیئر کوسچن'' کہتے تھے جبکہ اس دور میں پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کی لیڈر شپ ان ''ناٹ فیئر جرنلسٹس'' کے ناٹ فیئر کوسچنز کو کلمہ حق کہتے تھے' مجھے اچھی طرح یاد ہے محترمہ بے نظیر بھٹو ہوں' آصف علی زرداری ہوں' یوسف رضا گیلانی ہوں' رحمن ملک ہوں یا پھر میاں نواز شریف' میاں شہباز شریف' چودھری نثار علی خان اور اسحاق ڈار ہوں' یہ سب لوگ ان صحافیوں کو اکیسویں صدی کا مجاہد کہتے تھے' یہ صحافیوں کو کھلے عام جرأت' بہادری اور ایمانداری کا تمغہ بھی دیتے تھے لیکن 2008ء آیا' پاکستان پیپلز پارٹی اقتدار میں آئی اور پاکستان مسلم لیگ ن نے عدلیہ کے ایشو پر حکومت کی مخالفت کا راستہ اختیار کیا اور صحافیوں نے حکومت سے ''ناٹ فیئر کوسچنز'' شروع کیے تو پاکستان پیپلز پارٹی ایک آدھ سال میں پرویز مشرف کے چبوترے پر کھڑی ہو گئی اور اس کے رہنماؤں نے صحافیوں کو سرعام ملک دشمن' غیر سیاسی اداکار' لفافہ بردار اور پاکستان مسلم لیگ ن کے سیاسی کارکن کہنا شروع کر دیا جبکہ پاکستان مسلم لیگ ن کی قیادت انہیں بدستور مجاہد اسلام کہتی رہی لیکن جب میاں نواز شریف نے جوڈیشل کمیشن اور خیبر پختونخواہ کے ایشو پر ''یوٹرن'' لیا اور میڈیا نے میاں نواز شریف کی پالیسیوں پر تنقید شروع کی یا پھر میڈیا نے پاکستان مسلم لیگ ن کی ''فرینڈلی اپوزیشن'' حرکات کی نشاندہی کی' میاں شہباز شریف کی چیف آف آرمی سٹاف سے ملاقاتوں اور میاں نواز شریف کی طرف سے ان ملاقاتوں پر اظہار ناپسندیدگی کا پوسٹ مارٹم شروع کیا یا پھر میاں نواز شریف کی غیر قانونی اور غیر آئینی سیکورٹی پر انگلی اٹھائی تو میاں نواز شریف کا رنگ تبدیل ہو گیا اور یہ بھی اب صحافیوں کی گستاخیوں کو ''ناٹ فیئر کوسچن'' سمجھنے لگے' یہ بھی میڈیا کے معصومانہ سوالات کو ذاتیات قرار دینے لگے' میاں صاحب کی ناراضگی اس انجام کا نقطہ آغاز ہے جس پر کبھی

پرویز مشرف اور ان کے ہم نوا ہوتے تھے اور بعد ازاں پاکستان پیپلز پارٹی نے یہ عہدہ جلیلہ سنبھال لیا اور اب میاں صاحب اس وادی میں قدم رکھ رہے ہیں۔

میں کیونکہ اس "گستاخ" صحافی کا سینئر ہوں چنانچہ میں پوری صحافی برادری کی طرف سے اس "گستاخی" پر میاں نواز شریف اور پاکستان مسلم لیگ ن سے معافی مانگتا ہوں' یہ ایک سادہ دل صحافی تھا جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ پاکستان اور پاکستان مسلم لیگ ن تبدیل ہو چکی ہے' یہ سمجھ بیٹھا تھا پاکستان مسلم لیگ ن جو کہتی ہے دل سے بھی وہی سمجھتی ہے' میاں برادران عام آدمی کے آنسو دیکھ کر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دکھ محسوس کرتے ہیں اور یہ دل سے یہ سمجھتے ہیں پاکستان کی رولنگ ایلیٹ کو اب اپنا لائف سٹائل تبدیل کر دینا چاہیے' پاکستان کا خزانہ اب عام اور غریب شہری پر استعمال ہونا چاہیے' پاکستان میں اب کسی وی وی آئی پی کی گنجائش موجود نہیں اور ملک کے کسی لیڈر' کسی رہنما کو اب سیکورٹی اور پروٹوکول نہیں ملنا چاہیے' پاکستان کے کسی شہری کیلئے اب ٹریفک نہیں رکنی چاہیے اور کسی لیڈر' کسی رہنما کے ذاتی اخراجات کیلئے سرکاری خزانے کا منہ نہیں کھلنا چاہیے' یہ گستاخ صحافی اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ میڈیا آزاد ہے اور یہ اب اس ملک کے کسی بھی لیڈر سے دوسرے کرتے کا حساب مانگ سکتا ہے' اس کی نظر میں پرویز مشرف' آصف علی زرداری' یوسف رضا گیلانی اور میاں نواز شریف سب برابر ہیں اور یہ اگر پرویز مشرف سے چیف جسٹس کی معطلی اور لال مسجد پر فوجی آپریشن کے بارے میں سوال پوچھ سکتا ہے تو یہ میاں نواز شریف سے بھی یہ جسارت کر سکتا ہے "جناب جب ایلیٹ فورس آپ اور چودھری برادران کی سیکورٹی پر تعینات ہو گی تو یہ عام شہریوں کو کب تحفظ دے گی" چنانچہ اس گستاخ صحافی نے آزادی صحافت کی اس رو میں بہتے ہوئے میاں نواز شریف کے منہ کا ذائقہ خراب کر دیا جس پر میں پاکستان مسلم لیگ ن کی قیادت سے شرمندہ ہوں اور نہ صرف ان سے معافی کا خواستگار ہوں بلکہ میں اپنی صحافی برادری کو بھی یہ مشورہ دینا چاہتا ہوں آپ لوگ اس قسم کے "ناٹ فیئر کوئچن" نہ پوچھا کریں کیونکہ اس ملک میں ابھی تک کچھ لوگوں کیلئے سب کچھ جائز ہے اور جب تک مردار کی آخری ہڈی پر گوشت کا آخری ٹکڑا موجود ہے یہ سب کچھ اس وقت تک ان لوگوں کیلئے جائز رہے گا اور اس ملک میں ہم سب کا بس ایک ہی کام ہے' ہم صرف "فیئر کوئچن" پوچھیں' ہم عدلیہ سے کہیں آپ حکومت کو چلنے کیوں نہیں دے رہے' ہم ججوں سے کہیں آپ بار بار این آر او اور سوئس کیسز کا نام کیوں نہیں لیتے ہیں' ہم عوام سے کہیں آپ بلاوجہ خودکشیاں کیوں کر رہے ہیں' ہم عام لوگوں سے کہیں آپ بجلی کے دوگنے بلوں پر اعتراض کیوں کر رہے ہیں' ہم لوگوں کو گیس کے ریٹ میں اضافے کی افادیت بتائیں' ہم عوام کو مہنگائی برداشت کرنے پر آمادہ کریں' ہم لوگوں کو کرپشن کے ساتھ زندہ رہنے کا آرٹ سکھائیں' ہم عوام کو یہ بتائیں ڈگری اصلی ہو یا نقلی ہو ڈگری ڈگری ہوتی ہے اور ارکان اسمبلی کی جعلی ڈگریوں سے کوئی قیامت نہیں آتی' ہم لوگوں کو بتائیں وزراء اور وی آئی پی چھ چھ سرکاری گاڑیاں اور بلٹ پروف وہیکل رکھ سکتے ہیں اور عوام کو اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں' ہم عوام کو ذہنی طور پر تیار کریں پاکستان کے قائدین بیرون ملک اثاثے بھی بنا سکتے ہیں' اکاؤنٹس بھی رکھ سکتے ہیں اور گھر بھی خرید سکتے ہیں' ہم لوگوں کو سمجھائیں پاکستان ایک غریب اور بے آسرا ملک ہے چنانچہ ہمیں کیری لوگر بل پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے' ہم عوام کو سمجھائیں ہمارے

قائدین کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں چنانچہ ان سے [illegible] کی [illegible] زیادہ ہونا چاہیے اور ہم [illegible] یہ حقیقت بھی سمجھائیں کہ خودکش حملے اسرائیل اور امریکا نہیں روک سکا چنانچہ حکومت سے ان کے خاتمے کی توقع فیئر نہیں' ہم سب کو چاہیے۔

ہم صرف اور صرف اس قسم کے ''فیئر کو سچن'' پوچھیں اور پاکستان کے کسی رہنما' کسی لیڈر اور کسی معتبر شخصیت سے بلٹ پروف گاڑیوں' سیکورٹی کی چالیس چالیس وہیکلز اور جہازوں کے کھلے استعمال پر انگلی نہ اٹھائیں' کسی سے یہ ''ناٹ فیئر کو سچن'' نہ پوچھیں کہ جناب جب ایلیٹ فورس' پولیس' رینجرز اور خفیہ ادارے آپ کی سیکورٹی میں مصروف رہیں گے تو یہ عوام کیلئے فنڈز اور وقت کہاں سے لائیں گے' یہ داتا دربار کی حفاظت کیسے کریں گے' چنا ہمارے جیسے ملکوں میں یہ سوال واقعی ''ناٹ فیئر'' ہوتے ہیں' ہمیں یہ سوال پوچھنے سے پہلے پچاس مرتبہ سوچنا چاہیے اور ہمیں ایسی خلاف ورزیوں پر بابر اعوان اور میاں نواز شریف کا فرق بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے' اس قسم کے جرم صرف بابر اعوان کیلئے جرم ہوتے ہیں' میاں نواز شریف کیلئے نہیں۔

میں نے جب سے میاں صاحب کی خفگی کی خبر پڑھی ہے مجھے اس وقت سے پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت اچھی لگ رہی ہے کیونکہ یہ لوگ اڑھائی سال سے انتہائی خوفناک ''ناٹ فیئر کو سچنز'' کا سامنا کر رہے ہیں اور اب تک کسی صحافی کے گلے نہیں پڑے جبکہ میاں صاحب ایک چھوٹا سا' معصوم سا سوال بھی برداشت نہیں کر سکے اور انہیں اس سوال میں ذاتیات بھی دکھائی دیں اور انہیں یہ کو سچن ''ناٹ فیئر'' بھی محسوس ہوا' مجھے میاں صاحب کے اس ایک فقرے میں پاکستان مسلم لیگ ن کا سارا مستقبل دکھائی دے رہا ہے اور میں اس وقت سے پریشان ہوں کہ جب پاکستان مسلم لیگ ن اقتدار میں آئے گی اور اسے اس نوعیت کے بے شمار ''ناٹ فیئر کو سچنز'' کا سامنا کرنا پڑے گا تو اس وقت پارٹی اور پارٹی قیادت کی کیا حالت ہو گی' یہ کس کس کو غیر سیاسی اداکار کا خطاب دے گی' مجھے میاں صاحب سے ہمدردی ہے اور میں اس ہمدردی میں ان سے صرف اتنا عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں ''اگر آپ واقعی اس ملک کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں' آپ اگر حقیقتاً 1999ء کے نواز شریف سے مختلف ہیں تو پھر یہ ایک فیئر کو سچن تھا' ٹ ازراہ فیئر کو سچن کیونکہ آپ اتنی بڑی سیکورٹی کے ساتھ اس ملک کی حفاظت نہیں کر سکیں گے' یہ ملک اور اس ملک کے لوگ تبدیل ہو چکے ہیں اور اب ان کے دماغ میں اس نوعیت کے ناٹ فیر کو سچنز بھی آتے ہیں اور یہ ان کا جواب بھی چاہتے ہیں چنانچہ آپ کو بھی بے شمار دوسرے فیصلوں کے ساتھ ساتھ ان ناٹ فیئر کو سچنز کے سامنے کا فیصلہ بھی کرنا ہو گا ورنہ دوسری صورت میں آپ کا انجام بھی پرویز مشرف سے مختلف نہیں ہو گا کیونکہ اس نے بھی فیئر کو سچنز کو ناٹ فیئر سمجھنے کی غلطی شروع کر دی تھی۔

گیارہ سیکنڈ کے فاصلے پر رکھا پیغام

آج کا انسان دنیا بھر کی معلومات جیب میں ڈال کر پھر رہا ہے' ہم گاڑی میں کسی جگہ جا رہے ہوتے ہیں اور ہماری گاڑی چند لمحوں کیلئے اشارے پر رک جاتی ہے یا پھر ہم ٹریفک میں پھنس جاتے ہیں تو ہم کیا کرتے ہیں' ہم فوراً اپنا موبائل نکالتے ہیں' انٹرنیٹ کھولتے ہیں اور چند سیکنڈ میں معلومات کے سمندر سے ''کونیکٹ'' ہو جاتے ہیں اور اشارہ کھلنے سے پہلے صدر اوباما کے امریکا' ڈیوڈ کیمرون کے برطانیہ' نیکولس سرکوزی کے فرانس' من موہن سنگھ کے انڈیا اور حامد کرزئی کے افغانستان تک کی معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ انفارمیشن کی اس ''ایج'' نے معلومات کی حد تک دنیا کی سرحدیں ختم کر دی ہیں اور پاکستان کے شہری اب پاکستان میں بیٹھ کر کیلیفورنیا' لندن' ٹوکیو اور پیرس جیسی زندگی کی خواہش کرتے ہیں جبکہ نیویارک' لندن اور کوپن ہیگن کے لوگ انٹرنیٹ' موبائل اور ٹیلی ویژن کے ذریعے مریخ اور چاند کے شہری بن رہے ہیں۔ اس ''ایج'' نے جہاں معلومات' علم اور خبر کو عالمی اثاثہ بنا دیا وہاں اس نے تیسری دنیا کے غریب ممالک کے عوام کو ذہنی مریض بھی کر دیا ہے' ہم لوگ اب انٹرنیٹ اور ٹیلی ویژن کے ذریعے پاکستان اور امریکا کا تقابل کرتے ہیں ہمارے ڈپریشن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ہمارا ملک امریکا' برطانیہ یا جاپان کیوں نہیں ہو سکتا' ہم میں آخر کیا کمی ہے؟ ان دو سوالوں نے ہماری زندگی عذاب بنا رکھی ہے اور ہم ان سوالوں کی وجہ سے روزانہ بھٹی میں گری ہوئی مکئی کی طرح تڑپتے' اچھلتے اور پھٹتے ہیں مگر ہمیں قرار نہیں آتا۔ پنجابی میں کہتے ہیں بیوائیں بیوگی کاٹنے کیلئے تیار ہوتی ہیں لیکن انہیں ہمسائے آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے۔ ہمیں بھی ہمارے گلوبل ولیج کے ہمسائے سکون سے زندگی نہیں گزارنے دے رہے' یہ روز گڈ گورننس کی کوئی نہ کوئی مثال ہمارے سامنے رکھ دیتے ہیں اور ہمارے دل میں حکمرانوں' سیاستدانوں اور نام نہاد جمہوریت کی رہی سہی محبت بھی ختم ہو جاتی ہے اور ہم گہرے دکھ میں چلے جاتے ہیں۔

آپ اس گلوبل ولیج کی تازہ ترین مثال ملاحظہ کیجئے' فرانس کے ترقی کے وزیر ایلن جوائندت سے مارچ 2010ء میں ''چھوٹی'' سی غلطی ہو گئی تھی' ہیٹی میں زلزلہ آیا' فرانس نے بھی یورپی یونین کے دوسرے ممالک کی طرح ہیٹی میں امدادی سرگرمیاں شروع کر دیں' ان امدادی سرگرمیوں کے سلسلے میں ہیٹی میں کانفرنس تھی' جوائندت کانفرنس میں شرکت کیلئے پیرس سے نکلنے لگا تو اسے ہیٹی سے کوئی فلائٹ نہ ملی' اس کا جانا بھی ضروری تھا چنانچہ اس نے چھوٹا سا طیارہ چارٹر کرا لیا' وہ اس طیارے پر ہیٹی گیا اور واپس آ گیا' اس کی وزارت نے ایک لاکھ سولہ ہزار پانچ سو یورو کرایہ ادا کر دیا' کرسٹیئر پیرس بلان کا وزیر کرسیتان بلانک کیوبا کے سگار پیتا ہے' یہ فرانس کا وزیر بنا تو قانون کے مطابق اس کے سگار سرکاری خزانے سے خریدے جانے لگے' سال بعد حساب ہوا تو معلوم ہوا وزیر محترم سال میں بارہ ہزار یوروز کے سگار پی گئے ہیں' فرانس کی معیشت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو بارہ ہزار یورو اور ایک لاکھ ساڑھے سولہ ہزار یورو کوئی بڑی رقم نہیں' پیرس کے فائیو سٹار ہوٹلوں میں تین چار دنوں میں دس بارہ ہزار یورو خرچ ہو جاتے ہیں جبکہ وزراء کی آمدورفت اور رہائش گاہوں کی تزئین و آرائش پر ایک دو ملین یورو کے اخراجات معمول کی بات ہے لیکن جب یہ دونوں باتیں صدر سرکوزی کے نوٹس میں آئیں تو سرکوزی نے 4 جولائی 2010ء

کو اپنے دونوں وزراء کو فارغ کر دیا' یہ خبر مجھ تک سوموار کے دن ایس ایم ایس کے ذریعے پہنچی' میں نے دفتر پہنچ کر انٹرنیٹ سے اس خبر کی تفصیلات "ڈاؤن لوڈ" کروائیں تو میں شدید ڈپریشن میں چلا گیا' پاکستان اور فرانس کے درمیان ساڑھے چھ گھنٹے کا "فلائنگ ٹائم" ہے جبکہ انٹرنیٹ سے اس کا فاصلہ گیارہ سیکنڈ ہے' ہم سے گیارہ سیکنڈ کے فاصلے پر سیاسی اخلاقیات کا یہ عالم ہے کہ فرانس کا صدر اپنے دو اہم ترین وزراء کو سرکاری خزانے سے سگار خریدنے اور سرکاری کام کیلئے جہاز چارٹر کرانے پر وزارت سے فارغ کر دیتا ہے جبکہ ہم فرانس سے گیارہ سیکنڈ کے فاصلے پر بیٹھ کر کیا کیا نہیں کر رہے۔ ہماری رولنگ ایلیٹ سرکاری خزانے' اپنے اختیارات اور اپنی وزارتوں کو کس کس طرح نہیں لوٹ رہی؟ یہ کہانیاں اب زبان زد عام ہیں' اگر 2013ء سے پہلے پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کا خاموش سمجھوتہ ٹوٹ گیا اور پاکستان مسلم لیگ ن نے اصلی اپوزیشن شروع کر دی تو عوام وزراء کی "کارروائیوں" پر حیران رہ جائیں گے' لوگ یہ جان کر انگشت بدنداں رہ جائیں گے کہ کس وزیر نے چار چار کوٹھیاں خرید کر وہاں محل بنایا اور اس محل کیلئے افغانستان سے انتہائی قیمتی ماربل خریدا گیا' یہ ماربل اٹلی گیا وہاں سے پالش ہو کر اسلام آباد پہنچا اور بعدازاں اسے کس طرح فرش پر لگایا گیا، چینی کمپنیوں سے کس کس نے کیا کیا طلب کیا' لندن' دبئی اور نیویارک میں کس نے کتنی پراپرٹی خریدی' کس کے بیٹوں نے پانچ پانچ کروڑ کی گاڑیاں خریدیں اور کون سٹیل مل کو "ڈیفالٹر" ثابت کر کے فروخت کرنا چاہتا ہے۔ یہ ساری کہانیاں ہوش ربا ہوں گی لیکن یہ صرف اسی شکل میں سامنے آئیں گی کہ پاکستان مسلم لیگ ن چپ رہنے کا خاموش معاہدہ توڑ دے جو بظاہر اس وقت ممکن دکھائی نہیں دیتا کیونکہ دونوں جماعتوں کے درمیان یہ انڈرسٹینڈنگ موجود ہے کہ پاکستان مسلم لیگ ن پاکستان پیپلز پارٹی کے دور میں خاموش رہے گی اور بعدازاں پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان مسلم لیگ ن کی تمنا اقتدار کو دوڑنے' بھاگنے اور لوٹنے کھسوٹنے کا پورا پورا موقع دے گی۔

ہم "انفارمیشن ایج" کے لوگ جب دس گیارہ سیکنڈ کے فاصلے پر ایلن جوائنڈت اور کرسیتان بلانک جیسے وزیروں کا احتساب ہوتا دیکھتے ہیں اور پھر آنکھیں کھول کر اپنے ملک کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا ڈپریشن بڑھ جاتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں یہ سیاسی اخلاقیات ہمارے ملک میں کیوں ممکن نہیں؟ ہماری سیاسی جماعتیں جعلی ڈگری ہولڈرز کو ٹکٹ کیوں دیتی ہیں؟' ہماری لیڈر شپ جعلی ڈگری ہولڈروں کو "ڈگری ڈگری ہوتی ہے یہ جعلی ہو یا اصلی" یا پھر "جعلی ڈگری سے کیا قیامت آ جائے گی" جیسے دلائل دے کر "پروٹیکٹ" کرنے کی کوشش کیوں کرتی ہے' ہماری سیاسی جماعتیں جعلی ڈگری کے الزام میں فارغ ہونے والے ارکان کو دوبارہ ٹکٹ دے کر قانون' اخلاقیات اور علم کا مذاق کیوں اڑاتی ہیں' اور ہمارے پاس ایسی خبریں کیوں آتی ہیں کہ وفاقی کابینہ میں چودہ جعلی ڈگری ہولڈر بیٹھے ہیں؟ ہمارا دل ایسی باتوں' ایسی خبروں پر خون کے آنسو روتا ہے اور ہم ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ہمارا ملک کب ٹھیک ہو گا' ہم اخلاقیات کی شاہراہ پر کب قدم رکھیں گے اور ہم ایسی غلط سیاسی حرکات پر کب شرمندہ ہوں گے۔ ہمارے ذہن میں یہ سب سوال روزانہ اٹھتے ہیں' ہمارے ملک میں موجود ساڑھے سات کروڑ جوان اور نوجوان ان سوالوں کا جواب تلاش کر رہے ہیں لیکن اس پورے ملک کی رولنگ ایلیٹ کے پاس "سسٹم کو چلنے دیں' یہ گند خود بخود صاف ہو جائے گا" کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا' ہم

اس ملک کے [illegible] ہم [illegible] جب تک برداشت کریں گے [illegible] یا ہم اس وقت تک اسے برداشت کریں گے جب تک رولنگ ایلیٹ کے تمام لوگ بیرون ملک جائیدادیں نہیں بنا لیتے یا پھر یہ ملک آخری ہچکی تک نہیں پہنچ جاتا۔

ہمارے حکمران ہمیشہ لاڑکانہ' لاہور اور پشاور کو پیرس بنانے کا اعلان کرتے ہیں لیکن یہ لوگ یہ اعلان کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں پشاور' لاہور اور لاڑکانہ صرف سڑکوں اور عمارتوں سے پیرس نہیں ہوا کرتے' شہروں کو پیرس بنانے کیلئے صاف' شفاف اور مضبوط احتسابی نظام درکار ہوتا ہے اور جب تک خلفاء سے دوسری چادر کا حساب طلب نہیں کیا جاتا اس وقت تک کوئی مسلمان ریاست اسلامی بنتی ہے اور نہ ہی کسی اسلامی ریاست کا شہر پیرس ہوتا ہے۔ پیرس کو پیرس شانزے لیزے یا ایفل ٹاور نے نہیں بنایا' اُسے ایلین جوائنڈت اور کرسیتان بلانک جیسے وزراء کے احتساب نے پیرس بنایا اور ہم بھی جب تک یہ سسٹم اس ملک میں متعارف نہیں کریں گے اس وقت تک ترقی' خوشحالی اور سکون کے خواب ہماری پلکوں سے باہر نہیں آئیں گے اور یہ گیارہ سیکنڈ کے فاصلے پر رکھا ہوا وہ پیغام ہے جسے پڑھنے کیلئے ہمارے حکمران تیار نہیں ہیں۔
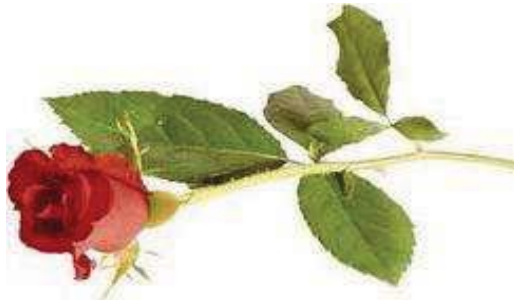
ہمارے علمائے کرام کو بھی مصری علماء کی طرح اکٹھا ہونا چاہئے اور دنیا کو عصری تقاضوں سے ہمکنار کرنے کا سلسلہ شروع کرنا چاہئے کیونکہ نائین الیون کے بعد اسلامی ممالک میں دینی طبقے کو ایک سازش کے تحت پچھلی صفوں میں دھکیلا جا رہا ہے اور اگر اس وقت علمائے کرام سامنے نہ آئے' انہوں نے جدید دور کے جدید آلات کو اپنی ڈھال نہ بنایا اور انہوں نے آج کے ذہن کو اپیل نہ کیا تو اسلام پسند آہستہ آہستہ اسلامی دنیا میں سمٹتے چلے جائیں گے اور ان کی جگہ روشن خیالی اور اعتدال پسندی لے لے گی۔ ہمیں ماننا پڑے گا اسلامی دنیا میں دینی طبقہ اجنبی ہوتا چلا جا رہا ہے جبکہ نام نہاد روشن خیال اور اعتدال پسند مغرب کی طاقت اور پیسے کے زور پر معاشرے پر حاوی ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اگر یقین نہ آئے تو آپ نائین الیون سے پہلے کے پاکستانی معاشرے اور نائین الیون کے بعد کے پاکستانی معاشرے کا تقابل کر لیں' آپ کو نو برسوں میں پاکستانی معاشرے میں بہت بڑی تبدیلی نظر آئے گی' ہم نو سال پہلے تک جس کو فحاشی' عریانی' مغربیت اور کفر سمجھتے تھے وہ آج روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے لیبل کے ساتھ نہ صرف ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکی ہے بلکہ ہم اس پر فخر بھی کر رہے ہیں۔اس تبدیلی کی بے شمار وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ ہمارے علمائے کرام بھی ہیں' ہمارے علمائے کرام بدقسمتی سے آج کے آئی فون یا آئی پیڈ ذہن کو مطمئن نہیں کر پا رہے' یہ انٹرنیٹ اور نیوز چینلز کے دور کا مقابلہ نہیں کر پا رہے چنانچہ آج ہماری نئی نسل اسلام سے دور اور مغرب کے قریب ہوتی جا رہی ہے اور یہ انتہائی خطرناک صورتحال ہے کیونکہ اس کی اگلی سٹیج ملک میں شراب خانوں' ڈسکو کلبز' قحبہ خانوں اور گرل فرینڈ' بوائے فرینڈ کا اوپن کلچر ہے اور یہ صورتحال جب ملک میں قانونی شکل اختیار کر لے گی اور دینی طبقے اس کے خلاف مزاحمت کریں گے تو بنیادی انسانی حقوق کا واویلا شروع ہو جائے گا اور اس سے صورتحال مزید گمبھیر ہو جائے گی' مسجد اور کلب دو الگ الگ یونٹ ہو جائیں گے' حکومت ان دونوں کے درمیان بیٹھ جائے گی اور یہ مسجد والوں سے کہے گی آپ اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کریں اور کلب میں مصروف لوگوں کو گارنٹی دے گی ملک کا کوئی شہری آپ کی پرائیویسی میں مداخلت نہیں کرے گا' آپ اطمینان سے اپنی شاموں کو رنگین بنائیں بس حکومت کو سترہ فیصد جی ایس ٹی دے دیا کریں' ہم اگر لبرل ازم کے اس اندھے انجام سے بچنا چاہتے ہیں تو ہمارے علمائے کرام کو مصری علماء کی طرح میدان میں آنا ہو گا اور مذہب کو جدید اذہان کے لئے قابل قبول بنانا ہو گا۔میں اب مصری علمائے کے اس اقدام کی طرف آتا ہوں جس نے مجھے یہ سطریں تحریر کرنے پر مجبور کیا۔

ہم سب بچپن سے دیکھ رہے ہیں ملک میں جب بھی اذان کا وقت ہوتا ہے تو تمام مساجد کے لاؤڈ سپیکر ایک کے بعد ایک ''آن'' ہو جاتے ہیں اور دس' پندرہ' بیس منٹ تک اذان کا سلسلہ چلتا رہتا ہے' ایک مسجد کی اذان ختم ہوتی ہے تو دوسری مسجد سے اذان شروع ہو جاتی ہے' وہاں ختم ہوتی ہے تو تیسری مسجد کا سپیکر آن ہو جاتا ہے' یہ تمام مساجد ایک دو کلو میٹر کے فاصلے پر ہوتی ہیں چنانچہ اس ایک دو کلو میٹر میں بیٹھے شخص کی سرگرمیاں قریباً معطل ہو کر رہ جاتی ہیں' گفتگو کرنے والے خاموش ہو جاتے ہیں' خریداری کرنے والے خریداری بند کر دیتے ہیں اور پڑھائی کرنے والے پڑھائی روک دیتے ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ صورتحال مصر میں بھی تھی' قاہرہ شہر میں چار ہزار

مساجد ہیں' وہاں دن میں پانچ بار اذانیں گونجتی ہیں اور اس وجہ سے شہر میں بعض اوقات ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی تھی جس کی وجہ سے نوجوان اپنے علمائے کرام کی طرف حیرت سے دیکھتے تھے' مصری علماء نے طویل غورو فکر کے بعد اس کا بڑا دلچسپ حل نکالا' انہوں نے قاہرہ میں ''متحدہ اذان'' کا فارمولا طے کر لیا' یہ فارمولا گیارہ اگست 2010ء رمضان کے پہلے دن سے قاہرہ شہر میں نافذ ہو جائے گا' اس دن شہر کی تمام مساجد سے لاؤڈ سپیکر اتار دیئے جائیں گے اور ایک ہی وقت میں ساری مسجدوں کیلئے اذان ہو گی' یہ ''متحدہ اذان'' ریڈیو سے بھی نشر ہو گی' علمائے کرام نے اذان سننے کیلئے خصوصی ریسیور تیار کروائے ہیں' یہ ریسیور ایک سو اسی مصری پاؤنڈز سے بازار سے خریدے جا سکتے ہیں' لوگ یہ ریسیور اپنے گھروں' دکانوں' گاڑیوں اور ٹیکسیوں میں لگا سکتے ہیں' یہ ریسیور اذان کے وقت خود بخود آن ہو جائیں گے اور ریڈیو سے نشر ہوتی ہوئی اذان کی آواز ریسیور کے مالکان تک پہنچ جائے گی' یہ اقدام اس سال صرف قاہرہ شہر تک محدود رہے گا جبکہ اگلے رمضان سے یہ سلسلہ دوسرے شہروں تک وسیع کر دیا جائے گا یوں تمام شہروں میں متحدہ اذان ہو گی جس سے نماز کے اوقات میں بھی ایک نظم و ضبط پیدا ہو جائے گا اور لاؤڈ سپیکر کے استعمال سے پیدا ہونے والے مسائل بھی ختم ہو جائیں گے' علمائے کرام کے اس ''اینی شیٹو'' کے دو بڑے فائدے ہوں گے' ایک دینی طبقے اور جدید ذہن کے درمیان فاصلہ کم ہو جائے گا اور آج کا ''آئی فون مائینڈ'' علمائے کرام کی ذہانت اور اتحاد سے متاثر ہو گا جس سے لبرل اور دینی طبقے کے درمیان موجود خلیج کم ہو گی۔ دو' مصری معاشرے میں یہ تاثر ابھرے گا کہ دینی طبقے میں بھی لچک موجود ہے' یہ لوگ بھی عام لوگوں کے مسائل کو سمجھتے ہیں اور یہ ان مسائل کو حل بھی کرنا چاہتے ہیں۔

ہمارے علمائے کرام بھی مصری علمائے کرام کی طرح اجتہاد کر سکتے ہیں' یہ بھی ایسے مسائل کا کوئی جدید حل تجویز کر سکتے ہیں' ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا لاؤڈ سپیکر' عید کا چاند اور متنازعہ بیانات تین ایسی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے آج کا ذہن ہمارے دینی طبقے سے دور ہو رہا ہے' شہر کی مساجد میں ہائی پاور سپیکر کی وجہ سے شہری زندگی بہر حال متاثر ہوتی ہے' اس سے طالب علموں' بیماروں اور زندگی کے دوسرے تقاضوں میں مصروف لوگ متاثر ہوتے ہیں' ہماری مساجد میں بعض اوقات بیک وقت اذان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے اذان کے الفاظ اور آوازیں ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو جاتی ہیں اور یہ صوتی اور تقدس دونوں لحاظ سے اچھی صورتحال نہیں۔ دوسرا ایک کے بعد دوسری مسجد اور دوسری کے بعد تیسری مسجد سے اذان شروع ہو جاتی ہے چنانچہ لوگ اذان کے احترام میں کام کاج اور بات چیت چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آج کے لوگ اس صورتحال پر بار بار علمائے کرام کی طرف دیکھتے ہیں اور ان سے پوچھتے ہیں ہم اگر ایک شہر میں ایک وقت میں ایک اذان پر متفق نہیں ہو سکتے تو ہم پورے اسلام پر کیسے متفق ہوں گے؟۔ دوسرا رمضان اور عید کے تعین پر ہم ہر سال پوری دنیا میں مذاق کا ہدف بنتے ہیں' ملک میں اکیسویں صدی میں تین تین عید ہوتی ہیں' لوگ اس مسئلے پر بھی علمائے کرام کی طرف دیکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں جو عالم دین چاند کا فیصلہ نہیں کر سکتے وہ زندگی کے باقی معاملات میں ہماری کیا راہنمائی کریں گے اور تیسرا ہمارے علمائے کرام نے ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے آج کا ذہن اس پر بھی پریشان ہے' ہمارے نوجوان ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ہم کس اسلام پر عمل کریں کیونکہ ہر دوسرے فرقے کا کوئی نہ کوئی عالم کسی نہ کسی شخص کو کافر قرار دے رہا ہے۔ ہمیں ماننا پڑے گا ہمارے علمائے کرام اعتراضات کو

[illegible]

اختلافات اور اختلافات کو زندگی اور موت کا مسئلہ بنا رہے ہیں لہٰذا آج اس کا نتیجہ داتا دربار' امام بارگاہوں' مساجد اور قبرستانوں میں خودکش حملوں کی شکل میں نکل رہا ہے' ان خودکش حملوں سے جہاں انسانی جانوں کا نقصان ہو رہا ہے وہاں پوری دنیا میں اسلام بھی بدنام ہو رہا ہے۔ میں ہرگز عالم دین نہیں ہوں' اسلام کی تشریح اور اجتہاد کا فیصلہ بہرحال ہمارے علمائے کرام نے ہی کرنا ہے' یہ تعین کہ آیا پورے شہر یا ملک میں ایک وقت میں اذان دی جا سکتی ہے' پورے ملک میں ایک ہی دن رمضان اور عید کس طرح ممکن ہے اور ہم مختلف فرقوں کے درمیان نفرت کو کس طرح کنٹرول کر سکتے ہیں' یہ سارے فیصلے بھی ہمارے علمائے کرام نے ہی کرنے ہیں اور ان تبدیلیوں کی اسلام میں کس قدر گنجائش موجود ہے اس کا فیصلہ بھی علمائے کرام ہی کریں گے لیکن جہاں تک مصری علماء کا معاملا ہے تو انہوں نے ''متحدہ اذان'' کا ''اینی شی ایٹیو'' لے کر اجتہاد کے ایک دور کا آغاز کر دیا ہے چنانچہ اگر یہ جائز ہے اور اس سے اگر اسلام کی بنیادی ہیئت اور فلسفہ تبدیل نہیں ہوتا تو ہمارے علمائے کرام کو میدان میں آنا چاہئے' انہیں بھی ایسے ''اینی شی ایٹیو'' لینے چاہئیں۔

سکاچ ٹیپ کا ٹکڑا
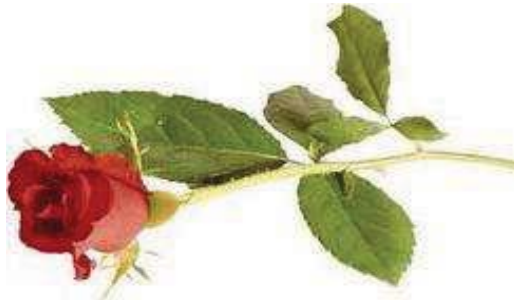
وہ خودکشی کی تیسری ناکام کوشش کے بعد ہمت ہار گیا اور اس نے اپنی زندگی عام لوگوں کیلئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا' وہ آج اس فیصلے کو دنیا کا بہترین فیصلہ سمجھتا ہے اور ورجینیا میں اپنے گھر کی بالکونی میں بیٹھ کر کافی کے مگ کے کنارے چپکی جھاگ پر ہونٹ رگڑ کر کہتا ہے "میں خودکشی کی تیسری کوشش کے بعد زندگی کے ہاتھوں شکست تسلیم نہ کرتا تو آج علاج کا یہ نیا طریقہ ایجاد نہ ہوتا اور سینکڑوں' ہزاروں بلکہ لاکھوں بیمار بچے قہقہوں کے ذریعے دکھوں کا مقابلہ نہ کرتے کاش دنیا کے وہ تمام لوگ جو خودکشی کرنے کیلئے گھر سے نکل رہے ہیں وہ ایک بار میرے ہسپتال کا دورہ کر لیں' وہ پیچ ایڈمز کی ویب سائٹ دیکھ لیں اور یہ ایک بار میرے مریض بچوں سے مل لیں تو یہ نا صرف مرنے کا فیصلہ واپس لے لیں گے بلکہ یہ میری طرح زندگی کو بڑے معانی' بڑے مقصد اور بڑے پیڈسٹل سے دیکھیں گے" اس کے ساتھ ہی وہ قہقہہ لگاتا ہے' اپنی لمبی گھنی اور سفید مونچھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے اور گہری آنکھوں سے مخاطب کو دیکھ کر کہتا ہے "دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط "ول پاور" خودکشی کرنے والے شخص کی ہوتی ہے' دنیا کا کوئی جاندار مرنا نہیں چاہتا لیکن خودکشی کرنے والا شخص زندگی کی خواہش پر بھی قابو پا لیتا ہے' یہ اپنی موت کا وقت اور طریقہ کار تک طے کر لیتا ہے' اس سے بڑی اور مضبوط قوت ارادی کس کے پاس ہو گی؟" وہ ساتھ ہی مخاطب کو گھور کر دیکھتا ہے اور مسخروں کی طرح قہقہہ لگا کر کہتا ہے "اور یہ شخص اگر اپنی قوت ارادی کو موت سے زندگی کی طرف شفٹ کر دے تو یقین کیجئے یہ پہاڑ کو اپنے قدموں پر کھڑا کر سکتا ہے کیونکہ زندگی میں اعلیٰ اور ارفع مقصد پانے کیلئے جنون درکار ہوتا ہے اور خودکشی کرنے والا شہ رگ تک جنون سے بھرا ہوتا ہے" وہ قہقہہ لگا کر کہتا ہے "پوری دنیا کو جنت بنانے کیلئے ایسے سو شخص چاہئیں جو میری طرح خودکشی میں ناکام رہے ہوں اور اس کے بعد انہوں نے نظام سے ٹکرانے کا فیصلہ کیا ہو' یقین کیجئے اس سے لوگوں کے دکھ اور مسئلے ختم ہو جائیں گے"۔

یہ ہنٹر کیمبل ایڈمز ہے' یہ ایک ناکام اور محروم انسان تھا' اس کا والد 1961ء میں کوریا کی جنگ میں مارا گیا' یہ اس وقت سولہ سال کا تھا' یہ خاندان کے ساتھ کوریا سے واشنگٹن آ گیا اور اس نے واشنگٹن میں ناانصافی' جنگ اور محرومی کے خلاف مہم شروع کر دی' یہ سڑکوں پر "جنگیں بند کرو" کے نعرے بھی لگاتا تھا اور سکول میں تعلیم بھی حاصل کرتا تھا' اس کا جنون سکول میں مذاق بن گیا' تمام بچے اسے پاگل سمجھ کر "اوئے اوئے" کے نعرے لگاتے تھے' اس کی ماں اور بہن بھائی غربت میں زندگی گزار رہے تھے' یہ ان کی حالت دیکھ کر کڑھتا تھا' خاندان کی غربت اور ساتھی طالب علموں کے مذاق نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا' اس کے اندر خودکشی کے رجحانات سر اٹھانے لگے' اس نے خودکشی کی پہلی کوشش کی' وہ اس میں ناکام ہو گیا' چھ ماہ بعد اس نے دوسری کوشش کی وہ اس میں بھی ناکام رہا' اس نے تین ماہ بعد تیسری کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں بھی ناکام رہا۔ تین لگاتار کوششوں کے بعد ڈاکٹروں نے اسے نفسیاتی مریض ڈکلیئر کر دیا اور اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیا' یہ پاگل خانے میں پاگلوں کے ساتھ رہتا تھا' پاگل خانے میں ایک سائنسدان بھی تھا' یہ شخص مطالعے کے جنون کی وجہ سے پاگل خانے پہنچ گیا تھا اور یہ وہاں اب ہر وقت مختلف تجربے کرتا رہتا تھا' ہنٹر کیمبل کو اس میں دلچسپی محسوس ہوئی اور وہ اکثر اوقات

اس لی ”لیبارٹری“ میں چلا جاتا جہاں سائنس دان فرضی تجربے کرتا رہتا تھا۔ وہ ایک دن سائنس دان کے ساتھ بیٹھا تھا تو اس نے دیکھا سائنسدان کی کافی کے کپ میں ہلکا سا سوراخ ہے اور اس سوراخ سے کافی کے قطرے میز پر ٹپک رہے ہیں' پاگل خانوں میں پاگلوں کو کاغذ کے کپوں اور پلیٹوں میں کھانے پینے کی چیزیں دی جاتی ہیں تاکہ یہ چینی یا دھات کے برتنوں سے اپنے آپ اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچا سکیں' سائنسدان کی کافی کا مگ بھی کاغذی تھا' ہنٹر کیمبل ایڈمز نے ٹیبل پر لگی سکاچ ٹیپ کا ایک چھوٹا سا پیس توڑا اور کپ کے ٹوٹے ہوئے حصے پر چپکا دیا' کافی کے قطرے رسنا بند ہو گئے' سائنسدان نے حیرت سے کپ کی طرف دیکھا' کپ پر لگے ”پیچ“ پر نظریں گاڑھیں اور ہنٹر کیمبل ایڈمز کو ”پیچ“ کا خطاب دے دیا یوں ہنٹر کیمبل ایڈمز کا نام ”پیچ ایڈمز“ ہو گیا اور یہ اس وقت پوری دنیا میں اسی نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے' اس واقعے سے ایڈمز نے اندازہ لگایا قدرت نے دراصل اسے دنیا میں پیچ (پیوند) لگانے کیلئے بھیجا ہے اور وہ اگر دکھی انسانیت کے رستے ہوئے زخموں پر پیوند لگا دے تو نا صرف اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا بلکہ ہزاروں' لاکھوں انسانوں کے دکھ درد بھی ختم ہو جائیں گے۔

پیچ ایڈمز پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا' میڈیکل ٹیسٹ کرائے' صحت مند ڈکلیئر ہوا اور پاگل خانے سے باہر آ گیا۔ پیچ ایڈمز کا خیال تھا میڈیکل سائنس میں سب کچھ ہے' اس میں طبی ٹیسٹ بھی ہیں' ادویات بھی ہیں' آپریشن کے جدید ترین آلات بھی ہیں اور طبی سہولتوں کی مشینیں بھی ہیں لیکن اس میں جذبات' احساسات اور انسانیت نہیں اور ایک مریض کو بیماری کے عالم میں دواؤں' ٹیسٹوں اور مشینوں سے زیادہ ہمدردی' پیار اور قہقہے درکار ہوتے ہیں' مریض اگر بیماری کی حالت میں روزانہ پانچ دس مرتبہ قہقہے لگا لے' یہ بستر پر بیٹھ کر خوشی سے تالیاں بجا لے تو یہ جلد صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا ڈاکٹروں اور طبی عملے کو ماں' بہن' بیوی' باپ اور بچے کی طرح ہمدرد اور مہربان ہونا چاہئے اور ہمارے ہسپتالوں میں یہ چیز کسی جگہ دکھائی نہیں دیتی' مریض ڈاکٹر کے پاس آتا ہے اور ڈاکٹر میکینکل انداز میں اسے چند کیپسول' چند نیلی پیلی گولیاں اور ٹیسٹوں کی لمبی چوڑی فہرست تھما کر واپس بھجوا دیتا ہے' اس سے مریض کا مرض بڑھ جاتا ہے اور وہ زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے' اس کا خیال تھا لوگ تھیٹروں میں بار بار کیوں جاتے ہیں' یہ ایک ہی قسم کے کارٹون پروگرام بیسیوں مرتبہ کیوں دیکھ لیتے ہیں اور یہ پچاس' پچاس سال پرانے جوکس پر بار بار قہقہے کیوں لگاتے ہیں؟ کیونکہ یہ چیزیں انہیں ریلیکس کرتی ہیں چنانچہ ڈاکٹروں کو بھی کارٹون کریکٹرز کی طرح ہونا چاہئے' انہیں تھیٹروں کا مزاحیہ اداکار ہونا چاہئے اور یہ ”جوک ماسٹرز“ ہونے چاہئیں تاکہ مریض خوشی سے ان کے پاس آئیں اور دوا کے ساتھ ساتھ قہقہے اور تالیوں کا تحفہ بھی لے کر جائیں' پیچ ایڈمز نے ایک ایسی نئی طب ایجاد کرنے کا فیصلہ کیا جس میں دوا کے ساتھ قہقہے بھی ہوں چنانچہ یہ پاگل خانے سے نکلا اور میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا' یہ دن کو میڈیکل کی تعلیم حاصل کرتا تھا اور رات کو مختلف کارٹون کریکٹرز کے کپڑے پہن کر ہسپتال کی مختلف وارڈز میں چلا جاتا تھا اور انتہائی بیمار مریضوں کے سامنے کھڑے ہو کر سرکس کے بونوں کی طرح اچھل کود کرتا تھا' مریض اسے دیکھ کر قہقہے لگاتے تھے اور یوں ان کی تکلیف' ان کا دکھ کم ہو جاتا تھا' یہ بچوں کی وارڈ میں بہت مقبول ہو گیا' کینسر کے انتہائی سیریس بچے رات اور پیچ ایڈمز کا انتظار کرتے تھے' یہ ”کلون“ بن کر وارڈ میں آتا تھا اور سارے مریض بچے مل کر اس کے ساتھ خوب

[illegible] طریقہ علاج کا [illegible] نتیجہ نکلا [illegible] کی شرح بہتر ہو گئی' میڈیکل کالج کی انتظامیہ نے پیچ ایڈمز کے طریقے کی شدید مخالفت کی' اسے کئی بار میڈیکل کالج سے نکالنے کی کوشش بھی کی لیکن مریضوں اور ساتھی طالب علموں کے شدید احتجاج پر کالج انتظامیہ اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور ہو گئی۔ہالی وڈ نے پیچ ایڈمز پر "پیچ ایڈمز" کے نام سے فلم بھی بنائی چنانچہ انڈیا کی مشہور فلم "منا بھائی" بھی پیچ ایڈمز کے اصلی کردار پر بنی ہوئی ہے' بہرحال جیسے تیسے پیچ ایڈمز نے میڈیکل کی تعلیم مکمل کی اور اس کے بعد اس نے 1972ء میں "Gesundheit" انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے نام سے ایک طبی ادارے کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے میں والنٹیئرز ڈاکٹرز خدمات سرانجام دیتے ہیں اور یہ سب لوگ پیچ ایڈمز کی طرح سرکس کے جوکرز' کارٹون کیریکٹرز اور مزاحیہ اداکاروں کے کپڑے پہن کر مریضوں کا علاج کرتے ہیں۔ پیچ ایڈمز کے ہسپتال میں تمام مریضوں کا علاج مفت ہوتا ہے اور اس کے مریضوں کی ریکوری کی شرح دنیا کے تمام ہسپتالوں سے کہیں اچھی ہے' پیچ ایڈمز اور اس کے ساتھی ہر سال سرکس کے جوکروں کے کپڑے پہن کر دنیا کے مختلف ملکوں میں بھی اپنے طریقہ علاج کی پروموشن کرتے ہیں اور ڈاکٹروں کو نیا طریقہ "اڈاپٹ" کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ پیچ ایڈمز کا خیال ہے مرض صرف ایک مریض تک محدود نہیں رہتا' یہ مرض مریض کے خاندان' اس کے بعد سوسائٹی' اس کے بعد ملک اور اس کے بعد پوری دنیا کو بیمار کر دیتا ہے چنانچہ ہمیں اپنے ماحول کو اتنا خوشگوار بنا دینا چاہئے کہ بیماریاں دوسرے لوگوں پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ پیچ ایڈمز آج کل مغربی ورجینیا میں 316 ایکڑ پر محیط دنیا کا جدید ترین فری ہسپتال بنا رہا ہے جس کے تمام ڈاکٹرز اور طبی عملہ قہقہوں اور لطیفوں کا ماسٹر ہو گا۔

کاش ہم سب لوگ پیچ ایڈمز کی طرح سوچ سکیں' ہم خودکشی کی بجائے پیچ ایڈمز کی طرح معاشرے کا پیوند بن جائیں' ہم اپنی زندگی کو سکاچ ٹیپ کا ایک ایسا چھوٹا سا ٹکڑا بنا لیں جو کسی کے دکھوں کے رستے ہوئے کپ کا پیوند بن جائے' جو موت کے سرہانے بیٹھے کسی مریض کے چہرے پر مسکراہٹ لے آئے۔ کاش ہم میں بھی دو چار پیچ ایڈمز ہوتے۔

اندھے معاشرے میں انصاف ڈھونڈتا ہوا اندھا
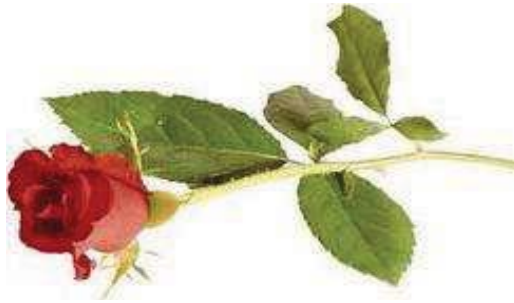
سردار احمد پیرزادہ میرے محسنوں کی فہرست میں چند ابتدائی ناموں میں آتے ہیں' میری ان سے پہلی ملاقات 1994ء میں ہوئی تھی' میں اس وقت ایک معمولی صحافی تھا اور پیرزادہ صاحب مقتدرہ قومی زبان میں پبلک ریلیشنز آفیسر تھے۔ پیرزادہ صاحب پہلے شخص تھے جنہوں نے مجھے کالم لکھنے کی ترغیب دی' وہ میری راہنمائی بھی کرتے تھے اور حوصلہ افزائی بھی۔ میں آج کالم نگار ہوں تو اس کی پہلی اینٹ اللہ تعالیٰ کے بعد سردار احمد پیرزادہ نے رکھی تھی' میں دو' تین سال تک ان سے مسلسل ملتا رہا لیکن مجھے اس دوران قطعاً اندازا نہیں ہوا پیرزادہ صاحب پوری طرح نہیں دیکھ سکتے کیونکہ وہ عام زندگی میں میری اور آپ کی طرح تمام تقاضے معمول کے مطابق پورے کرتے تھے' وہ ادارے کی پریس ریلیز تیار کرتے تھے' انہیں تمام اخبارات اور تمام مشہور صحافیوں کے نمبر زبانی یاد تھے' وہ خود یہ نمبر ڈائل کرتے تھے اور عام نارمل لوگوں کی طرح ٹیلی فون پر گفتگو کرتے تھے' اگلے دن اخبارات سے خبریں کاٹ کر کاغذ پر بھی لگاتے تھے اور یہ فائل چیئرمین کو بھی بھجواتے تھے' یہ آتے جاتے لوگوں کو بھی پہچان لیتے تھے اور ان کے ساتھ گپ شپ بھی کرتے تھے چنانچہ میں دو' تین برسوں تک ان کی معذوری نہ بھانپ سکا لیکن پھر مجھے اچانک معلوم ہوا پیرزادہ صاحب بچپن سے آنکھوں کی ایک ناقابل علاج بیماری "گلوکوما" کے شکار ہیں جس میں مریض کی بینائی آہستہ آہستہ تحلیل ہو جاتی ہے' آپ پیرزادہ صاحب کا کمال دیکھئے انہوں نے نا صرف اس بیماری کے باوجود پنجاب یونیورسٹی سے ابلاغیات میں ایم اے کیا بلکہ یہ مختلف اخبارات میں کام بھی کرتے رہے اور اس دوران انہوں نے کسی کو اپنی معذوری کی کانوں کان خبر نہیں ہونے دی' یہ 1988ء میں مقتدرہ قومی زبان میں تعلقات عامہ کے افسر بھرتی ہوئے' وہاں بھی یہ نارمل انسانوں کے مقابلے میں بڑے بڑے کام کرتے رہے' یہ ادارے کے ماہانہ مجلّہ "اخبار اردو" کی ادارت کرتے رہے اور یہ اردو کے ارتقاء اور ترقی و ترویج کے حوالے سے پانچ جلدوں پر مشتمل ایک جامع اور مکمل کتاب کے شریک مدیر بھی رہے' نوکری کے دوران پیرزادہ صاحب کی بینائی مکمل طور پر جواب دے گئی تو انہوں نے کانوں اور احساسات کو اپنی بینائی بنا لیا' یہ اپنی بیگم' اپنے بچوں اور اپنے ساتھیوں سے روزانہ دو تین اخبارات سنتے' رات بھر دنیا جہاں کی ریڈیو سروسز سنتے' ٹیلی فون پر دوستوں سے تازہ ترین خبریں جمع کرتے اور یوں اپنے آپ کو "اپ ڈیٹ" رکھتے' یہ دفتری کام بھی سن کر سرانجام دیتے' یہ سارے مضامین سن کر ایڈیٹ کراتے اور یہ سن کر "اخبار اردو" کا ٹائیٹل پیج بھی تیار کراتے اور ان میں غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہوتیں۔ پیرزادہ صاحب کی حسیات اس قدر تیز ہیں کہ آپ اگر ان کے سامنے کتاب یا اخبار پڑھ رہے ہیں تو یہ صرف ورق پلٹنے کی آواز سے اندازا لگا لیتے ہیں کہ آپ اردو کا اخبار پڑھ رہے ہیں یا پھر انگریزی کا۔ یہ پاؤں کی چاپ سے آنے اور جانے والوں کو بھی شناخت کر لیتے ہیں' یہ آواز سے آپ کو پہچان بھی جاتے ہیں اور برتن رکھنے کی آواز سے پلیٹ' پرچ اور کپ کا اندازا بھی لگا لیتے ہیں اور اس کے ہینڈل اور پوزیشن کا تعین بھی کر لیتے ہیں۔

سردار احمد پیرزادہ قدرت کا ایک شاہکار ہیں' معذوری نے بڑے ظالمانہ طریقے سے ان سے بہت کچھ چھین لیا لیکن انہوں نے اس سے کہیں زیادہ قوت کے ساتھ اپنی اس کمی کو اپنی طاقت بنا لیا اور حالات کچھ بھی ہوں'

مسائل جیسے بھی ہوں انہوں نے کسی قیمت پر ''کیواپ'' نہیں کیا' یہ 1988ء میں سترہویں گریڈ میں بھرتی ہوئے' آج انہیں ایک ہی ادارے میں بائیس سال ہو چکے ہیں' ان بائیس برسوں میں ان کے چپڑاسیوں تک کی پروموشن ہوگئی لیکن یہ آج بھی سترہویں گریڈ میں کام کر رہے ہیں اور شائد ریٹائرمنٹ تک ان کی پروموشن نہ ہو سکے کیونکہ یہ ایک جینوئن اور محنتی شخص ہیں اور ایسے لوگ اس ملک میں ہمیشہ پیچھے رہ جاتے ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے امید کا دامن نہیں چھوڑا حتیٰ کہ ان کی بینائی کے سارے چراغ گل ہوگئے تو انہوں نے کمپیوٹر کی مشعل جلالی' انہوں نے چالیس سال کی عمر میں کمپیوٹر سیکھا' جدید ''سکرین ریڈر پروگرام'' کی مدد سے ای میل' انٹرنیٹ اور ویب سرچنگ سیکھی اور یہ اب کمپیوٹر کے ذریعے پورے دنیا کے ساتھ منسلک ہیں' انہوں نے ریڈیو چینل پر ''سن رائز کے مہمان'' کے نام سے ایک پروگرام بھی شروع کیا اور یہ اب ایک قومی اخبار میں ''صاف صاف'' کے عنوان سے کالم بھی لکھ رہے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے پاکستان کے پہلے ''بلائنڈ کالمسٹ'' ہیں اور میں یہ تسلیم کرتے ہوئے پیرزادہ صاحب سے شدید حسد محسوس کر رہا ہوں کہ ان کا کالم ہم جیسے عقل کے اندھوں سے کہیں بہتر' شاندار اور مضبوط ہوتا ہے' پیرزادہ صاحب کے کالم کی مضبوطی کی وجہ ان کا ان تھک جذبہ' ناقابل شکست ارادہ اور ہار نہ ماننے کا فیصلہ ہے جبکہ ان کے مقابلے میں ہم عقل کے اندھے اکثر اوقات اپنے ٹوٹتے پھوٹتے ارادوں' اپنے ہار مانتے سمجھوتوں اور اپنے جذبوں کی تھکان کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے کالم پھیکے اور ہماری تحریریں بے روح ہو جاتی ہیں' ہمارے مقابلے میں پیرزادہ صاحب زیادہ مضبوط اور زیادہ ٹھوس ہیں چنانچہ ان کے کالم کی آن' شان اور بان ہر حال میں قائم رہتی ہے۔

قدرت کا یہ شاہکار آج کل ایک اندھے قانون کا شکار ہو رہا ہے۔ یہ قانون 1964ء میں اقتدار کی اندھی ہوس کے شکار ایک آمر نے بنایا تھا' اس قانون کو گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز مجریہ 1964ء کہا جاتا ہے' اس رول کی وجہ یہ تھی کہ 1964ء تک ہماری بیوروکریسی میں لوگوں کے ضمیر زندہ تھے اور اس وقت کے سرکاری ملازمین نوکری کے باوجود اخبارات اور ریڈیو پر اپنا مافی الضمیر کھل کر پیش کرتے رہتے تھے جس سے آمریت کا ایجنڈا متاثر ہوتا تھا چنانچہ فیلڈ مارشل ایوب خان نے سرکاری ملازمین کو تحریر اور صحافت سے دور رکھنے کیلئے ایک ایسا قانون پاس کیا جس کے تحت کوئی سرکاری ملازم اجازت کے بغیر اخبار میں نہیں لکھ سکتا۔ سردار احمد پیرزادہ نے کالم شروع کیا تو انہوں نے اس وقت کے چیئرمین پروفیسر فتح محمد ملک سے تحریری اجازت لے لی' پروفیسر صاحب کیونکہ خود کالم نگار ہیں چنانچہ انہوں نے پیرزادہ صاحب کو اجازت دے دی' پیرزادہ صاحب نے کالم شروع کیا تو مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین تبدیل ہوگئے' پروفیسر صاحب کی جگہ محترم افتخار عارف نے لے لی' افتخار عارف قاعدے اور قانون کے بندے ہیں لہٰذا انہوں نے پیرزادہ صاحب کو نوٹس دے دیا' اس نوٹس کے بعد پاکستان کا پہلا ''نابینا کالم نگار'' مشکل کا شکار ہوگیا' یہ قانون 1964ء میں بنا تھا' آج اس کو بنے ہوئے 46 سال ہو چکے ہیں' اس دوران درجنوں حکومتیں آئیں اور چلی گئیں' 1973 کا متفقہ آئین بھی آیا' اس آئین میں اٹھارہ ترامیم بھی ہوئیں اور ایک سویلین اور دو فوجی مارشل لاء بھی لگے لیکن کسی نے ایوب خان کے اس ظالمانہ قانون کو چھیڑنے کی زحمت نہیں کی' کیوں؟ کیونکہ یہ قانون تمام حکومتوں کو ''سوٹ'' کرتا تھا' اس دوران حکومتوں کے پروردہ

ملازمین سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ ریڈیو' ٹیلی ویژن اور اخبارات میں کام کرتے رہے اور قانون کونے میں کھڑا ہو کر شرماتا رہا لیکن جب اس ملک کے ایک نابینا شخص نے اپنی معذوری کے خلاف جہاد شروع کیا تو قانون تلوار لے کر اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا' کیا یہ ہے اس ملک کا انصاف' کیا یہ ہے اخلاقیات۔۔!!

سردار احمد پیرزادہ جیسے لوگ اس ملک کے بدبودار نظام میں خوشبو کے جزیرے ہیں' یہ دستیوں اور جٹوں کے اس ملک میں اصل رول ماڈل ہیں اور ہم اگر ان لوگوں کو ایوارڈ دینے' ان کی حوصلہ افزائی کرنے' ان کے کندھے پر ہاتھ رکھنے اور ان کے گلے میں ہار ڈالنے کی بجائے ان کی سفید چھڑی چھین لیں گے تو ہم اس معاشرے کو منافقت اور بے انصافی کے اندھے کنوئیں میں مزید آگے دھکیل دیں گے؟ کیا اس ملک میں کسی ایسے اندھے شخص کیلئے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کی کوئی گنجائش نہیں' جس نے پیدائشی معذوری کے ساتھ خوشاب میں آنکھ کھولی' جس نے مدہم ہوتی روشنیوں کے ساتھ کالج تک تعلیم حاصل کی بعدازاں ٹٹول ٹٹول کر لاہور پہنچا' پنجاب یونیورسٹی میں میرٹ پر داخلہ لیا' ریگولر سٹوڈنٹ کی حیثیت سے اعزاز کے ساتھ ایم اے صحافت کیا اور پھر بائیس سال ایک ہی گریڈ پر پروموشن کے بغیر زندگی گزار دی لیکن زندگی کے سامنے شکست تسلیم نہیں کی اور یہ معذوری کو اپنی طاقت بناتا چلا گیا' یہ شخص اس معاشرے' اس حکومت اور ہماری آزاد عدلیہ سے کیا مانگ رہا ہے؟ یہ ان سے صرف اظہار کی آزادی مانگ رہا ہے' یہ ان سے صرف اتنی درخواست کر رہا ہے "جناب ملک کا پہلا نابینا کالم نگار اپنے اندر موجود رنگ اخبار کے کاغذ تک پہنچانا چاہتا ہے' آپ اسے سانس لینے کی اتنی سی آزادی دے دیں" لیکن جس ملک میں قانون ساز جعلی ڈگریوں کی وکالت کر رہے ہوں اس ملک میں سردار پیرزادہ صاحب جیسے نابیناؤں کو انصاف کہاں ملے گا' یہ ایک اندھا معاشرہ ہے جس میں صرف اخلاق اور سیاست کے اندھوں کو انصاف ملتا ہے چنانچہ پیرزادہ صاحب کی جھولی خالی ہے اور یہ آخر تک خالی رہے گی' ایک اندھے کے اندھے جذبوں کی آنچ محسوس کرنے کیلئے ایک روشن شعور کی ضرورت ہوتی ہے اور ہم نے برسوں پہلے یہ شعور بیچ کر این آر او خرید لئے تھے۔

تقویٰ
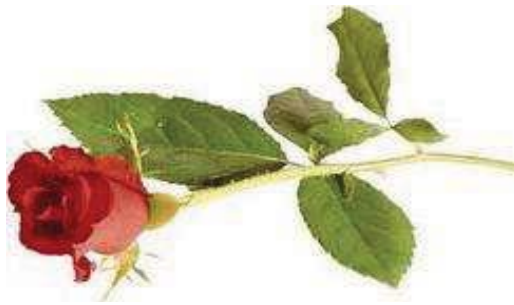
مجھے نام یاد نہیں لیکن ان کا شمار اماموں میں ہوتا تھا' لوگ دور دور سے ان سے فتویٰ لینے آتے تھے اور وہ قرآن مجید کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے' ایک دن طالبعلم ان کے ساتھ بیٹھے تھے اور ان کے کپڑوں پر مٹی کا چھوٹا سا داغ لگ گیا' آپ اٹھے' پانی منگوایا' وہ داغ دھویا اور دوبارہ بیٹھ گئے' شاگردوں نے عرض کیا "استاد محترم شریعت کے مطابق یہ داغ نجاست کے دائرے میں نہیں آتا تھا لیکن آپ نے اس کے باوجود اتنا تردد کیا کیوں؟" امام مسکرائے اور جواب دیا "میں نے یہ داغ فتوے کی وجہ سے نہیں تقویٰ کی وجہ سے دھویا تھا" شاگردوں نے پوچھا "جناب فتویٰ اور تقویٰ میں کیا فرق ہے" جواب میں فرمایا "فتویٰ عام لوگوں کیلئے ہوتا ہے اور تقویٰ فتویٰ دینے والوں کیلئے" آپ رکے اور دوبارہ فرمایا "فتویٰ دینے والے جب تک تقویٰ کے معیار پر پورے نہ اتریں انہیں اس وقت تک فتویٰ نہیں دینا چاہیے" آپ نے فرمایا "میرے کپڑے پاک ہوں گے تو ہی میں دوسروں کو صفائی کی تلقین کر سکوں گا" یہ امام کون تھے اور ان کا اسلام' شریعت اور طریقت میں کیا مقام تھا میں سر دست اس پر زیادہ بحث نہیں کر سکتا لیکن میرا خیال ہے ہمارے سیاستدانوں اور حکمران کلاس کے صاحبزادگان کو زندگی میں ایک بار فتویٰ اور تقویٰ کا فرق ضرور سمجھ لینا چاہیے کیونکہ ملک چلانے کی ذمہ داری سیاستدانوں کے کندھوں پر استوار ہوتی ہے اور جب تک یہ لوگ سیاسی تقویٰ کی پوزیشن پر نہیں پہنچیں گے اس وقت تک یہ لوگ اس ملک کے حالات ٹھیک نہیں کر سکیں گے۔

ہم لوگ اکثر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں لیڈر شپ کیا ہوتی ہے؟ کیا ایک لمبی چوڑی پارٹی' ہیوی ووٹ بینک اور دس بیس بلین ڈالرز کا اکاؤنٹ لیڈر شپ ہے؟ جی نہیں! ہرگز نہیں' قیادت میں جب تک پانچ خوبیاں نہ ہوں یہ اچھی لیڈر شپ ثابت نہیں ہوتی' قیادت کی پہلی خوبی کا اظہار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان کرتے وقت کیا تھا' آپ ؐ نے قریش کو بلا کر فرمایا تھا' میرے چالیس سال آپ لوگوں کے سامنے ہیں' آپ بتایئے کیا میں نے آج تک جھوٹ بولا' اہل قریش یک زبان ہو کر بولے "ہم گواہی دیتے ہیں آپ صادق اور امین ہیں" قریش کے اس اعتراف نے لیڈر شپ کا پہلا اصول طے کر دیا۔ دوسرا اصول اس وقت طے ہوا جب قریش نے آپ ؐ کو سونے' چاندی' ہیرے' جواہرات اور خوبصورت خواتین کی ترغیب دی تھی اور آپ ؐ نے فرمایا تھا اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے ہاتھ پر سورج رکھ دیا جائے تو بھی خدا کی قسم میں اپنے پیغام سے پیچھے نہیں ہٹوں گا' اس جواب نے قیادت کے دوسرے اصول کی بنیاد رکھ دی تھی کہ لیڈر لالچ میں نہیں آتے' یہ بک نہیں سکتے اور ترغیب اس کے پیغام کو ماند نہیں کرتی۔ تیسرا اصول بدر کے میدان میں طے ہوا تھا' آپ ؐ کے ساتھ صرف 313 لوگ تھے' آپ ؐ کے پاس سواریاں' خوراک اور اسلحہ کم تھا' تین تین لوگ ایک ایک اونٹ شیئر کرتے ہوئے بدر کے میدان میں پہنچے تھے' دو دو لوگوں کے پاس ایک ایک تلوار تھی اور ان لوگوں کے پاؤں میں جوتے' پیٹ میں خوراک اور تن پر پورے کپڑے بھی نہیں تھے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ مکہ کی سپر پاور کے سامنے کھڑے ہو گئے' غزوہ بدر نے لیڈر شپ کا تیسرا اصول طے کر دیا تھا' یہ اصول بتاتا ہے آپ اگر سچے ہیں تو آپ اللہ تعالیٰ پر یقین رکھیں' وسائل کی کمی کے باوجود ٹوٹے پھوٹے لشکر کے ساتھ میدان میں اتر آئیں' آپ

کے موقف کی سچائی سپر پاورز کو ''یوڈاؤن'' ہونے پر مجبور کر دے گی۔ لیڈر شپ کا چوتھا اصول فتح مکہ کے وقت طے ہوا تھا' آپؐ نے وہ مکہ فتح کر لیا جہاں سے آپ کو رات کے اندھیرے میں ہجرت کرنا پڑی تھی' کعبہ کے بت آپؐ کے قدموں میں پڑے تھے اور وہ تمام لوگ جو آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے' آپؐ پر (نعوذ باللہ) گندگی پھینکتے تھے' آپؐ کے گلے میں اونٹ کی اوجھڑی ڈال دیتے تھے اور جو گلیوں اور بازاروں میں آپ کا مذاق اڑاتے تھے' وہ سب لوگ سر جھکا کر آپؐ کے سامنے کھڑے تھے' آپؐ نے سر مبارک اٹھایا اور ان تمام لوگوں کو معاف کر دیا' اس آواز نے سب کے سینے دہلا دیئے اور ان لوگوں نے حیرت سے پوچھا' کیا آپؐ نے مجھے بھی معاف کر دیا' آپؐ نے فرمایا ہاں' ہندہ نے پوچھا' میں نے آپؐ کے چچا اور ہمدم دیرینہ حضرت امیر حمزہؓ کا کلیجہ چبایا تھا' آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن فرمایا میں نے تمہیں بھی معاف کیا' وہ حبشی جس نے حضرت امیر حمزہؓ کا سینہ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکالا تھا اس نے پوچھا کیا میں بھی معاف کر دیا گیا ہوں' فرمایا ''ہاں تم بھی لیکن کوشش کرنا تم میرے سامنے نہ آؤ'' یہ قیادت کا چوتھا اصول تھا یعنی سب کو معاف کر دو تاکہ معاشرہ اور سسٹم آگے چل سکے اور قیادت کا پانچواں اور آخری اصول آپ کی دنیا سے رخصتی کا دن تھا' آپؐ نے انتقال فرمایا تو گھر میں کفن دفن تک کیلئے پیسے نہیں تھے' آپؐ کی زرہ مبارک رہن رکھی گئی اور اس سے کفن کا بندوبست کیا گیا' تاج دار کائنات کی دنیا سے رخصتی نے قیادت کا آخری اصول طے کر دیا تھا یعنی لیڈر وہ ہے جو جاتے ہوئے دنیا میں کوئی خزانہ' کوئی جائیداد' کوئی اکاؤنٹ اور کوئی اثاثہ نہ چھوڑ کر جائے۔ یہ ہے قیادت کا وہ تقویٰ جس کے بغیر کوئی شخص قائد کہلا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی اچھل کود کو ہم لیڈر شپ کہہ سکتے ہیں' دنیا کا کوئی شخص اس وقت تک لیڈر نہیں بن سکتا جب تک لوگ اس کی صداقت اور امانت کی گواہی نہ دیں' جب تک وہ مالی اور دنیاوی ترغیبات سے بلند نہ ہو جائے' جب تک وہ دوسری طاقتوں کے خوف سے آزاد نہ ہو جائے' جب تک اس میں بڑے سے بڑے دشمن کو معاف کرنے کا حوصلہ پیدا نہ ہو جائے اور جب تک وہ دنیا سے خالی ہاتھ جانے کا سامان پیدا نہ کر لے۔ آپ اب قیادت کے ان پانچ اصولوں کو سامنے رکھ کر دنیا کے تمام بڑے قائدین کو دیکھئے' آپ کو دنیا کا ہر بڑا لیڈر ان پانچ اصولوں کی کسوٹی پر پورا اترتا دکھائی دے گا' آپ کو دنیا کا ہر بڑا لیڈر غیر محسوس طریقے سے نبی اکرمؐ کی سنت پر عمل کرتا نظر آئے گا' آپ قائداعظم سے لے کر نیلسن منڈیلا تک آج کے تمام بڑے لیڈروں کو دیکھ لیجئے' آپ کو یہ پانچ اصول ان سب میں دکھائی دیں گے۔

آپ اب آج کی لیڈر شپ کو ان پانچ اصولوں کے سامنے کھڑا کر کے دیکھئے اور یہ سوچئے کیا ہمارے آج کے لیڈر ان پانچ اصولوں پر پورے اترتے ہیں؟ مجھے یقین ہے آپ کا جواب ہو گا ''نہیں! ہرگز نہیں'' اب سوال یہ ہے پھر یہ لوگ اس بدلے ہوئے پاکستان کی قیادت کیسے کریں گے جس میں سول سوسائٹی نے اپنے زور پر فوجی حکمرانوں کو اقتدار سے بھی فارغ کر دیا تھا اور چیف جسٹس کو بھی بحال کرا لیا تھا' ہمارے لیڈر بدقسمتی سے ایک بدلے ہوئے پاکستان میں سیاسی دکانداری کو لیڈر شپ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور بری طرح منہ کی کھا رہے ہیں' ان کی صداقت اور امانت کا یہ عالم ہے کہ ان کے اہل خانہ تک ان کی صداقت اور امانت کی گواہی دینے کیلئے تیار نہیں ہیں' کیا جاوید ہاشمی' چوہدری نثار علی اور خواجہ آصف میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کی صداقت اور امانت کا حلف دے سکتے ہیں؟

امانت کا حلف دے سکتے ہیں؟

کیا میاں رضا ربانی اور یوسف رضا گیلانی صدر آصف علی زرداری کی صداقت اور امانت کا حلف دے سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ہم ان کی لیڈر شپ کو اکیسویں صدی کی لیڈر شپ کیسے تسلیم کر لیں' آج کا ذہن سوال کرتا ہے کیا یہ لوگ لالچ اور ترغیب سے آزاد ہو چکے ہیں' کیا یہ لوگ خوف سے پاک ہو چکے ہیں' کیا یہ لوگ کھلے دل سے دوسروں کو معاف کرنے کیلئے تیار ہیں اور کیا یہ لوگ دولت کی سیاست چھوڑنے کیلئے رضامند ہیں' اگر اس کا جواب نہیں ہے تو پھر اس ملک میں تبدیلی کیسے آئے گی؟' یہ لوگ اگر اسی طرح جعلی ڈگریوں کی وکالت کریں گے یا اپنے چھوٹے چھوٹے سیاسی مفادات کو جمہوریت کا نام دیں گے اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد پانچ سال تک حکومت ہو گا تو اس ملک کے عوام کی حالت کیسے تبدیل ہو گی' دنیا کی دس ہزار سال کی تحریری تاریخ کا اعلان ہے جس ملک کے حکمران' قائدین اور سیاسی رہنما امیر ہوتے ہیں اس ملک کے عوام ہمیشہ بھوکے سوتے اور ننگے بدن جاگتے ہیں اور اس کے برعکس جس ملک کے لیڈروں کو ادھار کا کفن دیا جاتا ہے اس ملک میں زکوۃ لینے والا کوئی نہیں ہوتا' آپ امریکا سے لے کر چین تک دنیا کی ساری لیڈر شپ دیکھ لیجئے' آپ کو ان میں کوئی دکاندار دکھائی نہیں دے گا' یہ سب لوگ اندر سے بھرے ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے قوم کا مقدر بدل دیا۔

میری اپنے لیڈروں سے درخواست ہے آپ خدا کیلئے چیونٹیوں کی طرح زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش بند کر دیں' آپ لیڈر بنیں' آپ اپنے تقویٰ کو اس لیول پر لے جائیں کہ آپ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ فتویٰ بن جائے اور لوگ اس پر مذہبی حکم کی طرح عمل کریں تا کہ آپ کا نام تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے زندہ رہ جائے۔ آپ نے اگر آج بھی سیاست کو کان اور فیکٹری کی طرح چلایا تو ملک ختم ہو جائے گا اور آپ اور آپ کی اولاد دوسری قوموں کے جھوٹے برتن مانجھ کر زندگی گزارے گی کیونکہ قدرت سب کو معاف کر دیتی ہے لیکن قوم سے دھوکہ کرنے والے لیڈروں کی غلطیاں کبھی معاف نہیں کرتی۔

چیونگم ٹو
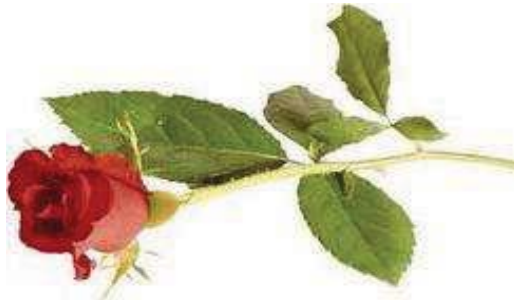
مجھے دوسری بات ایک عام اجنبی نے سمجھائی تھی' مجھے جب بھی کوئی قاری فون کرتا ہے یا ملاقات کیلئے آتا ہے اور میرے کام کی تعریف کرتا ہے تو مجھے فوراً وہ اجنبی یاد آ جاتا ہے اور میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کیلئے دعا نکلتی ہے' وہ کون تھا' کہاں سے آیا تھا' اس کا نام کیا تھا اور وہ اس بینچ سے اٹھ کر کہاں چلا گیا؟ میں نہیں جانتا لیکن اس شخص نے میری گروتھ میں مرکزی کردار ادا کیا۔

یہ 1993ء کی بات تھی' میں ایک نالائق' سست' ناکام اور مایوس شخص تھا' میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا اور میری زندگی کی کوئی منزل نہیں تھی' میرے ذہن' میرے دماغ میں ہر وقت آندھیاں چلتی رہتی تھیں اور میں ڈپریشن کی شدت میں آوارہ پتے کی طرح سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ میں ایک دن شدید ڈپریشن میں لاہور کے باغ جناح میں چلا گیا اور چپ چاپ ایک بینچ پر بیٹھ گیا' میرا سر میرے سینے پر گرا ہوا تھا اور میں بازو ٹانگوں پر رکھ کر آگے جھکا ہوا تھا' میں پچھلے کئی گھنٹوں سے اس پوزیشن میں گھاس کے تنکے گن رہا تھا' مجھے اچانک کسی کے آنے اور بینچ پر بیٹھنے کا احساس ہوا' میں نے سر اٹھا کر دائیں جانب دیکھا تو وہ شخص مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھا تھا' اس نے شہد سے بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا ''بیٹا جی کیا میں آپ کے ساتھ بات کر سکتا ہوں'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے ہاں میں گردن ہلا دی' وہ نرم آواز میں بولا ''میں پچھلے دو گھنٹوں سے آپ کو دیکھ رہا ہوں' آپ مجھے پریشان دکھائی دے رہے ہیں' آپ خیریت سے ہیں'' میں اس وقت تک اندر سے پک چکا تھا اور جب انسان کا ڈپریشن پوری طرح پک جاتا ہے تو وہ پھوڑے کی شکل اختیار کر جاتا ہے اور جس طرح پھوڑا اپنا مواد باہر پھینکنے کیلئے سوئی کی نوک' ہلکی سی چوٹ اور معمولی سی خارش کا انتظار کرتا ہے بالکل اسی طرح اندر سے پکے ہوئے انسان کو بھی کوئی ہمدرد کندھا' کوئی اخلاص سے بھری ہوئی تھپکی اور تسلی کے چند لفظ چاہئے ہوتے ہیں اور انسان پکے ہوئے پھوڑے کی طرح بہنے لگتا ہے' میں بھی بہہ نکلا' میں نے اپنی زندگی کی ساری محرومیاں' اپنی ساری ناکامیاں' اپنی روح کے تمام گھاؤ اور اپنے احساس پر دوسروں کی کھرچی ہوئی لکیریں سب اس کے سامنے رکھ دیں' وہ پورے سکون سے میری بات سنتا رہا' میں جب تھک کر چپ ہوا تو وہ مسکرایا اور نرم آواز میں بولا ''میرا بیٹا آپ کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں' آپ بس حساس ہیں'' میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا' وہ بولا ''حساسیت قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ جب کسی کو ترقی کیلئے چنتا ہے تو وہ اسے حساسیت کا تحفہ دیتا ہے' تم دنیا کے تمام کامیاب' بڑے اور نامور لوگوں کی آٹو بائیو گرافی پڑھو' تمہیں ان سب میں حساسیت کامن ملے گی' تم ناکام' ڈپریشن' پاگل پن اور خودکشی کے مرض میں مبتلا لوگوں کی کہانیاں بھی پڑھو' تمہیں ان میں بھی حساسیت ملے گی لیکن ان دونوں کی حساسیت میں ایک فرق ہوتا ہے' کامیاب لوگ اپنی حساسیت کو اپنی طاقت بنا لیتے ہیں جبکہ ناکام' پاگل اور ڈیپریس لوگ اسے اپنی قوت نہیں بنا پاتے لہٰذا یہ ناکامی' بدنصیبی اور پاگل پن کی عبرت ناک مثال بن جاتے ہیں اور دوسرے لوگ شہرت کی اس چوٹی پر پہنچ جاتے ہیں جہاں لوگ انہیں حسرت سے دیکھتے ہیں اور ان جیسا بننے کی دعا کرتے ہیں' تم کامیابی اور ناکامی کے درمیان کھڑے ہو' تم آج اپنی اس حساسیت کو اپنی طاقت بنا لو' یقین کرو دس سال بعد پورا ملک تمہارے نام سے واقف ہو گا اور تم آج اس

حساسیت کو آگ کی شکل دے دو' تم ایک سال میں اس کی تپش میں تحلیل ہو جاؤ گے" مجھے اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا لیکن اس کا طریقہ گفتگو اس قدر میٹھا اور پرکشش تھا کہ میں چپ چاپ سنتا رہا' وہ بولا "میں تمہیں حساسیت کو طاقت بنانے کا گر سکھاتا ہوں' تم اگر اس پر ابھی سے عمل شروع کر دو تو میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں تم ایک دو برسوں میں اس ٹریک پر آجاؤ گے جس کے آخر میں شہرت' عزت' دولت اور سکون کے انبار لگے ہیں" میں نے حیرت سے پوچھا "وہ کیا گر ہے" وہ مسکرا کر بولا "میں تمہیں پہلے حساسیت کی دو بڑی خوبیاں بتاتا ہوں' حساسیت کی پہلی خوبی انرجی یا ٹیلنٹ ہوتا ہے' یہ یاد رکھو دنیا میں صرف وہی شخص "سینسیٹو" ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ ٹیلنٹ' انرجی اور عقل سے نوازتا ہے' کوڑھ مغز' نالائق اور جاہل شخص کبھی حساس نہیں ہوتا' یہ جانوروں جیسی زندگی گزارتا ہے' کوہلو کے بیل کی طرح چپ چاپ گردن ہلا کر' ڈنڈے کھا کر۔ دوسری بات' دنیا کے تمام حساس لوگوں میں مستقل مزاجی ہوتی ہے' اگر کسی شخص میں مستقل مزاجی کی عادت نہ ہو تو وہ حساس نہیں ہو سکتا' دنیا کا کوئی حساس شخص جب مستقل مزاجی اور ٹیلنٹ سے کام نہیں لیتا تو اسے ڈپریشن ہو جاتا ہے اور یہ ڈپریشن آگے چل کر پاگل پن' مایوسی اور ناکامی کی شکل اختیار کر لیتا ہے' تم نے بس دو کام کرنے ہیں' ایک تم اپنے ٹیلنٹ کو پہچانو' تم یہ تعین کرو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دوسروں کے مقابلے میں کون سی خوبی زیادہ دے رکھی ہے اور اس کے بعد اس خوبی کے استعمال کو مستقل مزاجی کے ڈسپلن میں لے آؤ' تمہاری حساسیت تمہاری طاقت بن جائے گی"۔

میں اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگا' وہ بولا "تم اب چاہتے ہو میں تمہارے ٹیلنٹ کو ڈسکور کرنے میں تمہاری مدد کروں اور تمہیں مستقل مزاجی کی تکنیکس بتاؤں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا' وہ بولا "ٹیلنٹ کو ڈسکور کرنے کے چار اصول ہیں' وہ کام جسے کرتے ہوئے آپ تھکتے نہیں' وہ کام جسے کرتے ہوئے آپ کو وقت کا احساس نہیں ہوتا' وہ کام جسے مکمل کرنے کے بعد آپ کو بے تحاشا تسکین ہوتی ہے اور وہ کام جس کی دوسرے لوگ فوراً گواہی دیتے ہیں" میں فوراً بولا "مجھے لکھنے پڑھنے میں بہت مزہ آتا ہے" اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "اس کا مطلب ہے تم میں لکھاری بننے کی خوبی ہے' تم کرتے کیا ہو؟" میں نے عرض کیا "میں اخبار میں چھوٹا سا ملازم ہوں" وہ بولا "یہ بتاؤ اخبار کے کامیاب ترین لوگ کون ہوتے ہیں" میں نے جواب دیا "ایڈیٹر اور کالم نگار" وہ بولا "تم اب ان دونوں میں سے کسی ایک پوزیشن کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لو' بتاؤ تم ایڈیٹر بننا چاہتے ہو یا کالم نگار' میں نے ایک لمحے سوچا اور جواب دیا "کالم نگار" اس نے خوش دلی سے کہا "گڈ' تم اب بتاؤ اچھا کالم نگار بننے کیلئے انسان کو کیا کرنا چاہئے؟" میں نے جواب دیا "مطالعہ' مشاہدہ اور لکھنے کی پریکٹس" اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "تم اب ان تینوں چیزوں کو مستقل مزاجی کے ڈسپلن میں لے آؤ' تم آج سے روزانہ ایک صفحہ ضرور پڑھو گے' تم آج سے دنیا کی ہر چیز کا کالم نگار کی نظر سے مشاہدہ کرو گے' تم چائے کا کپ بھی یہ سمجھ کر پکڑو گے کہ اگر تمہیں اس پر کالم لکھنا پڑ جائے تو تم وہ کالم کس طرح شروع کرو گے اور کس نکتے پر پہنچ کر ختم کرو گے اور تم آج سے روزانہ ایک صفحہ ضرور لکھو گے" میں نے پہلو بدل کر پوچھا "لیکن اس سے کیا ہوگا" وہ بولا "روزانہ صفحہ پڑھنے' ایک صفحہ لکھنے اور دس' پندرہ' بیس چیزوں کے مشاہدے کا مطلب ہوگا سال میں 365 صفحات کا مطالعہ' 365 صفحات لکھنے کی پریکٹس اور چار' ساڑھے ہزار چیزوں کا کالم نگاروں کی نظر سے مشاہدہ۔ یہ سب چیزیں جب تمہاری مستقل مزاجی کا حصہ بن جائیں گی تو تمہیں ایک سال میں کالم نگار بنا دیں گی" وہ کا اس نے گھنٹوں پر ہاتھ رکھا اور بولا "میں [illegible]

آپ کو آخری کام کی بات بتانے لگا ہوں' انسان اگر پانچ اچھی چیزوں کو اپنی روزانہ روٹین کا حصہ بنالے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے کامیاب ہونے سے نہیں روک سکتی'' میں نے حیرت سے پوچھا'' وہ پانچ چیزیں کون سی ہیں'' اس نے قہقہہ لگایا اور بولا'' یہ پانچ عادتیں ہر شخص کیلئے مختلف ہوتی ہیں' دنیا کے ہر شخص کو دو اڑھائی سو اچھی عادتوں میں سے اپنی شخصیت سے میچ کرنے والی پانچ عادتیں منتخب کرنی چاہئیں اور جب یہ پانچ عادتیں منتخب کر لے تو پھر اسے انہیں اسی طرح اپنی زندگی کا حصہ بنالینا چاہئے جس طرح ہم لوگ رات کو سوتے ہیں' صبح جاگتے ہیں اور دوپہر اور رات کو کھانا کھاتے ہیں' ہم پانچ عادتیں تلاش کر کے انہیں اپنی روٹین بنالیں تو قدرت ہم پر کامیابی کے دروازے کھول دیتی ہے' تم بھی کوئی سی پانچ اچھی عادتیں اپنالو اور پھر مذہب کی طرح ان پر عمل کرو' تم ایک سال بعد دنیا کے کسی شخص کو ڈپریس دکھائی نہیں دو گے''۔

وہ شخص اس کے ساتھ ہی اٹھا' مجھ سے ہاتھ ملایا اور میری زندگی سے خارج ہو گیا لیکن اس کے چھوڑے ہوئے نقش آج تک میری ذات کا حصہ ہیں۔ میں جب بھی کوئی مثبت عادت اپناتا ہوں' مجھے کوئی چیز' کوئی خوبی اچھی لگتی ہے تو میں اسے اپنی روٹین کا حصہ بنالیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ میرے لئے مقدر کے بند دروازے کھول دیتا ہے' میں روز اس اجنبی کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں اور اس کو دعائیں بھی دیتا ہوں۔

جاوید ہاشمی صاحب اٹھیے
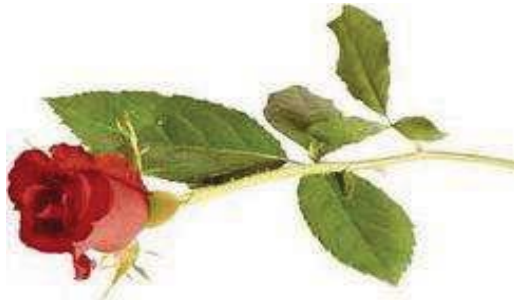
"اگر قائداعظم 2010ء تک زندہ ہوتے تو ان کے ساتھ کیا ہوتا" یہ سوال چند دن قبل مخدوم جاوید ہاشمی نے مجھ سے پوچھا تھا' میں ان کے کمرے میں بیٹھا تھا' ہم چائے پی رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ لگا رہے تھے' میں نے قہقہہ لگایا اور عرض کیا "وہ اس وقت جیل میں ہوتے' جلا وطنی کی زندگی گزار رہے ہوتے' کسی فوجی آمر کے ہاتھوں الیکشن ہار چکے ہوتے' ان کی پارٹی پیٹریاٹ بن کر کسی دوسری جماعت میں ضم ہو چکی ہوتی' وہ طیارہ سازش کیس میں عدالتوں کے دھکے کھا رہے ہوتے یا پھر انہیں کسی نہ کسی این آر او کی پیش کش ہو چکی ہوتی" میں روانی میں قائداعظم محمد علی جناح کے سیاسی مستقبل کے بارے میں پیش گوئی کرتا رہا اور مخدوم جاوید ہاشمی مسکراتے چلے گئے' میں نے عرض کیا "اور ان کی پارٹی بھی اب تک کسی نہ کسی جاگیر دار' سرمایہ دار اور صنعت کار کے ہاتھوں فروخت ہو چکی ہوتی اور قائداعظم حیرت سے کبھی اپنی قوم کی طرف دیکھتے اور کبھی ان رفقاء کار پر نظر ڈالتے جو انہیں دن رات مسلمانوں کا مسیحا کہتے تھے اور ان کے قدموں میں اپنی جان نچھاور کرتے تھے لیکن جب وقت بدلا تو وہ سب فوجی آمروں کی گود میں بیٹھ گئے اور انہوں نے نظریہ ضرورت کو نظریہ پاکستان بنا لیا" جاوید ہاشمی نے قہقہہ لگایا اور میری بات سے سو فیصد اتفاق کیا۔

میں مخدوم جاوید ہاشمی سے پہلی بار کب ملا' کہاں ملا اور ہماری پہلی بار کس موضوع پر گفتگو ہوئی' یہ مجھے یاد نہیں کیونکہ جب کوئی شخص آپ کے دل میں اتر جاتا ہے تو پھر پہلی' دوسری' تیسری اور ہزارویں ملاقات سب بے معنی ہو جاتی ہیں' بس اس کی شخصیت کا ہیولہ رہ جاتا ہے جو ہر وقت آپ کے ارد گرد منڈلاتا رہتا ہے۔ جاوید ہاشمی صاحب کے ساتھ میرا ایک ایسا ہی قلبی تعلق قائم ہو گیا جس میں ملاقاتیں اور بات چیت بے معنی ہو کر رہ گئی۔ جاوید ہاشمی حقیقتاً آج کے دور کا سیاسی ولی ہے' یہ اس ملک کے سیاستدانوں کا فرض کفایہ بھی ہے اور اس ملک کی ٹوٹی پھوٹی' پھٹی پرانی اور کرچی کرچی جمہوریت کا ضمیر بھی۔ ہم اگر آج اس ملک میں این آر او زدہ جمہوریت' کرپشن میں لتھڑی سیاست اور منافقت کی بو میں رچی بسی پارلیمنٹ کی عزت کرتے ہیں تو اس کی واحد وجہ جاوید ہاشمی جیسے چند سیاستدان ہیں جنہوں نے آج کے دور میں بھی اصول' سچائی' حق اور ضمیر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہرن کے بارے میں کہا جاتا ہے جب اس سے اس کا بچہ بچھڑ جاتا ہے یا کوئی اس کا بچہ چھین لیتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ رنگ کا ایک تل بن جاتا ہے" شاعری کی زبان میں اس نشان کو "نقش سویدا" کہتے ہیں۔ یہ نقش انسان میں بھی موجود ہے لیکن اس کے دل پر جدائی سے تل نہیں ابھرتا بلکہ اس کا دل وعدہ توڑنے' بے ضمیری کا مظاہرہ کرنے' لوگوں کی حق تلفی کرنے' اپنی ڈیوٹی پوری طرح سرانجام نہ دینے اور لوگوں کو دھوکا دینے کے بعد سیاہ ہونے لگتا ہے' یہ دل جب تلوں سے بھر جاتا ہے تو روحانی زبان میں اسے "قلب سیاہ" کہتے ہیں' آپ نے روحانی بزرگوں اور علمائے کرام سے اکثر سنا ہو گا فلاں شخص کا دل سیاہ ہو چکا ہے' یہ سیاہی وہی ہوتی ہے جو ہمارے منفی اقدامات کے باعث ہمارے دل پر چھوٹے چھوٹے تلوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب ہمارا چاند کی طرح چمکتا دل مخروطی بینگن کی طرح سیاہ ہو جاتا ہے۔ جاوید ہاشمی روحانی قدروں کو سمجھنے والا شخص ہے' اسے اپنی سیاسی کلاس کے سیاہ دل صاف دکھائی دے رہے تھے چنانچہ یہ پچھلے چھ ماہ سے شدید کرب میں مبتلا تھا' یہ برملا

اظہار کرتا تھا پاکستان کے تمام مسائل کے ذمہ دار سیاستدان ہیں۔ وہ کہتا تھا ''یہ ہم لوگ ہیں جن کے چھوٹے چھوٹے مفادات اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں'' وہ بانگ دہل کہتا تھا ''ہم سب سیاستدان' ہم سب سیاسی جماعتیں اور ہم سب کی سیاسی قیادت اس کی ذمہ دار ہے'' وہ یہ بھی کہتا تھا ''ہماری قیادت نے تاریخ اور اپنے عروج و زوال سے کچھ نہیں سیکھا' یہ آج بھی وہی ہیں جو 1980ء میں' 1990ء میں' 1996ء میں اور 1999ء میں تھے بلکہ یہ لوگ اپنی جیبوں میں انتقام کی زیادہ آگ بھر کر واپس آئے ہیں' یہ تو اللہ تعالیٰ نے اس ملک پر کرم کیا کہ اس دوران عدلیہ اور میڈیا آزاد ہو گیا اور یہ دو ادارے ان کے عزائم کے راستے میں حائل ہو گئے ورنہ یہ لوگ گلیوں' چوکوں اور بازاروں میں ٹکٹکیاں لگا دیتے اور اپنے تمام مخالفین کو ان پر چڑھا کر صبح و شام کوڑے برساتے'' جاوید ہاشمی کا کہنا تھا ''ہماری سیاسی قیادت میں اخلاص کا فقدان ہے' یہ لوگ ابھی تک ذاتی مفادات کے جنگل سے باہر نہیں نکل سکے'' ہم لوگ عموماً ان کی اس طرح کی سٹیٹمنٹ پر پوچھتے تھے ''کیا اس میں آپ کی قیادت بھی شامل ہے'' وہ فوراً جواب دیتے ''تمام سیاسی جماعتیں اور ساری سیاسی جماعتوں کی قیادت شامل ہے''۔

جاوید ہاشمی کی سیاسی جدوجہد بہت طویل ہے' یہ ایوب خان کی ملٹری ڈکٹیٹر شپ کے ساتھ بھی ٹکرایا اور اس نے میدان میں کھڑے ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کی سویلین ڈکٹیٹر شپ کا ڈٹ کر مقابلہ بھی کیا' یہ جنرل ضیاء الحق کے قریب آیا لیکن جلد ہی نظریاتی اور سیاسی دوری پر چلا گیا' پاکستان مسلم لیگ کی دو حکومتوں میں یہ پارٹی کا حصہ رہا لیکن یہ اپنے اندر کے باغی کو نہ مار سکا' 1997ء کی حکومت میں یہ وفاقی کابینہ کا حصہ رہا لیکن اس کے ضمیر کی آواز اقتدار کے ایوانوں کا مزہ کرکرا کرتی رہی۔ 1999ء کے ''ملٹری کو'' کے بعد جاوید ہاشمی پاکستان مسلم لیگ ن کا واحد راہنما تھا جس نے پاکستان کے اندر رہ کر پارٹی کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کی' اس وقت جب پارٹی کے تمام مجنوں چوری کے تھال اٹھا کر پرویز مشرف کے ساتھ شامل ہو گئے اور میاں برادران پورے خاندان کے ساتھ سعودی عرب منتقل ہو گئے تو اس وقت جاوید ہاشمی اس ملک میں پاکستان مسلم لیگ ن تھا اور پارٹی کے دفتر کے اخراجات جاپان میں مقیم ایک تاجر برداشت کرتا تھا' اس دور میں جب ہمارے ننانوے فیصد سیاستدان ناشتہ کرنے سے پہلے فوج سے اجازت لیتے تھے اس وقت جاوید ہاشمی نے علم بغاوت بلند کیا' اس پر غداری کا مقدمہ بنا اور یہ جیل کی کال کوٹھڑیوں کا اسیر بن گیا' فیلڈ مارشل ایوب خان سے لے کر جنرل پرویز مشرف تک تمام آمروں نے جاوید ہاشمی پر انسانیت سوز تشدد کیا' جاوید ہاشمی آج بھی قمیض اتارتا ہے تو اس کی پشت گردن سے کولہوں تک سیاہ دکھائی دیتی ہے' یہ وہ سیاہی ہے جو یہ اس ملک میں جمہوریت کی بقاء اور سیاسی حقوق کے استحکام کیلئے اپنی کمر پر درج کراتا رہا' یہ سارے دور' یہ سارے صعوبتیں جاوید ہاشمی کو نہ توڑ سکیں لیکن 2008ء میں آنے والی جمہوریت نے جاوید ہاشمی جیسے شخص کو مایوس کر دیا اور یہ اپنے سیاسی حجرے میں پناہ گزین ہوتا چلا گیا' اس مایوسی کا نتیجہ تھا جمہوریت کے اس ضمیر کو 20 جولائی 2010ء کو برین ہیمرج ہو گیا' اس کے دماغ کی شریان پھٹ گئی اور یہ آج ہسپتال میں زندگی کیلئے لڑ رہا ہے۔ مجھے فخر ہے میں جاوید ہاشمی کے دوستوں کی اس فہرست میں شامل ہوں جنہیں اس نے ہر دور میں عزت بھی دی' وقت بھی دیا اور اعتماد بھی۔ مجھے یہ بھی فخر ہے میں جاوید ہاشمی جیسے چند لوگوں کے دور میں زندہ ہوں جن کی وجہ سے ابھی تک سیاست اور سیاستدانوں کا اعتبار قائم ہے' جن کی زبان احتیاط کو مصلحت' مصلحت کو

صرف جاوید ہاشمی بیمار نہیں بلکہ اس ملک کی سیاست کا بچا کھچا ضمیر بیمار ہے اور ہم سب لوگ اگر اس ضمیر کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ سے جاوید ہاشمی کی زندگی، صحت اور تندرستی کی دعا کرنی چاہئے کیونکہ جاوید ہاشمی جیسے لوگ ہم جیسی قوموں کو بڑی مشکل سے ملا کرتے ہیں۔

ہاشمی صاحب اٹھیے، ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

LetItGo
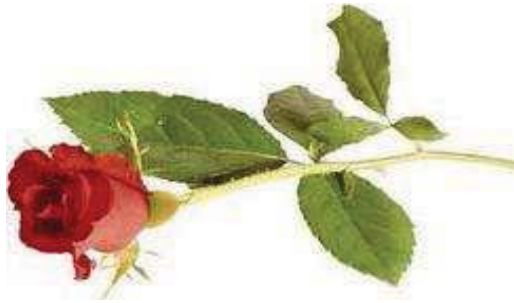
میں جب بھی پریشان ہوتا ہوں یا کوئی دوسرا شخص مجھے پریشان کرتا ہے تو مجھے بے اختیار پاکستان کے ایک مشہور صوفی رائیٹر اور سابق بیوروکریٹ کا فقرہ یاد آجاتا ہے اور میں مسکرا کر آگے نکل جاتا ہوں'صوفی رائیٹر کا کہنا تھا ستک انسان کے سامنے جب بھی کوئی مشکل آئے' یہ جب بھی پریشان ہو یا کوئی پریشانی اس کے دروازے پر دستک دے تو اسے اپنے دل میں انگریزی کا ایک فقرہ دہرانا چاہیے "لٹ اٹ گو" یعنی "اسے جانے دو" بس یہ فقرہ دہرانے کی دیر ہے وہ مشکل مشکل'وہ مصیبت مصیبت اور وہ پریشانی پریشانی نہیں رہے گی' مجھے شروع شروع میں یہ بات بے معنی اور غیر مصنفانہ محسوس ہوتی تھی لیکن یہ نسخہ جب استعمال کرنا شروع کیا تو اس کے حیران کن نتائج نکلے مثلاً میرے ساتھ جب کوئی شخص بدتمیزی کرتا ہے اور میں "فلیئر اپ" ہونے لگتا ہوں تو منہ سے شعلہ نکالنے سے ایک لمحہ پہلے دل میں دہراتا ہوں "لٹ اٹ گو" بس یہ فقرہ دہرانے کی دیر ہوتی ہے' میں مسکراتا ہوں' آگے نکل جاتا ہوں اور وہ بدتمیزی لڑائی یا جنگ نہیں بنتی'اسی طرح کوئی شخص میرا حق مار لیتا ہے' مجھے چھوٹا بڑا دھوکہ دے دیتا ہے'میرے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہے'میرے خلاف سازش کے تانے بانے بنتا ہے یا پھر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بات میرے نوٹس میں آجاتی ہے تو میں اس سے انتقام لینے کی بجائے دل میں "لٹ اٹ گو" دہراتا ہوں اور میرا جذبہ انتقام ٹھنڈا پڑ جاتا ہے' میں نے اس فقرے کی ایک اور کرامت کا مطالعہ بھی کیا'میں جب بھی یہ فقرہ دہرا کر "سٹیپ ڈاؤن" ہوتا ہوں' میرا وہ مسئلہ چند دنوں بعد خود بخود حل ہو جاتا ہے اور میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں' میں اگر اس دن "ری ایکٹ" کر دیتا' میں مخاطب سے الجھ پڑتا یا میری اس سے لڑائی ہو جاتی تو یہ مسئلہ کس قدر الجھ جاتا اور میں آج اطمینان سے نہ بیٹھا ہوتا'میں نے پچھلے دس پندرہ برسوں میں اندازہ لگایا ہمارے زیادہ تر مسائل' زیادہ تر پریشانیوں اور زیادہ تر مشکلات کی ایک "ایکسپائری ڈیٹ" ہوتی ہے'کوئی مسئلہ دس پندرہ بیس منٹ میں ایکسپائر ہو جاتا ہے'کوئی تین چار گھنٹے چلتا ہے اور کسی کی زندگی دو چار مہینے یا ایک دو سال ہوتی ہے اور ہم اگر یہ مدت صبر کر کے گزار لیں تو وہ مسئلہ خود بخود دم توڑ دیتا ہے کیونکہ دنیا میں آج تک کوئی ایسا مسئلہ 'کوئی ایسی پریشانی اور کوئی ایسی مشکل ایجاد نہیں ہوئی جس کا کوئی نہ کوئی حل نہ ہو یا پھر اس کی کوئی "ایکسپائری ڈیٹ" نہ ہو' ہمارے پاس دو آپشن ہوتے ہیں'ہم آگے بڑھ کر اس کا کوئی حل تلاش کر لیں یا پھر "لٹ اٹ گو" جیسی تکنیک کے ذریعے اس کو آگے گزر جانے کا موقع دے دیں'ہمارے مسائل کوشش سے بھی حل ہو جاتے ہیں اور اپنی "ایکسپائری ڈیٹ" پر پہنچ کر بھی دم توڑ جاتے ہیں'ہم نے بس ان مسائل کو انا' ضد' انتقام اور غصے کی آنچ سے محفوظ رکھنا ہوتا ہے بصورت دیگر مسائل' پریشانیاں اور مشکلیں پٹرول کی شکل اختیار کر جاتی ہیں اور ہماری پوری زندگی جہنم بن کر رہ جاتی ہے۔

میں اب اس فقرے کے موجد کی طرف آتا ہوں'اس فقرے کے خالق شہاب نامہ کے مصنف قدرت اللہ شہاب تھے' شہاب صاحب کل وقتی صوفی' جز وقتی بیوروکریٹ اور اردو ادب کی آخری سانس تک دانشور تھے'ان کی آپ بیتی نے ادب اور معاشرے دونوں میں تہلکہ مچا دیا اور آج اس ملک میں شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ہو گا جو شہاب صاحب کے نام سے واقف نہ ہو یا جس نے شہاب نامہ نہ پڑھا ہو' شہاب صاحب پریکٹیکل صوفی تھے اور یہ

دنیا سے رخصت ہوتے وقت دو صوفی پیچھے چھوڑ گئے ہیں' ایک سیم انور بیگ ہیں' سیم صاحب کو ہم سب انکل جی کہتے ہیں اور میں ان سے لاڈ سے عرض کرتا ہوں "انکل جی یاد رکھیں میں آپ کا آخری بیٹا ہوں" انکل نسیم اس پر قہقہہ لگاتے ہیں اور اس کے بعد میں ان سے عرض کرتا ہوں "اور آخری بیٹا لاڈلا بھی ہوتا ہے اور گستاخ بھی لیکن بزرگ اس کی گستاخی بھی برداشت کرتے ہیں اور لاڈ بھی" اور انکل نسیم بڑے پیار سے میری طرف دیکھتے ہیں' میں تین سال سے ان کے گھر حاضر نہیں ہو سکا لیکن مجھے یقین ہے میں جس دن ان کی دہلیز پر قدم رکھوں گا وہ اسی صوفیانہ پیار سے مجھے گلے لگا لیں گے' شہاب صاحب کے دوسرے شاگرد صدیق راعی صاحب ہیں' یہ اسلام آباد میں ہوتے تھے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد جھنگ شفٹ ہو گئے ہیں' یہ آج کل علیل ہیں مگر ان کا روحانی فیض جاری ہے' میرا ان کے ساتھ بھی قلبی اور روحانی تعلق ہے اور دوری اور مصروفیت آج تک یہ تعلق نہیں توڑ سکی' شہاب صاحب کی تحریروں اور شخصیت نے تین نسلوں کی روحانی آبیاری کی' ہم لوگ اگر آج "شہاب نامہ" کو اپنی معاشرتی بائبل سمجھ لیں اور شہاب صاحب کی تحریروں اور فقروں کو اپنے لئے مشعل راہ بنا لیں تو ہم ایک مطمئن' مسرور اور پرسکون زندگی گزار سکتے ہیں' انسان دنیا میں صرف دو چیزوں کا پیچھا کرتا ہے' ہم سب لوگ' ہم سب کی ہر قسم کی بھاگ دوڑ' سوشل' بزنس اور پروفیشنل ریس' ایک دوسرے کے پیٹ میں کہنی مارنے کا عمل' ہماری تعلیم' تربیت' عمل' ڈسپلن اور ہماری دعائیں' عبادتوں اور وظائف کے صرف دو مقصد ہوتے ہیں' ایک خوشی کا حصول اور دوسرا روح کی آخری تہوں تک سکون' دنیا میں جس انسان کو یہ دو چیزیں مل جاتی ہیں وہ خوش نصیب ترین شخص ہوتا ہے اور باقی لوگ خوش نصیبی کی اس وننگ پوسٹ پر قدم رکھنے کیلئے دوڑتے رہتے ہیں' اب سوال یہ ہے انسان کو خوشی اور سکون مل کیسے سکتا ہے؟ یہ دنیا کا مہنگا اور مشکل ترین سوال ہے کیونکہ اس میں انسان کے لاکھوں کروڑوں سالوں کے المیے دفن ہیں' انسان کو خوشی اور سکون دوسرے لوگوں سے مل کر حاصل ہوتا ہے اور اگر اس خوشی اور اس سکون میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو شامل کر لیا جائے تو یہ خوشی اور یہ سکون دائمی ہو جاتی ہے' یہ اچھے سیمنٹ کی طرح پھر کبھی ہماری ذات کے جوڑ نہیں کھلنے دیتی اور یوں ہم دکھوں' المیوں' افسوس' تاسف اور پریشانیوں کی ہوا اور نمی سے بچے رہتے ہیں' شہاب صاحب جیسے لوگ اللہ کا ایسا تحفہ ہوتے ہیں جو ہماری خوشی اور ہمارے سکون کے گرد سیمنٹ کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ ہم اچھی' مسرور اور پرسکون زندگی گزار سکیں چنانچہ میں اپنی نوجوان نسل کو مشورہ دیتا ہوں' یہ اگر کسی پیر کامل کی تلاش میں ہیں' یہ اگر اپنے مسئلے حل کرنا چاہتے ہیں اور یہ اگر پرسکون اور مسرور زندگی گزارنا چاہتے ہیں تو یہ شہاب صاحب جیسے لوگوں کی فکر اور روحانی تجربوں سے فائدہ اٹھائیں یقین کیجئے زندگی کی پرپیچ گلیوں میں بھٹکتی ہوئی ان کی روحوں کو قرار آ جائے گا۔

آج قدرت اللہ شہاب صاحب کی برسی تھی' میں آج کے دن اپنے روحانی استاد کو دعاؤں کے سوا کوئی تحفہ پیش نہیں کر سکتا تھا' آپ بھی میرے ساتھ مل کر شہاب صاحب کیلئے دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمیں ان جیسا بننے کی توفیق عطا کرے۔

دروازے کھول دیں
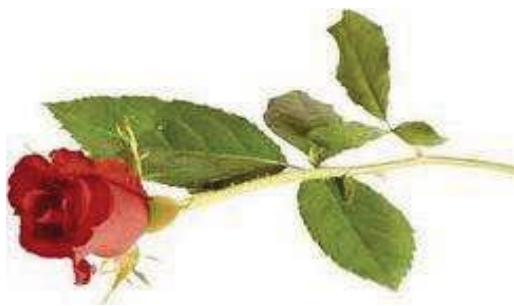
یہ منظر بہر حال حیران کن بھی تھا اور قابل تعریف بھی' میں نے سٹیج سے میدان کے آخری سرے کی طرف دیکھا' سٹیج سے پنڈال کے سرے تک لوگ ہی لوگ تھے اور یہ تمام لوگ نہایت خاموشی اور انہماک سے مقررین کی گفتگو سن رہے تھے' میں نے منتظمین سے مجمع کی تعداد پوچھی' معلوم ہوا دس ہزار سے زائد لوگ ہیں' میں نے پوچھا'' یہ کون لوگ ہیں'' پتہ چلا یہ کراچی کی مختلف کمیونٹیز سے تعلق رکھتے ہیں' ان میں بزنس مین بھی ہیں' صنعت کار بھی ہیں' استاد بھی ہیں' ٹرانسپورٹر بھی ہیں اور علمائے کرام بھی۔ میں نے مجمع کی طرف غور سے دیکھا' وہاں صرف داڑھی والے حضرات نہیں تھے' مجمع میں کلین شیو لوگ بھی شامل تھے' سندھ حکومت کی نمائندگی وزیراعلیٰ سندھ کے مشیر زبیر موتی والا کر رہے تھے' کراچی یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر ناصر الدین خان بھی مقررین میں شامل تھے اور جسٹس سعیدالزمان صدیقی نے بھی خطاب کیا' سٹیج کے دائیں بائیں ڈگری لینے والے طالب علم بیٹھے تھے' ان نوجوانوں نے خوبصورت گاؤن پہن رکھے تھے' ان کے سروں پر عمامے تھے اور یہ عجز اور انکساری کا پیکر بن کر بیٹھے تھے' یہ ایک غیر روایتی تقریب تھی' میں اور اوریا مقبول جان اس تقریب میں شرکت کیلئے لاہور اور اسلام آباد سے کراچی پہنچے تھے' یہ جامعۃ الرشید کی تقریب تھی جس میں کلیۃ الشریعہ اور ایم بی اے کے 232 ڈگری ہولڈرز کو اسناد پیش کی جارہی تھیں' پاکستان میں دینی اداروں کے بارے میں عموماً یہ تاثر ہے کہ ان میں ڈسپلن' صفائی اور ترتیب نہیں ہوتی' یہ لوگ خیالات میں بھی بہت متشدد ہوتے ہیں اور یہ غیر داڑھی والوں کو قبول نہیں کرتے وغیرہ' وغیرہ' لیکن اس پنڈال میں کھڑے ہو کر ہمیں ڈسپلن بھی ملا' صفائی بھی' ترتیب بھی اور لچک بھی' میں اس فنکشن میں پتلون اور شرٹ پہن کر گیا تھا اور بدقسمتی سے میرے چہرے پر داڑھی بھی نہیں لیکن وہاں موجود کسی شخص نے میرے حلیے پر اعتراض نہیں کیا بلکہ یہ لوگ بہت محبت سے ملے۔ جامعۃ الرشید مجلس علمی سوسائٹی کا ایک ادارہ ہے' اس ادارے کے تین بڑے کیمپس ہیں' ان میں جامعۃ الرشید کراچی کیمپس' جامعۃ الرشید لاہور کیمپس اور جامعۃ الرشید گوجرانوالہ کیمپس شامل ہیں۔ یہ کیمپس تو مختلف اداروں اور شعبوں کا گلدستہ ہے' ان میں صفہ سویئر سکول' البیرونی کالج' درس نظامی' کلیۃ الشریعہ' اسپیشل صحافت' صحافت کورس' ٹیچر ٹریننگ کورس' معہد اور کمز شامل ہیں۔ جامعۃ الرشید صرف ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ اس کے فلاحی کام بھی ایک حیران کن کہانی ہیں' یہ لوگ ہر سال کروڑوں روپے سے غریبوں کی امداد کرتے ہیں' جامعۃ الرشید کے طلباء اور اساتذہ سیلاب' طوفان' زلزلے اور بارشوں میں آفت زدہ علاقوں میں رضاکارانہ خدمات انجام دیتے ہیں' اس ادارے کے تحت کئی چھوٹے چھوٹے ہسپتال اور ڈسپنسریاں بھی قائم ہیں جہاں پر غریبوں کا مفت علاج ہوتا ہے جبکہ اس ادارے نے ملک بھر کے پسماندہ علاقوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے سکول بھی قائم کر رکھے ہیں جہاں ہزاروں غریب بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔

تقریب سے خطاب کے دوران مقررین نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر کھل کر اظہار خیال کیا' ہم لوگوں نے علمائے کرام سے عرض کیا ہم اگر آج سے دس' بارہ سو سال پہلے سائنس' فلسفے اور ادب کی بنیاد رکھ سکتے ہیں تو ہم آج ایک بار پھر اپنی محنت' اپنی ذہانت اور اپنی دیانتداری کے ذریعے دنیا کو اپنی طرف راغب کیوں نہیں کر سکتے' ہم نے آنکھ

کی ہیت سے لے کر ٹائی تک ایجاد کی تھی' جس وقت یورپ کی گلیوں میں ٹخنوں تک کیچڑ اور لید ہوتی تھی اس وقت قرطبہ شہر کے ہر باسی کو حکومت پانی سپلائی کرتی تھی' جس وقت یورپ جہالت کے اندھیرے میں ڈبکیاں کھا رہا تھا اس وقت قرطبہ' غرناطہ اور اشبیلیہ کے تمام شہری لائبریریوں سے استفادہ کرتے تھے' نیشاپور سے لے کر بغداد تک اور سکندریہ سے لے کر سسلی تک مسلمان اس وقت دنیا کی جدید ترین' مہذب اور متمدن قوم تھے' پورے پورے شہر میں سرکاری سطح پر چراغاں کیا جاتا تھا اور لوگ سرکاری لیمپ پوسٹر کے نیچے بیٹھ کر ساری ساری رات الف لیلیٰ کے قصے سناتے تھے' وہ ایک ایسا شاندار معاشرہ تھا جس میں عیسائیوں کے کلیسا بھی کھلے تھے' یہودیوں کے سیناگوگا بھی آباد تھے' زرتشیوں کے آتش کدے بھی دہکتے تھے اور ہماری مسجدوں کے میناروں سے بھی اللہ اکبر اللہ اکبر کی آوازیں اٹھتی تھیں اور کسی غیر مذہب کا کوئی شخص اس معاشرے میں خود کو اجنبی یا غیر محفوظ محسوس نہیں کرتا تھا لیکن آج یہ صورتحال یکسر تبدیل ہو چکی ہے' ہمارے دینی مدارس نے سائنس' لٹریچر' انجینئرنگ اور میڈیکل سائنسز کو طلاق دے دی ہے' ہمارے دینی حلقے اپنے ہی ہم مذہبوں کو غیر مسلم ڈکلیئر کرنے کی ریس میں شامل ہو گئے ہیں اور دہشت گردی کی موجودہ فضا نے اسلام' دینی حلقوں اور دینی روحانی حلیے تینوں کو کونے میں دھکیل دیا ہے' اس عالم میں جامعۃ الرشید جیسے اداروں کا وجود کسی نعمت سے کم نہیں' میں سندھ حکومت کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اس نے اپنے مشیر کو اس تقریب میں بھجوا کر یہ تاثر ختم کرنے کی کوشش کی کہ حکومت دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکا کی مکمل غلام بن چکی ہے' اس تقریب میں موجود صنعت کاروں' بزنس مینوں' دانشوروں اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی شرکت نے بھی یہ ثابت کر دیا دینی اور دنیاوی حلقوں کی تقسیم نے ابھی معاشرے کو پوری طرح تقسیم نہیں کیا' علمائے کرام کا ایک بڑا طبقہ آج بھی معاشرے کی فلاح و بہبود کیلئے کوشاں ہے اور عام لوگ بھی آج تک دینی حلقوں کا احترام کرتے ہیں' ہم نے اس تقریب میں محسوس کیا ماڈرن اور مذہبی دونوں طبقوں کو ابھی چند قدم مزید آگے بڑھانا ہوں گے' لبرل لوگوں کو مذہبی طبقوں کے ساتھ ڈائیلاگ کیلئے آگے بڑھنا ہو گا اور دینی اداروں کو مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنس' ٹیکنالوجی' میڈیکل اور انجینئرنگ کی گنجائش پیدا کرنا ہو گی اور پاکستان کے دیگر دینی اداروں کو بھی جامعۃ الرشید کی طرح اپنے سسٹم میں لچک لانا ہو گی اس سے پاکستان کی مجموعی معاشرتی صورتحال میں تبدیلی آ جائے گی۔ یہ تقریب ہمارے لئے ''آئی اوپننگ'' کی حیثیت رکھتی تھی' ہم نے پہلی بار کسی مدرسے کا ڈسپلن' کوالٹی آف ایجوکیشن اور علمانہ عجز و انکسار دیکھا تھا کاش ہم دینی اداروں کا یہ روپ یورپ اور امریکا کے ان اداروں کو دکھا سکیں جو اسلامی دنیا کے ہر پگڑی اور داڑھی والے کو دہشت گرد اور شدت پسند سمجھتے ہیں' مجھے یقین ہے ہم اگر دنیا کو ان لوگوں کا یہ روپ دکھا سکے تو اہل مغرب کی ہمارے بارے میں ساری رائے تبدیل ہو جائے گی' مجھے اس تقریب میں شامل ہو کر محسوس ہوا ہم لوگ مغربی میڈیا کے پروپیگنڈے میں آ گئے ہیں لہٰذا ہم دینی اداروں کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہیں' ہماری وفاقی حکومت کا رویہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے' میرا مشورہ ہے اگر سندھ حکومت کی طرح وفاقی حکومت بھی ان اداروں میں آئے' ہمارے وزیر داخلہ رحمٰن ملک' ہمارے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی' ہمارے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور ہمارے صدر آصف علی زرداری بھی ان اداروں میں جائیں' یہ بھی ان کی تقریبات میں شرکت ہوں' اسی طرح اگر غیر ملکی سفیروں کو بھی ان اداروں کے ہاں لے جائیں اور انہیں بھی ان اداروں

تقریبات میں شریک ہوں [illegible] یہ ادارے دکھائے جائیں اور انہیں ان اداروں کی مجموعی صورتحال کے مشاہدے کا موقع دیا جائے تو قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر پاکستان کا امیج بہتر ہو جائے گا۔

جامعۃالرشید نے ہم جیسے دنیاداروں کو اپنی تقریب میں شامل کیا' میں اب سوچ رہا ہوں ہم بھی علمائے کرام کو پاکستان کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں کا دورہ کرائیں' انہیں میڈیکل کالج' انجینئرنگ یونیورسٹیاں اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ادارے دکھائیں تاکہ دونوں طرف سے اعتماد بحال ہو جائے اور مجھے یقین ہے اس سے دین اور دنیا کے درمیان نہ صرف فاصلہ کم ہو جائے گا بلکہ شدت اور دہشت کے شکار اس معاشرے کو بھی قرار آجائے گا' ہم سب کو چاہیے ہم جامعۃالرشید جیسے اداروں کی طرف محبت سے ہاتھ بڑھائیں اور جامعۃالرشید جیسے ادارے ہم گناہ گاروں کو انسان سمجھ کر ہم پر اپنے دروازے کھول دیں' اس ملک' اس معاشرے کی بقاء کیلئے یہ اقدام انتہائی ضروری ہو گا۔

مارشل لاء یا انارکی
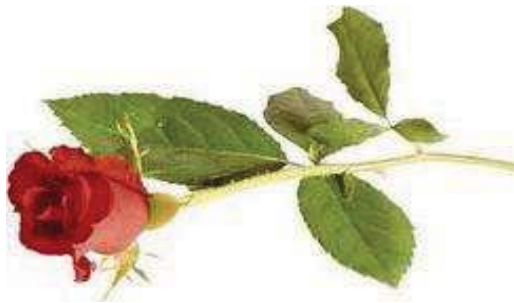
سرگودھا کا ضمنی الیکشن بنیادی طور پر پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن دونوں کا سیاسی مستقبل ہے لیکن اس سیاسی مستقبل کی طرف جانے سے پہلے ہم یہ ڈسکس کریں گے کہ انسان کا سب سے بڑا اثاثہ کیا ہوتا ہے؟ میں تجربے' مشاہدے اور مطالعے کی بنیاد پر دعوے سے کہہ سکتا ہوں انسان کا سب سے بڑا اثاثہ سچ ہوتا ہے' ہم لوگ اگر سچ کو تسلیم کر لیں' ہم اس کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر لیں اور ہم اپنے اندر سچ بولنے اور سچ سننے کا حوصلہ پیدا کر لیں تو ہمارے مسائل ختم ہونے لگتے ہیں اور اس کے برعکس اگر ہم جھوٹ کا سہارا لینا شروع کر دیں تو پھر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا مسئلہ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور ہم مسائل کی دلدل میں پھنستے چلے جاتے ہیں' سچ صرف انفرادی سطح پر اثاثہ نہیں ہوتا بلکہ یہ قومی' اجتماعی اور سیاسی جماعتوں کا بھی اثاثہ ہوتا ہے' اگر سیاسی جماعتیں' ان کی قیادت' معاشرے اجتماعی طور پر یا پھر قومیں من حیث سچ کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ انہیں طاقت بھی دیتا ہے اور ان کے راستے کے کانٹے بھی صاف کر دیتا ہے۔ ہم اب انسان کے اس سب سے بڑے اثاثے کو سامنے رکھ کر سرگودھا کے ضمنی الیکشن کی طرف آتے ہیں' سرگودھا کے حلقہ پی پی 34 سے 2008ء کے الیکشن میں پاکستان مسلم لیگ ن کے رضوان نوریز گل منتخب ہوئے تھے' رضوان نوریز گل کی ڈگری جعلی نکل آئی جس کے بعد پاکستان مسلم لیگ ن نے رضوان گل کے بھائی چودھری تبریز گل کو ٹکٹ دے دیا' پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار فیاض احمد اوٹھی تھے' سوموار 26 جولائی کو الیکشن ہوا اور عوام نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ساتھ پاکستان مسلم لیگ ن کو بھی مسترد کر دیا اور سرگودھا سے آزاد امیدوار اعجاز احمد کاہلوں کامیاب ہو گئے' پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن دونوں نے یہ الیکشن جیتنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا' وفاق میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت ہے اور پنجاب میں پاکستان مسلم لیگ ن برسراقتدار ہے' وفاقی وزیر مملکت برائے داخلہ تسنیم قریشی سرگودھا سے تعلق رکھتے ہیں' یہ اپنے انتظامی لاؤ لشکر کے ساتھ مہینہ بھر سرگودھا میں مقیم رہے' پنجاب حکومت نے بھی اپنی پارٹی کے اہم لوگ سرگودھا بھجوائے لیکن یہ ساری کوششیں دم توڑ گئیں اور سرگودھا پی پی 34 سے آزاد امیدوار اعجاز احمد کاہلوں 15 ہزار 9 سو 89 ووٹ لے کر کامیاب ہو گئے' دوسرے نمبر پر پاکستان مسلم لیگ ن کے امیدوار چودھری تبریز گل آئے' انہوں نے 14 ہزار 6 سو 87 ووٹ لئے' ہم اگر دونوں کے درمیان ووٹوں کا فرق دیکھیں تو یہ کچھ زیادہ نہیں' کامیاب امیدوار نے پاکستان مسلم لیگ ن کے امیدوار سے صرف 1 ہزار 3 سو 2 ووٹ زائد لئے تھے' پاکستان مسلم لیگ ن جیسی جماعت کیلئے یہ "گیپ" زیادہ نہیں تھا کیونکہ وہ پارٹی جس نے 2008ء کے الیکشن سے قبل اپنے ہر اس امیدوار کو ٹکٹ دے دیا تھا جس نے اپلائی کیا تھا اور اس سیاسی جوئے بازی کے باوجود یہ پارٹی نہ صرف وفاق میں 90 اور پنجاب میں 171 نشستیں حاصل کر گئی بلکہ یہ وفاق میں اپوزیشن اور پنجاب میں حکومت بھی بنا گئی۔ اس پارٹی کا اتنے کم مارجن سے ہارنا ایک الارمنگ صورتحال ہے۔

آپ 2008ء کے الیکشن سے قبل سیاسی صورتحال کا جائزہ لیجئے' میاں برادران برطانیہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے' یہ لوگ سعودی حکومت کی مہربانی سے الیکشن کمیشن میں کاغذات نامزدگی جمع کرانے سے ایک دن

جل پاکستان پہنچے‘ انہوں نے کاغذات جمع کرانے کے بعد دو مرتبہ الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کیا‘ ان کی پارٹی بھی پوری طرح تتر بتر تھی‘ ان کے پاس امیدواروں کی بھی کمی تھی اور انہوں نے جن لوگوں کو ٹکٹ دیئے تھے‘ پارٹی کی قیادت ان کی شکلوں اور ان کے ناموں تک سے واقف نہیں تھی لیکن اس کے باوجود لوگوں نے پاکستان مسلم لیگ ن کو دیوانہ وار ووٹ دیئے‘ اس کی دو وجوہات تھیں ایک وجہ شہروں کا ووٹ بینک تھا‘ 1988ء سے لے کر 2008ء تک پاکستان بالخصوص پنجاب کے تمام شہروں کا ووٹ بینک پاکستان مسلم لیگ ن کی جیب میں منتقل ہو گیا تھا اور یہ تاثر عام ہو چکا تھا کہ میاں صاحب کو شہروں سے ہرانا ناممکن ہے! دو میاں صاحب کا ”پولیٹیکل سٹانس“ بہت مضبوط تھا‘ لوگ ان کے الفاظ پر یقین کرتے تھے اور ان کا خیال تھا پاکستان مسلم لیگ ن مستقبل کی سیاست میں بڑا اہم کردار ادا کرے گی‘ پاکستان پیپلز پارٹی پورے ملک کی جماعت تھی اور شائد ابھی تک ہے‘ اس کا ووٹ بینک رورل ایریاز اور جاگیرداری کے پنجے میں پھنسے ہوئے علاقوں میں بہت مضبوط تھا‘ محترمہ بے نظیر بھٹو کی اچانک شہادت نے بھی اس ووٹ بینک کو مہمیز دی اور یوں پاکستان پیپلز پارٹی حکومت بنانے کے قابل ہو گئی لیکن بعد ازاں سیاسی وعدوں سے پھرنے‘ عدلیہ کی بحالی کی عوامی تحریک‘ امریکی عمل دخل‘ دہشت گردی‘ کرپشن کی ابھرتی پھیلتی کہانیوں‘ مس مینجمنٹ اور عوامی مسائل کو حل کرنے کی استطاعت کی کمی کے باعث پاکستان پیپلز پارٹی اپنی عوامی مقبولیت سے محروم ہوتی چلی گئی‘ اس دوران عدلیہ کی بحالی کی تحریک چلی تو پاکستان مسلم لیگ ن کی مقبولیت کو ”بوسٹ“ ملا لیکن پھر پاکستان مسلم لیگ ن کا سیاسی کنفیوژن رنگ دکھانے لگا اور پارٹی آہستہ آہستہ اپنی مقبولیت کے پیندے کی طرف بڑھنے لگی‘ اس کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً اس کی وجہ میاں صاحب کا یہ نفسیاتی خوف بھی ہو سکتا ہے کہ اگر انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کیلئے کوئی قدم اٹھایا تو اس کا فائدہ غیر سیاسی قوتیں اٹھا لیں گی‘ مثلاً اس کی وجہ برطانیہ‘ امریکا اور سعودی عرب بھی ہو سکتے ہیں‘ یہ تینوں ممالک پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار میں دیکھنا چاہتے ہیں اور میاں صاحب ان ممالک کی سابق مہربانیوں کے باعث سر دست انہیں ناراض نہیں کر سکتے۔ مثلاً اس کی وجہ دہشت گردی بھی ہو سکتی ہے‘ ملک میں خودکش حملوں کے باعث سیاسی قیادت کا میدان میں نکلنا قریباً ناممکن ہے اور میاں صاحب کا خیال ہے اگر انہوں نے اس وقت کوئی لانگ مارچ شروع کیا اور خدانخواستہ اس میں کوئی خودکش حملہ ہو گیا تو سیاسی بحران میں اضافہ ہو جائے گا اور مثلاً اس کی وجہ پانچ سال کا وہ فارمولا بھی ہو سکتا ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کی سیاسی قیادتوں کے درمیان خفیہ طور پر طے ہوا تھا‘ دونوں نے یہ فیصلہ کیا تھا یہ 1990ء کی دہائی کی سیاست میں نہیں جائیں گے‘ ان تمام وجوہات نے مل کر میاں صاحب کی سیاست کو غیر مقبولیت کی طرف دھکیل دیا اور آج حالت یہ ہے جعلی ڈگریوں پر شاندار ”سٹانس“ کے باوجود پاکستان مسلم لیگ ن کو ضمنی الیکشن جیتنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑ رہا ہے اور وہ شہر جنہیں کبھی میاں نواز شریف کی ”پاکٹ“ کہا جاتا تھا ان میں بھی مسلم لیگ ن کو ووٹ لینے کیلئے سخت محنت کرنا پڑ رہی ہے اور اس محنت کے باوجود سرگودھا جیسے واقعات بھی پیش آ جاتے ہیں جس میں پاکستان مسلم لیگ ن آزاد امیدوار کے ہاتھوں 1 ہزار 3 سو 2 ووٹوں سے ہار جاتی ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جس پر پہلے پاکستان پیپلز پارٹی نے توجہ نہیں دی تھی اور آج پاکستان مسلم لیگ ن بھی اسے تسلیم کرنے سے انکاری ہے

پاکستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں اس صورتحال سے کیسے نکل سکتی ہیں' یہ آج کے دن کا سب سے بڑا سوال ہے؟ہماری دونوں سیاسی جماعتیں اس صورتحال سے صرف اور صرف سچ کے ذریعے نکل سکتی ہیں' پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن اپنی غلطیوں کا اعتراف کریں' وہ تمام سیاسی سمجھوتے ختم کر دیں' دونوں جماعتوں کے پاؤں کی زنجیر بنے ہوئے ہیں' دونوں جماعتوں کی قیادتیں عوامی مسائل کے حل کیلئے اکٹھی ہو جائیں یا پھر اپنی اپنی پرواز شروع کر دیں' یہ محلوں سے نکل کر جھونپڑیوں میں آ جائیں اور مہاتیر محمد' آیت اللہ خمینی اور نیلسن منڈیلا کی سپرٹ سے عوام کی خدمت شروع کر دیں' ملک میں میرٹ قائم کریں' قانون کی حکمرانی اسٹیبلش کریں' لاقانونیت کو جڑوں سے اکھاڑنے کا بندوبست کریں' مہنگائی پر قابو پائیں' بے روزگاری کے خاتمے کیلئے طویل المدتی منصوبے تیار کریں' انرجی کرائسس کے حل کیلئے کوششیں کریں' انفراسٹرکچر وسیع کریں' ملکی قرضوں سے جان چھڑائیں' دہشت گردی کے خلاف جنگ کو کسی منطقی نتیجے تک پہنچائیں' ٹیکس کلچر نافذ کریں اور اس ملک کے چھوٹے سے لے کر بڑے تک تمام لوگوں کو قانون کے سامنے یکساں جوابدہ بنائیں' یقین کیجئے گا اس سے دونوں سیاسی جماعتوں کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہو گا اور ہماری جمہوریت بھی ناقابل شکست ہو جائے گی۔ آپ حکومت اور اپنی مقبولیت کو بچانے کیلئے کس کس کو ایکس ٹینشن دیں گے' کس کس کے ساتھ سمجھوتہ کریں گے اور کس کس خوف کے سایوں میں زندگی گزاریں گے؟ باہر نکلیں' سچ کا سامنا کریں' سچ بولیں اور حقیقت کی آنکھ سے اندیشوں کی ساری عینکیں اتار کر حالات کا مقابلہ کریں کیونکہ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا' ہم سب اپنے سب سے بڑے اور آخری اثاثے تک پہنچ گئے ہیں اور ہمیں اب اس اثاثے کو استعمال کرنا ہو گا بصورت دیگر مارشل لاء یا انارکی اس ملک کا مقدر بن جائے گی۔

یہ ہیں ہم

عدنان کی سیٹ کنفرم تھی لیکن وہ ٹریفک کی وجہ سے لیٹ ہو گیا تھا‘ چیک ان کاؤنٹر بند ہونے کے قریب تھا‘ عدنان نے اپنا بیگ ہاتھ میں اٹھار کھا تھا اور وہ ائیر پورٹ پر دیوانہ وار بھاگ رہا تھا‘اس کی سانس سینے سے الجھ رہی تھی‘ وہ سیدھا ائیر بلیو کے کاؤنٹر پر پہنچا اور اپنا ٹکٹ مسکراتی ہوئی خاتون کے سامنے رکھ دیا‘ خاتون نے گھڑی کی طرف دیکھا‘ فلائٹ کلوز ہونے میں تین منٹ باقی تھے‘اس نے لمبی سانس لی‘ کی بورڈ پر عدنان قیوم کا ”پی این آر“ ٹائپ کیا‘ پرنٹر سے کڑ کڑ ٹر ٹر کی آوازیں نکلیں اور عدنان قیوم کی شہادت کا بورڈنگ پاس جاری ہو گیا۔ عدنان نے بورڈنگ پاس اٹھایا‘ بیگ پر لگانے کیلئے ”ٹیگ“ اٹھایا‘ خاتون کا شکریہ ادا کیا اور وہ لاؤنج کی طرف چل پڑا۔

عدنان قیوم کی وجہ سے ایک اور مسافر کا چانس ختم ہو گیا‘ ائیر بلیو کی فلائٹ ای ڈی 202 کراچی سے اسلام آباد آ رہی تھی‘ فلائٹ نہ صرف پوری طرح بک تھی بلکہ تیرہ مسافر ویٹنگ لسٹ میں بھی شامل تھے‘ان کا اسلام آباد پہنچنا انتہائی ضروری تھا‘ انہوں نے ائیر لائن کے عملے کا گھیراؤ کر رکھا تھا اور یہ ہر قیمت پر جہاز میں سوار ہونا چاہتے تھے‘ ان مسافروں میں مظفر گڑھ سے ایم این اے جمشید دستی‘ سابق ایم این اے میر مہران خان بجارانی اور ان کے صاحبزادے میر سلیمان خان بجارانی بھی شامل تھے‘ان میں ایف آئی اے امیگریشن کراچی کے شفٹ انچارج انسپکٹر رحمت اللہ ڈوکی بھی تھے‘ ڈوکی اپنی فیملی کے ساتھ اسلام آباد آ رہے تھے لیکن عین وقت پر ان کی ایک مصروفیت نکل آئی‘ یہ خود کراچی میں رک گئے تاہم انہوں نے اپنی بیگم اور تین بچوں کو جہاز میں سوار کرادیا لیکن ان تمام لوگوں میں عدنان قیوم کی کہانی انتہائی افسوسناک تھی۔

عدنان قیوم نے ایم بی اے میں یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی‘اس نے نیشنل بینک میں اپلائی کیا‘ اسے نوکری مل گئی‘ یہ نوکری کا پروانہ لینے کیلئے کراچی گیا‘اس نے لیٹر لیا اور اس نے 28 مئی 2010ء کی صبح اسلام آباد کیلئے روانہ ہونا تھا‘ کراچی شہر اور ائیر پورٹ کے درمیان رش تھا چنانچہ یہ لیٹ ہو گیا اور اسے محسوس ہونے لگا اس کی فلائٹ مس ہو جائے گی‘ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتا تھا‘ پھر دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا تھا اور ساتھ ہی ڈرائیور کو گاڑی تیز چلانے کی ہدایت کرتا تھا‘ ائیر پورٹ پہنچ کر اس نے دوڑ لگا دی‘ وہ ”چیک ان“ بند ہونے سے پہلے کاؤنٹر تک پہنچنا چاہتا تھا اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا‘اس نے کاؤنٹر بند ہونے سے تین منٹ پہلے بورڈنگ پاس حاصل کر لیا لیکن اگر اس لمحے عدنان قیوم کو یہ خیال آ جاتا یہ اس کی زندگی کا آخری سفر ہے اور وہ اسلام آباد پہنچ کر بھی اپنے پیاروں سے نہیں مل سکے گا تو وہ کیا فیصلہ کرتا؟ اس سوال کے جواب میں ہم سب کی زندگی کی اصل حقیقت چھپی ہے‘ ہم سب عدنان قیوم جیسے لوگ ہیں‘ ہم میں اور اس شہید نوجوان میں صرف مہلت کا فرق ہے‘ اس کی مہلت 28 جولائی کو ختم ہو گئی جبکہ جمشید دستی‘ بجارانی صاحب‘ انسپکٹر ڈوکی اور ہم سب کی مہلت باقی ہے۔ آپ ایک لمحے کیلئے سوچیے اگر اس بدقسمت جہاز کے 152 مسافروں کو ایک لمحے کیلئے یہ خیال آ جاتا کہ یہ لوگ اسلام آباد پہنچیں گے ضرور لیکن ان کا جہاز ائیر پورٹ پر اترنے کی بجائے مارگلہ کی پہاڑیوں سے ٹکرائے گا‘ جہاز کے دو ٹکڑے ہوں گے‘ اس کے ملبے کو آگ لگے گی اور یہ 152 مسافروں کا قبرستان بن جائے گا تو عدنان قیوم اور اس بدقسمت جہاز کا کوئی مسافر اس میں سوار نہ ہوتا‘ یہ لوگ شائد زندگی میں کبھی فضائی سفر ہی

نہ کرتے سیلن موت وہ خوفناک حقیقت ہے جس کا ادراک انسان کو اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک یہ انسان کی آنکھوں تک نہیں پہنچ جاتی' جب تک یہ انسان کی روح کو ریشم کے دھاگے کی طرح جسم سے کھینچ کر باہر نکالنا شروع نہیں کرتی' موت انسان کی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے لیکن انسان اس حقیقت کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتا جب تک اس کے کٹے پھٹے جسم کو تابوت میں ڈال کر قبر میں نہیں رکھ دیا جاتا اور اس کے اپنے قریبی' اس کے اپنے رشتے دار اور دوست احباب اس کے اوپر مٹی نہیں ڈال دیتے۔ قدرت نے ہمارے ''سیلز'' میں زندگی کی خواہش کو اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر رکھا ہے کہ ہم مرنے کے بعد بھی اس خواہش سے آزاد نہیں ہوتے' روح کو رخصت ہوئے کئی منٹ گزر جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود چند ڈری سہمی دھڑکنیں ہمارے دل کی دیواروں سے چپکی رہتی ہیں' یہ دھڑکنیں ہر آنے جانے والے کو حسرت سے دیکھتی ہیں اور ان کا خیال ہوتا ہے شائد یہ شخص اس مردہ دل کو دوبارہ دھڑکا دے اور اس کا مالک اٹھ کر بیٹھ جائے' ہماری آنکھوں میں روشنی کے چند راستے مرنے کے بعد بھی کھلے رہتے ہیں' ہمارے جگر' ہمارے گردوں' ہمارے معدے اور ہمارے دماغ میں بھی گھنٹوں زندگی کے آثار دھڑکتے رہتے ہیں اور یہ بھی آنے جانے والوں کو حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور تو اور ہمارے ڈی این اے میں لاکھوں' کروڑوں سال تک زندگی قائم رہتی ہے' یہ کیا ہے؟ یہ زندگی کی وہ ان تھک خواہش ہے جو ہمیں نہ صرف ساٹھ' ستر سال کی عمر تک موت سے بیگانہ رکھتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی چنانچہ ہم اس خواہش سے بندھے رہ کر خود کو اس دنیا کیلئے ناگزیر سمجھ بیٹھتے ہیں' ہم سمجھتے ہیں موت اس کائنات کے ہر جاندار کو نگل جائے گی لیکن یہ ہمارے سائے تک کو نہیں چھو پائے گی' ہم اس کے ''ٹریپ'' سے صاف بچ جائیں گے اور یہ وہ خام خیالی ہے جو ہمیں روزانہ ظلم' زیادتی' ناانصافی' لوٹ کھسوٹ' فراڈ' دھوکہ دہی' مکاری اور اختیارات سے تجاوز پر مجبور کرتی ہے' ہم روز صبح فرعون بن کر اٹھتے ہیں اور نمرود کی طرح ٹانگیں پھیلا کر سوتے ہیں' ہم سمجھتے ہیں دنیا جہاں کی فلائٹس تباہ ہو سکتی ہیں لیکن ہماری فلائٹ کبھی غلط لینڈنگ نہیں کرے گی' دنیا جہاں کے لوگوں کو ہارٹ اٹیک ہو سکتے ہیں' اس زمین کے ہر شخص کو برین ہیمبرج ہو سکتا ہے' تمام لوگوں کے گردے فیل ہو سکتے ہیں' تمام لوگ اندھے ہو سکتے ہیں' تمام لوگوں کی ٹانگیں ٹوٹ سکتی ہیں اور اس زمین کے تمام لوگ کینسر' ایڈز اور ٹی بی جیسی مہلک بیماریوں کا نشانہ بن سکتے ہیں لیکن ہم بچ جائیں گے' ہمارا یہ خیال' ہماری یہ غلط فہمی ہی اس دنیا' اس زندگی کا اصل فساد ہے' یہ غلط فہمی ہی ہمیں اپنا قبلہ درست نہیں کرنے دیتی اور یہ ہی ہمیں اصل راستے پر قدم نہیں رکھنے دیتی۔

آپ ایک لمحے کیلئے آنکھیں بند کیجئے اور تصور کیجئے آپ اویس خان اور رومیہ خان ہیں' آپ آصف شہزاد اور عائشہ ہیں اور آپ کی چند دن پہلے شادی ہوئی ہے اور آپ ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر' آپ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اسلام آباد میں اتر رہے ہیں' اس شہر سے آپ کا ہنی مون شروع ہونا ہے' آپ آسٹریا کے وہ پروفیسر ہیں جو پاکستان کے نوجوانوں کو لیکچر دینے کیلئے ویانا سے اسلام آباد آئے اور آپ اس ملک کے ایسے مشہور' بڑے اور طاقتور بزنس مین ہیں کہ بڑے بڑے ایوان آپ کی دہشت سے لرزتے ہیں لیکن پھر آپ کی مہلت ختم ہو گئی' آپ کا جہاز 28 جولائی صبح 9 بجکر 40 منٹ پر اسلام آباد کی مارگلہ کی پہاڑی سے جا ٹکرایا' آپ کا

کی کون سے بندھا ہوا تھا جدا ہو گیا' آپ کا زندگی سے رشتہ ٹوٹ گیا اور آپ کی ساری سرگرمیاں آپ کی ساری اہمیت' آپ کی ساری جاگیر' ساری جائیداد' سارے بزنس' ساری فیکٹریوں اور سارے بینک بیلنس نے دس سیکنڈ میں آپ کا ساتھ چھوڑ دیا' آپ کا موبائل جنگل میں گم ہو گیا' کریڈٹ کارڈ' شناختی کارڈ اور انشورنس کارڈ' آپ کا پاسپورٹ اور آپ کا حسب نسب چند لمحوں میں جنگل میں تتر بتر ہو گیا' آپ کی ساری خواہشیں' آپ کی ساری منصوبہ بندیاں' آپ کی ساری نفرتیں' سارے غم' سارے اندیشے' ساری سازشیں اور آپ کی ساری کامیابیاں خون کے چھینٹے بن کر درختوں' جھاڑیوں اور گھاس کے پتوں سے لپٹ گئیں اور آپ گوشت' ہڈیوں اور آنتوں کے مغلوبے میں کہیں گم ہو گئے' آپ کی ٹانگ کسی کی ٹانگ کے قریب تھی اور آپ کا بازو کسی کے تابوت میں رکھ دیا گیا اور یہ بھی ہو سکتا ہے آپ کی نعش کھلے جنگل میں کھلے عام پڑی ہو اور بارش کے بے مہر قطرے اس پر مسلسل دستک دے رہے ہوں اور رات کے اندھیرے میں جنگلی جانوروں نے آپ کے اس قیمتی ترین جسم کا گھیراؤ کر رکھا ہو جسے آپ نے آج تک بدبو اور مٹی دونوں سے بچا کر رکھا تھا اور جسے آپ نے آج تک ظلم' زیادتی اور نفرت کا خون پلا پلا کر جوان کیا تھا لیکن اس وقت آپ کہاں ہیں۔ ہم' ہماری نفرت اور ہماری کامیابیاں کہاں ہیں؟ کہیں بھی نہیں۔ بس ہمارے گرد بد قسمت جہاز کے مسافروں کا سامان بکھرا ہے' ان کے خون' ان کی آنتوں کا تعفن ہے' گہری سیاہ رات اور جنگل میں برستی ہوئی بارش ہے اور ہماری نعش کسی ریسکیو ورکر کے پاؤں کی چاپ کا انتظار کر رہی ہے۔

یہ ہیں ہم۔ یہ ہے ہماری حقیقت لیکن ہم اس کے باوجود لوگوں کو معاف نہیں کرتے' ہم اس مہلت کو غنیمت جان کر اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔ ہم کتنے بے وقوف' کتنے نا سمجھ ہیں۔
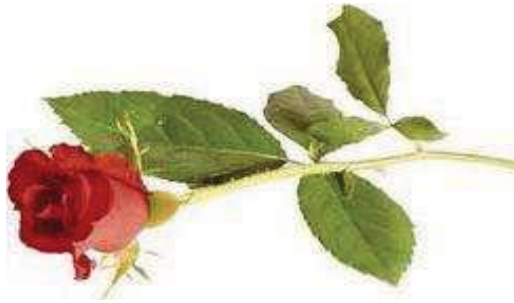
ہمیں نیلسن مینڈیلا ماڈل پر عمل کرنا ہوگا۔

نیلسن مینڈیلا اس وقت 92 سال کے ہو چکے ہیں' یہ اپنی طویل جمہوری جدو جہد اور قید و بند کی صعوبتوں کی وجہ سے پوری دنیا میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں لیکن نیلسن مینڈیلا کا اصل کمال ان کی قید و بند اور طویل جمہوری جدو جہد نہیں' ان کا اصل کمال جنوبی افریقہ کا اقتدار سنبھالنے کے بعد ان کا رویہ تھا' نیلسن مینڈیلا نے اقتدار سنبھالنے کے بعد ان تمام گوروں کو دل سے معاف کر دیا جو ساڑھے تین سو سال تک جنوبی افریقہ کو لوٹتے رہے تھے اور جنہوں نے نیلسن مینڈیلا جیسے سینکڑوں' ہزاروں لیڈروں کو تیس تیس سال قید بامشقت کی چکی میں پیسا تھا۔ ان کا دوسرا کمال اقتدار اور سیاست سے ریٹائر منٹ کا اعلان تھا' نیلسن مینڈیلا کی جدو جہد کے نتیجے میں جنوبی افریقہ نے 1994ء میں انگریزوں سے آزادی حاصل کی' نیلسن مینڈیلا نے 10 مئی 1994ء کو اقتدار سنبھالا اور ٹھیک 14 جون 1999ء کو سیاست سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ دنیا میں اس نوعیت کی پہلی مثال تھی کیونکہ جنوبی افریقہ نے نیلسن مینڈیلا کی وجہ سے آزادی حاصل کی تھی' پورا جنوبی افریقہ نیلسن مینڈیلا کو اپنا باپ سمجھتا تھا اور اگر یہ چاہتے تو یہ تامرگ جنوبی افریقہ کے صدر رہ سکتے تھے لیکن نیلسن مینڈیلا اپنی شخصیت کی طرح اپنے دل اور اپنے ظرف کے لحاظ سے بھی بڑے تھے لہٰذا یہ اقتدار سے الگ ہوگئے لیکن یہ نیلسن مینڈیلا کا آخری کارنامہ نہیں تھا' انہوں نے 2007ء میں اپنی نواسی ویں سالگرہ کے موقع پر ایک اعلان کر کے پوری دنیا کو حیران کر دیا' اس دن نیلسن مینڈیلا نے دنیا کی مشہور بزرگ شخصیات کی ایک تنظیم کی بنیاد رکھی' اس تنظیم کا نام ''دی ایلڈر'' یعنی بزرگ ہے۔ اس تنظیم میں امریکا کے سابق صدر جمی کارٹر' اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل کوفی عنان اور جنوبی افریقہ کے نوبل پرائز ونر آرچ بشپ ڈیسمنڈ ٹوٹو جیسی بزرگ شخصیات شامل ہیں۔ اس تنظیم کا مقصد اس دیہاتی کلچر کو دوبارہ زندہ کرنا تھا جس میں گاؤں کے بوڑھے ایک جگہ بیٹھ کر گاؤں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ نیلسن مینڈیلا کا کہنا تھا دنیا اس وقت گلوبل ویلیج ہے اور اس عالمی گاؤں کے مسائل کے حل کیلئے ایسے بزرگوں کی ضرورت ہے جو تجربے' مشاہدے' ذہانت اور عقل میں نوجوانوں سے بہتر ہوں' یہ لوگ ایک جگہ بیٹھیں دنیا کے بڑے بڑے مسائل کا تجزیہ کریں اور اس کے بعد ان کا کوئی ٹھوس حل تجویز کریں' یہ حل آگے چل کر دنیا کی بقاء کا باعث بنے گا۔ نیلسن مینڈیلا کا خیال تھا اگر دنیا کے بڑوں نے اس وقت اپنا کردار ادا نہ کیا تو یہ دنیا ایک ایسے بحران کا شکار ہو جائے گی جس کے آخری سرے میں غار کی زندگی ہو گی چنانچہ دنیا کے تمام بڑے بوڑھوں کو دنیا بچانے کیلئے آگے آنا چاہئے۔ نیلسن میڈیلا اور ان کے ساتھی جنوبی افریقہ کے سماجی' ثقافتی' معاشی اور نسلی مسائل کے حل کیلئے بے شمار منصوبے بنا چکے ہیں اور ان منصوبوں کے نتیجے میں آج جنوبی افریقہ کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہو رہا ہے جہاں جون 2010ء میں ورلڈ کپ منعقد ہوا تھا اور اس ورلڈ کپ کے دوران کسی قسم کا کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا اور یہ وہ جنوبی افریقہ ہے جو دس سال پہلے تک دنیا میں نسلی فسادات کا سب سے بڑا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔

ہمیں پاکستان میں بھی اس وقت اسی قسم کی تنظیم کی ضرورت ہے' ہمارے تمام بزرگ اکٹھے ہوں' فوج کے ریٹائرڈ

جنرل' بریگیڈئراور کرنل اپنی سکیم بنائیں' فارن آفس کے ریٹائرافسر' سول سروس کے بزرگ' ریٹائر سیاستدان' ریٹائر بزنس مین' ریٹائراستاد' ریٹائر کھلاڑی اور ریٹائر سائنس دان اپنی اپنی تنظیمیں بنائیں' یہ لوگ اپنی جمع پونجی' اپنی زمین' اپنی جائیداد اور اپنے اثاثوں میں سے تھوڑا تھوڑا "کنٹری بیوٹ" کر کے اپنے دفتر' کانفرنس ہال اور میٹنگ رومز بنائیں' ایک ایک ماہ' ایک ایک سال آپس میں میٹنگ کریں اور ملک کے ایک ایک گھمبیر ایشو کا کوئی سالڈ اور فوری حل تجویز کریں' حکومت ان بزرگوں کے تجربے' مشاہدے اور علم کا فائدہ اٹھائے اور اس حل پر فوری طور پر عمل شروع کر دے' مجھے یقین ہے ہمارے بڑے بڑے مسائل حل ہونا شروع ہو جائیں گے' ہمیں ماننا پڑے گا ہم حقیقتاً تاریخ کے نازک اور فیصلہ کن موڑ سے گزر رہے ہیں' ملک میں کسی جگہ عملاً حکومت دکھائی نہیں دے رہی' کراچی میں تاریخ میں پہلی بار تمام سٹیک ہولڈرز حکومت میں شامل ہیں' پاکستان پیپلز پارٹی' ایم کیو ایم اور اے این پی کراچی کی فیصلہ کن طاقتوں میں شامل ہیں لیکن اس کے باوجود آج کراچی کے فسادات کو پانچواں دن ہو چکا ہے' سو کے قریب لوگ جاں بحق اور پانچ سو زخمی ہو چکے ہیں اور پورے شہر میں املاک' پٹرول پمپس' شاپنگ پلازوں اور گاڑیوں کو آگ لگائی جا رہی ہے لیکن رینجرز' پولیس اور خفیہ اداروں کی بھاری نفری کے باوجود فسادات رک نہیں رہے؟ کیوں؟ اس کیوں کا فیصلہ اب اس ملک کے بزرگ ہی کر سکتے ہیں' ملک میں تاریخ کا بدترین سیلاب بھی آ چکا ہے' لاکھوں لوگ سیلاب میں محصور ہیں' انفراسٹرکچر تباہ ہو چکا ہے' شہری زندگی معطل ہو چکی ہے اور لوگوں میں مُردوں تک کو دفن کرنے کی استطاعت نہیں' حکومت کی حالت یہ ہے کہ یہ لوگوں کو سیلاب سے پہلے اطلاع دے سکی' انہیں سیلاب سے بچا سکی اور نہ ہی انہیں اب بحال کر پا رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ مس مینجمنٹ کی انتہا ہے۔ ہمارا ملک ہر سال دو فیز سے گزرتا ہے' ہم چھ ماہ پانی کی شدید کمی کا شکار رہتے ہیں' ہماری فصلیں' جانور' شہر اور ڈیم خشک سالی کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں' صوبے پانی کی تقسیم کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہو جاتے ہیں اور بعدازاں ملک میں سیلاب آ جاتا ہے اور پانی لاکھوں ایکڑ فصلیں اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے' یہ دونوں فیز ہمارے لئے انتہائی خطرناک ہیں اور ہم 63 سال گزرنے کے باوجود ان کا کوئی حل نہیں نکال سکے۔ یہ ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ہم ایک ماہ خشک سالی سے مرتے ہیں اور اگلے ماہ ہم پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو جاتے ہیں اور اکیسویں صدی جیسے روشن وقت میں ہمارے پاس اس کا کوئی حل موجود نہیں۔ ہمارے بڑے بوڑھے اکٹھے بیٹھ کر اس کا بھی کوئی حل تجویز کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں اس وقت لاکھوں لوگ سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں لیکن ہمارے صدر فرانس کے شمالی صوبے نارمنڈی میں اپنے ذاتی محل میں لنچ فرما رہے ہیں اور یہ جینز اور شرٹ پہن کر اس ڈیوڈ کیمرون سے ملاقات کیلئے لندن پہنچ گئے ہیں جس نے چند دن قبل بھارت میں کھڑے ہو کر پاکستان کو دہشت گردی کا ایکسپورٹر قرار دیا تھا' پورے ملک پر موت کا سوگ طاری ہے لیکن صدر صاحب دو دن بعد برطانیہ میں اپنے صاحبزادے بلاول زرداری بھٹو کی "پولیٹیکل لانچنگ" کریں گے' صدر صاحب کی ان سرگرمیوں پر لوکل اور عالمی میڈیا چیخ رہا ہے' آپ برطانیہ کے کل کے اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجئے' ان اخبارات میں صدر کے محلات اور بیرون ملک موجود جائیدادوں کی تصویریں اور خبریں چھپی ہیں اور ساتھ ہی پاکستانی قوم سے پوچھا گیا ہے کیا یہ اس ملک کے صدر

[illegible]

ہیں جو اس وقت سیلاب میں ڈبکیاں کھا رہا ہے؟ ہمارے پاس مغربی میڈیا کے اس سوال کا کیا جواب ہے؟ ہمیں اس جواب کیلئے بھی اس ملک کے بزرگوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے بزرگ اکٹھے ہوں اور یہ سفارت کاری کیلئے ایک جامع منصوبہ بنائیں' اس منصوبے میں موجودہ اور مستقبل کی حکومتوں کی سفارتی راہنمائی ہو اور انہیں بتایا جائے ہم نے من حیث القوم کیا کرنا ہے اور ہم نے کیا نہیں کرنا؟ ہم نے کس حد تک لچک دکھانی ہے اور کس جگہ 'کس مقام پر پہنچ کر ہم نے دنیا کو صاف جواب دے دینا ہے۔ یہ جامع فارن پالیسی بھی اس وقت انتہائی ضروری ہے کیونکہ ہم اگر ڈیوڈ کیمرون جیسے لوگوں کی ہرزہ سرائی کے باوجود ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے تو ہم قوم کی حیثیت سے اپنا وقار کھو بیٹھیں گے اور دنیا میں انسان ہو یا قوم جب اس کی عزت نفس' جب اس کی سیلف ریس پکٹ جواب دے دیتی ہے تو اسے ہوا میں تحلیل ہوتے دیر نہیں لگتی چنانچہ ہمیں اس وقت جنوبی افریقہ کے بوڑھوں کی طرح ایسے بزرگوں کی ضرورت ہے جو آگے بڑھیں اور اپنا وہ کردار ادا کریں جو یہ لوگ عملی زندگی میں روزگار اور نوکری کی مجبوریوں کے باعث ادا نہیں کر سکے تھے۔ آپ خود سوچئے اگر جنوبی افریقہ کے بزرگ نسلی فسادات کے شکار ملک کو دس سال میں اس لیول پر لا سکتے ہیں کہ اس میں ورلڈ کپ منعقد ہو جائے تو کیا ہمارے بزرگ پاکستان کو دس پندرہ برس میں اس قابل نہیں بنا سکتے کہ ہم اس ملک میں امن اور سکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں! یہ لوگ یقیناً ایسا کر سکتے ہیں' بس انہیں نام نہاد درویشی اور حجرہ نشینی ترک کرنا ہوگی اور اپنی زندگی کی آخری ساعتوں کو زندگی کا بہترین اور پیداواری دور بنانا ہوگا۔

بزرگو! باہر آؤ یہ ملک آپ کا منتظر ہے۔
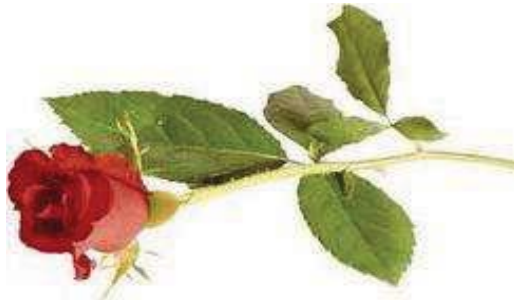
بارش میں بھیگی ہوئی محبت

میں اس کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا' یہ اگست کی پہلی تاریخیں تھیں' بارش کے چھوٹے چھوٹے قطرے آسمان سے مسلسل برس رہے تھے' ہمارے سامنے راول ڈیم تھا اور ڈیم کا پانی کناروں کی آخری حد کو چھو رہا تھا' ہمارے چاروں طرف دھند تھی اور اس دھند میں کیمرے کے فلش کی طرح کبھی کبھی بجلی کے کوندے لپکتے تھے اور سیکنڈ کے بیسویں حصے میں پورا اسلام آباد ہمارے دماغ کی فلم پر ''پرنٹ'' ہو جاتا تھا' وہ دو گھنٹے سے بارش میں بیٹھا تھا اور میں اس کی بیوی کی ٹیلی فون کال پر اس کو تلاش کرتا ہوا راول ڈیم پہنچا تھا' مجھے معلوم تھا یہ بارش کا دن ہے اور وہ گھر سے غائب ہو کر یقیناً راول ڈیم گیا ہو گا اور ڈیم کے کنارے کسی پتھر' کسی بینچ پر بیٹھ کر اپنے اوپر برستے قطرے گننے کی کوشش کر رہا ہو گا۔ یہ اس کے جنون کے دن تھے اور جنون کے ان دنوں میں وہ بے بس ہو کر شہر کے ان کونوں' ان کھدروں اور ان سپاٹس پر چلا جاتا تھا جہاں اس کے عشق بلاخیز کے آثار قدیمہ بکھرے تھے' وہ راول ڈیم کی ان سیڑھیوں پر جا کر کھڑا ہو جاتا تھا جو پانی کی آخری تہہ کو چھوتی ہیں اور ان سیڑھیوں کے آخری سٹپ پر اس نے چاند کو پانی میں ڈوبتے ہوئے دیکھا تھا اور ایک نرم انگلی نے اس کی کمر پر آہستہ سے ''اچھا ہے ناں'' لکھا تھا' وہ راول ڈیم کے اس سبزہ زار پر چلا جاتا تھا جہاں سے چاروں طرف پانی نظر آتا ہے اور ہوا رات کی گہری تنہائی اور خاموشی میں اس پانی پر گزرے وقتوں کی کہانیاں لکھتی ہے اور شہر کی روشنیاں ہلکورے لیتی ان کہانیوں میں غسل کرتی ہیں۔ وہ مارگلہ کے ان موڑوں پر بھی چلا جاتا تھا جہاں سے پورا شہر اس کے قدموں میں بچھا نظر آتا ہے اور وہ پہاڑ کے اس موڑ پر بھی ٹھہر جاتا تھا جہاں صرف ایک گاڑی کھڑی ہو سکتی ہے اور رات کے عالم میں گاڑی کی ونڈ سکرین ''سینما سکوپ'' بن جاتی ہے اور وہ دونوں اس کو ''اپنا سپاٹ'' کہتے تھے اور جس دن وہاں کوئی دوسری گاڑی کھڑی دکھائی دیتی تھی اس دن انہیں اپنا حق ملکیت غصب ہوتا محسوس ہوتا تھا اور وہ رات کے پچھلے پہر ''روز اینڈ جسمین گارڈن'' کے اس بینچ پر بھی بیٹھ جاتا تھا جہاں سے خوشبو کی لہریں شمال سے جنوب کی طرف سفر کیلئے نکلتی ہیں اور ہوا مقدس پیغام کی طرح خوشبو کو اپنے سینے پر اٹھا اٹھا کر پھرتی تھی' یہ جنون کے دن اس پر بڑے بھاری ہوتے تھے اور وہ طوفان میں پھنسے' الجھے پتے کی طرح شہر میں چکراتا' دوڑتا پھرتا تھا اور اس لمحے مجھے اس کی بیوی کا فون آ جاتا تھا اور میں اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا تھا۔ لوگوں کو لوگوں سے محبت کیوں ہوتی ہے؟ یہ ہوتی ہے تو لوگ پھر لوگوں سے جدا کیوں ہو جاتے ہیں؟ اور یہ جدائی بعد ازاں انسان کے دماغ' انسان کی روح اور انسان کے ضمیر میں کرچیوں کی طرح کیوں چبھتی ہے اور لوگوں کو کروٹ لیتے ہوئے' لمبا سانس کھینچتے ہوئے یا پھر کافی کا گرم مگ اٹھاتے ہوئے دل کی اندر کی دیواروں پر خارش کیوں محسوس ہوتی ہے اور انسان اپنے دل کے اندر ہاتھ ڈال کر خارش کے اس مقام کو ناخن سے کیوں کریدنا چاہتا ہے؟ میں آج تک اس کی کوئی وجہ تلاش نہیں کر سکا' میں یہ بھی معلوم نہیں کر سکا کہ دیوداس صرف مرد کیوں ہوتے ہیں' عورتیں ٹوٹتی محبتوں کی کرچیاں سنبھال کر اپنی نئی زندگی میں کیوں ایڈجسٹ ہو جاتی ہیں اور یہ جاتے ہوئے ان سیڑھیوں کو کہاں دفن کر دیتی ہیں جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے کئی چاندوں کو ڈوبتے ابھرتے دیکھا تھا اور یہ اس بینچ کو بھی کہاں چھوڑ جاتی ہیں جس پر یہ دو دو گھنٹے برستی بارش میں بیٹھی رہی تھیں اور انہوں نے مرد سے پوچھا تھا ''تم ہمیشہ ایسے ہی رہو گے ناں جانی؟'' عورتیں یہ سب

پچھ لیسے ہضم کر جاتی ہیں اور مرد ان لمحوں کو فراموش کیوں نہیں کر پاتے؟ مجھے ان سوالوں کا بھی جواب نہیں ملا' شائد اللہ تعالٰی نے محبت کرنے کا فن' اس کو پی جانے اور دل کے کسی اندھے کونے میں اسے دفن کرنے کا فن صرف عورتوں کو دیا ہے! محبت کرنا مردوں کا کام نہیں چنانچہ ان میں اسے برداشت کرنے کی کپیسٹی ہی نہیں لہٰذا جب مرد عورت جیسی شدت کے ساتھ محبت کرتے ہیں تو یہ دیوداس بن جاتے ہیں اور وہ دیوداس بن کر میرے ساتھ بینچ پر بیٹھا تھا۔

ہم دونوں کی عینکیں گیلی ہو چکی تھیں' ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے تھے صرف سن سکتے تھے' میں نے اس سے پوچھا "اس کم بخت عشق نے تمہیں کیا دیا؟" گیلی بارش میں اس کی ہنسی خشک تھی' اس نے جواب دیا "یہ دو جمع دو چار نہیں' یہ ایک جمع ایک' صفر ہے" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا' وہ دھندلے شیشوں میں ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا' اس نے کہا "دنیا کی ہر چیز دو جمع دو ہوتی ہے اور ہم اس دو جمع دو سے ہر نقصان اور ہر فائدے کا تخمینہ لگاتے ہیں' ہم ہر کھیل' ہر کاروبار اور ہر کوشش کے آخر میں دو جمع دو اور تین منفی ایک کی بیلنس شیٹ بنا لیتے ہیں لیکن یہ کم بخت عشق ایک ایسی کیلکولیشن ہے جس میں ایک جمع ایک ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ صفر نکلتا ہے مگر یہ صفر۔۔۔!" وہ رکا' اس نے بارش میں بھیگی ہوئی ایک لمبی سانس لی اور بولا "یہ صفر دنیا کی قیمتی ترین فگر ہوتی ہے' جس طرح دنیا کے صفر ایک کو دس' سو کو ہزار' ہزار کو لاکھ' لاکھ کو کروڑ اور کروڑ کو ارب بنا دیتے ہیں بالکل اسی طرح محبت کا صفر بھی ہماری زندگی کے تمام لمحوں کو قیمتی بلکہ انمول بنا دیتا ہے۔ میں اس کم بخت عشق سے پہلے دو جمع دو میں پھنسا ہوا ایک عام معمولی انسان تھا لیکن آج میں ایک ایسی فگر ہوں جس کے ساتھ گزرے دنوں کے صفر لگتے جا رہے ہیں اور میری ویلیو میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے" مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی' وہ میری کیفیت بھانپ گیا چنانچہ خود ہی بول پڑا "مجھے اس کم بخت عشق سے پہلے یہ معلوم نہیں تھا کہ بارش کیا ہوتی ہے' کھلے آسمان کے نیچے راول ڈیم کے کنارے بینچ پر بیٹھ کر بارش کو اپنے سر' اپنی گردن اور اپنے سینے پر محسوس کرنا کتنا عظیم' کتنا فرحت بخش کام ہوتا ہے' مجھے اس محبت نے سکھایا چاند جب پانی کے اندر لرزتا ہے تو اس کی لرزش کا کیا مطلب ہوتا ہے' کافی کے مگ کے کناروں پر جمی جھاگ کیا ہوتی ہے' پراٹھے کی خوشبو میں کیا چھپا ہوتا ہے' گرمیوں کی تپتی راتوں میں ٹھنڈی ہوا کا جھونکا کیا پیغام لے کر آتا ہے' گیلے رومال سے گرم پسینہ صاف کرنے میں کیا مزا ہے' آبشار جب پہاڑ کا سینہ چیر کر باہر نکلتی ہے اور اس کی نرم پھوار اور سفید جھاگ پتھروں کو کہاں کہاں گدگداتی ہے' گاؤں کے پرانے کنوئیں کے پانی میں مٹی کی خوشبو کیوں ہوتی ہے' کبوتر دیہاتی مسجدوں میں گھونسلے کیوں بناتے ہیں' درگاہوں کے فرش ٹھنڈے کیوں ہوتے ہیں اور جلتے ہوئے' دکھتے ہوئے دلوں کو نماز میں سکون کیوں ملتا ہے" وہ رکا' اس نے لمبا سانس لیا اور بولا "میں ہمیشہ ٹرین کی چھک چھک' ٹھک ٹھک سنتا تھا لیکن یہ مجھے اچھی اب لگنا شروع ہوئی ہے' میں فش اینڈ چپس اور کافی پکوڑے ہمیشہ پسند کرتا تھا لیکن ان کا مزہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے' مجھے خوشبو ہمیشہ متاثر کرتی تھی لیکن میں خوشبو کے پف کو ہوا میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتا ہوا اب محسوس کرتا ہوں' میں بہار کے موسم کو ہمیشہ انجوائے کرتا تھا لیکن بہار ہوتی کیا ہے اس کا ادراک مجھے اب ہوا ہے' مجھے نور جہاں' مہدی حسن اور لتا کی آواز ہمیشہ اپنی طرف کھینچتی تھی لیکن ان کی آوازوں میں

[illegible] کی کتنی [illegible] پھیلتی اور چیختی [illegible] مجھے [illegible] معلوم ہوا' فیض احمد فیض کا

[illegible]
دشت تنہائی' یہاں سے شہر کو دیکھو اور ہم نے کچھ عشق کیا اور کچھ کام کا کیا مطلب تھا' یہ مجھے اب معلوم ہوا۔ علامہ اقبال عطیہ فیضی خط کیوں لکھتے تھے' حسرت موہانی کی حسرتوں میں کیا چھپا تھا' فراز پوری زندگی اسلام آباد کی سڑکوں پر کیا تلاش کرتا رہا' انشاء کو چ کیوں کرنا چاہتا تھا' صادقین کی ٹیڑھی لکیروں میں جذبوں کا کتنا سیدھا پن تھا' اقبال بانو کی آواز میں اداسی کیوں ہے' پٹھانے خان اور ریشما کا گلا کیا مانگتا تھا' عابدہ پروین کی کافیوں میں دیوانگی کیوں ہے اور ریکھا کی مسکراہٹ میں دکھ اور تکلیف کا رنگ کیوں ہے' یہ سب مجھے اب معلوم ہوا۔ میں لوگوں کو ناراض کر دیتا تھا' میں لوگوں کی بے عزتی کر دیتا تھا' میں اپنے بچوں' اپنی بیوی کو ڈانٹ دیتا تھا' میں اپنے والدین کو تکلیف دیتا تھا اور میں دوستوں سے قطع تعلق کر لیتا تھا لیکن یہ چیزیں کس قدر تلخ' کس قدر خوفناک اور کس قدر بری ہیں' رشتوں کے ٹوٹنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے اور ناراضگی انسان کو اندر سے کتنا دکھ دیتی ہے یہ سب مجھے اب معلوم ہوا۔ عورت کے اندر کتنی طاقت ہے' یہ مرد کو کتنا مضبوط بنا دیتی ہے' اس کا ظرف کتنا گہرا ہے اور یہ اپنے سینے میں کیا کیا چھپا لیتی ہے اس کا احساس بھی مجھے اب ہوا اور وینس شہر میں آپ کی کھڑکی سمندر کی طرف کھلتی ہو' آپ ایمسٹرڈیم شہر میں رات کے دو بجے برستی بارش میں کافی تلاش کر رہے ہوں' فلورنس میں آپ کا کمرہ "ڈبل ہائیٹ" پر ہو' آپ کے جسم میں درد ہو رہا ہو اور کوئی اندھیرے میں گرتا پڑتا آپ کیلئے درد کی گولی لے آئے' پیرس میں آپ کا بیگ چوری ہو جائے' دوبئی ائرپورٹ پر آپ ہزاروں لوگوں میں سے کسی ایک کو تلاش کر رہے ہوں' آپ انٹرلاکن میں جیکٹ کے بغیر پھر رہے ہوں' آپ نے برسلز گینٹ اور اینڈورپن میں کئی راتیں جاگ کر گزاری ہوں' آپ نے بھاگ کر کولون کی ٹرین پکڑی ہو اور آپ دو مرتبہ شہر دیکھے بغیر ایتھنز سے واپس لوٹ آئے ہوں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے' یہ سب باتیں کس طرح آپ کے اندر خلش بن جاتی ہیں' یہ آپ کو کہاں کہاں سے کاٹتی ہیں' یہ سب مجھے اب معلوم ہوا۔ میں ایک ایسا صفر بن چکا ہوں جو میری ہی ویلیو میں مسلسل اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے" اس نے لمبا سانس لیا اور خاموش ہو گیا۔

بارش کے قطرے راول لیک پر چھوٹے چھوٹے بھنور بنا رہے تھے اور میں اپنی عینک ہاتھ میں پکڑ کر گیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا' اس نے جھیل کی طرف دیکھا' مسکرایا' میرا ہاتھ تھپتھپایا اور بولا "آج کی بارش کچھ زیادہ لمبی نہیں ہو گئی" میں نے ہاں میں سر ہلایا' اٹھا اور گاڑی کی طرف واپس آ گیا۔ مجھے معلوم تھا جب تک یہ بارش نہیں رکے گی وہ اس وقت تک اس بینچ سے نہیں اٹھے گا۔
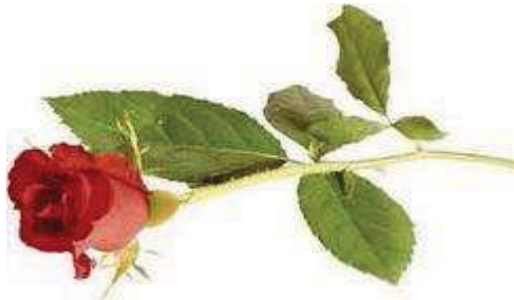
مان لیتے ہیں

ہم ایک لمحے کیلئے مان لیتے ہیں صدر آصف علی زرداری کا اس وقت فرانس اور برطانیہ جانا انتہائی ضروری تھا‘ ہم مان لیتے ہیں صدر کو یکم اگست کو فرانس ضرور جانا چاہیے تھا‘ انہیں نارمنڈی میں اپنے محل کا دورہ بھی ضرور کرنا چاہیے تھا اور اس دورے کیلئے ہیلی کاپٹر کا کرایہ بھی فرانس میں پاکستانی سفارتخانے کو ادا کرنا چاہیے تھا اور نارمنڈی کے اس لنچ کیلئے کھانے پینے کی اشیاء بھی سفارتخانے ہی کو خرید کر بھجوانی چاہیے تھیں اور اگر صدر یکم اگست کو فرانس نہ پہنچتے اور یہ فرنچ صدر نکولس سرکوزی سے ملاقات نہ کرتے تو پاکستان اور فرانس کے سفارتی تعلقات خراب ہو جاتے اور ہمیں ان تعلقات کو یکم اگست 2010ء کی پوزیشن پر واپس لانے کیلئے دس سال لگ جاتے اور صدر محترم نے قوم کو اس سفارتی خواری سے بچانے کیلئے اپنے قیمتی ترین وقت‘ توانائی اور سکون کی قربانی دی اور یہ فرانس پہنچ گئے۔ ہم ایک لمحے کیلئے یہ بھی مان لیتے ہیں صدر آصف علی زرداری کا برطانیہ کا دورہ بھی انتہائی ضروری تھا‘ برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون نے 28 جولائی کو انڈیا کے شہر بنگلور میں کھڑے ہو کر پاکستان کے بارے میں ہرزہ سرائی کی تھی‘ انہوں نے پاکستان کو دہشت گردی کا ایکسپورٹر کہا تھا اور ڈیوڈ کیمرون کی یہ غلط فہمی صرف اور صرف صدر آصف علی زرداری ہی دور کر سکتے تھے‘ یہ لندن جاتے اور ڈیوڈ کیمرون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں بتاتے ”وی آر یور فرینڈز‘ ناٹ ٹیررریسٹ“ ہم مان لیتے ہیں پاکستان اور افغانستان کی تعمیر نو کے مارشل پلان کی حمایت کیلئے صدر کا ڈیوڈ کیمرون سے ملنا ناگزیر تھا اور صدر اس لئے برطانیہ تشریف لے گئے تھے‘ یہ بھی مان لیتے ہیں صدر نے ”ون ٹو ون“ ملاقات میں ڈیوڈ کیمرون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور سفارتی آداب کے احترام میں بعدازاں میڈیا کے سامنے پہنچ کر اپنی آنکھیں جھکالی تھیں۔ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں ڈیوڈ کیمرون نے تنہائی میں ہمارے صدر کے گھٹنے چھو کر اپنے کئے کی معافی مانگ لی تھی‘ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں صدر کا برمنگھم میں پاکستانی کمیونٹی سے سیاسی خطاب بھی ناگزیر تھا اور اس خطاب میں سیاسی بیان اور سیاسی جملے بھی انتہائی ضروری تھے‘ یہ کہنا بھی ضروری تھا میاں نواز شریف نے میرے دورے پر تنقید کر کے اپنی مخصوص ذہنیت کا مظاہرہ کیا‘ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں اس سیاسی جلسے میں شمیم خان نام کے کسی شخص نے صدر زرداری کی طرف جوتے نہیں پھینکے تھے اور یہ خبر صدر زرداری کی شہرت کو نقصان پہنچانے کیلئے پاکستان پیپلزپارٹی کے دشمنوں نے اڑائی تھی اور اسے ایک سازش کے تحت ایس ایم ایس کے ذریعے پوری دنیا میں پھیلا دیا گیا تھا‘ ہم ایک لمحے کیلئے یہ بھی مان لیتے ہیں صدر برطانیہ کے سستے ترین ہوٹل میں اقامت پذیر ہیں‘ صدر کا جہاز دس دنوں سے کسی بین الاقوامی ائرپورٹ پر پارک نہیں اور قوم گھنٹے کے حساب سے اس کی پارکنگ فیس ادا نہیں کر رہی‘ صدر کے ساتھ ان کے دوست اور احباب بھی دورے پر نہیں ہیں‘ انہوں نے آکسفورڈ سٹریٹ کے مہنگے شاپنگ سینٹروں سے ہزاروں‘ لاکھوں پاؤنڈز کی خریداری بھی نہیں کی اور یہ پارٹیاں بھی اٹینڈ نہیں کر رہے اور ہم یہ بھی مان لیتے ہیں ہمارا ملک دہائیوں تک صدر کے اس دورے کے ثمرات سمیٹتا رہے گا۔ ہم یہ بھی مان لیتے ہیں وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات قمر زمان کائرہ نے صدر سے پہلے لندن پہنچ کر برطانیہ کے میڈیا کو ”پرو پاکستان“ بنا لیا تھا اور صدر کی آمد‘ اقامت اور واپسی تک برطانیہ کے کسی اخبار‘ کسی ٹیلی ویژن اور کسی میگزین نے یہ نہیں لکھا پاکستان میں

بدترین سیلاب آیا ہوا ہے' 35 لاکھ لوگ متاثر ہو چکے ہیں اور سولہ سو مر چکے ہیں سیلن پاکستان کے صدر اپنے محلوں کی سیر کر رہے ہیں اور ہم یہ بھی مان لیتے ہیں پاکستان کا میڈیا' سیاستدان اور عوام صدر آصف علی زرداری کے معاملے میں جانبدار ہیں اور اگر پاکستان میں سیلاب نہ آتا تو بھی سیاستدانوں اور میڈیا نے اسی شدت کے ساتھ اس دورے پر تنقید کرنا تھی۔

ہم یہ سب باتیں' یہ سارے اعتراضات اور یہ تمام حقائق ایک لمحے کیلئے تسلیم کر لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی کہ پاکستان کے عوام مشکل ترین دور سے گزر رہے ہیں' ملک کا ایک تہائی حصہ پانی میں ڈوب چکا ہے' لاکھوں ایکڑ فصلیں بہہ گئی ہیں' ایک سو سولہ شہر اور قصبے پانی میں ڈوب گئے ہیں' اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق ایک کروڑ 20 لاکھ لوگ اس سیلاب سے متاثر ہوئے ہیں' یہ سونامی سے بڑی تباہی ہے' لوگوں کے گھر' دکانیں اور فیکٹریاں بہہ گئی ہیں' لوگ کیمپوں میں پڑے ہیں یا پھر اپنے گھروں کی چھتوں پر مدد کے منتظر ہیں' سڑکیں' پل اور ریلوے لائنیں ٹوٹ چکی ہیں' متاثرہ علاقوں میں ٹرانسپورٹ معطل ہے' امدادی سرگرمیاں کہیں دکھائی نہیں دے رہیں' وفاقی کابینہ غائب ہے اور حکومتی ادارے کونے کھدروں میں چھپے بیٹھے ہیں' یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی کہ سیلاب سے اب تک کے تخمینے کے مطابق 45 ارب کا نقصان ہو چکا ہے' یہ نقصان ان لاکھوں گھروں' دکانوں' پلازوں' سڑکوں' گلیوں' گھریلو اشیاء اور مال مویشیوں کے علاوہ ہے جو اس سیلاب سے متاثر ہوئے جبکہ اس کے علاوہ ناران سے لے کر پشاور تک اور پشاور سے کوٹ مٹھن تک سینکڑوں دیہات اور لاکھوں ایکڑ زمین اور اس پر کھڑی فصلیں تباہ ہو چکی ہیں لیکن مصیبت کی اس گھڑی میں پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے شریک چیئرمین آصف علی زرداری اور چیئرمین بلاول زرداری بھٹو لندن کے محفوظ' ٹھنڈے اور روشن ماحول میں بیٹھے ہیں' ملک میں لوگ مر رہے ہیں' یہ پانی اور روٹی کے ایک ایک لقمے کیلئے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن ہمارے صدر اپنے محلوں کا جائزہ لینے کیلئے برطانیہ اور فرانس کے دورے کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی اور ہم یہ حقیقت جھٹلا نہیں سکیں گے۔ ذرا سوچئے کیا قوم یہ حقیقت آسانی سے ہضم کر سکتی ہے؟ کیا ہم تاریخ کے ماتھے سے اتنا بڑا سوالیہ نشان مٹا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر ہمیں یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا ہو گی' ہمیں ماننا پڑے گا مصیبت کی اس گھڑی میں صرف دو شخصیات میدان میں دکھائی دے رہی ہیں' ایک آرمی چیف اشفاق پرویز کیانی اور دوسرا وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف ۔ فوج اور فوجی جوان سیلاب سے متاثرہ ہر گاؤں' ہر قصبے اور ہر شہر میں پہنچ رہے ہیں' یہ لوگوں کو خوراک بھی پہنچا رہے ہیں اور لوگوں کو متاثرہ علاقوں سے باہر بھی نکال رہے ہیں' جنرل اشفاق پرویز کیانی خود بھی متاثرہ علاقوں میں جاتے ہیں اور لوگوں سے براہ راست ان کے مسائل سنتے ہیں' میاں شہباز شریف بھی پچھلے دس دنوں سے سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں موجود ہیں' یہ پانی میں آگے بڑھتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں' کشتیوں پر بھی سفر کرتے ہیں اور یہ کیمپوں میں متاثرین کی خوراک' رہائش' ادویات اور دوسری ضروریات زندگی کا مشاہدہ بھی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ میں میاں نواز شریف کو بھی یہ کریڈٹ دینے پر مجبور ہوں' میاں نواز شریف سیلاب کے ان دنوں میں صوبہ خیبر پختونخواہ بھی گئے اور انہوں نے مظفر آباد کا دورہ بھی کیا' وفاقی حکومت کے بعض

وزراء اس کو سیلابی سیاست کا نام دے رہے ہیں کاش یہ لوگ کاش اس قسم کی سیلابی سیاست کا مظاہرہ کرتے یہ لوگ بھی پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ٹیمیں بناتے ‘کشتیاں ‘رسے اور ٹیوبز لیتے ‘خوراک ‘ خیمے اور کپڑے جمع کرتے اور سیلاب زدہ علاقوں میں چلے جاتے ‘کاش رحمان ملک ‘بابر اعوان ‘مخدوم امین فہیم ‘راجہ پرویز اشرف ‘شاہ محمود قریشی اور قمر زمان کائرہ نیکریں اور ٹی شرٹس پہن کر سیلابی علاقوں میں جاتے ‘لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے سیلاب سے باہر نکالتے ‘زخمیوں کی مرہم پٹی کرتے ‘ بیماروں کو دوا کھلاتے اور بھوکوں میں کھانا تقسیم کرتے تو آج پاکستان میں سیاستدانوں کا امیج اچھا ہوتا ‘اسی طرح اگر صدر آصف علی زرداری بھی مشکل کی اس گھڑی میں اپنے ووٹروں کے ساتھ کھڑے ہوتے ‘ بلاول زرداری بھٹو بھی لندن سے خیبر پختونخواہ ‘ پنجاب یا سندھ آجاتے اور لوگوں کی مدد کرتے تو قوم کا مورال کہاں سے کہاں پہنچ جاتا؟

آپ امریکا کے کیترینا اور ریٹا طوفان کو لے لیجئے ‘کیا ان طوفانوں میں پوری دنیا نے صدر بش کو پانی میں کھڑے اور لوگوں کی مدد کرتے نہیں دیکھا تھا ‘اگر امریکا کا صدر یہ کر سکتا ہے تو ہمارے صدر آصف علی زرداری ایسا کیوں نہیں کر سکتے ؟ کیا ہم امریکا اور ہمارے صدر ‘ بش سے بڑے ہیں اور کیا امریکا کا طوفان ہمارے سیلاب سے زیادہ سنگین تھا؟ نہیں تھا بس ہم ڈھٹائی ‘ بے حسی اور بے شرمی میں ان سے بہت آگے ہیں ‘بس ہم نے اپنے مسئلوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ‘عوام کے مسئلے اور حکمرانوں کے مسئلے۔ حکمران اپنے مسئلوں کے حل کیلئے ہر سطح ‘ہر لیول پر چلے جاتے ہیں جبکہ عوام بیماری کا شکار ہوں ‘ طوفانوں میں گھرے ہوں یا پھر سیلاب میں ڈوب رہے ہوں ‘ ہماری ’’رولنگ ایلیٹ ‘‘ کے پاس ان کیلئے وقت ہے اور نہ ہی توانائی چنانچہ ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن حقیقت یہ ہے جب قوم کو قیادت کی ضرورت ہے اس وقت اسلامی فلاحی ریاست کا سربراہ لندن میں بیٹھا ہے ‘اس رویے پر پوری دنیا ہم پر ہنس رہی ہے ‘ہم صدر صاحب کی ساری مجبوریاں مان لیتے ہیں لیکن صدر صاحب بھی ہماری ایک مان لیں ‘ یہ بھی تسلیم کر لیں انہوں نے آج لندن بیٹھ کر جمہوریت اور حکمرانی دونوں کا مذاق اڑایا ہے۔
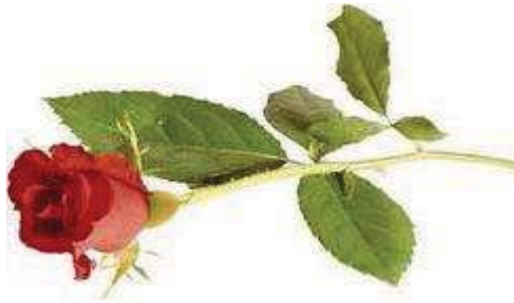
ایسو سی ایشن

مارگلہ کی پہاڑیوں سے اترتے ہوئے میں ایک چٹان کے قریب رک گیا' چٹان پر ابھی تک چیونگم چپکی ہوئی تھی' میں نے ناخن سے چیونگم کو کریدنے کی کوشش کی لیکن اس نے چٹان کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا' میں پتھر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا' مجھے پتھر کی رگوں میں تیرتا ہوا لمس محسوس ہونے لگا اور مجھے اس وقت معلوم ہوا انسان انسان کو بھول جاتا ہے لیکن یہ اس انسان سے وابستہ یادیں نہیں بھلا سکتا' یہ یادیں پتھر سے چپکی ہوئی چیونگم کی طرح ہوتی ہیں جو کبھی دماغ کی رگوں کا ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی چٹان ہوتی ہے اور اس چٹان پر یاد کی کوئی نہ کوئی چیونگم چپکی ہوتی ہے اور اس چیونگم کے ساتھ کسی نہ کسی ہاتھ کا لمس ہوتا ہے اور یہ لمس کئی سال تک پتھر کی یادداشت میں زندہ رہتا ہے' ہم انسان کو بھول جاتے ہیں لیکن اس کی مسکراہٹ اور اس کی آنکھیں ہماری یادداشت کے کسی نہ کسی صندوق میں پرانی رضائی' جہیز کی کسی چادر کی طرح ہمیشہ موجود رہتی ہیں اور ہم جب بھی وقت کے کسی موڑ' یاد کی کسی چٹان کے قریب سے گزرتے ہیں تو اس صندوق کا ڈھکن کھل جاتا ہے اور وہ چادر' وہ پرانی رضائی باہر نکل آتی ہے۔ یہ رضائی' یہ چادر ایسو سی ایشن ہوتی ہے اور انسانوں کی انسانوں سے ایسو سی ایشن کبھی نہیں مرتی' یہ شائد پرانی بھی نہیں ہوتی' یہ بھولی بھی نہیں جاسکتی اور شائد یہ ماضی کا حصہ بھی نہیں بن سکتی۔ انسان اسے ہر حال میں کیری کرتا ہے اور ہمارے حال کے ہر دن کی آنکھ اس ایسو سی ایشن کے صحن میں کھلتی ہے۔

اعجاز قادری میرا آرکی ٹیکٹ دوست ہے' یہ کوئٹہ میں ہوتا تھا' کوئٹہ کے حالات خراب ہوئے تو یہ فیملی کو لے کر اسلام آباد آ گیا' ہم ہفتے میں کئی بار ملتے ہیں اور ان ملاقاتوں میں اعجاز قادری کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی نیا رنگ میرے سامنے آ جاتا ہے' میں کل اس سے ملا تو مجھے اس کی ایک بات نے حیران کر دیا' اعجاز قادری نے مجھ سے کہا انسانی رشتوں میں سب سے بڑا رشتہ' سب سے گہرا تعلق ماں اور بیٹے کا ہوتا ہے' انسان آج تک اس رشتے کی گہرائی' اس کی وسعت اور رشتے میں موجود رنگوں کا اندازا نہیں لگا سکا لیکن جب بچہ ماں کے سامنے مر جاتا ہے' جب یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو ماں اس رشتے کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے' وہ اس تعلق کے انتقال کے بعد زندگی کو نئی شکل' نئی صورت میں قبول کر لیتی ہے اور یہ چیز ثابت کرتی ہے اگر ماں بچے کے بعد زندہ رہ سکتی ہے تو دنیا کا ہر انسان دوسرے انسان کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے۔ میں نے اس کے ساتھ اتفاق کیا لیکن پھر ہمارے سامنے اس سوال نے سر اٹھا لیا کہ انسان رشتے اور تعلق ٹوٹنے کے بعد اندر سے زخمی کیوں ہو جاتا ہے' یہ ڈپریشن' فرسٹریشن اور ذہنی خلجان کا شکار کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ بھی دنیا کا مہنگا ترین سوال ہے' انسان دو طرح کے رشتوں میں بندھا ہوتا ہے' خونی رشتے اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے رشتے۔ انسان کچھ رشتوں کے معاملے میں بے بس ہے' ہماری ماں کون ہو گی' ہمارا والد کون ہو گا اور ہمارے بہن بھائی اور بچے کون کون ہوں گے؟ ہم میں سے کوئی شخص اس کے بارے میں کچھ جانتا ہے اور نہ ہی ہم اس پر قادر ہیں لیکن ہماری بیوی کسے ہونا چاہئے یا ہمارا شوہر کون ہو گا یا پھر ہمیں کون سا شخص دوست کے روپ میں قابل قبول ہے ہم بڑی حد تک اس پر قدرت رکھتے ہیں اور ہم اپنا یہ اختیار زندگی میں استعمال بھی کرتے ہیں' ہم اپنے لئے رشتے بناتے ہیں۔ اب سوال دکھ کا پیدا ہوتا ہے'

ہمیں سب سے زیادہ دکھ اپنے بنائے ہوئے رشتے دیتے ہیں' دنیا میں شائد ہی چند لوگ ہوں گے جو اپنے والد' اپنی والدہ' اپنی بہن' اپنے بھائی اور اپنے بچے سے بچھڑنے کے بعد دیوداس بن گئے ہوں یا کسی نے اپنی بہن کی یاد میں تاج محل بنا دیا ہو یا پھر کسی نے اپنے بیٹے یا بیٹی کی یاد میں ہیر وارث شاہ لکھ دی ہو لیکن محبوبہ' بیوی یا دوست کی جدائی میں ہزاروں داستانیں بھی لکھی گئیں' تاج محل بھی بنے اور لوگ دیوداس بن کر گلیوں کی خاک بھی چھانتے رہے' دنیا میں صرف چند مثالیں ہوں گی جن میں کسی شخص نے اپنے بھائی' بہن' بچے یا والدین کی جدائی میں خود کشی کی ہو لیکن محبوبہ کی جدائی میں خود کشی کی خبریں ہم روز پڑھتے ہیں' یہ کیا ہے؟ یہ اپنے بنائے ہوئے رشتوں' اپنے گڑھے ہوئے تعلقات کی وہ چبھن ہے جو ننگے ہوئے بلیڈ' سوئی یا کانچ کے ٹکڑوں کی طرح انسان کو اندر سے کاٹتے ہیں اور انسان اس تکلیف سے بچنے کیلئے مجنوں' دیوداس یا پاگل بن کر گلیوں میں چکراتا پھرتا ہے' ماں اپنے بچے کے بغیر زندہ رہ لیتی ہے لیکن دیوداس دوستیاں اور محبتیں لوٹنے کے بعد سوکھے پتوں کی طرح بکھر جاتے ہیں ۔ میں اعجاز قادری کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا اور محبت کے اسرار ہم دونوں پر کھلتے چلے جا رہے تھے' ہم سوچ رہے تھے انسانوں کے جانے کے بعد پیچھے کیا رہ جاتا ہے اور پیچھے رہ جانے والی یہ چیز انسان کو آرام سے کیوں نہیں بیٹھنے دیتی؟ یہ چیز شائد ایسو سی ایشن ہوتی ہے' یہ پہاڑوں' سڑکوں' چوکوں اور گلیوں کے موڑوں پر چپکی ہوئی وہ چیونگم ہوتی ہے جو انسان کو حال اور مستقبل کی طرف نہیں بڑھنے دیتی' جو آگے جانے والے ہر راستے کی دیوار بن جاتی ہے اور انسان روز یہ دیوار توڑ کر آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ دیوار اسے آگے نہیں بڑھنے دیتی' انسان کی زندگی رک سی جاتی ہے اور یہ ایسو سی ایشن کا سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔

میں جب بھی سیلاب زدہ علاقوں کو دیکھتا ہوں' ہزاروں لاکھوں لوگوں کو کیمپوں میں پڑا ہوا دیکھتا ہوں' زندگی کو کشکول بن کر دوسروں کا راستہ دیکھتے دیکھتا ہوں تو دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور میں سوچتا ہوں یہ سیلاب تو گزر جائے گا' کناروں سے باہر نکلے دریا' بیراج' ڈیم اور نہریں واپس اپنے کناروں میں چلی جائیں گی' کیمپوں' سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر پڑے ہوئے لوگ بھی واپس لوٹ جائیں گے لیکن سیلاب سے وابستہ تلخ یادیں ہمیشہ ان لوگوں کے شعور میں گڑی رہیں گی۔ ان کے گھروں کی گری ہوئی دیواریں' ان کا پانی میں ڈوبا ہوا فرنیچر' ان کی بیٹیوں کا جہیز' ان کے بچوں کی کتابیں' ان کے کپڑے' رضائیاں اور گدے' ان کی اجڑی ہوئی دکانیں' ان کی فیکٹریاں اور ان کے گودام انہیں ہمیشہ تڑپاتے رہیں گے' ماؤں کے بچے مر جاتے ہیں' بچوں کے جسم قبر کے کیڑوں کا رزق بھی بن جاتے ہیں اور انسان ان قبروں کی نشانیاں بھی بھول جاتا ہے لیکن کیا ماں بیٹے کی یادیں بھی بھول جاتی ہے؟ کیا یہ بیٹے کی یادوں' بیٹے کی چیزوں سے وابستہ ایسو سی ایشن کو بھی بھلا دیتی ہے؟ نہیں ہر گز نہیں۔ انسان ایسو سی ایشن کا رشتہ نہیں توڑ سکتا' ماں جب بھی اپنے مرے ہوئے بیٹے کے ہم عمروں کو دیکھتی ہے' یہ اس کے سابق کلاس فیلوز کو کامیاب ہوتا' انہیں بڑا ہوتا' ان کی شادیاں ہوتے' بچے پیدا کرتے اور اپنی بیوی کے ساتھ قہقہے لگاتے دیکھتی ہے تو اس کا پورا ذہن بیٹے کی یادوں سے منور ہو جاتا ہے اور وہ سارا دن آنسو چھپا چھپا کر گزار دیتی ہے۔ اس کے اندر آتش فشاں پھٹتے ہیں اور وہ اس آتش فشاں کو آنسوؤں سے بجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ آپ تصور کیجئے سیلاب کے شکار دو کروڑ لوگوں کے ساتھ کیا کیا نہیں ہو گا؟ اور آنے والے دنوں میں گھر

سے [illegible] ان کی گرتی ہوئی دیواروں سے لے کر [illegible] اور [illegible] بھائیوں کی [illegible] تک ان کی زندگی کی کتنی ایسو سی ایشنز ہوں گی جو انہیں باقی زندگی تڑپاتی رہیں گی' یہ لوگ بارش' پانی اور دریاؤں کی آواز سے کس کس طرح تڑپیں گے' اس کا اندازا صرف ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو اس اذیت سے گزرا ہو۔ جس نے دیوار سے لے کر انسان تک ایسو سی ایشن کو بنتے اور ٹوٹتے دیکھا ہو۔

ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں' اللہ تعالٰی نے انسان کو بھولنے کی نعمت دے رکھی ہے لیکن ہم یاد کی ان چٹانوں کو نہیں بھول سکتے جن کے کناروں پر چیونگم کے نشان برسوں تک باقی رہتے ہیں' انسان انسان کو فراموش کر دیتا ہے' ہم سے جب کوئی شخص الگ ہوتا ہے تو ہم سب سے پہلے اس کی شکل بھولتے ہیں' ہمیں شروع میں اس کا چہرہ دھندلا دکھائی دیتا ہے' ہم پھر اس کے خدوخال بھولتے ہیں' ہم پھر آہستہ آہستہ اس کی آواز کو بھول جاتے ہیں' ہم پھر اس کی نرمی اور گرمی دونوں سے آزاد ہو جاتے ہیں اور آخر میں ہم اسے پورے کا پورا فراموش کر دیتے ہیں لیکن اس کی دو چیزیں ہمارے دماغ میں رہتی ہیں' اس کی آنکھیں اور اس کی مسکراہٹ۔ ہم جب بھی کسی دوسرے شخص کو اس کی طرح مسکراتے ہوئے دیکھتے ہیں یا پھر ہمیں کسی دوسرے شخص کی آنکھوں میں وہی مانوس چمک نظر آتی ہے تو ہماری میموری فوراً ری فریش ہو جاتی ہے اور ہمیں وہ بھولا ہوا شخص اپنی شخصیت کے تمام رنگوں کے ساتھ دوبارہ یاد آ جاتا ہے لیکن یہ آنکھیں اور یہ مسکراہٹ ہمیں یاد نہ بھی آئے تو بھی ایسو سی ایشن کی ہزاروں' لاکھوں ٹھوکریں ہماری زندگی میں باقی رہتی ہیں' ہم روز کسی نہ کسی چٹان کے پاس رک جاتے ہیں اور ناخن سے چیونگم کی لکیریں توڑنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں' گم ہوئے ہوئے' الگ ہوئے ہوئے اور مرے ہوئے لوگ اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنی خطرناک ان کی چیونگم' ان کی چٹانیں اور ان سے وابستہ ایسو سی ایشن ہوتی ہیں۔

کل ہو نہ ہو
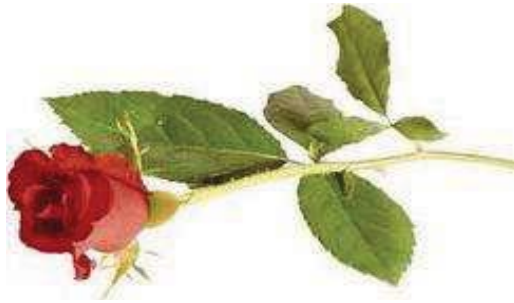
2010ء کا چودہ اگست عبدالباسط کی آخری خواہش کی تکمیل کا دن تھا' عبدالباسط پندرہ سال کا نوجوان ہے' یہ نوجوان بلڈ کینسر کا مریض ہے اور ڈاکٹروں نے اسے چند دنوں یا چند مہینوں کا مہمان ڈکلیئر کر دیا ہے' عبدالباسط کی آخری خواہش پاک فوج میں بھرتی ہونا تھی' کراچی کے چند درددل رکھنے والے خواتین و حضرات نے ''میک اے وش فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ادارہ بنا رکھا ہے' یہ ادارہ ایسے بچوں کی آخری خواہشیں پوری کرتا ہے جو موت کی دہلیز پر کھڑے ہیں اور ان کی زندگی کا سورج آہستہ آہستہ پگھل رہا ہے' یہ مریض بچے روز اپنی زندگی کے ایک دن کو کم ہوتا دیکھتے ہیں اور پھر اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کیا ہماری خواہشیں بھی ہمارے ساتھ ہی مٹی میں دفن ہو جائیں گی اور ان کے معصوم سوالوں کے جواب میں ان کی آنکھوں میں سیلاب آ جاتے ہیں' عبدالباسط فوج میں بھرتی ہونا چاہتا تھا' میک اے وش فاؤنڈیشن نے عبدالباسط کی آخری خواہش چیف آف آرمی سٹاف جنرل اشفاق پرویز کیانی تک پہنچائی اور آرمی چیف نے عبدالباسط کو ایک دن کیلئے فوج میں بھرتی کرنے کا حکم دے دیا یوں عبدالباسط کو چودہ اگست 2010ء کو فوجی وردی پہنائی گئی اور یہ ملیر کینٹ کراچی کی پنجاب رجمنٹ کی ایک یونٹ میں چلا گیا' عبدالباسط نے چودہ اگست کا پورا دن اس یونٹ میں گزارا اور اس طرح اس کی آخری خواہش پوری ہو گئی' اللہ تعالیٰ عبدالباسط کو صحت اور تندرستی دے لیکن آپ اس نوجوان کی بے بسی کا اندازہ کیجئے زندگی کس طرح مٹھی میں بند ریت کی طرح ذرہ ذرہ اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے اور یہ وقت کے ذروں کو اپنے قدموں میں گرتا ہوا محسوس کر رہا ہے' موت حقیقت ہے لیکن اس حقیقت کا شاندار پہلو اس کا خفیہ ہونا ہے' ہم سب نے مرجانا ہے مگر ہمیں اپنا آخری دن معلوم نہیں' یہ ناواقفیت کتنی بڑی نعمت ہے' یہ ہمیں عبدالباسط جیسے نوجوان ہی بتا سکتے ہیں جن کا ہر نیا سورج ان کی زندگی کا ایک دن کم کر دیتا ہے اور یہ لوگ روز زندگی کو اپنے تکیے کے نیچے ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تو یہ اپنی انگلیاں گننا شروع کر دیتے ہیں' ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہمیں عبدالباسط کی طرح اپنی موت کا دن معلوم نہیں چنانچہ ہم روز اپنی خواہشوں کے ساتھ کھیلتے ہیں' اپنی منصوبہ بندیوں کے ساتھ قہقہے لگاتے ہیں اور اپنی ادھوری چاہتوں کی پرچھائیوں پر سر رکھ کر سو جاتے ہیں لیکن عبدالباسط اور اس جیسے لوگ یہ نہیں کر سکتے' کیوں؟ کیونکہ انہیں اپنی موت کا دن معلوم ہے اور انسان کو جب موت کا دن معلوم ہو جائے تو پھر اس کی زندگی کی آنکھیں بجھ جاتی ہیں' یہ رنگوں کی تمیز بھول جاتا ہے اور اس کی نظر میں خوشی خوشی' قہقہہ قہقہہ اور خوشبو خوشبو نہیں رہتی' یہ ہر وقت قبرستان کی خاموشی ساتھ لے کر گھومتا ہے اور اسے اپنے بدن سے لوبان کی بو آنے لگتی ہے۔

ہم کیا ہیں؟ ہم نے کبھی سوچا؟ ہم پچھتاوا اور خوف ہیں' ہم ہمیشہ اپنے ماضی اور ماضی کی غلطیوں پر پچھتاتے رہتے ہیں' ہم نے اس وقت یہ کیوں کیا' ہم نے ایسا کیوں نہیں کیا' ہم اگر اس وقت یہ کر لیتے تو یوں نہ ہوتا اور ہم اگر یہ نہ کرتے تو آج یہ نہ ہوتا وغیرہ وغیرہ' ہم ہمیشہ یہ سوچتے رہتے ہیں اور یہ سوچتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ماضی وہ واحد چیز ہے جسے شاید قدرت بھی تبدیل نہیں کر سکتی' ہمارا گزرا ہوا کل ''کل'' تھا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اب تبدیل نہیں کر سکتی چنانچہ ٹوٹے ہوئے گلاس اور گزرے ہوئے کل کو یاد کرنا دنیا کی سب سے بڑی بے وقوفی ہوتی

ہے' ہم آنے والے کل کے خوف کا بھی شکار ہوتے ہیں' کل کیا ہو گا؟ میری اس حماقت کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ وہ حص کہیں مجھے دھوکا نہ دے دے' ملک کا کیا بنے گا؟ میری شادی چلتی رہے گی؟ یہ شخص میرے لئے کیسا ثابت ہو گا؟ گاڑی کو سکر یچ تو نہیں آ جائیں گے اور کیا میرا بچہ امتحان میں پاس ہو جائے گا؟ وغیرہ وغیرہ' ہم روز اس نوعیت کے ہزاروں خدشے لے کر بستر سے نکلتے ہیں اور رات کو انہیں دو سو سے ضرب دیتے ہیں' انہیں تکیے کے نیچے رکھتے ہیں اور کروٹ بدل بدل کر صبح کر دیتے ہیں اور ماضی کو درست کرنے اور مستقبل کے کھیت میں اندیشوں کے بیج بونے کے اس عمل کے دوران ہم اپنے حال کو بھول جاتے ہیں' ہم اس آج کو فراموش کر دیتے ہیں جو پورے رنگوں کے ساتھ ہاتھ باندھ کر ہمارے سامنے کھڑا ہے' جو ہمیں اپنی طرف بلا رہا ہے' ماضی اور مستقبل دونوں ہمارے نہیں ہوتے لیکن حال تتلی کی طرح بچے کی مٹھی میں ہوتا ہے مگر ہم ماضی اور مستقبل کی کشمکش میں اسے بھول جاتے ہیں چنانچہ ہمارے سارے زمانے' ہمارا ماضی' حال اور مستقبل بے رنگ اور پھیکا ہو جاتا ہے' ہم بدقسمتی سے زندگی بھر زندگی کو محسوس ہی نہیں کر پاتے' ہم کبھی کھل کر قہقہہ نہیں لگاتے' ہم کبھی ان لوگوں کو اپنی "فیلنگ" نہیں بتا پاتے جو روز اس کیلئے تیار ہو کر گھر سے نکلتے ہیں کہ ہم انہیں روک کر یہ بتائیں آپ پر سرخ رنگ بہت اچھا لگتا ہے اور آپ جب مسکراتے ہیں یا مسکراتی ہیں تو آپ کی آنکھوں کا رنگ بدل جاتا ہے اور آپ کی گردن کا تل آپ کی گفتگو کے دوران اپنی جگہ تبدیل کرتا رہتا ہے' بیٹا آپ میری جان ہو' مجھے آپ سے بہت محبت ہے' ابو جی میں جب تک آپ کو دیکھ نہ لوں مجھے چین نہیں آتا اور غفور تم میرے سب سے اچھے ملازم ہو وغیرہ وغیرہ' یہ وہ تمام کام ہیں جو ہمیں آج کرنے چاہئیں لیکن ہم انہیں ہمیشہ اس کل کی طرف دھکیل دیتے ہیں جس میں اندیشوں اور خوف کے کانٹوں کے سوا کچھ نہیں۔

میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا لوگ کہنے سے' اپنی بات کے اظہار سے کیوں ڈرتے ہیں' انہیں کیا خوف ہے' بابا آپ اپنی بات تو کرو' کیا قیامت آ جائے گی' اپنی خواہش کا اظہار تو کرو اس سے کیا طوفان آ جائے گا' میں آج تک یہ بھی نہیں سمجھ سکا لوگ کل کے خوف میں اپنا آج کا دن کیوں برباد کر دیتے ہیں' ہم آج کا دن تو اچھا گزار سکتے ہیں' روٹی کا وہ لقمہ جو ہمارے ہاتھ میں یا کافی کا وہ آخری گھونٹ جو مگ اور ہونٹوں کے درمیان ہمارا انتظار کر رہا ہے یا وہ قہقہہ جو ہمارے حلق میں پھڑ پھڑا رہا ہے یا وہ نوٹ جو ہماری جیب میں کڑ کڑا رہا ہے یا وہ سوٹ جسے ہم نے قیمتی سمجھ کر صندوق میں بند کر رکھا ہے یا وہ بری سلٹ جسے ہم صرف شادی بیاہ پر پہنتے ہیں یا پھر وہ گاڑی جسے ہم کبھی کبھی استعمال کرتے ہیں' ہم آج کے دن ان چیزوں کا لطف کیوں نہیں لیتے' ہم آج کے دن کسی کا ہاتھ پکڑ کر پارک میں دوڑ کیوں نہیں لگاتے اور ہم آج کے دن کوئی فلم' کوئی گیت' کوئی کتاب اور کوئی داستان کیوں نہیں پڑھتے' ہم نے فیض احمد فیض کی نظموں اور منٹو کے افسانوں کو کل کیلئے کیوں رکھ چھوڑا ہے' ہم آج کی بات آج ختم کیوں نہیں کرتے۔

آپ سیلاب ہی کو لے لیجئے' اس سیلاب میں دو کروڑ لوگوں کی خواہشیں ان کے سامان کے ساتھ بہہ گئی ہیں' ان لوگوں نے اپنے سارے خواب دیواروں کی درزوں میں چھپا کر رکھے ہوئے تھے' ان کا خیال تھا یہ کل آرام سے بیٹھ کر ان خوابوں کی گرہیں کھولیں گے اور پھر آج کی بوئی ہوئی فصلوں کو انجوائے کریں گے لیکن ہوا کیا؟ سیلاب

گیا اور ان کی ساری کو[illegible] ہیں اور سارے خواب تک بکھر گئے گیا اور یہ لوگ اب [illegible] میں پڑے ہیں اور اپنے
اپنے سامان کو یاد کر رہے ہیں کاش ان لوگوں نے اپنے ماضی کے ہر دن کو اپنا آخری دن سمجھ کر گزارا ہوتا تو آج یہ لوگ اس طرح پچھتا نہ رہے ہوتے' آیئے ہم سب لوگ عبدالباسط کی طرح آج کے دن کو اپنا آخری دن سمجھ لیں اور پھر اپنی ہر جائز خواہش پوری کر لیں کیونکہ ہو سکتا ہے کل ہو نہ ہو اور اگر کل ہوا بھی تو ہو سکتا ہے کل ہم نہ ہوں اور جب ہم نہیں ہوں گے تو ہماری خواہشیں' ہماری حسرتیں کہاں ہوں گی چنانچہ آیئے آج کے دن کو آخری سمجھ کر گزاریں بالکل عبدالباسط کی طرح' میک اے وش اور ٹرائی ٹو کمپلیٹ اٹ' ویٹس لائف کیونکہ اگر آج ہمارے پاس نہیں تو کل کبھی ہمارے پاس نہیں ہوگا۔

ایک دن جنوبی پنجاب میں
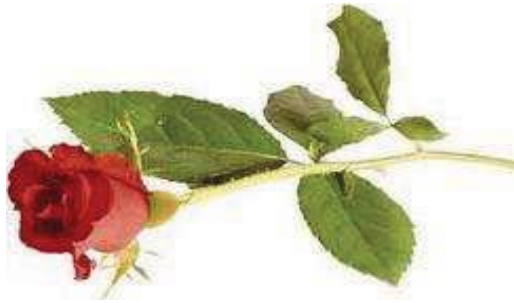
بھونگ شہر رحیم یار خان سے بیس منٹ کی مسافت پر ہے‘ ہم رحیم یار خان سے ہیلی کاپٹر پر بھونگ کیلئے نکلے‘ ہم زمین سے چند سو فٹ کی بلندی پر تھے‘ ہیلی کاپٹر میں انجنوں کا شور تھا اور ہوا ہمارے ساتھ گتھم گتھا تھی‘ آوازیں کانوں میں پہنچ کر منتشر ہو رہی تھیں اور یہ منتشر آوازیں کانوں کے اندر سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نیچے دیکھتے تھے‘ ایک لمبی سانس لیتے تھے اور دکھ سے کہتے تھے ”آپ تباہی دیکھیں‘ ان کھیتوں‘ ان ڈیروں‘ ان گھروں اور ان دیہات کو بحال کرنے کیلئے کتنے سال چاہئیں‘ ہم لوگ اس کا تصور تک نہیں کر سکتے ہیں“ میاں شہباز شریف کا کہنا تھا وہ سیلاب کے اگلے دن یہاں پہنچ گئے تھے‘ اس وقت بھونگ شہر پوری طرح پانی میں ڈوب چکا تھا‘ لوگ درختوں‘ ٹیلوں اور گھروں کی چھتوں پر پناہ گزین تھے‘ سڑکوں کے رابطے ختم ہو چکے تھے‘ بجلی اور ٹیلی فون بند تھے‘ مال مویشی پانی میں ڈوب کر مر چکے تھے اور لوگوں کا سارا سازوسامان پانی میں غرق ہو چکا تھا‘ بھونگ کی مشہور مسجد چھت تک پانی میں ڈوب چکی تھی اور اس لمحے یہ اور ان کی ٹیم نے کشتیوں‘ موٹر بوٹس اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے لوگوں کو خوراک‘ کپڑے‘ پانی اور خیمے پہنچانا شروع کئے‘ میاں شہباز شریف کا کہنا تھا ”میں نے زندگی میں اتنی بڑی تباہی نہیں دیکھی‘ یہ میری زندگی کے خوفناک ترین دن تھے اور میں اس وقت سوچتا تھا ہم لوگ اگر ان لوگوں کی مدد کیلئے آگے نہ بڑھتے تو یہ لوگ کیا کرتے‘ اس وقت ان کی کیا صورتحال ہوتی؟“ میاں صاحب کا کہنا تھا ”مجھے اس دوران اگر کسی سرکاری مصروفیت کی وجہ سے لاہور واپس جانا پڑتا تو میں وہاں ایک آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا تھا‘ مجھے لاہور کا آرام‘ سکون اور کمفر ٹیبل لائف ظلم محسوس ہوتی تھی اور میں بے چین ہو کر واپس جنوبی پنجاب آ جاتا تھا اور ان لوگوں کی مدد میں جت جاتا تھا“ میاں شہباز شریف کا کہنا تھا ”وہ ذاتی طور پر لوگوں کو ریسکیو بھی کرتے رہے اور ان تک خوراک بھی پہنچاتے رہے‘ اس دوران انہوں نے درجنوں مرتبہ دریائے سندھ اور دریائے چناب عبور کیا“ ان کا کہنا تھا ”میں اگر خود متاثرہ علاقوں تک نہ پہنچتا یا لوگوں کی اپنے ہاتھ سے مدد نہ کرتا تو میں کبھی اس تباہی اور متاثرہ لوگوں کی صورتحال کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا“ ان کا کہنا تھا ہمارے دوسرے صوبوں کے چیف ایگزیکٹوز‘ وفاقی حکومت اور پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کو بھی سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں خود جانا چاہئے‘ اس سے انہیں تباہی کا اندازہ بھی ہو گا اور یہ زیادہ جذبے سے لوگوں کی مدد بھی کریں گے“۔

ہم بھونگ شہر کا فضائی جائزہ لیتے ہوئے صادق آباد شہر میں اتر گئے‘ صادق آباد کی انتظامیہ نے وزیر اعلیٰ کے دورے کو ”کامیاب“ بنانے کیلئے ہیلی پیڈ کے قریب موجود کیمپ کا ”میک اپ“ کر رکھا تھا لیکن وزیر اعلیٰ نے گاڑی میں بیٹھتے ہی دوسرے کیمپ جانے کا اعلان کر دیا جس سے تمام لوگوں میں کھلبلی مچ گئی‘ ہم لوگ دوسرے کیمپ میں پہنچے تو لوگوں نے میاں شہباز شریف کو گھیر لیا اور میاں شہباز شریف زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیئے‘ مجھے شروع میں یہ تمام چیزیں مصنوعی محسوس ہوئیں اور مجھے یہ کیمپ اور اس کیمپ کے تمام لوگ انتظامیہ کا ”لائیو تھیٹر“ لگے لیکن جب مجھے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا‘ میں نے لوگوں سے انفرادی ملاقاتیں شروع کیں تو معلوم ہوا لوگ دل سے میاں شہباز شریف کی تعریف کر رہے ہیں اور ان کی روحوں سے ان کیلئے

دعائیں نکل رہی ہیں‘ کیمپ میں لوگوں کو کھانا بھی مل رہا تھا‘ کپڑے بھی‘ جیسے بھی اور دوائیں بھی۔ مجھے وہاں میکینکل تنور دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا‘ یہ تنور تمام کیمپوں میں لگائے گئے ہیں اور یہ ایک گھنٹے میں ایک ہزار روٹیاں تیار کر سکتے ہیں‘ ان سے جہاں وسائل کی بچت ہو رہی ہے وہاں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک روٹی بھی پہنچ رہی ہے‘ یہ کیمپ بھی ٹھیک ہیں‘ ان کا انتظام بھی اچھا ہے لیکن مجھے وہاں صفائی کا فقدان دکھائی دیا‘ خیموں میں ہزاروں مکھیاں تھیں‘ کیمپ میں گرد بھی اڑ رہی تھی اور میڈیکل کیمپ میں دوائیں بھی فرش پر پڑی تھیں اور ان پر بھی ہزاروں کی تعداد میں مکھیاں بیٹھی تھیں‘ سیکرٹری صحت خود علاقے میں موجود ہیں‘ یہ دن رات کام بھی کر رہے ہیں اور میں نے لوگوں کے منہ سے ان کی تعریف بھی سنی لیکن اس کے باوجود ہم مکھیوں کی یلغار سے پہلو نہیں بچا سکتے۔ مکھیوں کی وجہ سے کیمپوں میں متعدی امراض پھیلنے کا خدشہ ہے چنانچہ میاں صاحب اور سیکرٹری صحت کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے لیکن یہ وہ چھوٹا سا نقص پا سکتی ہے جس کی بنیاد پر ہم اگر اس ساری کوشش کو ”کھوہ کھاتے“ ڈال دیں تو یہ زیادتی ہوگی‘ سیلاب سے متاثرہ ایک کروڑ لوگوں کی روزانہ مدد کرنا‘ ان کیلئے کھانے‘ پینے اور دواؤں کا بندوبست کرنا واقعی مشکل کام ہے اور محدود وسائل میں یہ سب کچھ قابل تقلید بھی ہے اور قابل ستائش بھی۔ میں اگر ان انتظامات پر بیوروکریسی کو داد نہ دوں تو یہ بھی ظلم ہوگا‘ مجھے سیکرٹری لیول کے لوگ جاگرز‘ شرٹس اور ٹروزر میں فیلڈ میں کام کرتے دکھائی دیئے‘ مجھے وہاں آئی جی پنجاب بھی ملے‘ میاں شہباز شریف نے بتایا ”میں نے ان سے درخواست کی ہے یہ حالات ٹھیک ہونے تک جنوبی پنجاب میں رہیں‘ یہ یہاں چوری چکاری کی وارداتوں کا تدارک بھی کر رہے ہیں اور پٹرول اور اشیائے صرف کی قیمتیں بھی کنٹرول کر رہے ہیں“ میں نے لوگوں کو بھی بیوروکریسی کو سراہتے ہوئے دیکھا‘ یہ چیز ثابت کرتی ہے آپ اگر اپنے گھروں‘ اے سی والے ٹھنڈے دفتروں اور پرفیوم‌ڈ لائف سے باہر نکل کر عام لوگوں کی مدد کریں تو لوگ نہ صرف آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں بلکہ آپ پر ”واری واری“ بھی ہو جاتے ہیں۔

ہم صادق آباد سے مظفر گڑھ آئے‘ ہم نے راستے میں محمود کوٹ کے دیہات میں خورونوش کی اشیاء بھی پھینکیں جنہیں حاصل کرنے بلکہ لوٹنے کیلئے لوگ جس طرح گھروں سے نکلے یہ ایک عبرت ناک منظر تھا اور یہ منظر دیکھتے ہوئے میں‘ میاں صاحب اور ہمارا پروڈیوسر امان اللہ دیر تک اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتے رہے۔ میاں صاحب کا کہنا تھا یہ قرآن مجید کی اس آیت کی عملی تشریح ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا‘ دنیا کا مال دنیا ہی میں رہ جاتا ہے‘ یہ لوگ کل تک انتہائی خوشحال تھے لیکن آج یہ خوراک کے ایک تھیلے کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہیں‘ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ معاف کرے۔ مجھے اس وزٹ کے دوران کسی ائرپورٹ اور کسی ہیلی پیڈ پر پروٹوکول کیلئے کوئی ڈی سی او اور کوئی ڈی پی او دکھائی نہیں دیا‘ میں نے میاں صاحب سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے مسکرا کر جواب دیا ”میں نے جنوبی پنجاب کی ساری انتظامیہ کو حکم دے رکھا ہے یہ اپنے اپنے علاقے میں کام کریں اور جو افسر اپنا کام چھوڑ کر میرے استقبال کیلئے آیا وہ اپنے آپ کو معطل سمجھے“۔ ہم آخر میں مظفر گڑھ میں چوک سرور شہید پہنچے‘ یہاں ایک بہت بڑا امدادی کیمپ قائم تھا‘ لوگ راستے میں میاں شہباز شریف کیلئے تالیاں بجا رہے تھے اور زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے‘ مجھے لوگوں کے چہروں پر خوشی دکھائی دے رہے تھے‘ میاں شہباز شریف ... [illegible]

کی میاں شہباز شریف نے لوگوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر بتایا "میں اگر ان لوگوں کی مدد کے لیے بروقت یہاں نہ آتا تو یہ لوگ آج میری گاڑی پر پتھراؤ کر رہے ہوتے' میں آج اگر ان لوگوں کے درمیان بے خوف و خطر کھڑا ہوں تو اس کی واحد وجہ ان کا مجھ پر اعتماد ہے اور میں نے یہ اعتماد انہیں اور ان کے بچوں کو کھڑے پانی سے نکال کر حاصل کیا ہے"۔ میں رات کو جنوبی پنجاب سے واپس آ گیا' میرے سمیت پاکستان کے بے شمار لوگوں کو میاں شہباز شریف سے نظریاتی اور سیاسی اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن جہاں تک اس بحران کا تعلق ہے ہمیں یہ ماننا پڑے گا یہ واحد وزیر اعلیٰ ہیں جنہوں نے اب تک سیلاب زدگان کو سب سے زیادہ وقت دیا' میری خواہش ہے دوسرے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ' صدر' وزیر اعظم اور وفاقی وزراء بھی اسی سپرٹ کے ساتھ کام کریں' یہ لوگ بھی اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کو پانی سے نکالیں' انہیں خوراک اور ادویات پہنچائیں اور لوگوں کے گھروں کی بحالی میں اپنے ہاتھ سے کام کریں۔ مجھے یقین ہے ان لوگوں کی اس خدمت سے ملک میں سیاستدانوں کا وقار بھی بحال ہو گا اور حکومت کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہو گا۔

آپ یقین کیجئے تباہی ہمارے خیال سے بھی کہیں زیادہ ہے اور ہم نے اگر اس تباہی کو تعمیر میں تبدیل نہ کیا تو یہ دو کروڑ متاثرین شہروں کا رخ کر لیں گے اور یوں پورا ملک انارکی کے نا ختم ہونے والے جہنم میں جا گرے گا۔ ہم اگر اس ملک کو بچانا چاہتے ہیں اور اپنی خوش حال اور مطمئن زندگی کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان لوگوں کا ہاتھ تھامنا ہو گا ورنہ دوسری صورت میں یہ لوگ ہمارے ہاتھ کھینچ لیں گے۔
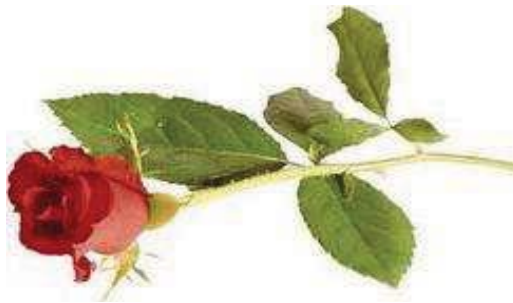
کوئی رشتہ تو موجود ہے

ابن انشاء پاکستان کے مشہور شاعر' ادیب اور کالم نگار تھے' انشاء جی کی بے شمار نظمیں پاکستانی ادب میں خون کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان نظموں کے بارے میں کہا جاتا ہے جب تک اردو ادب سانس لیتا رہے گا اس وقت تک یہ نظمیں بھی زندہ رہیں گی "انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو" ابن انشاء اور استاد امانت علی خان کا ایک ایسا شہکار ہے جو سننے والوں کے دل پر دستک دیتا ہے اور یہ دل بعد از اں آنکھوں سے ابل ابل کر باہر گرتا ہے' انشاء جی کی تخلیق "اردو کی پہلی کتاب" بھی ماسٹر پیس ہے اور ان کے کالم ایک وقت میں پاکستان کے ہر پڑھے لکھے شخص کی ادبی' صحافتی اور روحانی خوراک ہوتے ہیں اور لوگ صبح اٹھتے ہی دوسرے لوگوں کو فون کر کے پوچھتے تھے "تم نے انشاء جی کا آج کا کالم پڑھا" غرض ابن انشاء ایک ایسے تخلیق کار تھے جن کے ذکر کے بغیر شاعری مکمل ہوتی ہے' سفر نامہ مکمل ہوتا ہے' ادب مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی موسیقی' یہ پاکستانی ادب میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو قمیص میں دامن کو حاصل ہے آپ جس طرح دامن کے بغیر قمیض کو مکمل نہیں سمجھتے بالکل اسی طرح ابن انشاء کے بغیر اردو ادب کو بھی اردو ادب نہیں کہا جا سکتا' یہ ابن انشاء پاکستان کے شروع کے دنوں میں قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کی سربراہی میں بننے والے ایک ادارے میں ملازم تھے اور ممتاز مفتی اور احمد بشیر ان کے کولیگ تھے' اس دور میں ابن انشاء کراچی کی کسی خاتون کے عشق میں مبتلا ہو گئے' یہ خاتون شادی شدہ بھی تھی' بدصورت بھی تھی اور چالاک بھی اور یہ ابن انشاء کو جی بھر کر لوٹ رہی تھی' ممتاز مفتی اور احمد بشیر ابن انشاء کو سمجھاتے رہتے تھے' یہ کہتے تھے یہ عورت چالاک ہے' یہ فراڈ ہے اور یہ تمہیں بے وقوف بنا رہی ہے وغیرہ وغیرہ' ابن انشاء ان دونوں کا وعظ بڑی توجہ سے سنتے تھے اور یہ لوگ جب سمجھا سمجھا کر تھک جاتے تھے تو ابن انشاء شرارتی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے تھے اور مسکرا کر جواب دیتے تھے "دھوکہ ہی سہی لیکن اس کا میرے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ تو ہے"۔

ابن انشاء کے کہنے کا مطلب تھا انسانوں کا انسانوں کے ساتھ رشتہ قائم رہنا چاہیے خواہ یہ رشتہ دھوکے پر ہی مبنی کیوں نہ ہو' یہ بات بظاہر شاعرانہ نظر آتی ہے لیکن ہم اگر اس کی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو زندگی کی ایک نئی ڈائی مینشن ہمارے سامنے آتی ہے' ریلیشن اینڈ نو ریلیشن کی چوائس میں ریلیشن بہرحال نو ریلیشن سے بہتر ہوتا ہے خواہ یہ ریلیشن دھوکے پر ہی مبنی کیوں نہ ہو' خواہ اس کی بنیاد ہمدردی ہی کیوں نہ ہو یا پھر یہ اداکاری ہی کیوں نہ ہو یہ ہر حال میں بے حسی سے بہتر ہوتا ہے' آپ زندگی کی اس ڈائی مینشن کو سیلاب کی مجموعی صورتحال میں رکھ کر دیکھئے' پاکستان میں جولائی 2010ء کے آخری ہفتے میں انتہائی خوفناک سیلاب آیا' یہ سو سال کی تاریخ کا سب سے بڑا سیلاب تھا اور اس نے کالام سے لے کر جیکب آباد تک ملک کے ایک چوتھائی رقبے پر تباہی پھیلا دی' دو کروڑ لوگ سماجی زندگی سے محروم ہو گئے' لاکھوں مکان' دکانیں' فیکٹریاں' شاپنگ سنٹر' سڑکیں' پل اور گودام ڈوب گئے' صرف پنجاب میں 25 لاکھ ایکڑ پر کھڑی فصلیں تباہ ہو گئیں' یہ تاریخ کی بدترین انسانی تباہی تھی' اقوام متحدہ کے اپنے اعداد و شمار کے مطابق یہ ہیٹی کے زلزلے اور جنوب مشرقی ساحلوں پر آنے والے سونامی سے بڑی آفت تھا' سیلاب کے بعد حکومتی سطح پر دو قسم کے رویے سامنے آئے' ایک میڈیا نے حکومت کو سیلاب کی تباہی

کے بارے میں بتانا شروع کیا سیلن وفاقی حکومت میڈیا کو جانبدار سمجھتی ہے چنانچہ اس نے شروع میں سیلاب کی کوریج کو "میڈیا سٹنٹ" قرار دے دیا' صدر آصف علی زرداری پیرس تشریف لے گئے' وزیراعظم یوسف رضا گیلانی حسب عادت سوٹ پہن کر ملاقاتیوں کے ساتھ تصویریں بنواتے رہے اور وفاقی وزراء سیاسی بیانات جاری کرتے رہے لیکن جب حکومت کے "مہربان" صحافی بھی کلمہ حق پر مجبور ہوگئے تو حکومت نے اس ایشو کی طرف ذرا ذرا سی توجہ دینا شروع کر دی' اس دوران جب سیلاب پہاڑوں سے ہوتا ہوا وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے حلقے ملتان کی طرف بڑھنے لگا تو وزیراعظم کو اس کی سنگینی کا اندازہ ہوا' یہ بھاگ کر ملتان پہنچے اور انہوں نے ملتان کو سیلاب کی رخصتی تک "وزیراعظم سیکرٹریٹ" ڈکلیئر کر دیا' وزیراعظم کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے وفاقی وزراء بھی بھاگ کھڑے ہوئے' اس دوران صدر پیرس سے لندن تشریف لے گئے اور یہ وہاں پانچ دن تک برطانیہ کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی خدمات کا احساس دلاتے رہے' اس دوران سیلاب نے سندھ کا رخ کر لیا اور یہاں سے صدر صاحب کو بھی سنگینی کا احساس ہونے لگا لیکن بعدازاں یہ عالمی مسائل کے حل کیلئے روس تشریف لے گئے۔ دو سیلاب کے دوران کچھ شخصیات اور کچھ اداروں نے سنجیدگی' درد دل اور احساس کا اظہار کیا' ان اداروں میں ایدھی فاؤنڈیشن سے لے کر الخدمت فاؤنڈیشن' شہزاد رائے اور ابرار الحق کے ٹرسٹ سے لے کر ملک کی بے شمار گمنام اور چھوٹی چھوٹی آرگنائزیشن شامل ہیں' ان میں ملک کے وہ مخیّر حضرات بھی موجود ہیں جنہوں نے پہلے دن سے اپنے دل اور تجوریوں کے دروازے کھول دیئے تھے' یہ لوگ روزانہ خوراک' کپڑوں اور خیموں کے ٹرک بھر کر متاثرہ علاقوں میں بھجوا رہے ہیں' ہم اس معاملے میں وزیراعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کی خدمات کا اعتراف کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے' میاں شہباز شریف پندرہ دن تک جنوبی پنجاب کے متاثرہ علاقوں میں رہے' انہوں نے کشتیوں میں بھی سفر کیا' یہ ٹریکٹر اور ٹرالی میں بھی بیٹھے' انہوں نے کھوتا ریڑھی پر بھی سفر کیا اور یہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر بھی متاثرین تک پہنچے' ہم اس سلسلے میں سید خورشید شاہ' اعجاز جاکھرانی اور فیصل کریم کنڈی کا ذکر بھی کریں گے' سید خورشید شاہ سکھر' اعجاز جاکھرانی جیکب آباد اور فیصل کریم کنڈی نے ڈیرہ اسماعیل خان میں جی جان سے کام کیا' یہ تینوں حضرات اپنے اپنے علاقوں میں موجود ہیں اور اپنے ہاتھوں سے متاثرین کی مدد کر رہے ہیں' یہ لوگ کیمپ بھی چلا رہے ہیں اور مخیّر حضرات کو متاثرین کی مدد کیلئے بھی ابھار رہے ہیں' فیصل کریم کنڈی اس وقت ڈیرہ اسماعیل خان میں موجود ہیں جبکہ اس ڈویژن کے اصل سیاسی وارث مولانا فضل الرحمٰن عمرے پر تشریف لے گئے ہیں' ہم سیلاب میں جماعت اسلامی اور تحریک انصاف کے کردار کو بھی فراموش نہیں کر سکتے' کراچی کے سابق ناظم نعمت اللہ اسی سال کی عمر میں پورے ملک کا دورہ کر رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے ریسکیو ورک میں مصروف ہیں' عمران خان سیلاب کے دوران ملک سے باہر تھے' یہ 12 اگست کو واپس لوٹے لیکن انہوں نے آتے ہی کام شروع کر دیا' یہ بھی اب فیلڈ میں نظر آ رہے ہیں' یہ تمام لوگ جی جان سے متاثرین کی مدد کر رہے ہیں لیکن وفاقی حکومت کے چند بڑے ان لوگوں کو سیاسی اداکار اور ان کی کوششوں کو سیاسی اداکاری قرار دے رہے ہیں' وفاقی حکومت کے یہ بڑے میڈیا کی کوششوں پر بھی ناراض ہیں' ان کا خیال ہے میڈیا سیلاب زدگان کی صورتحال کو بار بار دکھا کر ملک میں انارکی پھیلانا چاہتا ہے اور یہ پاکستان پیپلز پارٹی کی

[illegible]

[illegible]ت کو بدنام کرنے کے [illegible] ایجنڈے کا حصہ ہے یہ لوگ اس فوج کی [illegible] کو بھی [illegible] ضرورت قرار دے رہے ہیں جس نے اس سیلاب کے دوران سب سے زیادہ ریسکیو ورک کیا' جس کے جوان ان ان علاقوں تک پہنچے جہاں صرف پانی اور ہوا پہنچ سکتی تھی اور یہ وہاں پھنسے ہزاروں لوگوں کو بحفاظت واپس نکال لائے' حکومت کے بڑے اس سیاسی اداکاری کو جمہوریت کے خلاف سازش قرار دے رہے ہیں۔ ہم ایک لمحے کیلئے ان لوگوں کی ان کوششوں کو سیاسی اداکاری اور ان لوگوں کو سیاسی اداکار تسلیم کر لیتے ہیں' ہم مان لیتے ہیں یہ سب ڈرامہ ہے اور میاں شہباز شریف سے لے کر سید خورشید شاہ تک سب لوگ دل سے متاثرین کی مدد نہیں کر رہے' یہ لوگ محض فوٹو سیشن کر رہے ہیں اور مستقبل کے الیکشن کیلئے راہ ہموار کر رہے ہیں' ہم یہ بھی مان لیتے ہیں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی جعلی کیمپوں کے ذریعے متاثرین کی مدد کر رہے ہیں اور صدر پیرس' لندن اور روس میں دو کروڑ متاثرین کا روشن مستقبل تلاش کر رہے ہیں۔

ہم یہ بھی مان لیتے ہیں وزیر اطلاعات قمر زمان کائرہ ہر دس منٹ بعد ایک بیان جاری کر کے سیلاب سے متاثرین کی مدد فرما رہے ہیں اور یہ بیانات آگے چل کر ان متاثرین کی قسمت بدل دیں گے اور ہم یہ بھی مان لیتے ہیں ہماری رولنگ ایلیٹ افطار ڈنر کے دوران متاثرین کی حالت زار پر جو سیر حاصل گفتگو کرتی ہے یہ ہی اصل سیاست ہے اور یہ سیاست آگے چل کر ملک کو بہت فائدہ پہنچائے گی لیکن ہمیں اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا متاثرین کو فائدہ بہر حال سیاسی اداکاروں کی سیاسی اداکاری سے ہی ہو رہا ہے' متاثرین کو اگر پانی کے دو گھونٹ' روٹی کے تین نوالے' درد کی تین چار گولیاں' ایک آدھ خیمہ اور تن کے دو کپڑے مل رہے ہیں تو یہ انہیں سیاسی اداکاروں کی مہربانی ہے بصورت دیگر ''اصل سیاستدان'' یعنی صدر صاحب روس میں ہیں اور وزیراعظم اسلام آباد کے خوشبودار ماحول میں بیٹھے ہیں چنانچہ یہ اداکاری ہی سہی لیکن اس سیاسی اداکاروں کا متاثرین کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ تو قائم ہے' ان کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا ریل شپ' کوئی نہ کوئی ایسا تعلق تو ہے جس سے انہیں فوٹو س سیشن کے بعد ہی سہی لیکن روٹی تو مل جاتی ہے اور روٹی آفت کے شکار لوگوں کیلئے کتنی قیمتی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک پانی زندگی کی گردن تک نہیں پہنچ جاتا اور موت انسان سے دو انچ کے فاصلے پر آ کر نہیں رک جاتی۔ کاش اس ملک کے تمام ''اصلی سیاستدان'' چند ماہ کیلئے سیاسی اداکار بن جائیں۔

شرم ہی تو نہیں آتی
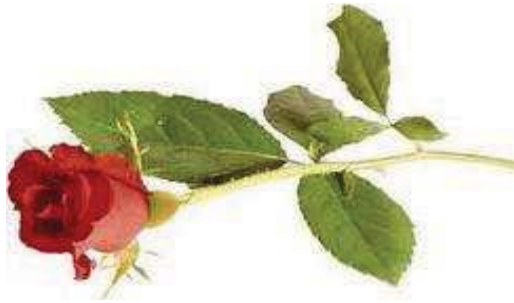
جنرل صاحب اداس تھے اور میں اس اداسی کو ملک کے مجموعی حالات کا نتیجہ سمجھ رہا تھا' ملک کا چوتھائی حصہ سیلاب میں ڈوب چکا ہے' دو کروڑ لوگ بے گھر ہو کر کیمپوں میں پڑے ہیں' گیسٹرو' جلدی امراض اور ملیریا پھیل رہا ہے' سڑکیں' پل' ریلوے لائنیں اور بند ٹوٹ چکے ہیں' کالام سے ٹھٹھہ تک ہزاروں دیہات' قصبے اور شہر پانی میں غرق ہیں' ہم ٹیلی ویژن آن کرتے ہیں تو سکرین پر لوگوں کو خوراک کیلئے ایک دوسرے پر جھپٹتے' ایک دوسرے کے گریبان پھاڑتے اور ایک دوسرے کو دھکے اور ٹھڈے مارتے دیکھتے ہیں' حکومت اور حکومت کی رٹ ختم ہو چکی ہے' شہروں میں مافیاز کی حکمرانی ہے' مضبوط شخص دریاؤں' نہروں اور بیراجوں کے بند تک توڑ دیتا ہے جبکہ مظلوم کے پاس پاؤں پکڑنے' دہائیاں دینے اور منتیں کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا' کراچی میں ہر دو تین ہفتے بعد قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے' پٹرول پمپ جلا دیئے جاتے ہیں' گاڑیوں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور شاپنگ سنٹرز اور دکانیں لوٹ لی جاتی ہیں' آج ہی پاکستان کے خفیہ اداروں نے کراچی میں خانہ جنگی کے خدشات پر رپورٹ ایوان صدر بھجوائی' جس میں واضح الفاظ میں وارننگ دی گئی ہے اگر کراچی کے حالات پر سنجیدگی نہ دکھائی گئی تو کراچی میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور یوں یہ شہر قبرستان بن جائے گا۔ مہنگائی کنٹرول سے باہر ہو چکی ہے' بجلی موجود نہیں لیکن بجلی کے بلوں میں اضافہ ہو رہا ہے' لوگ کھانے پینے کی اشیاء کا سٹاک کر رہے ہیں' ملک میں ٹماٹر اور کھیرے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے کلو مل رہے ہیں اور ان برے حالات میں سیالکوٹ کا واقعہ' چند لوگوں نے دو نوجوانوں کو درجنوں لوگوں کے سامنے سڑک پر لٹا کر ڈنڈے مار مار کر مار دیا اور پولیس چپ چاپ تماشا دیکھتی رہی' اس درندگی کی فلم سارا دن ٹیلی ویژن چینلز پر چلتی رہی اور یوٹیوب کے ذریعے دنیا کے کروڑوں لوگوں نے یہ مناظر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے' ان تمام حالات نے پورے ملک کو اداس کر رکھا ہے' ہم سب کی نفسیات تبدیل ہو رہی ہے' ہم اداسی کے گہرے کنوئیں میں اتر رہے ہیں' غم' تاسف اور دکھ ہمارے ایک ایک ٹشو' ایک ایک سیل کا حصہ بن رہا ہے' ہمارا معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو رہا ہے' ہم میں سے کچھ لوگ غم کی چلتی پھرتی تصویر بن چکے ہیں اور باقی بڑی تیزی سے بے حس ہو رہے ہیں' یہ دوسرے لوگ یورپ کی اس زندگی کی طرف بڑھ رہے ہیں جسے یورپ کے لوگوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران "اڈاپٹ" کیا تھا' جنگ نے عام لوگوں کے دماغ کو اس قدر متاثر کر دیا تھا کہ یہ لوگ نعشوں کے درمیان کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے تھے' تمام شہروں میں بڑے بڑے کلب بن گئے تھے اور لوگ ساری ساری رات شراب پی کر رقص کرتے رہتے تھے' یورپ میں برہنہ مساج سینٹرز' ایف کے کے کلب (جس میں داخل ہونے کیلئے ننگا ہونا ضروری ہوتا ہے) اور سٹرپ ٹیس ڈانس جیسی غلاظت بھی اسی دور میں شروع ہوئی تھی' دوسری جنگ عظیم کے دوران آدھے لوگ سانس لیتی قبروں کی شکل اختیار کر گئے تھے اور باقی جنسی بے راہ روی' نشے' رقص اور ہپی ازم میں غرق ہو گئے تھے' ہماری ملکی صورتحال نے بھی اسی فیصد لوگوں کو اداس کر رکھا ہے جبکہ باقی بیس فیصد لوگ زندگی کو بے راہ راوی میں تلاش کر رہے ہیں' یہ مصنوعی قہقہے لگا کر' ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اور شراب' چرس اور ہیروئن پی کر خود کو حالات سے الگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں جنرل صاحب کی اداسی کو بھی اسی صورتحال کا

نتیجہ سمجھ رہا تھا۔

میں نے جنرل صاحب کی طرف دیکھا‘وہ سوپ کا تیسرا پیالہ پی رہے تھے‘معاشرے میں جب عدم تحفظ بڑھتا ہے تو اس کی تین چیزوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔لوگ بلاوجہ ہنسنا شروع کر دیتے ہیں‘جنسی تعلقات بے راہ روی کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں اور لوگ بے تحاشا کھاتے ہیں لہٰذا میں نے جنرل صاحب کے تیسرے پیالے کو معاشرتی عدم تحفظ کے کھاتے میں ڈال دیا لیکن جنرل صاحب نے جب اداسی کی وجہ بیان کی تو میں حیران رہ گیا۔ جنرل صاحب بنگلہ دیش کی وجہ سے پریشان تھے‘جنرل صاحب کا کہنا تھا ”بنگلہ دیش نے بھی پاکستان کے سیلاب متاثرین کیلئے امداد میں اضافہ کر دیا ہے‘بنگلہ دیش کی حکومت نے 20لاکھ ڈالر کے خیمے‘کمبل‘پانی صاف کرنے کے پلانٹ‘خشک خوراک اور ادویات پاکستان بھجوائی ہیں جبکہ طبی ماہرین کی ایک خصوصی ٹیم سیلاب زدگان کو وبائی امراض سے بچانے کیلئے عنقریب پاکستان آ رہی ہے اور یہ ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے“ جنرل صاحب نے اس کے ساتھ ہی چوتھے پیالے کا آرڈر دے دیا۔ جنرل صاحب ریٹائر آرمی آفیسر ہیں اور انہیں 1968ء سے 1971ء تک مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں کام کرنے کا موقع ملا‘یہ اس سارے خطے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ جنرل صاحب نے بتایا ”مغربی پاکستان کے لوگ‘سیاستدان اور بیوروکریٹس مشرقی پاکستان کو بوجھ سمجھتے تھے‘ان کا خیال تھا یہ چھ کروڑ بھوکے ننگے لوگ ہیں جنہیں نہانے کی تمیز ہے اور نہ ہی کپڑے پہننے کی‘یہ ٹوائلٹ تک نہیں جاتے اور ان کے جسم سے مچھلی کی بو آتی ہے‘مشرقی پاکستان میں چھ ماہ سیلاب آتے ہیں اور ہم لوگ انہیں سیلاب سے نکال نکال کر تھک جاتے ہیں‘ہم انہیں ساڑھے چار فٹ کے بونے بھی کہتے تھے‘ ہم انہیں پولیس اور فوج میں بھی بھرتی نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کا قد اور چھاتی کا سائز کم ہوتا تھا اور یہ انڈر ویٹ بھی تھے چنانچہ 1971ء تک فوج میں سب سے بڑے بنگالی افسر کے پاس کرنل کا رینک تھا“ جنرل صاحب نے لمبا سانس لیا اور بولے ”یہ حقیقت ہے جب مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے الگ ہوا تو ہماری بیوروکریٹس‘ سیاستدانوں‘جاگیرداروں‘صنعت کاروں اور سرمایہ داروں نے خوشیاں منائی تھیں‘ان کا خیال تھا ان کی جان چھوٹ گئی ہے لیکن آج۔۔۔۔!“ جنرل صاحب نے ایک لمبا سانس لیا اور بولے ”لیکن آج ہم سیلاب میں گھرے ہوئے ہیں اور وہ بنگلہ دیش ہمیں امداد دے رہا ہے جسے ہم نے سیلابوں کی سرزمین سمجھ کر اپنے آپ سے کاٹ کر الگ کر دیا تھا‘افسوس کا مقام ہے‘بنگلہ دیش کے ساتھ ساتھ آپ بھارت کی مثال بھی لے لیجئے‘ہم قحط کے دنوں میں بھارت سے دالیں‘اناج اور سبزیاں تک خریدنے کیلئے تیار نہیں ہوتے تھے‘آج سے پانچ چھ سال پہلے بھارت سے گندم منگوانے کی بات شروع ہوئی تو پاکستان میں لوگوں نے جلوس نکال دیئے تھے‘ہم انڈیا سے ململ تک امپورٹ کرنے کے خلاف تھے لیکن آج بھارت نے ہمیں سیلاب زدگان کیلئے 50لاکھ ڈالر امداد دی اور ہم نے یہ امداد بخوشی قبول کر لی‘کیوں؟ ہماری پالیسی میں اتنی بڑی شفٹ کیسے آ گئی؟ ہم سماجی‘اخلاقی‘سفارتی اور سیاسی لحاظ سے اتنے ڈاؤن کیوں ہو رہے ہیں؟ میں جب بھی یہ سوچتا ہوں تو میں اداس ہو جاتا ہوں“ جنرل صاحب نے لمبی سانس لی‘سوپ کے پیالے پر جھکے اور شڑاپ شڑاپ سوپ پینا شروع کر دیا۔

میں جنرل صاحب کی اداسی کی وجہ جان گیا‘ہم واقعی چٹان سے نیچے کی طرف پھسل رہے ہیں‘دنیا کی کوئی قوم

اور سکون کے کچھ اصول ‘کچھ ضابطے طے کر رکھے ہیں، جوانسان اور جو قوم ان ضابطوں ‘ان اصولوں پر عمل کرتی ہے وہ کامیاب ہو جاتی ہے اور جو خلاف ورزی کرتی ہے وہ تباہ ہو جاتی ہے ۔ خواہ یہ کتنی ہی عبادت گزار اور مذہبی کیوں نہ ہو مثلاً جس قوم میں میرٹ نہ ہو‘ جو قوم اپنے بہترین لوگوں کو اپنا لیڈر منتخب نہ کرتی ہو‘ جس میں انصاف نہ ہو‘ جو وقت کی پابند نہ ہو‘ جس میں کام کا جذبہ نہ ہو اور جو تمام انسانوں کو برابری کا حق نہ دیتی ہو وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی خواہ یہ پٹرول کے سمندر اور ہیروں کے پہاڑ پر ہی کیوں نہ بیٹھی ہو اور کوئی انسان اس وقت تک اچھی‘ شاندار اور پر سکون زندگی نہیں گزار سکتا جب تک یہ وقت کی پابندی نہ کرے‘ یہ اپنے دل اور دماغ کی کھڑکیاں نہ کھولے‘ یہ جذبات کو عقل پر حاوی نہ ہونے دے‘ یہ آندھی ہو یا طوفان روزانہ اپنے معمول کے مطابق کام نہ کرے‘ اس میں تسلسل نہ ہو‘ یہ روز نئی چیزیں‘ نئی باتیں نہ سیکھے‘ اس میں عاجزی نہ ہو اور یہ اللہ سے نہ ڈرے‘ یہ وہ سیدھے سادھے اصول ہیں جو کامیابی اور ناکامی کا تعین کرتے ہیں اور ہم انفرادی اور قومی سطح پر روزان اصولوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ہم ترقی کیوں نہیں کر رہے‘ ہم آگے کیوں نہیں بڑھ رہے‘ آپ دیکھ لیجئے بنگلہ دیش جب تک مشرقی پاکستان تھا یہ اس وقت سیلاب میں غرق قوم تھی لیکن 1971ء کے بعد انہوں نے غلطیاں دہرانا بند کر دیں چنانچہ آج یہ اس پاکستان کو مدد دے رہا ہے جس نے اسے کبھی مسکین سمجھ کر خلیج بنگال میں پھینک دیا تھا‘ کیوں؟ صرف اور صرف ”رائٹ ڈائریکشن“ کی وجہ سے‘ بنگلہ دیش نے اپنے سمت درست کر لی جبکہ ہم نے اپنے جیٹ کی نوک زمین کی طرف موڑ لی چنانچہ آج دینے والا ہاتھ لینے والا بن چکا ہے اور لینے والا دینے والا‘ میں نے جنرل صاحب سے آخر میں پوچھا ”ہمیں شرم کیوں نہیں آتی“ انہوں نے میری طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ”ہمیں شرم ہی تو نہیں آتی‘ اسی لئے ہمارا یہ حال ہے اور جب تک ہمیں شرم نہیں آئے گی ہم اس وقت تک ایسے ہی رہیں گے کیونکہ قدرت بے شرمی کو قومی پالیسی بنانے والی قوم سے کبھی رعایت نہیں کرتی“۔

فوج حل نہیں
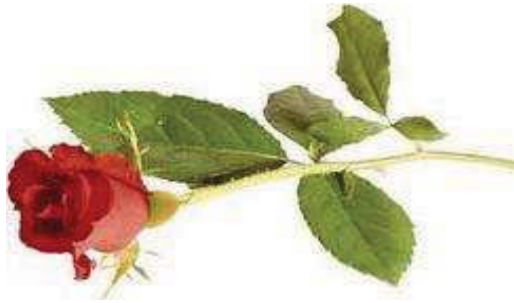
بزرگ کی آواز میں آنسوؤں کا سیلاب تھا‘ وہ بولے ”میں مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا‘ ہم لوگ جالندھر سے نکلے تو سکھوں نے میرے پورے گھرانے کو گھیر لیا‘ میرے سامنے میری ماں باپ اور بہن بھائیوں کو قتل کر دیا گیا لیکن سکھوں نے بھی ہمارے مقتولوں کا وہ حشر نہیں کیا جو سیالکوٹ کے شہریوں نے منیب اور مغیث کے ساتھ کیا‘ میں نے جب لوگوں کو نوجوانوں کو ڈنڈے مار مار کر ہلاک کرتے‘ ان کی نعشوں کو گھسیٹتے اور بعد ازاں انہیں الٹا لٹکاتے دیکھا تو مجھے پہلی بار اپنی ماں اور باپ کے قاتل سکھ اچھے لگے‘ وہ ہمارے دشمن تھے‘ وہ ہمارے سامنے ہماری عورتوں‘ بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرتے رہے لیکن ان میں سے کسی نے کسی نعش کے اوپر پاؤں نہیں رکھا‘ کسی نے ڈنڈوں اور پتھروں سے کسی کو نہیں مارا اور کسی نے کسی کی نعش کی بے حرمتی نہیں کی لیکن آج پاکستان میں مسلمان پاکستانیوں کے ہاتھوں مسلمان بچوں کا یہ بہیمانہ قتل اور پھر ان کی نعشوں کی بے حرمتی‘ مجھے آج پاکستانی اور مسلمان ہونے پر شرمندگی ہے“ یہ بزرگ مجھے کراچی سے فون کر رہے تھے اور ان کی آواز میں رقت تھی‘ یہ اس دکھ میں اکیلے نہیں ہیں‘ اس وقت پورا ملک سیالکوٹ کے سانحے پر اداس ہے‘ بیرون ملک بھی لوگ جب یہ مناظر دیکھتے ہیں تو دیر تک کف افسوس ملتے رہتے ہیں‘ اس واقعے کے بعد پاکستان کے باشعور طبقوں کے سامنے یہ سوال سر اٹھا کر کھڑا ہے کہ کیا ہم اس قسم کا پاکستان چاہتے تھے۔ عین ممکن ہے یہ نوجوان گناہگار ہوں‘ انہوں نے بھی کوئی بڑی واردات کی ہو‘ انہوں نے قتل کیا ہو‘ یہ اسلحہ لے کر لوگوں کو ڈراتے رہے ہوں یا پھر یہ ڈاکے کی نیت سے گھر سے نکلے ہوں لیکن کیا ملزموں یا مجرموں کو سڑکوں پر اذیت ناک موت دینا یا انہیں پولیس کی موجودگی میں ڈنڈے مار مار کر ہلاک کر دینا قرین انصاف ہے‘ کیا ہم ایسے معاشرے کو مہذب معاشرہ کہہ سکتے ہیں اور کیا یہ معاشرہ آگے چل کر رہنے کے قابل رہے گا۔ یہ آج کا سب سے بڑا سوال بھی ہے اور لمحہ فکریہ بھی اور ہم نے اگر اس پر غور نہ کیا‘ ہم نے اگر اس سوال کا جواب تلاش نہ کیا تو یہ المیہ آگے چل کر گرینڈ ٹریجڈی بن جائے گا کیونکہ اس وقت سیلاب سے متاثرہ دو کروڑ لوگ سیالکوٹ کے ڈنڈا بردار نوجوانوں کی نفسیات کیری کر رہے ہیں‘ یہ وہ لوگ ہیں جو کل تک اپنے گھروں میں سیٹل لائف گزار رہے تھے لیکن پھر سیلاب آیا اور ان کی تمام املاک‘ ان کے مکان‘ دکانیں‘ گودام‘ فیکٹریاں اور زمین بہالے گیا اور یہ کھلے آسمان تلے دوسروں کی امداد پر زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے‘ یہ لوگ جس وقت گیلی زمین پر پناہ تلاش کر رہے تھے اس وقت صدر صاحب پیرس اور لندن کے دورے پر تھے‘ وزیراعظم صاحب اس آفت کو ایزی لے رہے تھے‘ وفاقی وزراء اور پاکستان مسلم لیگ ن کی قیادت ایک دوسرے کے ساتھ زبانی میچ کھیل رہی تھی‘ ساری سرکاری مشینری اسلام آباد‘ لاہور‘ کراچی‘ کوئٹہ اور پشاور میں ٹھنڈی اور خوشبودار زندگی گزار رہی تھی اور پاکستان کے سرمایہ کار‘ تاجر اور صنعت کار اس آفت میں منافع کے امکانات تلاش کر رہے تھے‘ یہ دو کروڑ لوگ سارے فریب اور یہ ساری چالاکیاں دیکھ رہے ہیں‘ یہ باہر سے آنے والی امداد بھی گن رہے ہیں اور اگر آنے والے چند ماہ میں ان لوگوں کو واپس ان کے گھروں میں آباد نہ کیا گیا‘ اگر انہیں امداد میں سے حصہ نہ دیا گیا تو یہ لوگ سیالکوٹ کے ان نوجوانوں کی طرح ”بی ہیو“ کریں گے‘ یہ ڈنڈے لے کر شہروں میں نکل کھڑے ہوں اور پاکستان کا ہر وہ

شہری ان کا شکار ہو گا جس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے ہوں گے یا جس کے گھر میں وقت چولہا جلتا ہو گا ۔آپ تصور کیجئے ہم لوگ اس وقت کیا کریں گے ' ہمارا رویہ اس وقت کیا ہو گا ' یہ ملک کی نفسیاتی اور ذہنی صورتحال ہے۔

ملک کی اس ذہنی اور نفسیاتی صورتحال میں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کے بیان نے تلاطم برپا کر دیا' الطاف حسین نے 22 اگست کو لندن سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''محبّ وطن جرنیل بدعنوان سیاستدانوں کے خلاف مارشل لاء جیسا اقدام کریں'' الطاف حسین کی تقریر کا ایک حصہ درست ہے ' اس میں کوئی شک نہیں عوام نے ہماری سیاسی جماعتوں بالخصوص پاکستان پیپلز پارٹی سے جو توقعات وابستہ کی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں ' پاکستان کی تمام بڑی اور اہم سیاسی جماعتیں اس وقت کسی نہ کسی شکل میں اقتدار میں حصہ دار ہیں اور اگر سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ پاکستان کا آئیڈیل وقت ہے ' ملک میں اپوزیشن کسی جگہ دکھائی نہیں دیتی اور تمام پارٹیاں کسی نہ کسی سطح پر حکومت میں شامل ہیں لیکن آپ بدقسمتی ملاحظہ کیجئے اس سیاسی اتحاد کے باوجود حکمران طبقے نے عوام کو مایوس کر دیا اور خود میاں نواز شریف بار بار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے حکومت کی ناکامی جمہوریت کی ناکامی ثابت ہو رہی ہے۔ حکومت کے اپنے کولیشن پارٹنر اے این پی ' جمعیت علمائے اسلام اور ایم کیو ایم بھی اسی نوعیت کے خدشات کا اظہار کر چکے ہیں ' ان حالات میں الطاف حسین کا بیان درست بھی ہے اور بروقت بھی۔ میرا خیال ہے پاکستان پیپلز پارٹی ' پاکستان مسلم لیگ ن ' پاکستان مسلم لیگ ق ' اے این پی ' جمعیت علمائے اسلام اور دوسری چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں کو بھی اپنے اپنے حصے کا سچ بولنا چاہئے ' انہیں بھی جھوٹ اور سب اچھا ہے یا سب اچھا ہو جائے گا کا الاپ بند کر دینا چاہئے اور ایک بار سچ کا سامنا کرنے یا مقابلہ کرنے کی تیاری کرنی چاہئے لیکن جہاں تک اس سیاسی صورتحال کے حل کی بات ہے تو میں اس ملک کے تمام پڑھے لکھے طبقوں کی طرح الطاف حسین سے اختلاف کروں گا ' یہ درست ہے ملک میں جمہوریت مکمل جمہوریت نہیں ' پارٹیاں ووٹ عوام سے لیتی ہیں لیکن اقتدار میں پہنچ کر فوج اور امریکا کی ماتحت بن جاتی ہیں ' یہ بھی ٹھیک ہے ملک میں مافیاز کی حکومت ہے اور جاگیردار ' سرمایہ دار اور صنعت کار سیاستدانوں کے ساتھ مل کر اس ملک کے غریب عوام کو لوٹ رہے ہیں اور یہ بھی سچ ہے پاکستان میں سیاست ' جمہوریت اور پارلیمنٹ کرپشن ' ذاتی مفادات ' نااہلیت اور خاندانی کاروبار کا گڑھ بن چکی ہے لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم ملک کو دوبارہ فوج کے حوالے کر دیں ' ہم فوج کی '' پھکی '' چار بار استعمال کر چکے ہیں اور ہر بار مریض کے مرض میں اضافہ ہی دیکھا گیا ' صدر ایوب خان سے لے کر پرویز مشرف تک فوجی اقتدار نے ملک کو کیا دیا؟ کیا فوج کی واپسی کے بعد ملک کے حالات پہلے سے زیادہ خراب نہیں ہوئے ؟ اور کیا عوام نے ہر بار فوج کے خلاف بغاوت کا علم نہیں اٹھایا ' اگر ان تمام ''کیا '' کا جواب اثبات ہے تو پھر ہم بہت بے وقوف ہوں گے کہ ہم یہ تجربہ پانچویں مرتبہ بھی دہرائیں ' فوج اس بار بھی آئی تو آٹھ دس سال بعد ملک دوبارہ سیاستدانوں ہی کے ہاتھ میں جائے گا اور اس وقت بلاول زرداری بھٹو میدان میں ہوں گے یا حمزہ شہباز نے پارٹی کی عنان تھام رکھی ہو گی اور آپ تصور کیجئے اس وقت ناتجربہ کار حمزہ شہباز اور بلاول زرداری بھٹو ملک کا کیا حشر کریں گے ؟ فوجی اقتدار سرے دست پاکستان پیپلز پارٹی کو بہت ''سوٹ '' کرتا ہے کیونکہ یہ لوگ ڈھائی تین سال بھی لگا چکے ہیں اور

لوگ چپ چاپ بیرون ملک منتقل ہو جائیں گے اور یوں پاکستان مسلم لیگ ن اپنی ”باری“ سے محروم رہ جائے گی‘ آٹھ دس سال بعد جب سول سوسائٹی دوبارہ انگڑائی لے گی تو اس وقت تک بلاول زرداری بھٹو کی قیادت پک کر تیار ہو چکی ہو گی اور یوں پیپلز پارٹی نئے ”بھٹو“ کے ساتھ میدان میں اتر آئے گی جبکہ اس سارے ”سینیاریو“ میں پاکستان مسلم لیگ ن نقصان میں رہے گی شائد یہی وجہ ہے ملک میں جب بھی مارشل‘ بنگلہ دیش ماڈل‘ قومی حکومت یا ٹیکنوکریٹس کی گورنمنٹ کی بات ہوتی ہے تو پاکستان مسلم لیگ ن تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوتی ہے جبکہ پیپلز پارٹی کی قیادت میٹھی میٹھی ہنسی ہنسنے لگتی ہے لیکن حالات جیسے بھی ہوں‘ سیاسی سینیاریو جیسا بھی ہو ہم لوگ فوج یا مارشل لاء کی حمایت نہیں کر سکتے‘ یہ اکیسویں صدی کا آپشن نہیں۔

اکیسویں صدی میں بہر حال جمہوریت ہی پرفارمنس دے سکتی ہے لہٰذا ہم اگر اس ملک کو چلانا چاہتے ہیں تو ہمیں سیاسی جماعتوں‘ سیاسی قیادت اور ارکان اسمبلی پر کام کرنا ہو گا‘ ہماری سیاسی جماعتیں اگر توبہ کر لیں‘ یہ لوگ اگر اللہ سے ڈر جائیں‘ یہ مل ملا کر کوئی فارمولہ طے کر لیں اور ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر اس ملک کے اقتدار کو ہاتھ میں لے لیں تو یقین کیجئے اس ملک کے مسئلے چھ ماہ میں حل ہو سکتے ہیں بصورت دیگر وہ وقت دور نہیں جب سیلاب سے متاثرہ دو کروڑ لوگ ڈنڈے لے کر کیمپوں سے نکلیں گے اور ان تمام لوگوں جنہوں نے اپنی زمینیں بچانے کیلئے دریاؤں اور نہروں کے بند توڑے تھے یا جنہوں نے سیلاب زدگان سے منافع کمانے یا امدادی رقم ہڑپ کرنے کیلئے سیلاب کو عطیہ خداوندی سمجھ لیا تھا ان کا وہ حشر کریں گے جو سیالکوٹ کے عام لوگوں نے سڑک پر کیا تھا اور اگر خدانخواستہ یہ وقت آ گیا تو لوگوں کے اس سیلاب کو فوج بھی نہیں روک سکے گی۔

ہمارے سیاستدانوں نے اب ایک بڑا فیصلہ کرنا ہے‘ یہ لوگ ہمیشہ کیلئے جلاوطنی کی زندگی منتخب کر لیں یا پھر یہ خلوص نیت کے ساتھ عوام میں اتر جائیں کیونکہ فوج بہر حال ان سیاسی حالات کا حل نہیں‘ اس کا حل ہر طرف سے سیاسی جماعتوں کی جیب میں پڑا ہے اور ہم اگر انارکی سے بچنا چاہتے ہیں تو ہماری سیاسی قیادتوں کو اپنی جیبیں جھاڑنا ہوں گی ورنہ دوسری صورت میں جیب بچے گی اور نہ ہی قمیص۔

شرم سے سر نہیں جھکنا چاہیے
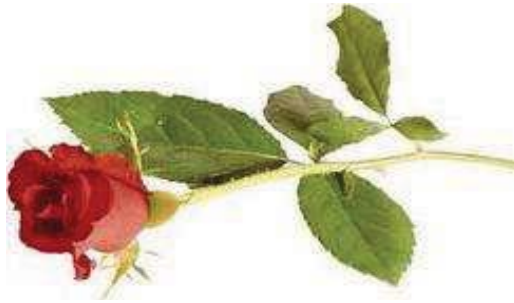
ہماری کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی لندن میں میچ فکسنگ کے ایشو میں پھنس گئے ہیں‘ سکاٹ لینڈیارڈ نے محمد عامر‘ محمد آصف‘ سلمان بٹ اور کامران اکمل سمیت سات کھلاڑیوں کے پاسپورٹ ضبط کر لئے ہیں‘ ان کے موبائل فون جمع کر لئے گئے ہیں‘ ان کے کمروں کا سامان تحویل میں لے لیا گیا اور بڑے پیمانے پر تحقیقات شروع ہو گئیں‘ ان کھلاڑیوں پر الزام ہے انہوں نے پاکستانی نژاد بکی مظہر مجید کے ساتھ مل کر لارڈ ٹیسٹ میں میچ فکسنگ کی تھی‘ 29 ہمارے کھلاڑیوں نے نو بال کرانے کیلئے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ وصول کئے تھے‘ یہ رپورٹ برطانوی میگزین نے اگست 2010ء کو جاری کی‘ اخبار کا ایک رپورٹر مظہر محمود بزنس مین کے روپ میں بکی مظہر مجید سے ملتا رہا اور انتہائی حساس آلات کے ذریعے اس کی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈ کرتا رہا اور ان کی بنیاد پر میگزین نے 29 اگست 2010ء کو اپنی رپورٹ تصویروں کے ساتھ شائع کر دی جس نے چند گھنٹوں میں پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا‘ اس رپورٹ پر وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے فوری طور پر بیان جاری کیا ”کھلاڑیوں کی اس حرکت پر ہمارا سر شرم سے جھک گیا“ میں وزیراعظم کے خیالات اور جھکے ہوئے سر کا بہت احترام کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں کھلاڑیوں کی اس حرکت کو زمینی حقیقت‘ نظریہ ضرورت اور کھلاڑیوں کا حق بھی سمجھتا ہوں اور میرا خیال ہے اگر ہم اپنے کھلاڑیوں کو ایسے چھوٹی موٹی کرپشن کی اجازت نہیں دیں گے تو یہ ان کے ساتھ ظلم ہو گا‘ ہمارے کھلاڑیوں کو قوم نے بھرپور مینڈیٹ دیا ہے اور جب تک یہ مینڈیٹ پورا نہیں ہوتا ہمیں اس وقت تک انہیں کھل کھیلنے کا پورا پورا موقع دینا چاہیے تاکہ یہ بھی جمہوری حکومت کی طرح پانچ سال پورے کریں‘ آخر میں قوم کا سامنا کریں اور اگر قوم انہیں دوبارہ کھیلنے کا مینڈیٹ دے دے تو انہیں دوبارہ قومی ٹیم میں لے لیا جائے اور انہیں مظہر مجید جیسے بکیوں کے ساتھ مل کر ایک بار پھر قوم کی خدمت کا موقع دے دیا جائے اور ہمیں اس سسٹم کو چلنے دینا چاہیے کیونکہ یہ سسٹم چلے گا تو اس کا گند خود بخود ”فلٹر آؤٹ“ ہو جائے گا اور ملک کی طرح ہماری کرکٹ ٹیم بھی صاف ستھری اور مضبوط ہو جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہماری کرکٹ ٹیم ملکی سیاست کی طرح درجہ کمال پر کیسے پہنچ گئی‘ یہ جاننے کیلئے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں‘ آپ بس یہ حکایت پڑھ لیجئے‘ کسی نوجوان بادشاہ کی سلطنت میں ایک سو بیس سال کا ایک بوڑھا رہتا تھا‘ بادشاہ نے اس بوڑھے کو بلایا اور اس سے پوچھا ”آپ نے ہمارے دادا حضور کا دور بھی دیکھا‘ آپ ہمارے والد محترم کی حکومت میں بھی زندہ تھے اور آج آپ ہمارا دور بھی دیکھ رہے ہیں‘ آپ کو تینوں ادوار میں کیا فرق محسوس ہوا“ بوڑھے نے چند لمحے سوچا اور عاجزی کے ساتھ بولا ”اگر حضور جان بخشی کا وعدہ فرمائیں تو بندہ سچ بولنے کی جرات کرے“ بادشاہ دل کا کھلا تھا چنانچہ اس نے فوراً بوڑھے کی جان بخش دی‘ بوڑھے نے عرض کیا ”جناب عالی آپ کے دادا کا دور تھا‘ میں ایک جوان اور خوبصورت مرد تھا‘ میں جنگل سے گزر رہا تھا‘ رات کا وقت تھا‘ مجھے جنگل میں ایک خوبصورت جوان عورت ملی‘ عورت زیورات سے لدی ہوئی تھی اور اس قدر خوبصورت تھی کہ میں نے زندگی میں اس سے پہلے ایسی حسین عورت دیکھی تھی اور نہ ہی اس کے بعد دیکھ سکا‘ وہ راستہ بھٹک گئی تھی‘ میں نے اپنی چادر اس کے سر پر ڈالی‘ اُسے ساتھ لیا‘ اس کا گھر تلاش کیا اور اسے اس کے گھر والوں کے حوالے کر کے

گاؤں واپس آ گیا'' بوڑھا رکا' لمبا سانس لیا اور بولا ''حضور جب تک آپ کے دادا کا دور رہا' مجھے اس نیکی پر ہمیشہ فخر کا احساس ہوا' میں اپنے آپ کو بڑا انسان سمجھتا رہا' آپ کے دادا حضور کے بعد آپ کے والد کا دور آیا تو مجھے اپنی وہ نیکی بے وقوفی محسوس ہونے لگی اور میں روزانہ اپنے آپ سے کہتا کرم دین تو کتنا بے وقوف ہے تو عورت کو چھوڑ دیتا لیکن اس کے زیورات تو اتار لیتا تاکہ آج تو خوشحال ہوتا' آج تمہارے پاس بھی گھر ہوتا' تم بھی دکاندار اور تاجر ہوتے اور تم بھی آرام دہ اور پرسکون زندگی گزار رہے ہوتے وغیرہ وغیرہ' مجھے جب بھی یہ خیال آتا' میں سارا دن اپنی بے وقوفی پر پچھتاتا رہتا'' بوڑھے نے سانس لیا اور رک کر بولا ''حضور آپ کے والد جب تک حکمران رہے' میں بے وقوفی کے شدید بخار میں مبتلا رہا' اللہ تعالیٰ بڑے بادشاہ سلامت کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے' وہ پردہ فرما گئے اور آپ ان کی جگہ بادشاہ سلامت بن گئے تو میرا احساس حماقت مزید شدت اختیار کر گیا اور میں آپ کے تخت سنبھالنے سے لے کر آج تک اپنے آپ کو اس بات پر کوستا ہوں کہ میں نے اس عورت کو گھر کیوں پہنچایا' مجھے چاہیے تھا' میں اسے اپنے گھر لے آتا' اس کے ساتھ زبردستی شادی کر لیتا اور یوں وہ عورت اور اس کے زیورات دونوں میرے ہو جاتے اور میری زندگی دنیا میں جنت بن جاتی' حضور جب سے آپ بادشاہ بنے ہیں' میں روزانہ اپنے آپ کو دو جوتے مارتا ہوں اور کہتا ہوں کرم دین تو کتنا بے وقوف تھا تو نے ہزاروں روپے کے زیور بھی چھوڑ دیئے اور دنیا کی حسین ترین عورت بھی' تم سے بڑا احمق کون ہو گا'' بوڑھا چپ ہو گیا' بوڑھے کی تقریر سن کر بادشاہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس کا دل چاہا وہ جلاد کو اشارہ کرے اور جلاد بوڑھے کا سر اتار کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دے لیکن بادشاہ میں ابھی بادشاہوں کے چند اصول باقی تھے چنانچہ اس نے بوڑھے کو معاف کر دیا۔

ہم لوگ اور ہماری کرکٹ ٹیم بھی اسی نفسیاتی' روحانی اور اخلاقی دور سے گزر رہی ہے' ملک میں کرپشن جب لائف سٹائل کا حصہ بن جائے گی' ایوان بالا سے لے کر پٹواری تک کرپشن جب گراؤنڈ ریالٹی ہو گی' ہماری جمہوریت جب این آر او کی کھلے عام حفاظت کرے گی' جب سرکاری محکموں' وزارتوں اور وزیروں پر کرپشن کے کھلے الزام لگیں گے اور کسی الزام پر کسی قسم کی تحقیق نہیں ہو گی' لندن کے مہنگے ترین سٹور ہیرالڈ سے لاکھوں پاؤنڈز کی شاپنگ ہو گی اور یہ شاپنگ 35 بڑے بڑے کاٹنوں میں پیک ہو کر پاکستان لائی جائے گی اور کوئی اس پر انگلی نہیں اٹھائے گا' جب ملک اور بیرون ملک درجنوں ایجنٹ پھر رہے ہوں گے اور یہ لوگوں کو کھلے عام یہ پیش کش کر رہے ہوں ''آپ ہمیں کام بتائیں'' جب یو ایس ایڈ کا سربراہ راجیو شاہ یہ کہہ دے ہم پاکستان کو اسی صورت میں امداد دیں گے جب پاکستان اس کے شفاف استعمال کو یقینی بنائے گا اور جب ارکان پارلیمنٹ کی ڈگریاں جعلی نکل آئیں گی اور سیاسی جماعتیں ان ڈگریوں کی وکالت بھی کریں گی اور جعلی ڈگری ہولڈرز کو ٹکٹ بھی دیں گی اور جب سرمایہ دار سیلاب کے بعد اجناس ذخیرہ کرنا شروع کر دیں گے تو ان حالات میں اگر پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی میچ فکسنگ نہیں کریں گے تو کیا یہ لوگ ان حالات میں اس بوڑھے کی طرح بے وقوف ثابت نہیں ہوں گے؟ ملک میں جب ہر چیز' ہر ادارہ' ہر بااثر شخصیت کرپشن' اقرباء پروری اور لوٹ کھسوٹ کے رنگ میں رنگ چکی ہے تو پھر کرکٹ ٹیم اور کرکٹ کے کھلاڑی اس سے کیسے بچ سکتے ہیں' یہ قدرت کا قانون ہے جب ایک چیز خراب ہوتی ہے تو یہ دوسری چیز کو ضرور خراب کرتی ہے اور یہ دونوں چیزیں آگے چل کر درجنوں چیزوں کو خراب کر دیتی ہیں اور یوں آخر میں ساری مشین بیٹھ جاتی ہے۔

ہماری ... میں بیٹھ جاتی ہے۔

ہم اگر سیاست سے لے کر سماج تک اور مذہبی طبقے سے لے کر بزنس مین کمیونٹی تک خرابی' برائی اور بداخلاقی میں لت پت ہو چکے ہیں تو ہم کرکٹ ٹیم سے اچھائی' ایمانداری اور اخلاقیات کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ اگر اس ملک میں عمرے اور حج کے کوٹے بک سکتے ہیں' مسجدوں' درگاہوں اور مزاروں کی تعمیر میں کمیشن کھائی جاسکتی ہے اور ہسپتالوں میں غریب مریضوں کی ادویات میں خورد برد ہو سکتی ہے اور اگر زلزلے کے متاثرین اور سیلاب میں پھنسے بد نصیبوں کی امداد کرپٹ لوگوں کی جیب میں جاسکتی ہے تو پھر ہم کھلاڑیوں سے ایمانداری کی توقع کیوں کرتے ہیں؟ ہمارے سر اگر وزارت مذہبی امور' محکمہ صحت اور وزارت تعلیم کی کرپشن پر شرم سے نہیں جھکتے تو پھر میرا خیال ہے ہمیں کرکٹ ٹیم کی میچ فکسنگ پر بھی شرمندہ نہیں ہونا چاہئے' آخر یہ لوگ بھی انسان ہیں' یہ بھی پاکستانی ہیں اور انہیں بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو آئین اور قانون محترم جمشید دستی کو دیتا ہے کیونکہ یہ بڑی زیادتی ہو گی وزیراعظم محکمہ تعلیم کے ساتھ فکسنگ کرنے والے جمشید دستی کے انتخابی جلسے سے تو خطاب کریں لیکن میچ فکسنگ کرنے والے کھلاڑیوں کی مذمت کریں۔ آخر جمشید دستی اور محمد آصف میں کیا فرق ہے؟ صرف پارٹی کا فرق ہے۔۔! ہم لوگ آخر صحراؤں میں چیڑھ کا درخت کیوں دیکھنا چاہتے ہیں' ہم جیکب آباد میں برف کی دکان کیوں کھولنا چاہتے ہیں اور ہم گرم پانیوں کے سمندروں میں برف کے جزیرے کیوں بنانا چاہتے ہیں' ہم اگر کرپٹ ہیں تو پھر ہماری کرکٹ ٹیم بھی کرپٹ ہو گی کیونکہ یہ قدرت کا اصول بھی ہے اور معاشرے کی روایت بھی۔ اور ہم جب مجموعی طور پر کرپٹ ہیں تو پھر ہماری کرکٹ ٹیم بھی کرپٹ ہو گی چنانچہ شرم سے سر جھکانا بند کر دیں۔

منگولیا کی طرح
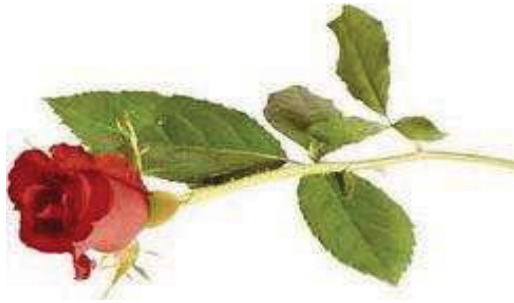
منگولیا دنیا کے مشرقی وسطی ایشیاء میں واقع ایک چھوٹا سا ملک ہے' یہ ملک سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں انتہائی گرم ہو جاتا ہے۔ اس کی آبادی 27 لاکھ 36 ہزار 800 نفوس پر مشتمل ہے اور اس ملک میں گوبی کا وہ صحرا بھی موجود ہے جو اپنی وسعت' سفاکی اور حدت کی وجہ سے پوری دنیا میں انفرادیت کا حامل ہے اور جس نے تاتاریوں کی وجہ سے تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے تھے' چنگیز خان اسی صحرا سے اٹھا تھا اور اس نے بعدازاں آندھی طوفان کی طرح پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا' منگولیا سن 1921ء تک چین کا حصہ رہا' 11 جولائی 1921ء کو آزادی حاصل کی اور اس وقت اس کی معیشت کا زیادہ تر دارومدار زراعت اور معدنی ذخائر پر ہے' یہ ملک دنیا کے اس خطے میں واقع ہے جہاں موسمیاتی تبدیلیاں انسانوں' جانوروں اور نباتات کو تیزی سے متاثر کر رہی ہیں' دنیا میں پچھلے دس برسوں میں جتنی موسمیاتی تبدیلیاں آئیں' منگولیا پر اس کے انتہائی خوفناک اثرات ظاہر ہوئے' ملک میں بارشوں کی شرح تیزی سے کم ہوئی' ملک کا ستر فیصد رقبہ بری طرح متاثر ہوا' فصلیں تباہ ہو چکی ہیں' جانور مر رہے ہیں' صحرا میں موجود آبادیاں نقل مکانی پر مجبور ہیں اور شہری زندگی تعطل کا شکار ہو چکی ہے' منگولیا کی حکومت اس صورتحال سے ٹھیک ٹھاک پریشان ہے کیونکہ اسے محسوس ہو رہا ہے اگر اس نے منگولیا کے عام لوگوں کیلئے کچھ نہ کیا تو لوگ گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئیں گے اور حکومت کیلئے ان لوگوں کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا' حکومت عام آدمی کی مشکلات کو اپنی ذمہ داری بھی سمجھ رہی ہے چنانچہ حکومت نے گلوبل وارمنگ کے ایشو پر دنیا کو منگولیا کی طرف متوجہ کرنے اور اپنے عوام کو اپنی سنجیدگی اور خلوص کا یقین دلانے کیلئے 29 اگست 2010ء کو ایک عجیب کام کیا' منگولیا کے وزیراعظم باتبولڈ سخ باتر نے اپنی کابینہ کو ساتھ لیا' ان لوگوں نے پندرہ گھنٹے سفر کیا اور یہ صحرا اگا شونی خولوئی پہنچے اور انہوں نے وہاں وفاقی کابینہ کا اجلاس منعقد کر لیا' کابینہ کے تمام ارکان نے سبز رنگ کی ٹوپیاں پہن رکھی تھیں اور یہ لوگ چار گھنٹے صحرا میں بیٹھ کر ماحولیاتی تبدیلیوں کے منگولیا پر اثرات پر گفتگو کرتے رہے' یہ منظر بعدازاں ٹیلی ویژن چینلز کے ذریعے دنیا بھر کے لوگوں نے دیکھا۔ منگولیا کے وزیراعظم کے اس اقدام کے فوری طور پر دو نتائج نکلے' ایک پوری دنیا تک گلوبل وارمنگ' ماحولیاتی تبدیلیوں اور موسمیاتی اتار چڑھاؤ کا پیغام گیا' دنیا کو معلوم ہوا ماحولیاتی تبدیلیوں سے منگولیا جیسے ملکوں پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور دنیا کو ان چیلنجز کے مقابلے کیلئے ٹھوس بنیادوں پر پالیسی بنانی چاہئے اور دو' منگولیا کے عوام کے اعتماد میں اضافہ ہوا' عوام کو معلوم ہوا ان کی حکومت عام لوگوں کے دکھوں' تکلیفوں اور مصیبتوں میں ان کے ساتھ ہے چنانچہ کابینہ کے اجلاس کے بعد منگولیا کے عوام اپنی حکومت پر فخر کرنے لگے

۔

یہ حقیقت ہے بارشیں عطیہ خداوندی ہوتی ہیں اور کوئی ملک کسی دوسرے ملک کی بارشیں چوری نہیں کر سکتا' گلوبل وارمنگ بھی عالمی ایشو ہے اور صحرائے گوبی میں کابینہ کے اجلاس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا اور یہ بھی حقیقت ہے سیلابوں' زلزلوں اور طوفانوں کی طرح خشک سالی بھی آسمانی آفت ہوتی ہے اور کوئی ملک' کوئی قوم اپنے طور پر اس آفت سے نہیں نمٹ سکتی لیکن اس کے باوجود منگولیا کی حکومت نے اپنے عوام کو ایک شاندار گڈول جیسچر دیا'

وزیراعظم اوراس کی کابینہ نے صحرائے گوبی میں کابینہ کا اجلاس منعقد کر کے اپنے عوام کو یہ پیغام دیا کہ حکومت ہر مسئلے میں عوام کے ساتھ کھڑی ہے‘اس نوعیت کے اقدامات حکومتوں کی سیاسی مقبولیت کیلئے بھی اہم ہوتے ہیں اور عوام کے حوصلے کیلئے بھی۔ مجھے یاد ہے ہمارے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے این ایف سی ایوارڈ پر دستخط کیلئے گوادر کا انتخاب کیا تھا‘گوادر میں چاروں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی اکٹھے ہوئے تھے اور وفاقی کابینہ کا اجلاس بھی ہوا تھا‘اس اقدام کا بہت اچھا نتیجہ نکلا تھا‘ میرا خیال ہے وزیراعظم کو سیلاب کی تباہیوں کو عالمی فورمز تک پہنچانے اور سیلاب سے متاثرہ دو کروڑ لوگوں کی تالیف قلب کیلئے اب بھی اسی قسم کا ”اینی شیٹیو“ لینا چاہئے‘ یہ اعلان کر دیں سیلاب متاثرین جب تک اپنے اپنے گھروں میں واپس نہیں جاتے حکومت اس وقت تک وفاقی کابینہ کے اجلاس سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں کیا کرے گی‘ ہماری وفاقی کابینہ کے تمام ارکان صوبہ خیبر پختونخواہ کے متاثرہ علاقوں سے لے کر ٹھٹھہ اور صادق آباد سے اوستہ محمد تک ہر بدھ کو کسی نہ کسی متاثرہ علاقے میں پہنچیں گے اور کھلے آسمان تلے بیٹھ کر کابینہ کے اہم فیصلے کریں گے‘اس نوعیت کے اجلاس قومی اور بین الاقوامی میڈیا پر بھی دکھائے جائیں تا کہ دنیا کو ہماری اصل صورتحال کا اندازا ہو سکے‘ ہماری صوبائی حکومتیں بھی اس کی پیروی کر سکتی ہیں‘ یہ بھی متاثرین کی بحالی تک متاثرہ علاقوں میں کابینہ کے اجلاس منعقد کریں اور جب تک لوگ اپنے گھروں کو نہیں لوٹ جاتے یہ اس وقت تک خود کو لوگوں تک محدود کر دیں۔ ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا سیلاب کے دوران اور سیلاب کے بعد حکومت کا رویہ قابل ستائش نہیں تھا‘ حکومت پہلے پندرہ دن غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی رہی‘ وزیراعظم اوران کی کابینہ کے ارکان سیلاب کو میڈیا سٹنٹ ثابت کرتے رہے جبکہ صدر آصف علی زرداری پیرس میں اپنے محل اور لندن کے دورے فرماتے رہے‘ سیلاب کا پانی جب سر سے اونچا ہو گیا تو حکومت نے جوتے تلاش کرنا شروع کر دیئے اور یہ ابھی تک دوسرا جوتا نہیں پہن سکی‘اس تاخیر اور غیر سنجیدگی نے حالات مزید خراب کر دیئے‘کرپشن اور غیر سنجیدگی کی وجہ سے حکومت کی کریڈیبلٹی پہلے ہی خراب تھی چنانچہ عالمی ڈونرز اور بین الاقوامی برادری نے بھی ضرورت کے مطابق ہماری مدد نہیں کی‘ آج حالت یہ ہے عالمی برادری فوج پر اعتماد کیلئے تو تیار ہے لیکن یہ حکومت کو فنڈز دینے کیلئے رضامند نہیں‘ عالمی برادری نے پاکستان کو اب تک 90 کروڑ ڈالر کی پیش کش کی لیکن ہم نے ابھی تک صرف 14 کروڑ ڈالر وصول کئے ہیں‘ ہمیں باقی 76 کروڑ ڈالر کیوں نہیں مل رہے؟ اس سوال میں ہمارے سیاسی اور سماجی زوال کی تمام وجوہات چھپی ہیں‘ حکومت کی حالت یہ ہے سیلاب کے بعد متحدہ عرب امارات نے پاکستان کو ریسکیو ورک کیلئے چار ہیلی کاپٹر دیئے تھے‘ یہ ہیلی کاپٹر کئی دن تک ملتان ائرپورٹ پر کھڑے رہے تھے اور ان کا عملہ سرکاری خرچ پر ملتان کے فائیو سٹار ہوٹل میں مزے لیتا رہا تھا‘ حکومت شروع میں یہ ہیلی کاپٹر استعمال نہیں کر سکی‘ سعودی عرب سیلاب زدگان کیلئے دو موبائل ہسپتال دے رہا ہے لیکن اس کی شرط ہے وہ یہ ہسپتال فوج کو دے گا اور فوج ہی ہسپتال اور ہسپتال کے عملے کی حفاظت اور نقل وحرکت کی ذمہ دار ہو گی‘ امریکا‘ ترکی اور افغانستان نے بھی پاکستان کو ہیلی کاپٹر اور دوسرا سامان فراہم کیا لیکن یہ سامان اور ہیلی کاپٹر بھی براہ راست فوج کو دیئے گئے‘ گزشتہ ہفتے چین نے بھی سیلاب کے متاثرین کیلئے امدادی سامان اور ریسکیو کے آلات بھجوائے تھے‘ یہ آلات اور امدادی سامان بھی چین کے زعمانے سست بارڈر پر فوج کے

[illegible] سیلاب سے متاثرہ علاقوں میں سیاستدانوں‘ سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور سرکاری محکموں کی بجائے فوج زیادہ دکھائی دیتی ہے جس کا ظاہر ہے حکومت پاکستان پیپلز پارٹی اور سیاسی جماعتوں کو نقصان ہو گا۔

وزیراعظم صاحب اگر ٹھنڈے دماغ سے اس صورتحال کا جائزہ لیں‘ یہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کریں اور آج سے منگولین ماڈل کے تحت کام شروع کر دیں تو ہمیں یقین ہے سیاسی صورتحال بھی تبدیل ہو جائے گی اور عوام بھی مطمئن ہو جائیں کیونکہ اگر منگولیا کی کابینہ 50 درجہ سینٹی گریڈ کی گرمی میں صحرائے گوبی میں بیٹھ سکتی ہے تو ہماری کابینہ بھی چند گھنٹے سیلاب زدگان کے ساتھ گزار سکتی ہے۔ آخر ہمارے وزیراعظم ملتانی ہیں اور یہ اگر دو گھنٹے ملتان کی گرمی میں گزار لیں گے تو کوئی قیامت نہیں آ جائے گی‘ ہم اگر اخلاقیات میں امریکا‘ یورپ‘ جاپان اور چین کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو ہم کم از کم منگولیا کی برابری تو کر سکتے ہیں‘ ہم ان کی طرح ننگی زمین پر تو بیٹھ سکتے ہیں‘ ہمارے وزراء خود کو آفت زدہ علاقوں کے وزراء تو ثابت کر سکتے ہیں۔
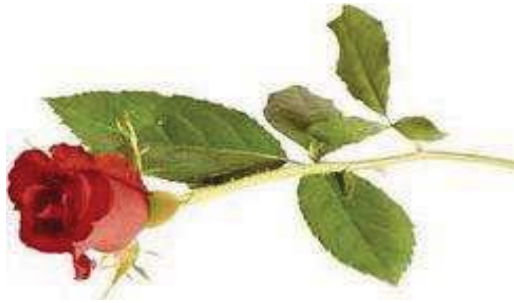
میرے پاؤں زمین پر گڑھ کر رہ گئے' میں آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم سے ساری توانائی نکل گئی اور میں نے زبردستی ایک قدم بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی تو میں جلے' سڑے اور سوکھے درخت کی طرح زمین پر آگروں گا' میں چپ چاپ' خاموشی سے ان کے پاس بیٹھ گیا' ان کی نظریں وہاں گڑھی تھیں جہاں زمین اور آسمان کے کنارے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور سورج ب نقشی رنگ کی لکیر بن کر افق پر بکھر جاتا ہے اور انسان اس لکیر کو آہستہ آہستہ اندھیرے کی چادر میں دفن ہوتا ہوا دیکھتا ہے' ان کی نظریں افق پر تھیں' ہاتھ دعا کیلئے اٹھے تھے اور ہونٹ ساقط تھے' ان کے چہرے کی ہر سلوٹ اس وقت ایک التجا' ایک پکار اور ایک چیخ دکھائی دے رہی تھی' میں نے آج تک ہزاروں لاکھوں چہرے دیکھے ہیں لیکن یہ میری زندگی کا پہلا چہرہ تھا جو ٹھوڑی سے لے کر ماتھے کی آخری سرحد تک ایک دعا' ایک التجا محسوس ہوتا تھا' اس چہرے پر لکھا تھا یہ چہرہ اللہ تعالیٰ سے جو کچھ مانگتا ہے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ اسے مایوس نہیں لوٹاتی' میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا لیکن وہ میرے وجود سے لاتعلق چپ چاپ افق پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ ہم سب ابلاغ کیلئے زبان کے محتاج ہیں' ہمیں پانی مانگنے سے لے کر ماں کی موت کے دکھ تک اپنے ہر جذبے' اپنے ہر احساس اور اپنی ہر ضرورت کیلئے کوئی نہ کوئی زبان چاہئے' مردوں کے کان پوری زندگی ایسی عورتوں کی تلاش میں بھٹکتے رہتے ہیں جو انہیں یہ بتا سکیں ''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی'' اور عورتیں ہر دو منٹ اور اکتیس سیکنڈ بعد اپنے مردوں کی طرف اس حسرت سے دیکھتی ہیں کہ یہ انہیں ایک بار پھر یقین دلائے ''میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے تم سے محبت کرتا ہوں'' اور اگر مرد ہر دو منٹ اور اکتیس سیکنڈ بعد انہیں یہ بتا بھی دے تو ان کی تسلی نہیں ہوتی اور یہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر' ہونٹوں کو گول بنا کر اور آواز کو لچکا مٹکا کر پوچھتی ہیں ''کتنی' تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے'' یہ جذبے شائد ہیں ہی ایسے! اللہ تعالیٰ نے آزادی' محبت اور نفرت کو پیاس کی کوکھ سے پیدا کیا ہے شائد اسی لئے آزادی' محبت اور نفرت کتنی ہی زیادہ ہو جائے انسان کی تسلی نہیں ہوتی' یہ مزید آزادی' یہ مزید محبت اور یہ مزید نفرت کرنا چاہتا ہے۔
ہم سب لفظوں کے محتاج ہیں' ہمیں انسانوں سے مخاطب ہونے کیلئے لفظ چاہئے ہوتے ہیں لیکن دنیا میں ایک ایسی زبان بھی ہے جو لفظوں کی محتاجی سے آزاد ہے' جس میں اشارے' گرائمر' فقرے اور محاورے نہیں ہیں اور جس میں کوئی آواز نہیں ہوتی' ہم اس زبان کو آفاقی زبان کہہ سکتے ہیں' یہ زبان دنیا کا ہر جاندار بولتا بھی ہے اور سمجھتا بھی اور جانداروں کو یہ زبان سیکھنے کیلئے کسی سولائزیشن' کسی سماج' کسی سکول یا کسی یونیورسٹی کی ضرورت نہیں ہوتی' یہ جونہی پہلی سانس لیتے ہیں یہ زبان خود بخود ان کے وجود کا حصہ بن جاتی ہے اور آخری سانس تک ان کا ساتھ دیتی ہے' یہ زبان بنیادی طور پر اللہ کی زبان ہے' اللہ تعالیٰ اس زبان سے اپنی مخلوق سے مخاطب ہوتا ہے اور مخلوق بھی اسی زبان کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک اپنی درخواستیں پہنچاتی ہے' آپ نے کبھی غور کیا آپ جانوروں کو دیکھ کر ان کے مسائل' ان کی تکلیفوں کا اندازہ کیسے کر لیتے ہیں' آپ کو کیسے معلوم ہوتا ہے کون سا کوا پیاسا ہے اور کس چیل کو بوٹی چاہئے اور گلی کے کتے کو بخار ہے اور بلی کو سردی لگ رہی ہے' آپ نے کبھی غور کیا آپ کیڑے مکوڑوں کو دیکھ کر ان کے دکھوں اور ان کی خواہشوں کا اندازا لگا لیتے ہیں اور آپ جنگلوں سے گزرتے

ہوئے پودوں' درختوں اور بیلوں کو دیکھ کر ان کی کیفیات جانچ سکتے ہیں' آپ کو یہ جاننے میں چند سیکنڈ لگتے ہیں کہ جنگل کا کون سا پودہ خوشحال ہے' کون سا صحت مند اور کون ساد کھی ہے۔ آپ کبھی دوسرے جانداروں کو اس نظر سے دیکھ کر دیکھئے' آپ کو ہر جاندار کچھ نہ کچھ کہتا دکھائی دے گا اور آپ اس کی زبان بھی سمجھ رہے ہوں گے اور جانداروں کے درمیان یہ رابطہ وہ آفاقی زبان ہے جو اللہ تعالیٰ کی زبان ہے اور اللہ تعالیٰ اس زبان کے ذریعے اپنی مخلوق سے مخاطب بھی ہوتا ہے اور ہم جاندار اس کے ذریعے اسے اپنے دکھ بھی بتاتے رہتے ہیں۔

وہ اور ان کا چہرہ آفاقی زبان سے بہت کچھ کہہ رہا تھا اور اس زبان نے میرے قدم جکڑ لئے' میں ان کے پاس بیٹھ گیا' مجھے محسوس ہوا وہ اس آفاقی زبان کے پروفیسر ہیں اور اس وقت اس زبان کے ذریعے کائنات کی خفیہ طاقتوں کے ساتھ ان کا رابطہ قائم ہے' وہ بڑی دیر تک ہاتھ پھیلا کر افق کی مدھم ہوتی سرخ لکیر پر نظریں جمائے بیٹھے رہے اور میں چپ چاپ انہیں دیکھتا رہا' افق کی لکیر اندھیرے میں تحلیل ہو گئی تو انہوں نے جھرجھری لی' چہرے پر ہاتھ پھیرا' میری طرف مڑے اور مسکرا کر بولے ''ہم سب اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ) صرف عربی زبان سمجھتا ہے چنانچہ ہم زیادہ سے زیادہ عربی دعائیں رٹنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو اپنے عربی لہجے' الفاظ کے ذخیرے اور بھاری بھرکم آواز سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں' ہم گویوں کی طرح گا کر دعائیں کرتے ہیں یا پھر فقیروں کی طرح گڑ گڑا کر مانگتے ہیں اور یہ سب کچھ کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں فرشتوں کے پاس سعودی عرب کی شہریت نہیں اور انہوں نے کسی جامعہ سے شریعت کا کورس بھی نہیں کیا اور دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے جرثومے سے لے کر ہاتھی جتنے بڑے جانور بھی عربی نہیں سمجھتے اور کسی پودے' کسی درخت اور کسی بیل کو عربی نہیں آتی لیکن اس کے باوجود یہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ سے شکایت بھی کرتی ہیں اور دعا بھی'' میں یہی بات معلوم کرنے کیلئے ان کے پاس بیٹھا تھا اور وہ منہ کھولے بغیر میری بات سمجھ گئے تھے' وہ بولے ''اللہ تعالیٰ نے جب روحیں پیدا کی تھیں تو اس نے انہیں وہ آفاقی زبان بھی ودیعت فرمادی تھی جس کے ذریعے جاندار بغیر کچھ بولے' بغیر کچھ کہے ایک دوسرے سے بھی رابطہ کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی اور یہ وہ زبان ہے جس کی مدد سے مائیکروسکوپک جرثومے بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا کر سکتے ہیں''۔ وہ رکے اور نرم آواز میں بولے ''دنیا میں کسی نے کبھی کسی نبی کو اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتے نہیں دیکھا تھا' کوئی نبی عبرانی' عربی یا فارسی میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب نہیں ہوتا تھا' یہ سب اس آفاقی زبان میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ انہیں اس زبان میں جواب دیتا تھا اور دنیا کے تمام ولی' قطب اور ابدال بھی اسی زبان کے ماہر ہوتے ہیں' یہ لوگوں کو دیکھتے ہیں اور لوگوں کی روحیں آفاقی زبان کے ذریعے اپنے اپنے جسموں کی ساری کیفیات انہیں بتا دیتی ہیں اور یوں یہ لوگ ان لوگوں کے ماضی' حال اور مستقبل سے واقف ہو جاتے ہیں اور رہ گئی دعا تو۔۔۔'' وہ رکے' لمبا سانس لیا اور نرم آواز میں بولے ''انسان جب تک اس آفاقی زبان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا'' میں نے بے تاب ہو کر ان سے پوچھا ''لیکن یہ زبان ہوتی کیسی ہے؟ ہم اسے سمجھ یا سیکھ کیسے سکتے ہیں'' وہ مسکرائے اور بولے ''یہ وہ زبان ہوتی ہے جس میں چیونٹی حضرت سلیمانؑ سے مخاطب ہوتی ہے اور حضرت سلیمانؑ اس کا شکوہ سن کر اپنے لشکر کا رخ بدل دیتے تھے' یہ وہ زبان ہوتی ہے جس کے ذریعے مینڈک اللہ تعالیٰ سے خشک سالی کا شکوہ

[illegible] بدل دیتے ہیں' یہ وہ زبان ہوتی ہے جس کے ذریعے مینڈک اللہ تعالیٰ سے [illegible] کا شکوہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی دعا سن کر آسمانوں کے شاور کھول دیتا ہے' یہ وہ زبان ہوتی ہے جس کے ذریعے پتھر کے کیڑے اللہ سے رزق مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کیلئے پتھر کے پیٹ کو نرم کر دیتا ہے اور یہ وہ زبان ہوتی ہے جس کے ذریعے ریشم کے کیڑے اللہ تعالیٰ سے تخلیق کی توفیق مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ریشم کی فیکٹری بنا دیتا ہے"۔

میں ان کی باتوں کی بارش میں بھیگتا چلا گیا' وہ بولے "ہم سب بھی اس زبان کے ماہر ہوتے ہیں لیکن ہم اپنی اپنی زبانوں' اپنے اپنے لفظوں اور اپنے اپنے فقروں کے بہکاوے میں آ جاتے ہیں' ہم اس آفاقی زبان کو مترنم دعاؤں میں دفن کر دیتے ہیں چنانچہ ہم پوری زندگی اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہتے ہیں لیکن قدرت کی طرف سے قبولیت کا پیغام نہیں آتا' کیوں نہیں آتا؟ اس لئے نہیں آتا کہ ہم سمجھتے ہیں ہمارا رب (نعوذ باللہ) لفظوں کا محتاج ہے اور ہم جب تک ماہر وکیل کی طرح اپنا مقدمہ اس کی عدالت میں پیش نہیں کریں گے وہ اس وقت تک ہماری طرف توجہ نہیں دے گا' ہم کتنے بے وقوف ہیں' ہم سے وہ مینڈک ہزار درجے بہتر ہیں جن کی دعا سن کر اللہ تعالیٰ بارش برسا دیتا ہے اور گندم کے وہ بیج لاکھ درجے اچھے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ مٹی میں نمی دے کر زندہ ہونے کا فخر عنایت کرتا ہے" وہ رکے اور نرم آواز میں بولے "آؤ میں تمہیں دعا کرنے' اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہونے اور اس پوری کائنات کو آفاقی زبان میں گفتگو کرتے دکھاتا ہوں" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا' مجھے دو زانو ہو کر بیٹھنے کا حکم دیا اور فرمایا "اپنے آپ کو چند لمحوں کیلئے لفظوں سے خالی کر لو' تمہارے ذہن' تمہارے دل میں کوئی لفظ نہیں آنا چاہئے' نظریں افق پر جماؤ اور اپنے دھیان کو اپنے دل پر فوکس کر لو' تمہیں اپنے دل سے روشنی کی ایک "بیم" نکلتی دکھائی دے گی' اپنی دعا کو اس "بیم" میں ڈال دو اور پھر جواب کا انتظار کرو' تمہیں اللہ تعالیٰ کا جواب ای میل سے پہلے موصول ہو جائے گا" میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا اور مجھے اس وقت معلوم ہوا انسان جوں جوں روحانی ترقی کرتا ہے یہ خاموش کیوں ہو جاتا ہے' یہ لفظوں سے دور کیوں ہو جاتا ہے۔

اس سے اگلے دن
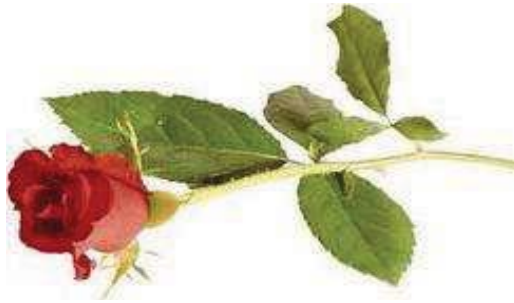
''آج کا دن کیسا تھا؟''میں نے اس سے پوچھا'اس نے چونک کر میری طرف دیکھا'میرے دوست کی آنکھوں میں نیند کی لالی تھی'رات کے دو بج چکے تھے'ہم گاڑی میں ہوٹل کی طرف جا رہے تھے'شہر میں سناٹا تھااور ہم اس سناٹے میں ڈرائیو کر رہے تھے۔

انسان کی آنکھیں جب نیند سے سرخ ہونے لگتی ہیں تو اس کا دماغ سست ہو جاتا ہے'دل کی دھڑکن مدہم ہونے لگتی ہے'سانسیں آہستہ آہستہ چلنے لگتی ہیں اور یہ دس سال پرانی باتیں یاد کرنے لگتا ہے'ہم سب سونے سے پہلے چند لمحوں کیلئے ماضی کی طرف پلٹ جاتے ہیں'کیوں پلٹتے ہیں؟یہ ہم آج تک نہیں جان سکے'شائد یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے یا اس کا تعلق انسان کی روح کے ساتھ ہے لیکن یہ حقیقت ہے ہم نیند کے گہرے سمندر میں اترنے سے پہلے ایک لمحے کیلئے ماضی کی طرف ضرور جاتے ہیں'شائد یہی وجہ ہے انسان جب مرنے لگتا ہے تو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کی ساری زندگی فارورڈ ہوتی ہوئی سی ڈی کی طرح اس کے دماغ کی سکرین سے گزرتی ہے'وہ ایک لمبی ہچکی لیتا ہے اور اپنی زندگی کا سارا ڈیٹا لے کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے'نیند بھی کیونکہ ایک عارضی موت ہوتی ہے شائد اسی لئے ہم سونے سے پہلے اپنے ماضی کی طرف پلٹتے ہیں اور ماضی کا یہ ڈیٹا لے کر نیند میں اتر جاتے ہیں'انسان کی آنکھوں میں جب نیند کی لالی اترتی ہے تو اسے ہلکا'نرم اور میدانی علاقوں کے بہتے دریاؤں جیسا رواں میوزک اچھا لگتا ہے'اس وقت کا سفر بھی بہت شاندار ہوتا ہے'میں برسوں سے اس علت کا شکار ہوں'میں رات گئے آہستہ سپیڈ میں گاڑی چلاتا ہوں'میوزک سنتا ہوں اور رات کی تنہائی میں آسمان سے اترتی ہوئی روشنیوں کو محسوس کرتا ہوں'میں نے آج تک ایسی ہزاروں راتوں کا تجربہ کیا اور ہر رات پچھلی رات سے مختلف تھی'چاند کی راتوں کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے'گہری اندھیری راتوں کا اپنا اسرار ہوتا ہے'راول ڈیم کے کنارے رات کے پچھلے پہر یوں محسوس ہوتا ہے یہ خوبصورتی'سکون اور امن کی انتہا ہے'برستی بارشوں کی راتیں ٹرکش کافی کی طرح کسیلی ہوتی ہیں'گرمیوں کی راتوں میں ذرا سی تلخی ہوتی ہے اور جب دو موسم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں تو ان گلے ملتے موسموں کی کوکھ سے جنم لیتی راتیں مستانی ہوتی ہیں اور سردیوں کی راتیں!اف ان میں بڑی اداسی ہوتی ہے'میں اکثر رات کے گہرے اندھیرے میں جنگلوں میں بھی چلا جاتا ہوں اور اندھیرے کی خاموشی کو محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں'رات کی خاموشی میں جھینگروں کی آوازیں''لائف ٹائم''تجربہ ہے اور جو شخص اس تجربے سے نہیں گزرتا اس شخص کو شخص نہیں کہنا چاہئے'رات کا انسان کی روح'تخلیق اور منصوبہ بندی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے'دنیا کی تمام بڑی تخلیقات'تمام بڑی ایجادات اور تمام بڑی دریافتیں رات کے وقت ہوئی تھیں'دنیا کے نوے فیصد بچے رات کے وقت پیدا ہوتے ہیں'دنیا کے تمام بڑے منصوبے رات کے وقت بنتے ہیں اور انسان کی روح بھی رات کے وقت ہی ایک درجے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے درجے میں داخل ہوتی ہے'دنیا کے تمام اولیاء کرام رات کے وقت سلوک کی منزلیں طے کرتے ہیں'اس پورے کرہ ارض پر'تمام ممالک'تمام معاشروں'تمام مذاہب اور تمام سماجوں میں شادیوں کی تقریبات رات کے وقت ہی اختتام پذیر ہوتی ہیں اور تاریخ کی تمام بڑی ہجرتیں'تمام بڑے واقعات'تمام بڑی کتابیں'تمام بڑی دھنیں اور تمام

بڑی پینٹنگز بھی رات ہی کے وقت مکمل ہوئی تھی‘ رات میں کوئی ایسا اسرار‘ کوئی ایسا جادو ضرور ہے ورنہ دنیا بھر کے اولیاءاور تمام نبی راتوں کو نہ جاگتے۔

یہ بھی ایک ایسی ہی رات تھی خاموش‘ رواں‘ مدہم لیکن ٹرکش کافی کی طرح کسیلی‘ میرے دوست نے جواب دیا ”ن تھنگ‘ ایز۔۔یوژول“(کوئی خاص نہیں‘ بس عام دنوں کی طرح) میں نے اس سے پوچھا”کیا یہ دن آپ کی زندگی میں دوبارہ آئے گا“ اس نے چند لمحے سوچا اور انکار میں سر ہلادیا‘ میں نے عرض کیا”ہاں یہ دن دنیا کی تاریخ میں دوبارہ کبھی طلوع نہیں ہوگا‘ کل بھی آج کی طرح سورج نکلے گا اور غروب بھی ہوگا لیکن وہ اگلا دن ہوگا‘ آج کا دن نہیں چنانچہ یہ ایک خاص دن تھا لیکن ہم نے اسے عام سمجھ کر ضائع کر دیا“ اس کی آنکھوں میں اب نیند کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تیرنے لگی‘ جس طرح نیند کا رنگ سرخ ہوتا ہے بالکل اسی طرح حیرت نیلے رنگ کی ہوتی ہے‘ آپ کسی حیران شخص کی طرف دیکھیں وہ آپ کو نیلے رنگ کا دکھائی دے گا‘ اسی طرح غصے کا رنگ آتشی ہوتا ہے‘ سکون کا رنگ برف کی طرح سفید‘ حسد کا رنگ پیلا‘ محبت چاندی کی طرح چمکیلی ہوتی ہے‘ نفرت کا رنگ بجھے ہوئے کوئلے جیسا ہوتا ہے اور رقابت ہمیشہ دورنگی ہوتی ہے‘ اس میں پیلا اور آتشی دونوں رنگ ہوتے ہیں‘ اس کی آنکھوں میں اب نیند کے سرخ ڈوروں کے ساتھ ساتھ حیرت کی نیلی لکیریں بھی تیر رہی تھیں‘ اس نے پوچھا”کیا ہم ہر دن کو خاص بنا سکتے ہیں“ میں نے ہنس کر جواب دیا”دنیا کا ہر دن عام‘ ایز۔یوژول‘ ن تھنگ ہوتا ہے اور یہ ہم ہوتے ہیں جو اس ایز۔یوژول دن کو خاص بنا دیتے ہیں‘ 14 اگست ایک عام دن تھا لیکن قائداعظم نے اسے خاص بنا دیا‘ 31 اگست ایک عام دن ہے لیکن دنیا کے بے شمار لوگوں کیلئے یہ ایک خاص دن ہوگا‘ کیوں؟ کیونکہ ان لوگوں نے اسے خاص دن بنا لیا ہے‘ چار نومبر ایک عام دن ہے لیکن ہزاروں‘ لاکھوں‘ کروڑوں لوگوں کیلئے یہ عام دن‘ عام دن نہیں ہوگا‘ کیوں؟ کیونکہ ان لوگوں نے 4 نومبر کو محض چار نومبر نہیں رہنے دیا‘ چار جولائی عام دن ہوتا لیکن امریکن ہسٹری نے اسے خاص بنادیا‘ اگر کچھ لوگ کچھ دنوں کو خاص بنا سکتے ہیں تو ہم لوگ بھی ہر دن کو اپنی حد تک خاص بنانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ میرا کل کا دن بہت خاص تھا‘ میں اس دن بارش میں بیٹھا رہا‘ میں نے ایک گھنٹہ باہر بیٹھ کر بارش کا ذائقہ چکھا‘ میرا آج کا دن بھی خاص تھا‘ میں آج سارا دن تمہارے ساتھ رہا‘ میرا کل کا دن بھی خاص ہوگا میں کل الکیمسٹ دوسری بار ختم کروں گا‘ میرا پرسوں بھی خاص ہوگا میں وہ دن دو یتیم بچوں کے ساتھ گزاروں گا‘ میں انہیں یہ بتاؤں گا دنیا کے تمام بڑے لوگ یتیم تھے اور اگر یتیمی بری بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ کبھی نبی اکرم ﷺ کو یتیم پیدا نہ کرتا‘ میں اس سے اگلا پورا دن جھوٹ نہیں بولوں گا‘ یہ میرا”جھوٹ فری ڈے“ ہوگا‘ میں اس سے اگلے دن شام کے وقت کسی گاؤں میں چلا جاؤں گا‘ میں اس گاؤں کی گلیوں میں پھروں گا‘ لوگوں سے ملوں گا‘ ان کے چہرے اور نام یاد رکھنے کی کوشش کروں گا‘ میں ان کی زندگی کا مطالعہ اور مشاہدہ کروں گا‘ میں اس سے اگلے دن لوگوں کو بتاؤں گا آپ کو سڑکوں پر بوتلیں‘ ریپر‘ کاغذ اور لفافے نہیں پھینکنے چاہئیں‘ میں اس سے اگلے دن اپنی بیٹی کے بالوں میں برش کروں گا‘ میں اس سے اگلے دن سیلاب زدہ خاندانوں میں سے کسی ایک خاندان کے ساتھ رابطہ کروں گا اور اس کا کوئی ایک مسئلہ حل کرنے کی کوشش کروں گا‘ میں اس سے اگلے دن کسی اداس شخص کو اس کی اداسی کی وجہ بتاؤں گا اور اسے اس اداسی سے نکالوں گا‘ میں اس سے اگلے دن کسی راہ چلتے شخص کو بتاؤں گا اللہ تعالیٰ آپ سے کسی کسی خوشی سے نوازنے والا ہے‘ وہ ہنستا ہے

تو وہ کتنا اچھا لگتا ہے اور اگر وہ ہنستے ہنستے اپنا ہاتھ چہرے پر اس طرح رکھ لے کر اس کا آدھا چہرہ دکھائی دے اور آدھا چھپ جائے اور وہ آدھے چھپے ہوئے چہرے سے جھانک کر دوسروں کی طرف دیکھے تو اس کی فیس ویلیو میں ہزار گناہ اضافہ ہو جائے گا' اس سے اگلے دن میں کسی ریڑھی والے' کسی کھوکھے والے اور کسی مزدور کو یہ بتاؤں گا وہ اگر اپنی دکان پر فلاں چیز رکھ لے تو اس کی آمدنی میں کتنا اضافہ ہو سکتا ہے' میں اس سے اگلے دن سکول کے بچوں میں دنیا کی دس بہترین کتابیں تقسیم کروں گا' میں اس سے اگلے دن لوگوں کو یہ بتاؤں گا خوشی وہ خزانہ ہے جو انسان کے اپنے اندر دفن ہوتا ہے لیکن ہم اسے دوسروں کے چہروں' دوسروں کے ہاتھوں' دوسروں کے ہونٹوں اور دوسروں کی جیبوں میں تلاش کرتے رہتے ہیں' میں اس سے اگلے دن جیل کے قیدیوں سے ملنے جاؤں گا اور یہ دیکھوں گا انسان کس طرح جذبات کے بہکاوے میں اپنی آزادی کو قید میں بدل دیتا ہے' میں یہ دیکھوں گا ہم کس طرح چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور غلط فہمیوں کی وجہ سے اپنی زندگی کو عذاب بنا لیتے ہیں' میں اس سے اگلے دن ہسپتال جاؤں گا اور یہ دیکھوں گا جو لوگ زندگی کے خوبصورت دنوں کو ایزی۔یوژول سمجھ کر ضائع کر دیتے ہیں وہ بیماری کے عالم میں کیسے لگتے ہیں اور اس عید پر ہاں اس عید پر میں اولڈ ہوم جا کر ایک گھنٹہ بوڑھوں کے ساتھ بیٹھوں گا' میرا ہر دن عام ہے لیکن تم دیکھو میں اسے کس طرح خاص بنا رہا ہوں"۔

اس کی آنکھوں سے نیند کی سرخی غائب ہو گئی' اس نے مجھ سے کہا" آپ گاڑی روکیے' میں آج کے دن کو خاص بنانا چاہتا ہوں" میں نہر کے کنارے رک گیا' وہ گاڑی سے نکلا' نہر کے کنارے پہنچا اور رات کی سیاہی کو نہر کے پانیوں میں گھلتے ہوئے دیکھنے لگا' یہ واقعی ایک خاص رات تھی' ہماری روحوں کے دروازے آہستہ آہستہ کھل رہے تھے اور نہر کے اس کنارے ہمیں زندگی میں پہلی بار کشف کی حقیقت معلوم ہوئی۔
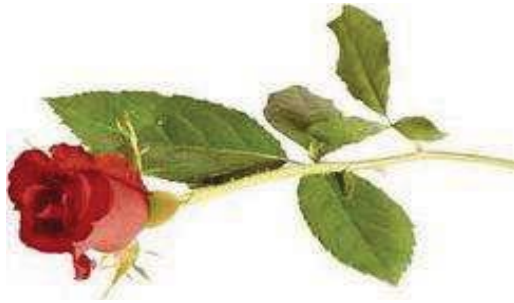
وہ پامسٹ ہمیں لندن میں یوں ہی چلتے پھرتے مل گیا تھا' میں اور میرا دوست' ہم دونوں راستہ بھٹک گئے تھے اور ہم اندازے سے آکسفورڈ سٹریٹ تلاش کر رہے ہیں' ہم ایڈریس سمجھنے کیلئے ایک کافی شاپ میں چلے گئے' کافی شاپ کے سامنے مینو کا وائٹ بورڈ لگا تھا اور اس وائٹ بورڈ کے ساتھ گلی کے فرش پر ایک بلیک بورڈ پڑا تھا جس پر ہاتھ کی تصویر بنی تھی اور تصویر کے نیچے لکھا تھا "اگر آپ کی جیب میں بیس پونڈ ہیں تو آپ اپنے مقدر سے زیادہ دور نہیں ہیں" ہم دونوں مسکرانے پر مجبور ہو گئے کیونکہ ہمارے پاس بیس بیس پاؤنڈ تھے' ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ گئے' یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس کی چاروں دیواروں پر کتابوں کے ریک تھے اور ان ریکس میں ہزاروں کتابیں تھیں' کمرے کے عین درمیان میں رائٹنگ ٹیبل تھی' اس رائٹنگ ٹیبل پر ہاتھ کے درجنوں پرنٹس پڑے تھے' ٹیبل لیمپ جل رہا تھا اور لیمپ کی روشنی میں چار سو دس سال کا ایک انگریز ہاتھ کے ایک نقشے پر جھکا ہوا تھا' اس کا گنجا سر لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا' اس کے سر کی جلد پر براؤن رنگ کے چھوٹے چھوٹے سینکڑوں تل تھے' میں نے اتنی بڑی تعداد میں تلوں کے نشان زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے' مجھے کمرے کے ماحول میں عجیب قسم کی پراسراریت محسوس ہوئی' ہم دونوں میز کے قریب کھڑے ہو گئے' بوڑھا ہاتھ کے پرنٹ پر بدستور جھکا رہا' ہمیں جب اس پوزیشن میں کئی منٹ گزر گئے اور ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر طنزیہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کر کر کے تھک گئے تو بوڑھے نے اسی جھکی ہوئی پوزیشن میں کہا "تم دونوں چالیس پونڈ نکال کر میز پر رکھ دو" ہم دونوں کے منہ سے ہنسی نکل گئی کیونکہ یہ پچھلے پندرہ منٹوں میں اس کمرے کی پہلی آواز تھی' وہ ایک ایسا گونگا بہرہ کمرہ تھا جس کا چھوٹا سا پنکھا بھی بغیر آواز کے چل رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا بوڑھے پامسٹ نے تمام آوازوں کو کان سے پکڑ کر کمرے سے نکال دیا ہے' وہ کمرے کی خاموشی کا حصہ بن کر دو چار سو سال سے ہاتھوں کے پرنٹس پر جھکا ہوا ہے اور ہم اس صدی کے پہلے لوگ ہیں جنہوں نے اس کے مقدس معبد کو اپنے پاؤں اور طنزیہ مسکراہٹوں سے آلودہ کرنے کی کوشش کی اور وہ ابھی سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھے گا' گاڈ فادر کی شیطانی آواز میں ہمیں اٹھا کر بحر الکاہل میں پھینکنے کا حکم دے دے گا' میں نے فوراً جیب سے پچاس پونڈ کا نوٹ نکالا اور اس کی میز پر رکھ دیا' اس نے نوٹ کی طرف دیکھے بغیر سختی سے کہا "اونلی فار فورٹی پونڈز' ناٹ ففٹی" میں نے فوراً گھبرا کر نوٹ اٹھا لیا' جیبیں ٹٹولیں' چالیس پونڈ اکٹھے کئے اور میز پر رکھ دیئے' بوڑھا میکینکل انداز سے سیدھا ہو گیا' اف خدایا' میں اس کا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا' اس کے چہرے پر سینکڑوں جھریاں تھیں اور یہ تمام جھریاں جمی ہوئی آبشار کی طرح چہرے کی ہڈیوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں اور جب وہ بولتا تھا تو یہ جھریاں تار پر لٹکے ہوئے کپڑوں کی طرح دائیں بائیں اور شمالاً جنوباً جھولتی تھیں۔

ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھ گئے' میرے دوست کو اپنی شادی کے بارے میں جاننے کا تجسس تھا' وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کسی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن یہ شادی ممکن نہیں تھی چنانچہ اسے جہاں کوئی پامسٹ' آسٹرالوجسٹ یا روحانی شخصیت ملتی تھی وہ اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیتا تھا اور جب تک پامسٹ اس کی مرضی کی بات نہیں کرتا تھا وہ اس کی جان نہیں چھوڑتا تھا' اس نے اس بار بھی یہی کیا' اس نے دونوں ہاتھ

ٹیبل لیمپ کی ”بیم“ کے نیچے رکھے اور اس سے پوچھا ”مسٹر فراسٹ‘ کیا میری شادی میری مرضی کے مطابق ہو جائے گی“ فراسٹ نے قہقہہ لگایا‘ اس نے کرسی کی پشت کے ساتھ ٹیک لگائی‘ آدھا بجھا ہوا سگار جلایا اور اس کے بعد وہ بات کہہ دی جس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کر دیا‘ یہ وہ سچ‘ یہ وہ حقیقت تھی جسے میں برسوں سے کتابوں‘ درگاہوں‘ دانشوروں اور روحانی بابوں کی مجلسوں میں تلاش کر رہا تھا لیکن مجھے یہ حقیقت ملی کہاں؟ لندن کی ایک گمنام گلی کی چھوٹی سی کافی شاپ کی دوسری منزل کے چھوٹے سے کمرے میں ستر اسی سال کے گمنام پامسٹ کے پاس‘ شاید علم بھی رزق کی طرح ہوتا ہے‘ یہ بھی آپ کو دانا دانا کر کے ملتا ہے اور یہ جب‘ جہاں اور جس کے ساتھ لکھا ہوتا ہے آپ دھکے‘ ٹھڈے کھاتے ہوئے اس تک پہنچ جاتے ہیں اور رزق کے نوالے اور ٹھنڈے گرم پانی کے گھونٹ کی طرح علم بھی آپ کی دسترس میں آجاتا ہے‘ میرے ایک بزرگ نے دس سال پہلے کہا تھا ”بیٹا مت (عقل) دینے والی چیز نہیں‘ یہ لینے والی جنس ہے“ اور مجھے اور میرے دوست کو وہ سچ لندن کے اس گمنام پامسٹ نے تھما دیا‘ پامسٹ نے سگار کا کش لیا اور بولا ”سوال یہ نہیں کہ آپ کی شادی وہاں ہو گی یا نہیں‘ سوال یہ ہے کہ کیا وہ شادی آپ کو خوشی بھی دے گی“ ہم دونوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا‘ وہ بولا ”میں پچاس سال سے اس پروفیشن میں ہوں‘ میں نے اب تک ہزاروں لوگوں کے ہاتھ دیکھے‘ ان میں سے ہر دوسرے شخص کو دولت چاہیے تھی‘ ہر تیسرا شخص مرضی کی شادی کرنا چاہتا تھا‘ ہر چوتھا شخص پروفیشن میں ترقی کا متمنی تھا‘ ہر پانچواں شخص اولاد تلاش کر رہا تھا اور ہر چھٹا شخص دشمن کو ذلیل و خوار دیکھنا چاہتا تھا لیکن ان میں سے آج تک کسی نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ جو دولت مجھے ملے گی کیا مجھے اس سے خوشی بھی نصیب ہو گی‘ کیا میں مرضی کی شادی کے بعد خوش بھی رہ سکوں گا‘ کیا میری ترقی مجھے خوشی بھی دے گی‘ کیا مجھے اس اولاد سے خوشی بھی ملے گی جس کو میں ڈاکٹروں کے کلینکس میں تلاش کر رہا ہوں اور کیا دشمن کے ذلیل و خوار ہونے کے بعد میں خوش ہو جاؤں گا“ وہ رکا‘ اس نے سگار کا لمبا کش لیا اور بولا ”ہم لوگ خوشی اور سکون کی تلاش میں ہیں‘ یہ دونوں چیزیں ہماری ہر حرکت‘ ہمارے ہر کام کی وجہ اور مقصد ہیں اور اگر انسان کی زندگی سے خوشی کی تلاش اور سکون کی جستجو نکال دی جائے تو انسان اور چمپینزی میں کوئی فرق نہ رہے گا‘ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پتھر کے زمانے میں واپس چلے جائیں لیکن ہم ان دونوں چیزوں کو ہمیشہ فراموش کر بیٹھتے ہیں‘ ارے بھائی پانی مقصد نہیں ہوتا مقصد پیاس بجھانا اور جسم کے خلیوں کو شفاف اور صاف ستھرا مائع فراہم کرنا ہوتا ہے‘ خوراک مقصد نہیں ہوتی‘ مقصد بھوک مٹانا ہوتا ہے‘ دولت مقصد نہیں ہوتی‘ مقصد اس دولت سے خوشیاں حاصل کرنا ہوتا ہے اور شادی مقصد نہیں ہوتی‘ مقصد وہ مسرت‘ وہ سرشاری ہوتی ہیں جو قدرت دو انسانوں کے درمیان کہیں چھپا دیتی ہے اور یہ دونوں مل کر اسے تلاش کرتے ہیں“ اس نے قہقہہ لگایا‘ قہقہے کے ساتھ ہی اس کی جھریاں ہوا میں لہرائیں اور اس کے دانتوں کی درزوں سے سگار کے دھوئیں کی باریک باریک سی تاریں باہر نکلنے لگیں‘ وہ بولا ”ہمیں خوشی کو پہلی ترجیح دینی چاہیے‘ ہم اگر اسے ٹاپ پر رکھیں گے تو ہی ہماری زندگی اچھی اور بامعنی ہو سکے گی کیونکہ میں نے ایسے ہزاروں لوگ دیکھے ہیں جو اربوں پونڈ کے مالک ہیں لیکن اس دولت نے انہیں خوشی نہیں دی‘ میں نے دنیا کے بہترین اور خوبصورت ترین جوڑوں کو اسی کمرے‘ انہیں کرسیوں پر روتے دیکھا ہے‘ میں نے دنیا کے کامیاب ترین لوگوں

کو بھی اداس اور مایوس دیکھا ہے اور میں نے خوبصورت اور ذہین ترین بچوں کے والدین کو بھی اپنی اولاد سے مایوس اور دکھی پایا‘انسان کو کامیابیاں ‘ترقیاں ‘ ساتھی اور دوست خوشی نہیں دیتے‘انسان کو خوش رہنے کا آرٹ خوشی دیتا ہے اور جو شخص دس پونڈ میں خوش رہنے کا ہنر نہیں سیکھتا اس شخص کو دس بلین پونڈز بھی خوش نہیں کر سکتے‘جو شخص دوسروں کے بچوں کو دیکھ کر خوش نہیں ہو سکتا وہ دس بچوں کا باپ بن جائے تو بھی اسے خوشی نہیں مل سکتی‘ جو شخص پانچ منٹ کی ملاقات ‘ڈیڑھ منٹ کا ٹیلی فون اور ایک ایس ایم ایس سے خوش نہیں ہو سکتا اس شخص کو عمر بھر کا ساتھ بھی خوشی نہیں دے سکتا‘جو شخص مسجد ‘مندر ‘چرچ یا سیناگوگا کی دہلیز پر ایک قدم رکھ کر خوش نہیں ہو سکتا اسے عمر بھر کی عبادت خوشی نہیں دے سکتی‘جو شخص برگر کی ایک ”بائٹ “پر خوش نہیں ہو سکتا وہ دنیا کے سب سے بڑے ریستوران کی مہنگی ترین ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر بھی خوش نہیں ہو سکتا اور جو شخص ٹرین یا بس کی سیٹ ملنے پر خوش نہیں ہو سکتا وہ بوئنگ کارپوریشن یا مائیکرو سافٹ کا چیئر مین بن کر بھی خوشی محسوس نہیں کر سکتا چنانچہ ہم جب تک دعا اور کوشش سے پہلے خوشی کی عادت نہیں ڈالتے کامیابی اس وقت تک ہمیں خوشی نہیں دیتی۔وہ بولتے بولتے رک گیا۔

میں نے اس سے پوچھا”لیکن کیا اپنی خوشی خود غرضی نہیں ہوتی “اس نے قہقہہ لگایا اور بولا”نہیں عام آدمی کیلئے نہیں ‘ سینٹ (صوفی)اور عام آدمی میں فرق ہوتا ہے‘ سینٹ وہ ہوتا ہے جو دوسروں کو خوش کر کے خوش ہوتا ہے جبکہ عام آدمی خوش ہو کر دوسروں کو خوش کرتا ہے‘ہم سب عام لوگ ہیں‘ہم سینٹ نہیں ہیں چنانچہ خوش ہونا سیکھو ورنہ ہر کامیابی‘ہر وش(دعا)اور ہر سٹرگل (کوشش) کے آخر میں تمہارے لئے دکھوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا“۔

شمیم طوائف
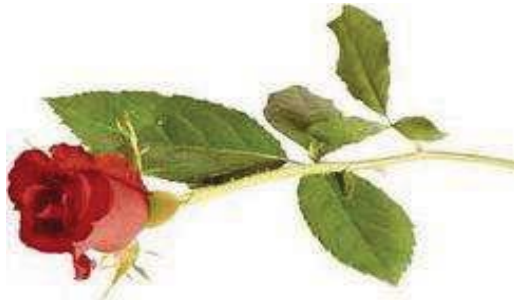
جولائی کے آخری دس دنوں میں میرے ڈپریشن میں اضافہ ہو گیااور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے زندگی کی گاڑی آخری سرنگ میں داخل ہو گئی ہےاور سرنگ کے آخر میں روشنی کی کوئی کرن نہیں۔ ہم ڈپریشن کا شکار کیوں ہوتے ہیں؟ یہ سوال بھی دنیا کے ان مشکل سوالوں میں شامل ہے جن کے جواب ابھی تک انسان کو نہیں ملے' حکماء اور صوفیائے کرام اسے روحانی مرض سمجھتے ہیں جبکہ جدید میڈیکل سائنس اسے دماغی عارضہ قرار دیتی ہے۔ صوفیاءاور حکماءاس کیفیت میں انسان کو نماز' روزےاور وظائف کی تلقین کرتے ہیں جبکہ مریض کو سکاٹریسٹ دماغ کو سلانے والی دوائیں دیناشروع کر دیتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں آگے چل کر خطرناک ثابت ہوتی ہیں' وظائف انسان کو ریلیف ضرور دیتے ہیں لیکن یہ بعدازاں اسے پریکٹیکل لائف سے نکال کر درویشی کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ لوگ جنہیں اللہ تعالیٰ نے تین چار ہزار لوگوں کی روزی کا ذریعہ بنایا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی درگاہ کا حصہ بن جاتے ہیں اور یوں معاشرے کا ارتقاء رک جاتا ہے۔ دوسری صورت میں دماغ کو سلانے والی ادویات انسان کے مائینڈ کو ماؤف کر دیتی ہیں اور یہ آہستہ آہستہ ''اڈیکٹ'' ہو جاتا ہے' میرے ڈپریشن کی بے شمار وجوہات تھیں' اس کی پہلی وجہ ''اوورورک'' تھا' میں پچھلے بیس برسوں سے سترہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتا چلا آرہا ہوں' اس طویل ذہنی اور جسمانی مشقت کی وجہ سے میرا دماغ غیر ضروری حد تک ''ایکٹو'' ہو گیا' میری یادداشت ''فوٹوگرافک'' ہو گئی' مجھے معمولی سے معمولی ''ڈیٹیل'' یاد رہنے لگی' کون سا شخص آٹھ سال پہلے کہاں ملا تھا' اس وقت موسم کون سا تھا' اس نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے' وہ کتنی بار کھانسا تھا' اس نے کتنے بج کر کتنے منٹ پر کون کون سی بات کی تھی' مجھے کتابوں کی کتابیں حفظ ہو گئیں اور انہوں نے آگے چل کر میرے دماغ کی ہارڈ ڈسک کو ''چوک'' کر دیا' میں نے اس دوران ایک دو بزنس بھی شروع کئے' یہ بھی چل پڑے' ان کی مصروفیت نے بھی مجھے گھیر لیا' کالم کے ساتھ ٹیلی ویژن پروگرام شروع کر دیا' یہ بھی چلنا شروع ہو گیا' بچوں نے بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھ دیا اور میں نے ان کے ساتھ بھی ''مقابلہ'' شروع کر دیا' اس دوران میری چھٹی حس بھی سرخ لکیر کو چھونے لگی اور اس سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیااور آخر میں میرا ایک عزیز ترین دوست بھی انتقال کر گیا' یہ میرے بہت قریب تھا' ہم نے اکٹھے آدھی دنیا دیکھی تھی اور میں ذہنی' جذباتی اور قلبی لحاظ سے اس پر بہت زیادہ انحصار کر رہا تھا' اس کے انتقال کے بعد میں خود کو بے سہارا سمجھنے لگا' یہ تمام چیزیں اکٹھی ہوئیں' ان کا ایک گولہ سا بنااور ایک صبح جب میں اٹھا تو میں' میں نہیں تھا' میں اندر سے خالی ہو چکا تھا' میں کام کے ساتھ بہت زیادہ ''امیچ'' تھا' میں برٹرینڈ رسل کی زبان میں ''ورکولک'' تھا' مجھے صرف اور صرف کام سے خوشی ملتی تھی لیکن اس دن زندگی میں پہلی بار مجھے کام میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی' میرا دل اخبار پڑھنے' دفتر جانے' کتابوں کی طرف دیکھنے' بچوں سے بات کرنے' واک کرنے' ٹی وی دیکھنے اور ٹیلی فون سننے کی طرف راغب نہیں ہوا' میں گیلے کاغذ کی طرح بیکار ہو چکا تھا' میرے دماغ میں قبرستان جیسی خاموشی تھی' گردن سینے پر جھکی تھی اور میرے اندر سے انتہائی سرد آہیں نکلتی تھیں' میں قدم اٹھاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا میں ابھی دائیں یا بائیں گر جاؤں گا اور میری دنیا کی ہر چیز سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی' مجھے محسوس ہو رہا تھا ''آئی ایم نو مور''

زندگی کا شو ختم ہو چکا ہے‘ میلہ اجڑ گیا ہے اور میں اب ایک آدھ دن میں سنگل کالم خبر بن جاؤں گا۔اس وقت میرے پاس صرف دو آپشن تھے۔ایک‘ میں خود کو اس ڈپریشن کے حوالے کر دوں‘ مجھے برین ہیمبرج ہو جائے یا ہارٹ اٹیک اور میں چپ چاپ دنیا سے رخصت ہو جاؤں یا پھر میں اس کے خلاف ”فائٹ“ کروں‘ میں کیونکہ پیدائشی طور پر فائٹر ہوں‘ میں بچپن سے آج تک اپنے حالات‘ اپنی کمزوریوں اور اپنی خامیوں سے لڑتا آیا ہوں چنانچہ میں نے اس بار بھی لڑنے کا فیصلہ کیا‘ میں اٹھا‘ میں نے تمام گولیاں‘ تمام کیپسول ڈسٹ بین میں پھینکے اور اپنی اس عجیب و غریب بیماری سے لڑنے کیلئے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

یہ ایک عجیب سفر تھا‘ میں جس میں کسی ایسے شخص کو تلاش کر رہا تھا جو مجھے میرا اپنا آپ واپس کر دے‘ جو مجھے واپس پندرہ جولائی جیسا شخص بنا دے‘ میں اس تلاش میں درجنوں لوگوں سے ملا لیکن مجھے آرام نہیں آیا‘ میں نے اس دوران نماز بھی شروع کر دی‘ مولانا طارق جمیل جیسے مہربانوں نے حرم شریف میں دعائیں بھی کیں اور دنیا بھر میں موجود نیک دل مہربانوں نے بھی مہربانی فرمائی‘ جامعۃ الرشید کے حفاظ بھی روزانہ صبح دعا کرتے رہے لیکن بے قرار دل کو قرار نہیں رہا تھا‘ میں اندر سے اجنبی ہوتا چلا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا میرے اندر کوئی اور شخص بیٹھا ہے کیونکہ میری ساری دلچسپیاں‘ میری ساری عادتیں اور میری ساری حرکتیں تبدیل ہو گئی تھیں‘ میری آواز‘ میرا لہجہ تک بدل گیا تھا‘ یہ سلسلہ اگست کے پہلے ہفتے تک جاری رہا‘ میں اپنے آپ سے‘ اپنی کیفیات سے اور اپنی خوفناک بیماری سے لڑتا رہا لیکن آخر میں تھک گیا‘ میں مایوس ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا میں اس کیفیت سے آزاد نہیں ہو سکوں گا‘ میری سپیڈ تیز تھی اور میں چالیس سال کی عمر تک پہنچ کر وہ سب کچھ کر بیٹھا ہوں جو میں نے کرنا تھا یا جس کی میں نے خواہش پال رکھی تھی اور اب کیونکہ میرے سامنے کوئی چیلنج نہیں لہٰذا میری ”فائٹنگ فورس“ بھی اب میرا ساتھ نہیں دے رہی چنانچہ میرے لئے بہتر ہے میں خود کو حالات پر چھوڑ دوں‘ میں دیر تک سوچتا رہا‘ سوچتا رہا یہاں تک کہ میں نے ہار مان لی اور میں نے فیصلہ کر لیا میں کل سے تمام ایفرٹس بند کر دوں گا‘ میں نے اس فیصلے کے بعد جائے نماز بچھائی‘ دو نفل نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا ”یا اللہ میں اس سے زیادہ نہیں لڑ سکتا‘ اب آپ جو مناسب سمجھیں‘ میں حاضر ہوں“۔ میں یہ دعا کر کے سو گیا‘ میرا اگلا دن ڈپریشن کی پیک کا دن تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا یہ شائد میرا آخری دن ہے لیکن پھر ایک عجیب واقعہ ہوا‘ مجھے چلتے چلتے وہ مل گئے‘ میں ان کا نام نہیں جانتا‘ وہ مجھے صرف آدھ گھنٹے کیلئے ملے تھے اور پھر اٹھارہ کروڑ لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گئے تھے۔ میں نے چند دن قبل ان کا ذکر کیا تھا‘ وہ افق پر نظریں گاڑھ کر بیٹھے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا تھا دنیا میں ایک آفاقی زبان ہوتی ہے جس میں جانداروں کی روحیں ایک دوسرے سے مخاطب ہوتی ہیں‘ میں ان کے پاس بیٹھا‘ وہ گفتگو کرتے رہے‘ کرتے رہے اور اسی گفتگو کے دوران انہوں نے مجھ سے کہا‘ آپ ذرا قریب آئیے‘ میں ان کے قریب ہوا‘ انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ میرے دل پر رکھا‘ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا‘ ہاتھ اٹھایا اور میں واپس اپنے اندر موجود تھا‘ میں پندرہ جولائی پر واپس آ چکا تھا اور زندگی کی وہی تڑپتی‘ مچلتی‘ مہکتی خواہشیں اور حالات سے ٹکرانے کا وہی آہنی جذبہ اور لکھے‘ بولے اور سنے جانے والے لفظوں سے وہی محبت۔ ہر چیز چند لمحوں میں اپنی اپنی جگہ پر موجود تھی‘ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا‘ انہوں نے مسکرا کر فرمایا

”آپ [illegible] کے دل پر [illegible] اللہ تعالیٰ [illegible] اگلے پانچ سال تک آپ کو کچھ نہیں ہو گا“ میں [illegible]

آپ کے دل پر تالا لگ گیا تھا اللہ تعالیٰ نے کھول دیا اب اسے پانچ سال تک آپ کو کچھ نہیں ہوگا" میں نے پوچھا "یہ کیسا تالا تھا' آپ نے یہ کیسے کھول دیا اور پانچ سال بعد کیا ہوگا" وہ مسکرائے "اللہ تعالیٰ کامیاب لوگوں کے دلوں پر ایسے تالے لگاتا رہتا ہے تاکہ انہیں اپنی اوقات کا اندازا ہوتا رہے' آپ تکبر کا شکار ہو گئے ہوں گے اور آپ نے اللہ کی نعمتوں کو اپنا حق سمجھنا شروع کر دیا ہوگا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل پر تالا لگا کر آپ کو آپ کی اوقات یاد دلا دی۔ آپ کا یہ سوال کہ میں نے یہ تالا کیسے کھولا تو میرے عزیز میں اللہ تعالیٰ کی چابی ہوں' وہ جس کو میرے پاس بھیج دیتا ہے میں اللہ کا حکم سمجھ کر اس کے دل کا تالا کھول دیتا ہوں اور رہی پانچ سال کی بات تو میرے کھولے ہوئے تالے پانچ سال تک کھلے رہتے ہیں' اس کے بعد یہ صورتحال دوبارہ پیدا ہو جاتی ہے"

میرے لئے یہ باتیں حیران کن تھیں' میں کمپیوٹر ایج کا ایک عملی انسان ہوں جس نے زندگی کو ہمیشہ دو جمع دو کی نظر سے دیکھا ہے اور جو عملیات اور روحانیات کو ڈھکوسلا اور کچھ لوگوں کے رزق کا ذریعہ سمجھتا ہے لیکن وہ میرے سامنے بیٹھے تھے اور میں انہیں' ان کی فلاسفی اور ان کے عمل کو جھٹلا نہیں سکتا تھا کیونکہ میں وہ مریض تھا جس کے دل پر ہاتھ رکھ کر ایک شخص نے اس کی ساری کیفیت بدل دی تھی لہٰذا میں اب اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے ان سے پوچھا "آپ کو یہ خوبی کیسے عطا ہوئی" وہ زیر لب مسکرائے' مغرب کی اذان کا وقت ہو رہا تھا' موذن اذان کیلئے سپیکر آن کر رہا تھا' مسجد میں نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا' انہوں نے رات کی سیاہی میں کھلتے ہوئے میناروں کی طرف دیکھا اور نرم آواز سے بولے "مجھے یہ تحفہ ملتان کی ایک طوائف کی دہلیز سے ملا تھا' شمیم طوائف سے۔ مجھے اس مرتبے پر اس طوائف نے پہنچایا تھا' میں اس کی مغفرت کیلئے سال میں دو عمرے کرتا ہوں اور ہر نماز کے بعد رو رو کر اس کیلئے دعائیں بھی کرتا ہوں' وہ حقیقتاً میری محسن تھی۔ (جاری ہے)
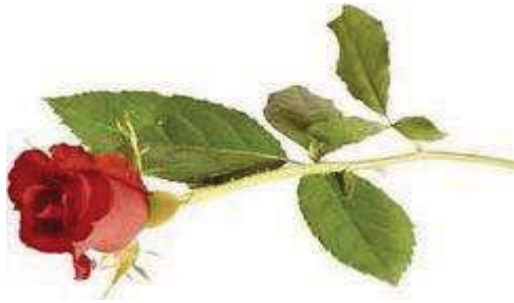
شمیم طوائف (2)

میں نے ان سے پوچھا ''آپ کو یہ خوبی کیسے عطا ہوئی ''مغرب کی اذان کا وقت تھا' موذن سپیکر آن کر رہا تھا' مسجد میں نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا' انہوں نے رات کی سیاہی میں کھلتے ہوئے میناروں کی طرف دیکھا اور نرم آواز میں بولے ''مجھے یہ تحفہ ملتان کی ایک طوائف کی دہلیز سے ملا تھا' شمیم طوائف۔ مجھے اس مرتبے تک اس طوائف نے پہنچایا تھا' میں اس کی مغفرت کیلئے سال میں دو عمرے کرتا ہوں اور ہر نماز کے بعد رو رو کر اس کیلئے دعا کرتا ہوں' وہ حقیقتاً میری محسن تھی'' یہ ایک حیران کن انکشاف تھا اور میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا' اس دوران مغرب کی اذان شروع ہو گئی' انہوں نے اپنا ''پرنا'' سیدھا کیا' پردہ دار عورتوں کی طرح سر پر اوڑھا اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ آسمان پر ابابیلیں اڑ رہی تھیں' میں ابابیلوں کی اڑان اور اذان کا تار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا' مجھے محسوس ہوا اذان کی آواز اور ابابیلیں دونوں ایک ہی لے میں آسمان پر اڑ رہی ہیں' اذان کی لے جب بلند ہوتی ہے تو ابابیلیں پروں کی قینچی سی بنا کر اوپر آسمان کی طرف اٹھتی ہیں اور جب لے نیچے آتی ہے تو یہ کاغذ کے جہاز کی طرح نیچے مسجد کے صحن کی طرف ''ڈائی'' مارتی ہیں اور اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے یہ ابھی نمازیوں کی جھولی میں گر جائیں گی' میں نے پہلی بار ابابیلوں اور اذان کے درمیان غیر مرئی رشتہ ڈسکور کیا' اذان کے بعد نماز ہوئی' نماز کے بعد وظائف کا سلسلہ چلا اور وظائف کے بعد اجتماعی دعا ہوئی' میں اس دوران ان کے ساتھ چپک کر بیٹھا رہا' وہ فارغ ہوئے تو انہوں نے مسکرا کر کہا ''آپ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہیں'' میں نے عرض کیا'' جناب اللہ تعالیٰ نے مجھے بنایا ہی ایسا ہے' اللہ تعالیٰ نے مجھے سائنس دانوں جیسا دماغ دے دیا' عاشقوں جیسا تڑپتا' مچلتا' پھڑکتا بے چین دل دے دیا' جاسوسوں جیسی آنکھیں دے دیں' سیاحوں کے پاؤں دے دیئے' عورتوں جیسے ہاتھ دے دیئے' درویشوں کی روح دے دی' لکھاریوں کا تجسس دے دیا اور مراثیوں' گویوں اور موسیقاروں کا احساس دے دیا اور میں دن رات اپنی ذات کے ان بکھرے ٹکڑوں کو جوڑتا رہتا ہوں' ان متضاد صلاحیتوں میں تال میل پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں''

وہ مسکرائے اور بولے ''شمیم طوائف کی طرف آتے ہیں' آپ کو اس کہانی میں اپنے سارے جواب مل جائیں گے '' انہوں نے لمبی آہ کھینچی اور بولے ''میں ایک زمین دار تھا' میرے والد سینکڑوں مربع زمین کے مالک تھے اور میں ان کی اکلوتی اولاد تھا' میں نے ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے تعلیم حاصل کی' دولت' طاقت اور غرور میرے ساتھ ساتھ چلتا تھا' یہ تینوں چیزیں جب اکٹھی ہوتی ہیں تو ہمیشہ اخلاقیات کا دھاگا کمزور ہو جاتا ہے' میرے اخلاقی حصار کی دیواریں بھی آہستہ آہستہ گرنے لگیں' میں نے شروع میں شراب پینا شروع کی' پھر جوا' ریس اور سٹہ بازی میں لگ گیا اور تیسری سٹیج پر میں طوائفوں میں گھر گیا' یہ ایوب خان کا دور تھا' اس دور میں طوائف' شراب اور جواء اعلیٰ طبقے کے لائف سٹائل کا حصہ تھا' میرے عزیزوں' رشتے داروں اور دوستوں نے بھی اسے معمول کے طور پر لیا لیکن میرے والد بہت پریشان تھے' ان کا خیال تھا میں شدت پسند انسان ہوں اور میں اگر برائی کی طرف چل پڑا تو میں اس سرنگ کے آخری سرے کو چھوئے بغیر واپس نہیں آؤں گا چنانچہ انہوں نے مجھے سمجھانے کیلئے ہر حیلہ کیا' انہوں نے میری شادی بھی کر دی' میرے دو بچے بھی ہو گئے' انہوں نے مجھے ملک سے باہر بھی بھجوا دیا' انہوں

نے میرے حلقے میں دین دار نوجوانوں کو بھی شامل کر دیا' انہوں نے میری میں جی ہیں اور انہوں نے نیکوکار لوگوں کے حج کے اخراجات اٹھا کر خانہ کعبہ میں بھی میرے لئے دعائیں کرائیں لیکن میں ایک نہ ختم ہونے والے راستے پر چل نکلا تھا اور میرے کان' آنکھیں اور ضمیر تینوں بند ہو چکے تھے' میں کاشت سے پہلے ہی اپنی فصلیں بیچ دیتا تھا اور یہ رقم لاہور' کراچی اور ملتان کی طوائفوں پر لٹا دیتا تھا' میری صبح کا آغاز وائن سے ہوتا تھا اور رات سکاچ پر ختم ہوتی تھی"۔

ان کی آنکھوں میں آنسو تھے' انہوں نے پرنے سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور میری طرف دیکھ کر بولے "مرد جب زیادہ عورتوں میں گھرتے ہیں تو یہ کسی نہ کسی بڑے حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں' عورتوں کے اس ہجوم میں انہیں کوئی ایسی زہریلی عورت مل جاتی ہے جو انہیں اندر اور باہر دونوں طرف سے برباد کر دیتی ہے' مرد ہر قسم کی عورتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن دنیا میں کوئی ایسی عورت ضرور ہوتی ہے جس کے خلاف مزاحمت ممکن نہیں ہوتی اور یہ عورت اگر چلتر ہو' فراڈ ہو' طوائف ہو یا چالاک ہو تو پھر دنیا جہنم بن جاتی ہے' میرے ساتھ بھی یہی ہوا' میں عورتوں اور ان کی صحبت کو کھیل سمجھ رہا تھا لیکن کھیل کے اس میدان میں اچانک شمیم اتر آئی' یہ کشمیری طوائف تھی اور مختلف شہروں اور خاندانوں سے ہوتی ہوئی ملتان پہنچی تھی' یہ آئی تو میں ہار گیا' عیاشی کے کھیل کے کچھ ازلی نتائج بھی ہیں' ان نتائج میں ایک نتیجہ ہار ہے' میرے جیسے رئیس جب کسی عورت کے سامنے ہارتے ہیں تو پھر ان کے پاس کچھ نہیں بچتا' یہ تن' من' دھن' عزت' آبرو اور اصول سب کچھ ہار جاتے ہیں' میں بھی ایک ایک کر کے سب کچھ ہار گیا' میری جاگیر شمیم کے منہ بھولے بھائی کھا گئے اور میری کوٹھیاں' میری گاڑیاں اور میرا بینک بیلنس شمیم کی ماں ہڑپ کر گئی' میں نے شمیم کے حکم پر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور میرے بچے میرے سالوں کے ٹکڑوں پر پلنے لگے' میرے والد کا انتقال ہوا تو مجھے شمیم نے جنازے پر نہ جانے دیا یوں میرے والد کو میرے مزارعوں نے دفن کیا' میرے تمام عزیز' رشتے دار اور دوست شمیم نے بھگا دیئے یہاں تک کہ میں پوری دنیا میں اکیلا رہ گیا' میں اکیلا بھی کہاں تھا' میں تو صرف شمیم کا خادم تھا' وہ کہتی تھی بیٹھ جاؤ اور میں اس کی محفل میں ایک طرف بیٹھ جاتا تھا اور وہ ناچ ناچ کر نوٹ جمع کرتی رہتی تھی' وہ کہتی تھی جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے اور میں اٹھ کر اس کے دروازے کے باہر بیٹھ جاتا تھا اور صبح تک اس کے اٹھنے کا انتظار کرتا تھا' وہ کہتی تھی کھا لو' میں کھا لیتا تھا' وہ کہتی تھی پی لو' میں پی لیتا تھا اور آخری دنوں میں یہ غلامی اس قدر آگے چلی گئی کہ میں اسے اس کے گاہکوں کے گھروں تک چھوڑ کر آتا تھا اور خود باہر بیٹھ کر ساری ساری رات روتا رہتا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی' میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟' میں کیا تھا اور میں کیا بن گیا ہوں اور میں اس گھن چکر سے نکلوں گا کیسے"

انہوں نے ایک لمبی سرد آہ کھینچی اور آہستہ آواز میں بولے "دنیا میں محبت سے زیادہ خطرناک نشہ کوئی نہیں ہوتا' ہیروئن' چرس اور شراب کے نشئی اپنے مذہب' اپنی اخلاقی روایات کا کسی نہ کسی حد تک پاس کرتے ہیں لیکن محبت کے نشئی (اور نشئی بھی طوائف کی محبت کے ہوں) اخلاقیات' روایات اور مذہب سب کچھ روند ڈالتے ہیں' میں بھی طوائف کی محبت میں اس سٹیج پر چلا گیا تھا' میں اپنے خدا' اپنے مذہب اور اپنے حسب نسب سب کو بھلا بیٹھا تھا' میں اپنی ذات میں شمیم طوائف ہو گیا تھا لیکن پھر ایک رات اللہ نے بغیر مانگے میری سن لی اور اس ذلت سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آزاد ہو گیا"

سسرال بھی رئیس خاندان تھا چنانچہ میرے بیٹوں کو اپنے نانا' اپنے ماموں سے اتنی رقم مل گئی تھی کہ یہ زمینداروں کی طرح ہلکی پھلکی عیاشی کر سکتے تھے' میں نے بیٹے کو پہچان لیا' وہ ابھی بمشکل سولہ' سترہ سال کا تھا اور یہ عیاشی کی طرف اس کا پہلا قدم تھا' میں نے اس رات شمیم کے پاؤں پکڑ لئے' میں نے اس سے کہا ''تم اس لڑکے کو یہاں سے بھگا دو'' اس نے بڑی نخوت سے میری طرف دیکھا اور بولی ''ہم طوائفیں ہیں' ہمارا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا' ہم مرد کو صرف گاہک سمجھتی ہیں' میری نظر میں تم بھی گاہک ہو اور تمہارا بیٹا بھی'' میں نے اس کی بڑی منتیں کیں لیکن میری بات ماننے کی بجائے اس نے اپنے سازندوں کو بلا کر مجھے اپنی کوٹھی سے باہر پھنکوا دیا' طوائف کے گھر سے میرا رول ختم ہو چکا تھا' میں اس کی دہلیز پر پڑا تھا اور میرا پورا وجود دھوپ میں پڑی برف کی طرح پگھل رہا تھا''

انہوں نے ایک اور لمبی آہ کھینچی' مسجد کا صحن لوگوں سے خالی ہو چکا تھا' رات آسمان سے آہستہ آہستہ اتر رہی تھی اور ہم دونوں اندھیرے صحن میں دھیرے دھیرے تحلیل ہوتے چلے جا رہے تھے' مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا وہ امراؤ جان ادا کے کوئی کردار ہیں اور میں الف لیلیٰ کا کوئی خاموش سامع اور ہم دونوں اترتی رات کے سناٹے میں گزرے بسرے کرداروں کی آہٹوں پر کان جما کر بیٹھے ہیں' کیا حقیقت میں افسانوں اور ناولوں جیسی کشش ہو سکتی ہے؟ میں اکثر اپنے آپ سے پوچھا کرتا تھا لیکن اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھے تھے اور ان کی کہانی میں ہزاروں لاکھوں ناولوں کی کشش اور لاکھوں' ہزاروں فلموں کا ڈرامہ موجود تھا اور میں اس ڈرامے اور اس کشش کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا' وہ بولے ''میں شمیم طوائف کی دہلیز پر پڑا تھا' میرا پورا وجود آنسو بن کر ابل رہا تھا' میں نے اس لمحے زندگی میں پہلی بار دل' روح اور جسم کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے رب کو آواز دی اور اللہ تعالیٰ نے سیکنڈ کے ہزارہویں حصے میں نہ صرف میری آواز سن لی بلکہ اس نے اسی وقت مجھے رسپانس بھی کیا' طوائف کی اس دہلیز پر مجھے میرا رب مل گیا' طوائف کی اس دہلیز پر میں نے دنیا کی دولت کھو دی لیکن میں روح کا سیٹھ بن گیا' میں ذلت کا سوداگر' عزت کا بیوپاری بن گیا۔ (جاری ہے)
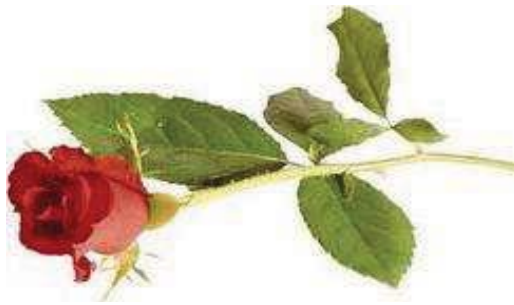
شمیم طوائف (آخری حصہ)

وہ رکے' لمبی سانس لی اور بولے "میرا پورا وجود آنسو بن کر ابل رہا تھا' میں نے اس لمحے زندگی میں پہلی بار دل' روح اور جسم کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے رب کو آواز دی اور اللہ تعالیٰ نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں مجھے رسپانس کیا' طوائف کی دہلیز پر مجھے میرا رب مل گیا" ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی اتر رہی تھی اور وہ ہر دس بیس سیکنڈ بعد پرنے سے اپنی آنکھیں صاف کرتے تھے' لوگ عشاء کیلئے مسجد میں جمع ہونا شروع ہو گئے' وہ اٹھے' میرا ہاتھ پکڑا اور ہم مسجد کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے' مسجد کا فرش ٹھنڈا لیکن دیوار گرم تھی اور میں وہاں بیٹھ کر ٹھنڈے اور گرم دونوں قسم کے احساسات کو انجوائے کر رہا تھا' وہ بولے "اللہ تعالیٰ انسان سے اربوں' کھربوں میل کے فاصلے پر ہوتا ہے' ہم اسے زندگی بھر آوازیں دیتے رہتے ہیں لیکن ہمیں اس کی طرف سے جوابی ایس ایم ایس موصول نہیں ہوتی لیکن جب انسان ذلت کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے' وہ دکھ' تکلیف اور پریشانی کی آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ کھربوں میل کی دوری سے اس کی سانس کی نالی تک پہنچ جاتا ہے' وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں ایک بار "یا اللہ" کہتا ہے' دل کی آواز کے ساتھ' دھک' دھک یا اللہ دھکا دھک اور بس اس دھک' دھک' یا اللہ دھکا' دھک کی دیر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ انسان کے کندھے پر ہوتا ہے اور سیکنڈ کے اس ہزارویں حصے میں انسان اللہ سے جو مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اسی وقت عنایت کر دیتا ہے یہی وجہ ہے صوفیائے کرام لوگوں کو دکھی دلوں کی بددعاؤں سے بچنے کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ دکھ ایک ایسی کنجی ہے جس سے عرش کے ساتوں دروازے کھل جاتے ہیں' رسول اللہ ﷺ جانوروں کو دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر بے تاب ہو جاتے تھے' کیوں؟ کیونکہ وہ جانتے تھے اللہ تعالیٰ اس وقت ان جانوروں کے کتنے قریب ہے اور اگر اس جانور نے بددعا دی تو یہ بددعا سینکڑوں' ہزاروں لوگوں کو برباد کر دے گی' آپ آج سے مشاہدہ کر لیں جس آبادی' جس بستی میں جانوروں پر ظلم ہوتا ہے اس میں سکون نہیں ہوتا اور وہ تمام بستیاں' وہ تمام آبادیاں اور وہ تمام شہر برباد ہو جاتے ہیں جن میں ظلم اور زیادتی۔۔۔ توبہ اور معافی کے دائرے سے نکل جاتی ہے' دکھ کے کسی ایسے لمحے میں جب اللہ تعالیٰ مظلوم' دکھی کے قریب ہوتا ہے اور اس وقت وہ شخص پوری آبادی کو بددعا دے دیتا ہے تو فرشتے پورے شہر کو جڑوں سے ہلا دیتے ہیں' بربادی اور انتقام کی یہ بددعا بعض اوقات جانور بھی دے دیتے ہیں اور یوں بھی بستیاں اور شہر برباد ہو جاتے ہیں بہرحال میں شمیم طوائف کی طرف واپس آتا ہوں"۔

مسجد میں لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور ہم دونوں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے' وہ بولے "میں شمیم طوائف کی دہلیز پر اوندھے منہ پڑا تھا' میرا جسم نشے کی کمی سے ٹوٹ رہا تھا لیکن میرا دکھ' میری تکلیف اور میری ذلت کا احساس اس سے کہیں زیادہ تھا' میں نے وہیں لیٹے لیٹے اللہ کو یاد کیا' میں نے اس سے عرض کیا یا باری تعالیٰ میں اس کائنات کا بدترین انسان ہوں لیکن اس کے باوجود تیرا بندہ ہوں' اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے مجھے اپنی محبت میں گرفتار کر لے' مجھے ان لوگوں میں شامل کر لے جو تجھ سے محبت کرتے ہیں اور جن سے تو محبت کرتا ہے' اللہ نے میری سن لی' میرے پورے وجود سے پسینے کی دھاریں نکلنے لگیں' یہ انتہائی بدبودار اور ناقابل برداشت پسینہ تھا' اس کی بو اس قدر خوفناک تھی کہ ساری گلی کے لوگ مجھ سے دس دس قدم پیچھے ہٹ

گئے' میرا دماغ بھی بو سے پھٹ رہا تھا' میں اٹھا' قلی سے بھاگا اور شہر کے مضافات میں آ گیا' وہاں ایک کنواں تھا' میں نے کنوئیں میں ڈول ڈالا' غسل کیا اور زندگی میں پہلی بار ننگی زمین کو جائے نماز بنا کر اللہ کے سامنے جھک گیا' یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ میرا پہلا کانٹیکٹ تھا'' وہ رک گئے' میں نے ان سے پوچھا'' آپ کے جسم سے بو کیوں آئی تھی'' وہ مسکرائے'' روحانیت کے سکول میں حضرت ایوبؑ کے فرقے کے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں' حضرت ایوبؑ کئی سال تک بدبو میں لتھڑے رہے تھے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو شفا عنایت کی تھی' اس فرقے کے صوفیاء کا آغاز ہمیشہ بدبو سے ہوتا ہے' آپ زندگی میں سینکڑوں مجذوبوں کو گند' بدبو اور غلاظت میں لتھڑا دیکھتے ہیں' ان میں پاگل بھی ہوتے ہیں اور مجذوب بھی۔ اس کیفیت کے شکار مجذوب روحانیت کے ایوبی فرقے کے فرد ہوتے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ انہیں اس کیفیت میں رکھتا ہے یہ اپنے بدن کی بدبو میں لپٹے رہتے ہیں'' میں نے پوچھا'' ہم مجذوب اور پاگل میں کیسے تمیز کریں گے'' وہ مسکرائے اور سرگوشی میں بولے'' تمیز بڑی آسان ہے' آپ ان لوگوں کو فجر سے ذرا پہلے دیکھیں' پاگل اس وقت دنیا اور مافیہا سے آزاد گہری نیند سو رہا ہو گا جبکہ مجذوب نہ صرف جاگ رہا ہو گا بلکہ وہ مشرق کی طرف منہ کر کے آسمان پر نظریں جما کر بیٹھا ہو گا'' وہ رکے' لمبی سانس لی اور بولے'' میں شیم طوائف کے قصے کی طرف واپس آتا ہوں' میں نے نماز پڑھی اور حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ کے مزار پر آ گیا' مجھے وہاں سے اُچ شریف پہنچنے کا حکم ملا' میں دو سال اُچ شریف رہا' وہاں سے بری امام گیا' وہاں سے داتا دربار آ گیا اور داتا دربار سے میری ڈیوٹی لال شہباز قلندر کے دربار پر لگ گئی' میں وہاں سے کراچی گیا' کراچی میں مجھے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کے ہاں نوکری کا حکم ملا' میں نے ان کے گھر چوکیدار کی ملازمت کر لی' پروفیسر صاحب کے پیر صاحب ان سے ملاقات کیلئے آئے' انہوں نے مجھے دیکھا' مسکرائے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے' میں کئی مہینے انہیں وضو کراتا رہا' پھر انہوں نے مجھے دلوں کے تالے کھولنے کا وظیفہ سکھایا اور مجھے اس زنجیر کا ایک حلقہ بنا دیا جس کے اندر اس وقت اس ملک کے لوگ رہ رہے ہیں'' وہ خاموش ہو گئے۔

میرے لئے ان کی یہ ساری گفتگو ہضم کرنا مشکل تھی' میں سائنسی دماغ کا ماڈرن انسان ہوں جس نے زندگی کو ہمیشہ دو جمع دو کی عینک سے دیکھا' اس کیلئے یہ باتیں حیران کن بھی تھیں اور ناقابل یقین بھی۔ ان کی کہانی ختم ہو گئی لیکن میرے ذہن میں ابھی تک سوالوں کی سینکڑوں لکیریں باقی تھیں' میں نے ان سے پوچھا'' آپ کو حکم کون دیتا ہے' آپ کی ڈیوٹی کی شیٹ کون بناتا ہے اور آپ کی اگلی منزل کون طے کرتا ہے'' وہ مسکرا کر بولے'' 40 اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین عدد ہے' اس نے اس دنیا' اس کائنات کو 40 زونز میں تقسیم کر رکھا ہے' ہم زیرو پوائنٹ پر پیدا ہوتے ہیں' ہم جب شعور کی آنکھ کھولتے ہیں تو ہمارے سامنے چالیس راستے ہوتے ہیں' ہم آنے والے دنوں میں ان چالیس راستوں میں سے کسی ایک راستے پر چل پڑتے ہیں' ہم جب اس راستے پر قدم رکھتے ہیں تو اس راستے پر پہلے سے چلنے والے لوگ ہمارے گائیڈ بن جاتے ہیں' آپ آج اور ابھی شراب پینے کا فیصلہ کر لیں آپ کو اسی مسجد میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو نہ صرف آپ کو شرابیوں کی محفل تک لے جائیں گے بلکہ وہ آپ کو شراب کے سپلائرز سے بھی ملا دیں گے' آپ اسی وقت بزنس مین بننے کا فیصلہ کریں' آپ کو اسی مسجد میں ایسے

[illegible]
کریں گے‘ یہ کیا ہے؟ یہ وہ راستے ہیں آپ نے جن پر قدم رکھنے کا بس فیصلہ کرنا ہوتا ہے‘ باقی سلسلہ ایک خود کار نظام کے تحت چلنا شروع ہو جاتا ہے‘ روحانیت بھی ان چالیس راستوں میں سے ایک راستہ ہے‘ انسان اللہ کے کرم سے‘ کسی دوسرے کی تحریک پر یا پھر حادثاتی طور پر ایک بار اس راستے پر قدم رکھ دے تو اسے خود بخود گائیڈ ملنا شروع ہو جاتے ہیں‘ اس کی ڈیوٹیاں بھی لگنے لگتی ہیں اور اسے اگلی منزلوں کے پتے بھی ملنے لگتے ہیں‘‘ وہ رکے اور دوبارہ بولے ’’میں ملتان میں حضرت بہاؤالدین ذکریاؒ کے مزار پر ہی تھا کہ شمیم طوائف قتل ہو گئی‘ اسے کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا‘ اس کے بعد اس کا کوٹھا اجڑ گیا اور دو‘ تین سال بعد لوگ اس کا نام تک بھول گئے لیکن میں اسے کبھی نہیں بھولا‘ اس کی دو وجوہات ہیں‘ ایک مجھے اس سے عشق تھا اور میں نے اس عشق میں اپنا تن‘ من‘ دھن اور عزت آبرو سب کچھ قربان کر دی تھی اور یہ حقیقت ہے عشق روح پر آئی ہوئی وہ خراش ہوتا ہے جو اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک روح قائم رہتی ہے اور دو‘ شمیم نہ ہوتی تو میں آج میں نہ ہوتا‘ میں اس ملک کے دس ہزار زمینداروں میں سے ایک زمیندار ہوتا اور کتے پال کر یا کتے لڑا کر زندگی گزار دیتا۔ یہ اس کی مہربانی تھی کہ میں اپنے رب سے مل گیا اور آج آپ جیسے لوگوں کے کام آ رہا ہوں چنانچہ میں شمیم کا قرض اتارنے کیلئے ہر نماز کے بعد اس کیلئے دعا بھی کرتا ہوں اور سال میں دوبار اس کے نام کے عمرے بھی کرتا ہوں کیونکہ وہ جیسی بھی تھی لیکن تھی میری محسن‘‘۔ وہ خاموش ہو گئے‘ موذن نے سپیکر پر پھونک ماری اور مسجد کے صحن میں دور دور تک پھونک کی آواز گردش کرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میری ان سے ملاقات ختم ہو گئی۔

سرگودھا سے ماموں آئیں گے
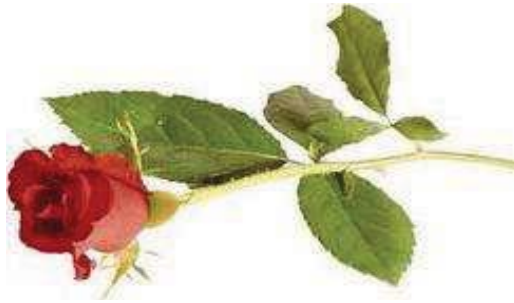
ہم پنجابی زبان میں خواجہ سراؤں کو کھسرے کہتے ہیں' یہ بے چارے مردوں اور عورتوں کے درمیان ایک خوفناک زندگی گزارتے ہیں' یورپ اور امریکا جیسے ممالک میں ان لوگوں کو عام شہریوں کے برابر بلکہ بعض ریاستوں میں عام شہریوں کے مقابلے میں زیادہ حقوق حاصل ہیں لیکن پاکستان میں یہ لوگ عبرت ناک صورتحال کا شکار ہیں اور انہیں پیٹ پالنے کیلئے اکثر اوقات بداخلاقی کی اس حد تک جانا پڑ جاتا ہے جس کے تصور تک سے گھن آتی ہے' یہ لوگ مردانہ یا زنانہ اوصاف کی کمی کا شکار ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود ان میں بلا کی حس مزاح ہوتی ہے شاید یہی وجہ ہے آپ کسی بھی کھسرے کی طرف دیکھیں آپ کیلئے ہنسی روکنا مشکل ہو جائے گی' یہ لوگ بڑے بڑے زہریلے فقرے گھڑتے ہیں اور یہ فقرے اکثر اوقات ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں' مجھے ایک بار ایک کھسرے اور ایک خاتون کی لڑائی دیکھنے کا اتفاق ہوا' وہ خاتون بلا کو خان تھی اور کھسرے کا جنگی پیمانے پر ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی' یہ لڑائی آہستہ آہستہ اس فیز میں داخل ہو گئی جس میں پہنچ کر بے شرمی کو بھی پسینہ آ جاتا ہے چنانچہ سننے والوں کے کان سرخ ہونا شروع ہو گئے اور لوگ ایک ایک کر کے موقع واردات سے کھسکنے لگے' میں بھی اپنے دوست کے ساتھ وہاں سے چل پڑا لیکن جاتے جاتے دونوں کا ایک ایسا معرکۃ الآراء مکالمہ میرے کان میں آ پڑا جس نے آنے والے دنوں میں باقاعدہ فلسفے کی حیثیت اختیار کر لی' کھسرے نے "جوش جنگ" میں خاتون سے چلا کر کہا" میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گی / گا" یہاں میں آپ کو یہ بھی بتاتا چلوں "اٹھا کر لے جانا" ایک نہایت وسیع ٹرم ہے اور اس میں وہ ساری وارداتیں شامل ہیں جو پریم چوپڑا یا مصطفیٰ قریشی پرانی فلموں میں کیا کرتے تھے' خاتون کھسرے کے بلیغ اشارے کو سمجھ گئی اور اس نے فوراً جواب دیا" تو کیا فائدہ' تم سے مجھے کیا خطرہ' تم تو کھسرے ہو" یہ فقرہ کھسرے کی غیرت پر تیزاب کا قطرہ ثابت ہوا' انگریزی میں اس قسم کی حرکت کو "بلو دی بیلٹ" کہا جاتا ہے' کھسرے کو بھی "بلو دی بیلٹ" تکلیف ہوئی لیکن اس نے اپنی خامی' اپنی کمزوری کو جس خوبصورت طریقے سے "جسٹی فائی" کیا میں اس کی ذہانت پر قربان ہو گیا اور مجھے آج تک نہ صرف اس کا وہ فقرہ یاد ہے بلکہ آج میں اس فقرے کو باقاعدہ فلسفہ سمجھتا ہوں' اس نے جواب دیا" تم فکر نہ کرو' میں تمہیں اٹھاؤں گا (گی) اور تمہارے "استقبال" کیلئے سرگودھے سے اپنے ماموں کو بلاؤں گا (گی) اور تمہیں بتا دوں اس نے چار شادیاں کی ہوئی ہیں اور اس کے بارہ بچے ہیں"۔

آپ اگر اس واقعے پر تھوڑی سی توجہ دیں تو آپ کو اس میں بڑا بھیانک سیاسی فلسفہ دکھائی دے گا' ہم لوگ زندگی میں جب کمزوری' خامی یا سمجھوتے پر مجبور ہوتے ہیں تو اس وقت ہم اپنے کسی نہ کسی ماموں کی طرف دیکھنے لگتے ہیں جو سرگودھا کے کسی گاؤں سے اپنی پوری مردانگی کے ساتھ ہمارے پاس آئے گا اور ہمارے دشمن کا "استقبال" کرے گا' ہمارے دشمن کے ساتھ لڑے گا' اس کا مقابلہ کرے گا' اس کی ٹانگیں اور بازو توڑے گا اور جب دشمن زخموں سے چور ہو جائے گا تو وہ فتح کا جھنڈا ہمارے ہاتھ میں پکڑا کر چپ چاپ چک 211 شمالی گ ب واپس لوٹ جائے گا اور ہم فتح کا جھنڈا اٹھا کر ڈھول کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیں گے' ہم چند لمحوں کیلئے اس فلسفے کو "ماموں آئیں گے" کا نام دے دیتے ہیں' مجھے یقین ہے آپ کو اب فوری طور پر پورے معاشرے میں اس قسم کے

سینکڑوں ہزاروں کردار دکھائی دیں گے اور آپ کو محسوس ہو گا ہم میں سے ہر دوسرا شخص اپنے پیشیجز کے مقابلے کیلئے کسی نہ کسی ماموں کا راستہ دیکھ رہا ہے اور بدقسمتی سے ان کا ماموں چک 211 شمالی گ ب سے باہر نہیں آ رہا چنانچہ ان کے مسائل اپنی جگہ پر قائم دائم ہیں' آپ اس فلسفے کو اب سابق صدر پرویز مشرف کی واپسی کے اعلان اور اس کے جواب میں وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کے اس تاریخی بیان کے سامنے رکھ کر دیکھئے جس میں وزیراعظم نے فرمایا "پرویز مشرف آئیں گے تو چیف جسٹس ان کا استقبال کریں گے" تو آپ کو ساری صورتحال کھل کر سامنے آتی نظر آئے گی کاش ہم وزیراعظم صاحب سے یہ پوچھ سکتے جناب این آر او کے ذریعے فائدے آپ اٹھائیں' پرویز مشرف سے وزارت عظمیٰ کے حلف آپ لیں' آپ کی ساری کابینہ آمر پرویز مشرف کے سامنے کھڑی ہو کر وزارتوں کے قلم دان سنبھالے' امریکا' برطانیہ' یو اے ای اور سعودی عرب کی حکومتوں کو درمیان میں ڈال کر پرویز مشرف کے ساتھ "باعزت رخصتی" کا معاہدہ آپ کریں' پرویز مشرف کو مستعفی ہونے پر تمام سہولتوں کا وعدہ آپ کریں' پرویز مشرف کو ایوان صدر میں گارڈ آف آنر آپ دیں' پرویز مشرف کو سرمائے سمیت ملک سے باہر جانے کی اجازت آپ دیں' پاکستان میں موجود پرویز مشرف کے ظاہری اور خفیہ اکاؤنٹس کی حفاظت آپ کریں' پرویز مشرف کی پراپرٹی کی سرکاری سطح پر نگہداشت آپ کریں' پرویز مشرف کو لندن جانے کا موقع آپ دیں' پرویز مشرف کو لندن میں سیکورٹی آپ فراہم کریں' پرویز مشرف کو پاسپورٹ آپ جاری کریں اور یہ پاسپورٹ "ایکسپائر" ہو جائے تو نیا پاسپورٹ بھی آپ بنا کر دیں' پرویز مشرف کے دنیا بھر کے دوروں پر خاموش آپ رہیں' پرویز مشرف کے خلاف آرٹیکل سکس آپ استعمال نہ ہونے دیں' پرویز مشرف کے خلاف عدالتوں میں مقدمے آپ دائر نہ ہونے دیں' پرویز مشرف کی اہلیہ کو ائیر پورٹس پر پروٹوکول آپ دلائیں' پرویز مشرف کی والدہ کو سرکاری سہولتیں آپ فراہم کریں اور پرویز مشرف کے دوستوں کو کاروباری ٹھیکے' وزارتیں اور سرکاری عہدے آپ دیں لیکن جب پرویز مشرف کے استقبال کی باری آئے تو یہ کام چیف جسٹس آف پاکستان کریں' واہ جی واہ! اس جمہوریت کی مردانگی کو سات سلام ہیں' آپ نے ثابت کر دیا بدترین جمہوریت بہترین آمریت سے ہزار درجے بہتر ہوتی ہے کیونکہ یہ جمہوریت مردانگی کے جوہر سے پاک ہوتی ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو گا پرویز مشرف کے "اعلان واپسی" کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کی صفوں میں سراسیمگی پھیل گئی ہے اور یہ دونوں جماعتیں جو پچھلے تین برسوں سے ایک دوسرے کی دشمن چلی آ رہی تھیں یہ پرویز مشرف کے نقطے پر ایک بار پھر "کولیشن پارٹنر" بنتی نظر آ رہی ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی خواہش ہے پرویز مشرف کا مقابلہ عدلیہ' وکلاء' میڈیا اور سول سوسائٹی کرے اور یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر آرام سے تماشے دیکھتی رہیں' مجھے اس نام نہاد جمہوریت پر ترس آتا ہے جس میں اس پرویز مشرف کا مقابلہ کرنے کی بھی ہمت نہیں جو دو سال پہلے اس ملک سے بھاگنے پر مجبور ہو گیا تھا اور پاکستان میں کوئی اس کی ٹیلی فون کال تک سننے کیلئے تیار نہیں تھا' جسے اس کی اپنی بنائی ہوئی پارٹی پاکستان مسلم لیگ (ق) چھوڑ گئی تھی اور جس کی شامیں اب نشے کے عالم میں پاؤنڈز کی ویلیں دے کر گزرتی ہیں' ہماری جمہوریت اگر اس پرویز مشرف کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور وزیراعظم کو پرویز مشرف کے "استقبال" کیلئے چیف جسٹس کی ضرورت ہے تو پھر پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟ ہم اس خواجہ سرا جمہوریت کا کیا کریں گے جس میں اپنی حفاظت کیلئے بھی مردانگی نہیں

[illegible]
وزیراعظم اگر ایم کیوایم کے قائد الطاف حسین کے اس بیان جس میں انہوں نے محبِ وطن جرنیلوں کو آگے آنے اور مارشل لاء نما سسٹم کو اس ملک کی بقاء قرار دیا تھا اور پرویز مشرف کی واپسی کے اعلان کو آمنے سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہ مستقبل کے آئینے میں اپنی شکل زیادہ واضح انداز سے دیکھ سکیں گے' آپ ایک لمحے کیلئے سوچئے الطاف حسین کا مطلب کہیں پرویز مشرف جیسے ''محبّ وطن'' جرنیل تو نہیں تھا اور مارشل لاء نما سسٹم وہ تو نہیں جو پرویز مشرف بین الاقوامی طاقتوں کی مدد سے پاکستان میں لانے کا منصوبہ بنارہے ہیں اور یہ بھی ذہن میں رکھئے اگر ایم کیو ایم نے پرویز مشرف کی حمایت کا اعلان کر دیا' انہیں کراچی میں اترنے اور ایم کیوایم کے کسی حلقے سے الیکشن لڑنے کی دعوت دے دی تو اس وقت کیا سیناریو ہو گا؟ ذرا تصور کیجئے کیا اس وقت بھی چیف جسٹس آف پاکستان ہی پرویز مشرف کا ''استقبال'' کریں گے اور اگر یہ وقت آ گیا تو ہم اس وقت سرگودھا سے کسی ماموں کو تکلیف دیں گے۔

ایک فرمائشی کالم

وہ خاتون واقعی خوبصورت تھی اور آپ اسے ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے' انسان کی شخصیت صرف سراپے تک محدود نہیں ہوتی' پرسنیلیٹی کیلئے صرف قد کاٹھ' رنگ' نین نقش' ہاتھ پاؤں اور آنکھیں کافی نہیں ہوتیں' انسان کے اندر کیا ہے؟ یہ کتنا پڑھا لکھا ہے' اس کا وژن کتنا وسیع ہے' اس کی قوت مشاہدہ کتنی ہے' اس کی سوچ' اس کے احساس کا افق کتنا کھلا ہے' اس کے اندر رحم' ہمدردی اور محبت کا کتنا جذبہ ہے' یہ تہذیب اور شائستگی کی کس بلندی پر فائز ہے' یہ گفتگو کرنے' اٹھنے بیٹھنے' مخاطب ہونے اور دوسرے کے خیالات کے احترام میں کتنا طاق ہے اور یہ لفظوں کی بجائے باڈی لینگویج سے کتنا کام لیتا ہے یہ تمام چیزیں بھی پرسنیلیٹی کیلئے انتہائی اہم ہوتی ہیں' میں اگر یہ کہوں ہماری شخصیت میں ''آؤٹ لک'' دس فیصد سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور باقی نوے فیصد ہماری ذات کے اندر چھپا ہوتا ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا لیکن ہم میں سے زیادہ تر لوگ ظاہر سے مار کھا جاتے ہیں' آپ ایک لمحے کیلئے سوچئے اگر دنیا کی خوبصورت ترین عورت آپ کے سامنے چائے کے کپ میں چھینک مار دے یا قمیض کے دامن سے ناک صاف کر لے یا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر سر سے جوئیں نکالنا شروع کر دے تو آپ کے احساسات کیا ہوں گے؟ اسی طرح دنیا کا خوبصورت ترین اور وجاہت اور کشش سے مالا مال نوجوان سب کے سامنے اپنی قمیض کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنی بغلوں میں خارش شروع کر دے یا محفل میں جرابیں اتار کر بیٹھ جائے یا دوسروں کی مذہبی روایات کا مذاق اڑانا شروع کر دے تو آپ کے اس کے بارے میں کیا خیالات ہوں گے؟ اسی طرح مسٹر یونیورس یا مس ورلڈ جاہل اور ان پڑھ نکل آئے' اس کی آواز بھدی ہو یا وہ گالیاں بکنا شروع کر دے یا وہ چند سیکنڈ میں بھڑک اٹھے اور دوسروں کے گلے پڑنے کی کوشش کرے تو کیا آپ اس کی شخصیت سے متاثر ہوں گے؟ نہیں ہوں گے! اس کا یہ مطلب ہوا جب تک انسان کے ظاہر اور باطن میں ''ہارمنی'' نہیں ہوتی یا پھر اس کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا' ہم اس وقت تک خوبصورت انسان کو خوبصورت نہیں کہہ سکتے اور اس خاتون میں یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں' وہ ظاہری لحاظ سے یونان کے قدیم مجسمہ سازوں کا شہکار تھی' یوں لگتا تھا اس کا ایک ایک نقش پوری توجہ' پوری یکسوئی سے گھڑ گھڑ کر بنایا گیا ہے' وہ ماتھے کی ادھوری شکن سے لے کر پاؤں کے ناخن تک ایک مکمل اور ناقابل فراموش عورت تھی' رہ گیا اس کا باطن تو میں نے آج تک اس سے زیادہ ذہین عورت نہیں دیکھی' اس کو بات کرنی آتی تھی' وہ ایک ایک لفظ اس طرح بولتی تھی کہ اس کے اندر چھپے سارے معنی اپنے سارے رنگوں کے ساتھ باہر آجاتے تھے' اس نے سینکڑوں ہزاروں کتابیں بھی پڑھی تھیں اور وہ زمانے' لوگوں اور حالات کی بھی نباض تھی' قصہ مختصر اس کی موجودگی میں وہ سب کچھ تھا جسے سب کچھ کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

وہ مجھے دو دن سے فون کر رہی تھی اور اس کا کہنا تھا' وہ صرف ملاقات کیلئے کراچی سے آئی ہے اور یہ ملاقات انتہائی ضروری ہے' میں نے اس کے اصرار کے سامنے شکست تسلیم کر لی اور یوں وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی' میرا خیال تھا وہ پاکستان کے کسی بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ وہ کسی بھی پہلو' کسی بھی اینگل سے مڈل کلاس یا لوئر مڈل کلاس دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن جب اس نے مجھے اپنا پیشہ بتایا تو مجھے اپنی سانس سینے میں دبتی ہوئی

محسوس ہوئی' وہ اس پیشے سے تعلق رکھتی تھی جس کا نام لیتے ہوئے بھی انسان کو شرم آتی ہے' میرا بھی سر جھک گیا لیکن اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی' اس کا کہنا تھا وہ مجھ سے ایک فرمائشی کالم لکھوانا چاہتی ہے اور اس کالم سے اس ملک کی ہزاروں لاکھوں بچیوں اور ان کے والدین کا بھلا ہو جائے گا' میرے لئے یہ ایک عجیب مطالبہ تھا چنانچہ میں نے معذرت کر لی لیکن اس کا کہنا تھا ''آپ پہلے میری بات سن لیں' فیصلہ بعد میں کیجئے گا'' اور یہاں سے اس کی کہانی شروع ہو گئی' وہ کراچی کے ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے کے ساتھ تعلق رکھتی تھی' اس کے والدین پٹھانوں' کشمیریوں اور اعوانوں کا ''کمبی نیشن'' تھے چنانچہ وہ بچپن ہی سے انتہائی خوبصورت تھی' والدین نے اسے اعلیٰ تعلیم دلائی' اس نے کراچی کے ایک بڑے بزنس کالج سے ایم بی اے کیا اور ایک غیر ملکی بینک کی برانچ میں ''انٹرن شپ'' شروع کر دی' اس ''انٹرن شپ'' کے دوران بینک میں اسے ایک نوجوان ملا' یہ انتہائی خوبصورت' فارن کوالی فائیڈ اور امیر نوجوان تھا' یہ ڈیفنس میں دو کنال کی کوٹھی میں اکیلا رہتا تھا' ڈیڑھ کروڑ کی گاڑی میں سفر کرتا تھا اور ہفتے میں کریڈٹ کارڈ کے ذریعے دو تین لاکھ روپے کی شاپنگ کرتا تھا' یہ نوجوان کی پرسنیلٹی' اس کے لائف سٹائل اور اس کی دولت سے متاثر ہو گئی اور دونوں کے درمیان دوستی کا تعلق پیدا ہو گیا' اس دوستی کے دوران نوجوان نے اس پر پانی کی طرح پیسہ بہانا شروع کر دیا' یہ سلسلہ دو ماہ تک چلتا رہا پھر اچانک ایک دن نوجوان نے ایک ''سی ڈی'' اس کے حوالے کر دی' اس ''سی ڈی'' میں ان دونوں کی ''خوفناک'' فلم تھی' یہ گھبرا گئی' نوجوان نے بتایا ''کسی نے ہم دونوں کی فلم بنا لی ہے اور یہ اب مجھے بلیک میل کر رہا ہے'' خاتون گھبرا گئی' بہر حال قصہ مختصر ایک ہفتے میں ایک تیسرا کردار درمیان آیا' خاتون سے ملا اور اس نے اسے بتایا وہ ایک بڑے گینگ میں پھنس چکی ہے' وہ نوجوان اس گینگ کا حصہ تھا اور اب اس کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں وغیرہ وغیرہ' قصہ مزید مختصر ان لوگوں نے آخر میں اسے اس پیشے کی آفر کی جس میں یہ اب ملوث ہے' اس نے بچنے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ اس وقت تک بری طرح پھنس چکی تھی' ان لوگوں نے بعد ازاں اسے ٹریننگ دی اور اس کے بعد اس کام میں دھکیل دیا۔

خاتون نے انکشاف کیا یہ لوگ ملک میں مافیا کی طرح کام کرتے ہیں' ان کا ہیڈ کوارٹر کراچی میں ہے لیکن یہ لوگ ملک کے تمام بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں' اس میں لڑکیاں بھی ہیں اور لڑکے بھی' یہ لوگ خوبصورت لڑکیوں کو زنانہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے دلاتے ہیں' یہ لڑکیاں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں خوبصورت لڑکیاں تلاش کرتی ہیں' ان کے ساتھ دوستیاں لگاتی ہیں' انہیں اپنے ساتھ ریستورانوں' ہوٹلوں اور پارٹیوں میں لے کر جاتی ہیں' وہاں انہیں اس مافیا کے خوبصورت لڑکے ملتے ہیں' ان لڑکوں کے پاس بڑی بڑی گاڑیاں اور ہیوی کریڈٹ کارڈ ہوتے ہیں' یہ لڑکیوں کے ساتھ دوستیاں لگاتے ہیں' انہیں شاپنگ کراتے ہیں' شادی کا جھانسہ دیتے ہیں' ان کی فلمیں بناتے ہیں اور بعد ازاں یہ لڑکیاں مافیا کے پھندے میں پھنس جاتی ہیں' اس مافیا کے کارکن لڑکے شاپنگ سینٹروں' بینکوں' ٹریول ایجنسیوں اور نیم سرکاری دفتروں میں بھی پھرتے رہتے ہیں اور انہیں جہاں کوئی خوبصورت لڑکی ملتی ہے یہ اسے گھیر لیتے ہیں' ان لوگوں نے لڑکیوں کو پھانسنے کیلئے بڑے بڑے دفتر اور جعلی کمپنیاں بھی بنا رکھی ہیں' یہ لوگ مہنگے علاقوں میں بڑی بڑی کوٹھیاں بھی لے لیتے ہیں اور یہ اپنے شکار

کو بچانے کیلئے کئی کئی لاکھ روپے خرچ کرتے ہوئے بھی دریغ نہیں کرتے۔خاتون نے انکشاف کیا' کام نکل جانے کے بعد نوجوان لڑکوں کا رول ختم ہو جاتا ہے' یہ غائب ہو جاتے ہیں اور ان کے بعد دوسرے لوگ سامنے آ جاتے ہیں جس کے بعد لڑکی کے پاس خودکشی یا ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا'' اس کا کہنا تھا'' یہ لوگ بڑے بڑے بااثر گھرانوں کی لڑکیوں کو بھی گھیر لیتے ہیں' یہ لڑکیاں بعد ازاں انہیں پولیس اور ایجنسیوں سے بھی بچاتی ہیں اور انہیں دوسرے بااثر گھرانوں تک بھی پہنچاتی ہیں'' اس کا کہنا تھا وہ اس ملاقات کے ذریعے تمام والدین تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کی سہیلیوں پر نظر رکھا کریں' ہو سکتا ہے اس سہیلی کا تعلق اس مافیا سے ہو' یوں ان کی بیٹی بھی اس کی طرح ایسے گھناؤنے گرداب میں پھنس جائے' اس کا کہنا تھا تمام لڑکیاں بھی گھروں سے باہر قدم رکھتے ہوئے اس کی کہانی کو ضرور سامنے رکھیں' ہو سکتا ہے جسے وہ اپنا منگیتر سمجھ رہی ہوں وہ اسے اس راستے پر لے جائے جس کے آخر میں دکھ اور گناہ کے علاوہ کچھ نہیں' میں نے اس سے پوچھا'' کیا آپ کے والدین کو آپ کی جاب کا علم ہے'' اس نے انکار میں سر ہلایا اور بولی'' نہیں میں بظاہر ایک بڑی کمپنی میں کام کرتی ہوں' وہاں میری حاضری بھی لگتی ہے اور ہر مہینے تنخواہ بھی جاری ہوتی ہے لیکن مجھ سے کام اس نوعیت کے لئے جاتے ہیں'' اس کی کہانی انتہائی ہولناک تھی' میں نے اس سے یہ فرمائشی کالم لکھنے کا وعدہ کر لیا' وہ اٹھی اور میں اسے چھوڑنے کیلئے باہر آ گیا' باہر اس کی گاڑی کھڑی تھی' ڈرائیور نے لپک کر سیون سیریز بی ایم ڈبلیو کا دروازہ کھولا' میں نے ڈرائیور کو پہچان لیا' یہ ملک کی ایک اہم شخصیت کا ڈرائیور تھا اور وہ مجھے دیکھ کر تھوڑا تھوڑا پریشان تھا۔
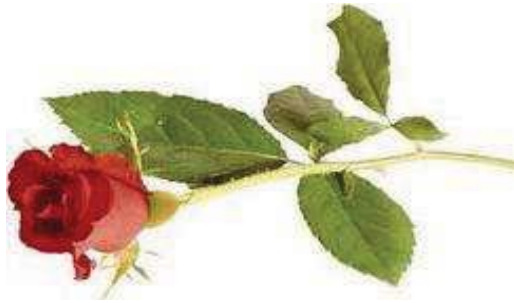
یہ فارمولہ شروع میں صرف یہودیوں تک محدود تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ ہمارے شیخ اور میمن بھی اس کے ہاتھوں بیعت ہوتے چلے گئے چنانچہ اب یروشلم کے ڈیوڈ اور فلپ ہوں یا بڑے حاجی صاحب یا س بیر بھائی یہ تمام ''جان چلی جائے لیکن مال بچ جائے'' کے فارمولے کے تحت زندگی گزار رہے ہیں' یہ لوگ حب مال میں اس قدر آگے چلے جاتے ہیں کہ ان کی نظر میں عزت اور جان دونوں غیر ضروری ہو جاتی ہیں اور یہ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اگر مال بچ گیا تو یہ کسی نہ کسی طریقے سے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور اگر مال نہ بچا تو پھر عزت اور جان دونوں کا کوئی فائدہ نہیں' میرا خیال تھا یہ فارمولہ ابھی صرف شیخ اور میمن برادریوں تک محدود ہے اور اس کی تابکاری نے دوسرے شعبوں کو متاثر نہیں کیا لیکن جب سے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کھل کر سامنے آئے ہیں اور انہوں نے ''ہمیں کوئی گھر نہیں بھجوا سکتا' میں منتخب وزیراعظم ہوں' اگر کوئی غیر جمہوری طریقہ استعمال کیا گیا تو ملک ٹوٹ جائے گا اور میں حضرت غوث الاعظم کی اولاد ہوں'' وغیرہ وغیرہ قسم کے بیانات دینا شروع کئے ہیں' مجھے اس وقت سے اس فارمولے کے اثرات سیاست تک جاتے دکھائی دے رہے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے وزیراعظم صاحب کیلئے اقتدار ان کی جان اور عزت دونوں سے زیادہ اہم حیثیت اختیار کر چکا ہے اور یہ اب میمنوں اور شیخوں کی طرح اس وقت تک اس کے ساتھ لٹکے رہیں گے جب تک عوام انہیں ووٹ دینے پر پوری طرح پچھتا نہیں لیتے اور اس پچھتاوے میں سڑکوں پر نہیں آجاتے یا پھر پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاست پانچ سال پورے کر کے دفن نہیں ہو جاتی' یہ تخمینہ لگانا سرے دست مشکل ہے کہ آئندہ چند ہفتوں یا چند دنوں میں کیا ہوگا؟ لیکن یہ طے ہے حالات اب جوں کے توں نہیں رہیں گے' کیوں نہیں رہیں گے اس کی چار بڑی وجوہات ہیں۔

پاکستان کے اقتدار ساز اداروں یا قوتوں نے 2008ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اقتدار میں لانے کا فیصلہ فوج کے خراب ہوتے امیج کی وجہ سے کیا تھا' اس وقت عوام میں فوج کا امیج اس قدر خراب ہو چکا تھا کہ فوجی افسر گھروں سے سول کپڑوں اور عام گاڑیوں میں دفتر پہنچتے تھے' دفتر میں یونیفارم پہنتے تھے اور یونیفارم ہاتھ روم میں لٹکا کر واپس گھر آتے تھے' اقتدار ساز طاقتوں کا خیال تھا پاکستان پیپلز پارٹی آئے گی تو یہ ماضی کی بدنامیوں کا بوجھ بھی اٹھا لے گی اور عوام کو بھی متحرک کر لے گی' پیپلز پارٹی کے تین برسوں میں فوج کا امیج بحال ہو گیا' جنرل کیانی نے فوج کو سیاست سے الگ کر کے اس کی فارمیشن پر توجہ دی' فوج نے پرویز مشرف کو سپورٹ نہ کر کے بھی اپنا امیج بہتر بنایا اور حالیہ سیلاب کے دوران فوج کے ریسکیو آپریشن نے بھی اس کے امیج کو سہارا دیا چنانچہ آج پاک آرمی کا وہ امیج نہیں رہا جو 2007ء یا 2008ء تک تھا لہٰذا اب اگر یہ پردے کے پیچھے رہ کر کسی تبدیلی کو سپورٹ کرتی ہے تو عوام ''مائینڈ'' نہیں کریں گے۔ دو' عالمی طاقتیں 2007ء تک پرویز مشرف جیسے آمر سے جو کچھ حاصل کرنا چاہتی تھیں یہ کر چکی تھیں اور ان کا خیال تھا باقی کام اب جمہوری حکومت سے لیا جائے' محترمہ بے نظیر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی پرویز مشرف کی ''روشن خیالی اور اعتدال پسندی'' کے قریب تھی لہٰذا پاکستان پیپلز پارٹی کو آگے آنے کا موقع دیا گیا لیکن بدقسمتی سے تین برسوں میں اعتدال پسندی اور روشن خیالی کو پچھلا گیئر لگ گیا اور معاشرے میں زیادہ شدت پسندی آ گئی اور مغرب اس شدت پسندی سے پریشان ہے چنانچہ یہ بھی تبدیلی چاہتا ہے

اور تین ’ملکی معیشت جیٹ طیارے کی رفتار سے نیچے آ رہی ہے‘ کرپشن بے قابو ہو چلی ہے‘ مس مینجمنٹ کی یہ حالت ہے کہ وزیراعظم ایک افسر کو لگانے کا حکم جاری کرتے ہیں اور دو دن بعد یہ نوٹی فکیشن واپس لے لیتے ہیں اور یہ مس مینجمنٹ بھی اب حکومت کو چلنے نہیں دے رہی اور چار‘ عوام میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے‘ ملک کے اندر اور باہر یہ تاثر مضبوط ہو تا جا رہا ہے کہ صورتحال کو کنٹرول نہ کیا گیا تو ملک میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی اور اگر ایک بار حالات ایسے ہو گئے تو پھر پاکستان جیسی نیوکلیئر طاقت کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے گا چنانچہ جو بھی کیا جائے فوراً کیا جائے اور یہ فوراً بھی حکومت کی رخصتی کا باعث بن رہا ہے۔

یہ وہ وجوہات ہیں جن کی بنیاد پر تبدیلی کے اشارے واضح ہوتے جا رہے ہیں لیکن اب سوال یہ ہے یہ تبدیلی آئے گی کیسے؟ میرا خیال ہے اس تبدیلی کے دو ہی طریقے ہیں‘ آئینی اور غیر آئینی‘ آئینی طریقے کیلئے اپوزیشن کو پارلیمنٹ میں وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنا ہو گی یا صدر کا مواخذہ اور یہ سر دست ممکن نہیں کیونکہ اپوزیشن بالخصوص پاکستان مسلم لیگ ن کے پاس اتنے ارکان نہیں ہیں کہ یہ آئینی طریقے سے تبدیلی لا سکے‘ اس کو آئینی طریقے کیلئے پاکستان مسلم لیگ ق‘ ایم کیو ایم‘ اے این پی‘ جے یو آئی اور آزاد ارکان کو ساتھ ملانا ہو گا اور یہ ممکن نہیں کیونکہ میاں صاحب پاکستان مسلم لیگ ق‘ ایم کیو ایم‘ اے این پی اور جے یو آئی کے ساتھ کس منہ سے ہاتھ ملائیں گے اور یہ جماعتیں بھی صرف میاں نواز شریف کو اقتدار میں لانے کیلئے ان کا ساتھ کیوں دیں گی؟ اب آتے ہیں غیر جمہوری طریقے کی طرف‘ اس کے تین طریقے ہیں‘ ایک‘ فوج ملک میں مارشل لاء لگا دے‘ آئین معطل کر دے‘ پی سی او لائے اور حکومت شروع کر دے‘ یہ حل بھی آج کے سیناریو میں ممکن نہیں کیونکہ فوج بھی اس کیلئے تیار نہیں‘ عالمی برادری بھی اس کو سپورٹ نہیں کرے گی اور عدلیہ بھی کس منہ سے اس اقدام کو درست قرار دے گی؟ میڈیا بھی ہرگز ہرگز اسے سپورٹ نہیں کرے گا۔ دو‘ وزیراعظم اور صدر پر استعفے کیلئے دباؤ ڈالا جائے‘ یہ دونوں مستعفی ہو جائیں اور ملک میں شوکت ترین کی سربراہی میں ٹیکنوکریٹس کی حکومت بنا دی جائے یا پھر عمران خان کی قیادت میں عارضی حکومت تشکیل دے دی جائے‘ یہ حکومت احتساب کیلئے عدالت سے وقت مانگے اور عدالت انہیں دو ڈھائی سال دے دے‘ یہ حکومت دونوں جماعتوں کا خوفناک احتساب کرے‘ ملکی معیشت کو دوبارہ ٹریک پر لائے اور 2013ء کے آخر میں نئے الیکشن کرا دیئے جائیں اور تین‘ عدلیہ این آر او کیس یا عدالتی کاموں میں مداخلت کے کسی کیس یا پھر ججوں کو دھمکیاں دینے اور ان پر قاتلانہ حملے کرانے کے کسی مقدمے میں وزیراعظم اور صدر کو ”ڈس کوالی فائیڈ“ قرار دے اور ساتھ ہی فوج سے اس حکم پر عملدر آمد کی درخواست کر دے‘ فوج مداخلت کرے اور دونوں سے اقتدار کے ایوان خالی کرا لے‘ پارلیمنٹ کو اندر سے تبدیلی کا موقع دیا جائے‘ پارلیمنٹ ناکام ہو جائے تو شوکت ترین یا عمران خان کی سربراہی میں کیئر ٹیکر حکومت بنا دی جائے‘ یہ حکومت نئے الیکشنوں کا اعلان کرے لیکن بعدازاں ملکی صورتحال کو جواز بنا کر الیکشنوں کو ناقابل عمل قرار دے دے‘ عدالت اس حکومت کو دو ڈھائی سال دے دے اور یوں یہ حکومت ”گند“ صاف کرنے میں جت جائے‘ اس دوران سیاسی قیادتیں ملک سے باہر چلی جائیں‘ پاکستان کی تمام مسلم لیگیں اکٹھی ہو جائیں‘ میاں نواز شریف بھی ان مسلم لیگیوں میں شامل ہو جائیں‘ یہ مسلم لیگیں ایوان کے اندر تبدیلی لائیں‘ کسی غیر معروف مسلم لیگی لیڈر کو وزیراعظم بنا دیا جائے‘ وزیراعظم حالات کنٹرول نہ کر سکے‘ اسمبلیاں توڑ دی جائیں‘

نئے الیکشن ہوں اور نئی حکومت بن جائے۔

یہ وہ تمام سیناریوز ہیں جو اس وقت پائپ لائن میں ہیں اور پورا اسلام آباد ان ''سیناریوز'' کے بطن سے جنم لینے والی افواہوں میں پھنس چکا ہے' ہمیں ماننا پڑے گا حالات غیر معمولی شکل اختیار کر چکے ہیں اور ان غیر معمولی حالات میں میاں نواز شریف خاصی مشکل کا شکار ہیں' یہ اگر 2013ء کا انتظار کرتے ہیں تو اس وقت تک عوام سیاستدانوں اور جمہوریت دونوں سے مایوس ہو جائیں گے اور ان کی نظر میں دونوں پارٹیاں اور دونوں لیڈر ایک سکے کے دو رخ ہو جائیں گے' دوسری صورت میں اگر میاں صاحب آئینی تبدیلی کیلئے مسلم لیگوں میں شامل ہو جاتے ہیں تو انہیں ق لیگ کے ساتھ ''کمپرومائز'' کرنا پڑے گا اور یوں ان کی کریڈیبلٹی متاثر ہو گی اور تیسری صورت میں اگر یہ غیر جمہوری عمل کو سپورٹ کرتے ہیں یا پھر اس کوشش پر خاموش رہتے ہیں تو یہ اپنی ''باری'' سے بھی محروم ہو جائیں گے اور غیر جمہوری طاقتوں کے ایجنٹ بھی ثابت ہو جائیں گے چنانچہ میاں نواز شریف اپنے سیاسی کیریئر کے مشکل ترین دور سے گزر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے یہ پوزیشن پیدا کس نے کی؟ ہمیں ماننا پڑے گا یہ اور اس سے ملتی جلتی تمام سیاسی پوزیشنز کے ''آرکی ٹیکٹ'' صدر آصف علی زرداری ہیں اور میں جب بھی اس مزاحیہ صورتحال کا جائزہ لیتا ہوں تو میں قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا ہوں اور میرے اندر سے زرداری صاحب زندہ باد کا نعرہ نکلتا ہے اور میں ان کی ذہانت کے اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہوں لیکن زیادہ ذہین ہونا بھی خطرناک ہوتا ہے کیونکہ ذہانت انسان سے بعض اوقات ایسی غلطی کرا بیٹھتی ہے جس کا کوئی مداوا نہیں ہوتا اور زرداری صاحب سیاست کو اس سرخ لکیر تک لے آئے ہیں جہاں سے پیچھے ہٹنا بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا آگے جانا۔

ہر جنرل‘ ڈیگال نہیں ہوتا
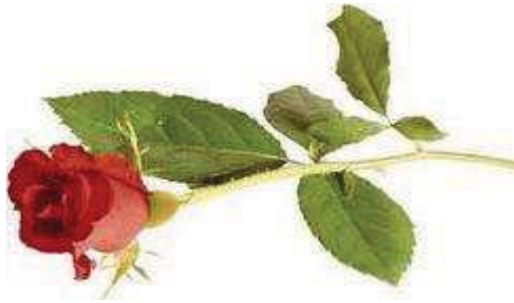
صدر (سابق) پرویز مشرف سیاست میں کودنے کیلئے پوری طرح پر تول رہے ہیں‘ یہ سیاست میں ضرور آئیں‘ یہ پاکستان بھی آئیں‘ پارٹی بھی رجسٹرڈ کرائیں اور الیکشن بھی لڑیں کیونکہ پاکستان کا آئین انہیں اس کا پورا پورا حق دیتا ہے لیکن میری ان سے درخواست ہے یہ سیاست کی دلدل میں چھلانگ لگانے سے پہلے ایک بار اپنے سینئر جنرل (ر) اسلم بیگ سے مشورہ ضرور کر لیں۔ یہ حقیقت ہے جنرل پرویز مشرف اپنے اقتدار کے سوا نیزے پر جنرل اسلم بیگ اور جنرل حمید گل کو نام نہاد دانشور کہتے تھے اور اپنی تقریروں‘ انٹرویوز اور خطابات میں ان کے بارے میں توہین آمیز کلمات بولتے تھے مگر اس کے باوجود میری درخواست ہے ایک بار جنرل اسلم بیگ سے مشورہ ضرور کر لیں کیونکہ جنرل صاحب ایک تو آپ کے سینئر ہیں اور سابق فوجی آمر کی تکلیف کو جس گہرائی کے ساتھ ایک ریٹائرڈ آرمی چیف محسوس کر سکتا ہے یہ صلاحیت اللہ تعالیٰ نے کسی بلڈی سویلین کو عنایت نہیں کی اور دو‘ جنرل پرویز مشرف آج جس راستے پر قدم رکھ رہے ہیں جنرل اسلم بیگ 1993ء میں نہ صرف اس راستے پر سیاسی گھوڑے دوڑا چکے ہیں بلکہ یہ بری طرح مار بھی کھا چکے ہیں اور سیانے کہتے ہیں آپ نے مشورہ کرنا ہو تو عقل مند سے نہ کریں‘ تجربہ کار سے کریں اور جنرل اسلم بیگ تجربہ کار ہیں۔ میں نے جنرل پرویز مشرف کو ''مشورہ'' تو دے دیا لیکن مجھے یقین ہے پرویز مشرف جنرل اسلم بیگ سے رابطہ نہیں کریں گے کیونکہ بدقسمتی کے بارے میں کہتے ہیں انسان جب اس کے گھیرے میں آتا ہے تو اس کی کشتی ساحل پر بھی ڈوب جاتی ہے اور جنرل (ر) پرویز مشرف کے ساتھ یہی ہو رہا ہے۔ جنرل صاحب وہی غلطی دہرا رہے ہیں جو جنرل اسلم بیگ نے 1993ء میں کی تھی اور اس کے بعد ان کی سیاست اخباری بیانات اور ٹیلی ویژن انٹرویوز تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مجھے معلوم ہے جنرل پرویز مشرف جنرل اسلم بیگ سے رابطہ نہیں کریں گے چنانچہ جنرل اسلم بیگ کے تجربے کی کہانی میں ہی جنرل صاحب کو سنا دیتا ہوں۔

جنرل اسلم بیگ 1990ء میں سیاسی لحاظ سے بہت ''ایکٹو'' تھے‘ یہ اقتدار کو بہت قریب سے دیکھ چکے تھے‘ یہ 1988ء میں جنرل ضیاء الحق کے انتقال کے بعد اقتدار پر قابض بھی ہونا چاہتے تھے لیکن غلام اسحاق خان نے انہیں موقع نہیں دیا‘ بے نظیر بھٹو کی حکومت آئی تو اس وقت بھی جنرل اسلم بیگ دو تین مرتبہ اقتدار کے قریب پہنچے لیکن یہ مواقع بھی ضائع ہو گئے‘ جنرل اسلم بیگ 16 اگست 1991ء میں ریٹائر ہو گئے اور 1993ء میں انہوں نے باقاعدہ سیاست میں آنے کا فیصلہ کر لیا‘ انہوں نے عوامی قیادت پارٹی کے نام سے اپنی سیاسی جماعت بنا لی‘ جنرل صاحب نظریاتی اور لسانی لحاظ سے ایم کیو ایم کے قریب تھے‘ ان کے ایک مہربان نے لندن میں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین سے رابطہ کیا‘ جنرل اسلم بیگ اور الطاف حسین میں طے ہوا اگر جنرل صاحب کسی نہ کسی طریقے سے قومی اسمبلی کی پندرہ نشستیں حاصل کر لیں تو ایم کیو ایم ان کا ساتھ دینے کا اعلان کر دے گی‘ یوں ایم کیو ایم کی اٹھارہ نشستیں اور جنرل صاحب کی بارہ نشستیں مل کر تیس ارکان ہو جائیں گے اور یہ تیس ارکان آگے چل کر دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ جوڑ توڑ کریں گے اور یوں جنرل اسلم بیگ کو صدر بنا دیا جائے گا۔ یہ فارمولا طے پا گیا‘ اس دور میں میرے ایک دوست جنرل اسلم بیگ کے بہت قریب تھے‘ یہ دوست آج کل ملک کے ہاؤسنگ

سیلٹر کے سب سے بڑے ٹائی کون ہیں‘ جنرل صاحب نے ان کو بلوایا‘ انہیں سولہ کروڑ روپے دیئے‘ پاکستان کے بادشاہ گر اور اسلحے کے سوداگر بریگیڈئر نیاز اس وقت جنرل اسلم بیگ کے قریب ہوتے تھے‘ بریگیڈئر نیاز نے بھی اس سیاسی کھیل میں ”کنٹری بیوشن“ کیا‘ تیسرا کنٹری بیوشن مہران بینک کے صدر سیٹھ یونس حبیب کی طرف سے آیا اور یوں یہ رقم سولہ کروڑ سے چوبیس کروڑ ہو گئی‘ یہ فیصلہ ہوا جنرل اسلم بیگ امیدواروں کا فیصلہ کریں گے اور ریئل ٹائی کون ان امیدواروں کے الیکشن کے اخراجات پورے کریں گے‘ جنرل صاحب نے امیدوار سلیکٹ کر لئے اور ریئل ٹائی کون نے امیدواروں کو سرمایہ فراہم کرنا شروع کر دیا‘ سیاست کنوئیں کی طرح ہوتی ہے جس میں کروڑوں روپے ایک آدھ اینٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لہٰذا چوبیس کروڑ روپے ہوا میں اڑتے دیر نہیں لگی اور چند دنوں میں جنرل صاحب کا سرمایہ ختم ہو گیا‘ الیکشن کے دن قریب پہنچ آئے تو ایک دن میرے دوست کو لندن سے ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کا ٹیلی فون آ گیا‘ یہ تعزیت کیلئے کسی دوست کے گھر جا رہے تھے‘ الطاف حسین نے ان کو بتایا ”میں جنرل اسلم بیگ سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن وہ ٹیلی فون پر موجود نہیں ہیں‘ آپ انہیں میرا یہ پیغام دے دیں ہماری رابطہ کمیٹی نے الیکشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیا ہے اور ہم اب الیکشن نہیں لڑ رہے“ میرے دوست کے بقول یہ سن کر ان کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی کیونکہ جنرل اسلم بیگ کے اقتدار کا تمام تر منصوبہ ایم کیو ایم کی نوک پر کھڑا تھا اور اگر ایم کیو ایم الیکشن نہیں لڑتی تو جنرل اسلم بیگ کا سارا منصوبہ خاک میں مل جاتا۔ یہ راستے ہی سے اسلم بیگ کے گھر کی طرف دوڑے‘ جنرل اسلم بیگ اس وقت سو رہے تھے‘ میرے دوست نے انہیں جگایا اور انہیں تازہ ترین صورتحال سے مطلع کیا‘ جنرل صاحب کی نیند اڑ گئی‘ وہ ننگے پاؤں لان میں آئے‘ وہ اسی عالم میں ٹیلی فون پر الطاف حسین کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن ایم کیو ایم کا فیصلہ اٹل تھا‘ ٹیلی فون بند ہوا تو جنرل اسلم بیگ اقتدار کے خوابوں کے ساتھ ساتھ چوبیس کروڑ روپوں سے بھی محروم ہو چکے تھے‘ وہ محل سے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے کیونکہ ان کا سارا سرمایہ ڈوب چکا تھا‘ ایم کیو ایم نے بعد ازاں صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور وہ سندھ اسمبلی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتی رہی۔

پرویز مشرف بھی آج وہی غلطی کر رہے ہیں‘ ان کا خیال ہے متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب انہیں سرمایہ فراہم کرے گا‘ برطانیہ اور امریکا انہیں سیاسی اور سفارتی مدد دے گا اور ایم کیو ایم انہیں کراچی میں لینڈ کرنے‘ سیاسی سرگرمیاں شروع کرنے اور کراچی کے کسی ایک حلقے سے الیکشن لڑنے اور جیتنے کا موقع دے دے گی اور فیس بک پر موجود ان کے تین لاکھ ”فین“ ان کیلئے سڑکوں پر نکل آئیں گے‘ یہ لوگ پہلے کراچی میں ان کا استقبال کریں گے اور بعد ازاں لاہور اور اسلام آباد کے جلسوں میں ان کے حق میں نعرے لگائیں گے‘ رہ گئی ان کی دفتری سرگرمیاں تو یہ میجر جنرل (ر) راشد قریشی‘ بیرسٹر محمد علی سیف‘ ڈاکٹر شیر افگن نیازی اور ڈاکٹر امجد سنبھال لیں گے‘ پیچھے رہ گئی فوج تو پاک فوج میں ابھی تک ان کے جونیئرز موجود ہیں‘ یہ لوگ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ لوگ ان کے خلاف کوئی مقدمہ چلنے دیں گے اور نہ ہی انہیں گرفتار ہونے دیں گے اور یوں یہ عوام کے ووٹوں سے ملک کے وزیراعظم بن جائیں گے اور ایک بار پھر ”سب سے پہلے پاکستان“ کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ یہ منصوبہ خوابوں اور کاغذوں میں بظاہر اچھا اور مکمل دکھائی دیتا ہے لیکن حقائق اس سے برعکس ہیں‘ ایم کیو ایم اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان اختلافات کی خلیج گہری ہوتی جا رہی ہے لیکن اس کا فائدہ

ایم کیو ایم اور پاکستان پیپلز پارٹی کے درمیان اختلافات کی خلیج گہری ہوتی جا رہی ہے لیکن اس کا فائدہ جنرل پرویز مشرف کی بجائے پاکستان مسلم لیگ ق اٹھائے گی' پاکستان مسلم لیگ ق مسلم لیگوں کو اکٹھا کر رہی ہے' یہ مسلم لیگیں آزاد ارکان کو ساتھ شامل کریں گی اور اس کے بعد ایم کیو ایم کو سندھ میں حکومت بنانے کی پیش کش کر دیں گی۔ یہاں سے ایک نیا سیاسی کھیل شروع ہو جائے گا جس کے آخر میں پاکستان مسلم لیگ بھی اپنا ڈول ڈال دے گی' یہ تمام سیاسی کھلاڑی اس دوران سپریم کورٹ کے فیصلوں سے فائدہ اٹھاتے چلے جائیں گے یہاں تک کہ نئے الیکشن کا اعلان ہو جائے گا' اس سیاسی کھیل میں پرویز مشرف صرف ایک جگہ دکھائی دیتے ہیں اور یہ وہ جگہ ہے جسے جنرل اسلم بیگ نے 1993ء میں خالی کیا تھا یعنی جنرل پرویز مشرف آئیں اور اپنے دو تین ارب روپوں سے محروم ہو جائیں اور باقی زندگی کمین گاہ میں چھپے اپنے ہی دوستوں کو لعن طعن کر کے گزار دیں چنانچہ میری جنرل صاحب سے درخواست ہے آپ اپنا سرمایہ اور بچی کھچی عزت بچائیں کیونکہ دنیا کا ہر جنرل فیلڈ مارشل چارلس ڈیگال کا مقدر لے کر پیدا نہیں ہوتا' ان میں کچھ جنرل اسلم بیگ ہوتے ہیں اور کچھ پرویز مشرف۔

طوطے کی طرح

دفاعی پیداوار کے وفاقی وزیر عبدالقیوم جتوئی کے ساتھ وہی ہوا جو اُس اداکارہ کے ساتھ ہوا تھا جو بولنے والا طوطا خریدنے گئی' وہ طوطے کے سامنے کھڑی ہوئی تو طوطے نے چلا کر اپنے مالک سے کہا" مجھے اس کے ہاتھ فروخت نہ کرنا" مالک نے طوطے کو گھور کر دیکھا' اداکارہ نے منک کر طوطے سے پوچھا"تم میرے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتے" طوطے نے بڑی جرات سے جواب دیا"اس لئے کہ آپ کا کردار ٹھیک نہیں ہے" اداکارہ کو بہت غصہ آیا اوراس نے مالک سے کہا"تمہیں اور تمہارے طوطے کو شرم آنی چاہئے" مالک نے معذرت کی اور عرض کیا"میں طوطے کو ابھی شریف بنا دیتا ہوں" اس نے طوطے کو پنجرے سے نکالا اُسے پانی کی بالٹی میں لمبی ڈبکی دی' دوبارہ پنجرے میں رکھا اور ادکارہ سے کہا"یہ اب شریف ہو چکا ہے' آپ اب اس کا امتحان لے سکتی ہیں" اداکارہ نے طوطے سے پوچھا"میں اگر شام کو ایک اجنبی مرد کے ساتھ گھر آؤں تو وہ کون ہو گا؟" طوطے نے اپنے گیلے پر پھڑ پھڑائے اور آہستہ سے بولا"وہ یقیناً آپ کا بھائی ہو گا" اداکارہ خوش ہو گئی اوراس نے پوچھا"اگر میرے ساتھ دو مرد ہوں تو؟" طوطا بولا"میرا خیال ہے یہ دونوں آپ کے بھائی ہوں گے" اداکارہ نے قہقہہ لگایا اور پوچھا"اور اگر میرے ساتھ تین مرد ہوں تو؟" طوطے نے غور سے اس کی طرف دیکھا' سر جھکایا' پر پھڑ پھڑائے اور ذرا دیر سوچ کر بولا"میں سمجھوں گا تیسرا بھی آپ کا بھائی ہے" اداکارہ خوش ہو گئی اوراس نے پوچھا"اوراگر میرے ساتھ چار مرد ہوں تو؟" طوطے نے سر اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا' پھر بھیگے ہوئے پروں پر نظر ڈالی' چند سیکنڈ سوچا اور مالک کی طرف مڑ کر بولا"آپ بالٹی قریب لے آئیں' میں اس سے زیادہ شریف نہیں رہ سکتا" عبدالقیوم جتوئی بھی طوطے کی طرح تین سال تک شریف رہے ہیں لیکن تین سال بعد انہوں نے"ڈبکی" قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ شائداسی لئے انہوں نے 25 ستمبر کو طلال بگٹی کے گھر میڈیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فرمایا"کرپشن میں بھی مساوات ہونی چاہئے' کرپشن پر سب کا حق ہے' 60 برسوں میں ہمیشہ کرپشن کی گئی لہٰذا بلوچیوں' سندھیوں' پنجابیوں اور سرائیکیوں کو بھی کرپشن پر حق حاصل ہے" انہوں نے فوج کے بارے میں فرمایا"فوج ذوالفقار علی بھٹو' بے نظیر اور نواب اکبر بگٹی کی قاتل ہے' ہم نے اسے بوٹ اس لئے نہیں پہنائے کہ وہ ہمارے حقوق غصب کرے اور ہمارے رہنماؤں ذوالفقار علی بھٹو' بے نظیر بھٹو اور نواب اکبر بگٹی کو شہید کرے۔" اور عدلیہ کے بارے میں ان کے خیالات تھے"چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کا تعلق فیصل آباد سے ہے اور یہ بلوچستان کے جعلی ڈومیسائل پر چیف جسٹس بنے ہیں۔" کرپشن میں مساوات جتوئی کا پرانا فلسفہ ہے' یہ اس سے پہلے 2 دسمبر 2009ء کو ہمارے پروگرام"کل تک" میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں' انہوں نے فرمایا تھا"کرپشن پر پاکستان پیپلز پارٹی کا بھی حق ہے" ان کا کہنا تھا"اگر دوسری جماعتیں کرپشن کر سکتی ہیں تو ہم پاکستان پیپلز پارٹی کے ارکان اور راہنما کرپشن کیوں نہیں کر سکتے" ان کے ان خیالات کے بعد ملک میں ہلچل مچ گئی تھی جس کے بعد وزیراعظم نے ان پر ٹاک شوز میں جانے پر پابندی لگا دی تھی اور اس پابندی کے بعد قیوم جتوئی قریباً" دس ماہ ٹیلی ویژن چینلز سے غائب رہے تھے لیکن دس ماہ بعد انہوں نے 25 ستمبر کو دوبارہ پرانا تیر داغ دیا اور پورے سسٹم کو جڑوں سے ہلا دیا' سیاسی"دائیوں" کا خیال ہے یہ بیان عبدالقیوم جتوئی نے خود نہیں دیا

یہ ان سے دلوایا گیا ہے جبکہ میں اس تھیوری سے اختلاف کرتا ہوں' عبدالقیوم جتوئی کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر وسیع جرات رندانہ دے رکھی ہے کہ یہ اس سے کہیں زیادہ تیزابی بیانات داغ سکتے ہیں' یہ علاقہ جتوئی کے ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں' بچپن میں ان کی سوتیلی والدہ نے انہیں کھانے میں پارہ ڈال کر کھلا دیا تھا جس کے باعث یہ جسمانی اور دماغی عارضوں کا شکار ہوگئے تھے' یہ عارضے آج کل سامنے آ رہے ہیں' عبدالقیوم جتوئی بولنے' کرنے اور اپنی خواہش کے اظہار کے دوران ڈرتے نہیں تھے' یہ پرویز مشرف کے دور میں مظفر گڑھ کے ضلع ناظم رہے ہیں' یہ اس علاقے میں پاکستان پیپلز پارٹی کے واحد نمائندے تھے اور انہوں نے چھ سات سال تک پرویز مشرف اور پاکستان مسلم لیگ ق کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا' 2008 کے الیکشن کے بعد یہ اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ کلب میں شراب' شباب اور کباب کی محفل میں رنگے ہاتھوں بھی پکڑے گئے تھے' ان کی فلم بھی بنی تھی' یہ فلم آج تک یوٹیوب پر موجود ہے اور لاکھوں لوگ اب تک اس کا "معائنہ" کر چکے ہیں لیکن عبدالقیوم جتوئی اس پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئے' ان کی نظر میں یہ خالص مردانہ واردات تھی اور مردانہ وارداتوں پر مردوں کو شرمندگی نہیں ہونی چاہئے اور مجھے یہ واقعہ بھی پاکستان پیپلز پارٹی ہی کے ایک رکن نے بتایا تھا' جتوئی صاحب وفاقی وزیر کی حیثیت سے کسی دفاعی سودے کیلئے برطانیہ تشریف لے گئے تھے اور وہاں سرکاری ملاقات کے دوران انہوں نے برطانیہ کے وزیر سے پوچھ لیا' میں اگر برطانیہ کی شہریت کیلئے درخواست دوں تو مجھے کتنے عرصے میں انگلینڈ کی نیشنلٹی مل سکتی ہے؟ لہٰذا آپ ان چند واقعات سے اندازہ لگا لیجئے عبدالقیوم جتوئی کس قدر جرات مند اور نڈر انسان ہیں اور یہ طوطے کی طرح ڈبکی کھا لیں گے لیکن سچ بولنے سے پرہیز نہیں کریں گے۔

میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ سمجھتا ہوں عبدالقیوم جتوئی نے غلط نہیں کیا' یہ وہ خیالات ہیں جو ہم لوگ پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں' ایم این ایز اور ایم پی ایز کے منہ سے اکثر سنتے رہتے ہیں' یہ اکثر "آف دی کیمرہ" فرماتے رہتے ہیں' ہمیں فوج چلنے نہیں دے رہی' ہمیں مکمل اقتدار نہیں ملا اور جمہوریت مکمل نہیں ہوئی' وغیرہ وغیرہ۔ یہ لوگ اکثر سپریم کورٹ اور اس کے ججوں کو بھی تنقید کا ہدف بناتے رہتے ہیں' یہ چیف جسٹس کے بارے میں بھی مذموم پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں اور میڈیا' اینکر پرسنز اور کالم نگاروں کو بھی چیف جسٹس کے بارے میں بولنے اور لکھنے کیلئے اکساتے رہتے ہیں لیکن یہ لوگ عبدالقیوم جتوئی کے برعکس کیمروں اور لوگوں کے سامنے اس "سچ" کے اظہار کیلئے تیار نہیں ہوتے' عبدالقیوم جتوئی میں یہ جرات موجود ہے شائد اسی لئے انہوں نے اس سچ کا برملا اور کھل کر اظہار کر دیا۔ آپ یقین کیجئے چودھری قمر زمان کائرہ ہوں' راجہ پرویز اشرف ہوں یا پھر رحمان ملک ہوں حکومت کے اہم ستونوں کے خیالات وہی ہیں جو عبدالقیوم جتوئی کے ہیں بس عبدالقیوم جتوئی بول پڑے ہیں جبکہ باقی حضرات میں "ابھی" بولنے کی جرات نہیں' بہر حال میں عبدالقیوم جتوئی کی اس جرات پر سلام پیش کرتا ہوں کیونکہ جرات ہر لحاظ سے قابل تعریف بھی ہوتی ہے اور قابل تقلید بھی۔ اور ہمیں ماننا پڑے گا عبدالقیوم جتوئی کے دل میں جو کچھ تھا انہوں نے وہ کہہ دیا جبکہ باقی حضرات یہ سب کچھ کہنے کیلئے اپنی حکومت کے جانے کا انتظار کر رہے ہیں' آپ دیکھ لیجئے آج سے پندرہ دن بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے زیادہ تر وزراء یہی کچھ فرما رہے ہوں گے جو 25 ستمبر کو عبدالقیوم جتوئی نے کہا تھا۔ جتوئی صاحب بہادر انسان ہیں چنانچہ انہوں نے

[illegible]
پیپلز پارٹی سچ سمجھ رہی ہے اور پورا ملک جھوٹ کیونکہ اس بار اس ملک میں جمہوریت کو فوج نہیں بلکہ پاکستانی پیپلز پارٹی نقصان پہنچا رہی ہے۔

تبدیلی کا وقت آچکا ہے

میاں نواز شریف کے لہجے میں یقین تھا‘ ان کا کہنا تھا ”ہمارے پاس اب سچ بولنے اور سچ کا سامنے کرنے کے سوا کوئی آپشن نہیں‘ ہم نے اور ہمارے سیاستدان بھائیوں نے اگر سچ نہ بولا‘ انہوں نے اپنی غلطیوں‘ اپنی کوتاہیوں اور اپنی خامیوں کا اعتراف نہ کیا اور انہوں نے اگر قوم سے معافی نہ مانگی تو معاملات وہاں چلے جائیں گے جہاں سے یہ ”ری ورس“ نہیں ہو سکیں گے“ میں رائے ونڈ میں میاں نواز شریف کی رہائش گاہ پر ان کے سامنے بیٹھا تھا‘ یہ 28 ستمبر کی نیم گرم سہ پہر تھی‘ کمرے کے باہر شام آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی لیکن اندر کا ماحول بہت روشن تھا‘ ہم میاں نواز شریف کی سیاست پر بے شمار اعتراضات کر سکتے ہیں‘ ہم یہ کہہ سکتے ہیں میاں صاحب وہ کردار ادا نہیں کر رہے جو ایک اپوزیشن لیڈر کو کرنا چاہئے تھا‘ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں میاں نواز شریف ضرورت سے زیادہ محتاط ہیں اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں پاکستان مسلم لیگ ن نے صوبائی اور قومی اسمبلی کے امیدواروں کو ٹکٹ دیتے ہوئے احتیاط سے کام نہیں لیا تھا اور ان امیدواروں کی جعلی ڈگریوں نے پاکستان میں سیاست‘ سیاسی جماعتوں اور مسلم لیگ تینوں کو بدنام کر دیا‘ پاکستان مسلم لیگ ن کے امیدواروں کی ڈگریوں کی کیا حالت ہے‘ آپ اس کا اندازہ صرف اس مثال سے لگا لیجئے عارف والا کے این اے 166 کے ایم این اے رانا زاہد کی ڈگری عنقریب ایک دھماکا ثابت ہو گی‘ رانا زاہد نے ایف اے اور بی اے پہلے کیا تھا اور میٹرک بعد میں اور ان کی بی اے کی ڈگری پر بلوچستان یونیورسٹی کا مانوگرام چھپا تھا لیکن یونیورسٹی کے رجسٹرار نے عدالت میں یہ لکھ کر دے دیا ہے یہ ڈگری نہ صرف جعلی ہے بلکہ افسوسناک حد تک جعلی ہے۔ یہ کیس ابھی زیر سماعت ہے اور شائد آنے والے چند دنوں میں یہ پاکستان مسلم لیگ ن کیلئے شدید ہزیمت کا باعث بن جائے‘ ہم ان جعلی ڈگریوں کو بھی میاں نواز شریف کی سیاسی بے احتیاطی قرار دے سکتے ہیں‘ میاں صاحب کو ٹکٹ جاری کرنے سے پہلے امیدواروں کی سکروٹنی کرنی چاہئے تھی لیکن ان تمام سیاسی خامیوں کے باوجود ہم میاں صاحب کی چند ذاتی اور سیاسی خوبیوں کا اعتراف کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔

میاں صاحب کی ذات میں ایک خاص نوعیت کی حلیمی‘ سادگی اور مہمان نوازی ہے‘ میڈیا کے لوگ جب بھی میاں نواز شریف کا انٹرویو کرنے جاتے ہیں تو یہ سٹاف کے چھوٹے سے چھوٹے ملازم کو اپنے ہاتھوں سے پلیٹیں پکڑا کر کھانا کھلاتے ہیں‘ یہ بظاہر ایک معمولی سی بات دکھائی دیتی ہے لیکن اگر اس کو بڑے کینوس میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کوئی چھوٹی خوبی نہیں۔ میاں نواز شریف واحد سیاستدان اور لیڈر ہیں جن کے دستر خوان پر ڈرائیور سے لے کر کیمرہ مین اور اینکر سے لے کر پروڈیوسر تک سب پہنچتے ہیں اور یہ اپنی نگرانی میں نہ صرف انہیں کھانا کھلاتے ہیں بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے انہیں پلیٹیں بھی پکڑاتے ہیں‘ ان کے بعد چودھری شجاعت حسین کی مہمان نوازی کا نمبر آتا ہے جبکہ ان کے علاوہ کوئی لیڈر‘ کوئی سیاستدان چینلز کے چھوٹے سٹاف کو ”لفٹ“ نہیں کراتا‘ میاں نواز شریف میں حس جمال اور حس مزاح بھی ہے‘ ان کے گھر‘ ان کے دفتر میں ایک خاص جمالیاتی حس‘ صفائی ستھرائی اور سلیقہ دکھائی دیتا ہے‘ اس سلیقے‘ صفائی اور حس جمال سے دوسرے راہنما محروم ہیں۔ میاں صاحب ہلکے پھلکے موڈ میں بعض اوقات ایسا بھڑکتا ہوا فقرہ داغ دیتے ہیں جو لوگوں کو برسوں یاد رہتا ہے اور آخری بات

میاں نواز شریف حالات کی نزاکت کا ادراک رکھتے ہیں' انہیں صاف دکھائی دے رہا ہے اگر سیاستدانوں نے اپنا ہاؤس ان آرڈر نہ کیا تو ملک ناختم ہونے والی انارکی کا شکار ہو جائے گا چنانچہ سیاستدانوں بالخصوص پاکستان کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن کو اپنا آئینی اور سیاسی کردار ادا کرنا چاہیے۔

یہ ستمبر کی 28 تاریخ تھی اور میں رائے ونڈ میں میاں نواز شریف کے پاس ان کے گھر میں بیٹھا تھا' میاں نواز شریف کا کہنا تھا ''آصف علی زرداری کو چاہئے تھا یہ 2008ء کے الیکشن کے بعد عوام کے سامنے یہ اعتراف کر لیتے مجھ سے ماضی میں کچھ غلطیاں ہو گئی تھیں' میں نے کرپشن بھی کی کک بیکس بھی لیں اور میں نے ناجائز اثاثے بھی بنائے' میں آج اس کا اعتراف کرتا ہوں اور قوم کی لوٹی ہوئی دولت قوم کو واپس کرتا ہوں اور یہ وعدہ کرتا ہوں میں آئندہ ایسی غلطی خود کروں گا اور نہ ہی کسی دوسرے کو کرنے دوں گا تو یقین کیجئے ملک کا مقدر بدل جاتا اور ہم آج ان نازک سیاسی حالات سے نہ گزر رہے ہوتے' زرداری صاحب صدارت کا منصب سنبھالنے کے بعد بھی یہ کر سکتے تھے' چلئے انہوں نے یہ دونوں مواقع ضائع کر دیئے لیکن یہ اب بھی ایسا کر سکتے ہیں' یہ قوم کے سامنے اعتراف کریں' قوم کی لوٹی ہوئی دولت واپس کریں اور پورے جذبے کے ساتھ ملک کی باگ ڈور سنبھال لیں' مجھے یقین ہے قوم انہیں معاف کر دے گی'' میاں نواز شریف کی یہ تجویز اچھی ہے' میرا خیال ہے سچ بولنے کا وقت آ گیا ہے اور ہماری سیاسی قیادت کو اپنی ماضی کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف بھی کرنا چاہئے اور یہ ماضی کی کوتاہیوں کو جس حد تک ٹھیک کر سکتے ہیں یہ اپنی اس قدر اصلاح کر لیں اور اس کے بعد پوری نیک نیتی اور جذبے کے ساتھ ملکی مسائل پر توجہ دیں تو پاکستان ایک نئے دور میں داخل ہو سکتا ہے ورنہ دوسری صورت میں سیاسی درجہ حرارت میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے اس کے نتائج جلد سامنے آنا شروع ہو جائیں گے اور اگر یہ نتائج ایک مرتبہ سامنے آنا شروع ہو گئے تو پھر ملک کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم کرپشن اور مس مینجمنٹ کے ایشوز کو چند لمحوں کیلئے بھول بھی جائیں تو بھی ٹیکس حکومت کی کارکردگی کا بہت بڑا ٹیسٹ ہے' چند دن قبل کسی اخبار میں خبر شائع ہوئی تھی وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اور ان کے 25 وزراء ٹیکس ادا نہیں کرتے' ان ٹیکس نادہندگان میں وفاقی وزیر خزانہ عبدالحفیظ شیخ اور اقتصادی امور کی مشیر حنا ربانی کھر بھی شامل ہیں' اس خبر میں انکشاف کیا گیا تھا وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کا شمار پاکستان کے جاگیردار خاندانوں میں ہوتا ہے لیکن انہوں نے پچھلے تین برسوں میں انکم ٹیکس کے ساتھ ساتھ زرعی ٹیکس بھی ادا نہیں کیا' مخدوم امین فہیم ملک کے بہت بڑے جاگیردار اور ایک بڑی گدی کے مالک ہیں لیکن انہوں نے صرف دس ہزار روپے ٹیکس دیا' عبدالقیوم جتوئی جنوبی پنجاب کے بڑے جاگیردار ہیں' ان کے ایک بیان ''کرپشن پر سب کا حق ہے'' نے پچھلے دنوں عالمی شہرت حاصل کی تھی' انہوں نے صرف 24 ہزار روپے زرعی ٹیکس دیا' راجہ پرویز اشرف اسلام آباد میں چالیس کروڑ روپے کے گھر میں رہتے ہیں اور ان کی جائیدادوں کا کوئی حساب کتاب نہیں' ثمینہ گھرکی' پیر آفتاب شاہ جیلانی اور میرے دوست امتیاز صفدر وڑائچ بھی ''نوابی'' کی حد تک امیر ہیں لیکن یہ صرف رکن اسمبلی کی حیثیت سے ملنے والی تنخواہ پر انکم ٹیکس دے رہے ہیں' انسانی حقوق کے وزیر سید ممتاز عالم گیلانی نے صرف بارہ سو تین روپے' قمر زمان کائرہ جیسے ''غریب'' وزیر نے 7 ہزار 9 سو 99 روپے' نواب آف کالاباغ کے پوتے ملک عماد نے 9 ہزار 64 روپے اور رانا فاروق سعید جیسے

ٹیکس وزیر ہے جس نے 7 ہزار 7 سو 80 روپے ٹیکس دیا ہماری وفاقی کابینہ میں 13 ایسے وزراء ہیں جو دس ہزار سے پچاس ہزار روپے ٹیکس دیتے ہیں' پوری کابینہ میں اے این پی کے مسعود عباس واحد وزیر ہیں جنہوں نے 2 کروڑ 2 لاکھ 10 ہزار روپے ٹیکس دیا تھا جبکہ وزیراعظم سے لے کر کابینہ کے تمام بڑے وزیر غریب اور مسکین ہیں' حکومت پچھلے دو برسوں سے ٹیکس نیٹ بڑھانے کا واویلا کر رہی ہے لیکن اس کی اپنی چارپائی کے نیچے کیا ہو رہا ہے اس پر کوئی توجہ نہیں دے رہا۔ یہ ساری صورتحال ثابت کرتی ہے حالات مشکل دور میں داخل ہو چکے ہیں اور اگر حکومت اور سیاستدانوں نے اپنا قبلہ ٹھیک نہ کیا' انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کیا' اگر انہوں نے اپنے حال کا دامن ماضی سے نہ چھڑایا اور انہوں نے اگر قوم سے معافی نہ مانگی تو حالات ناقابل اصلاح ہو جائیں گے اور اس کے بعد تمام سیاسی فیصلے عوام کریں گے اور سڑکوں اور چوکوں پر کریں گے اور اگر یہ صورتحال آ گئی تو شائد ہم میں سے کوئی نہ بچے اور گندم کے ساتھ ساتھ گھن بھی پس جائے' بانس اور بانسری دونوں ختم ہو جائیں۔ میرا خیال ہے میاں نواز شریف کی تجویز غلط نہیں' صدر آصف علی زرداری کو اس تجویز پر ہمدردانہ غور کرنا چاہئے اور اس کے بعد اسی قسم کی ایک تجویز میاں نواز شریف کے سامنے بھی رکھنی چاہئے کہ یہ بھی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کریں' یہ بھی قوم سے معافی مانگیں اور یہ بھی ملک کو پوری نیک نیتی کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش کریں ورنہ دوسری صورت میں تبدیلی کا وقت آ چکا ہے اور اگر سیاسی قیادت نے خود کو تبدیل نہ کیا تو عوام انہیں ''ٹیک اوور'' کر لیں گے اور یہ ان کا قبلہ اس انداز سے سیدھا کریں گے کہ اس کے بعد یہ دوبارہ ٹیڑھا نہیں ہو گا۔

ہو سکتا ہے
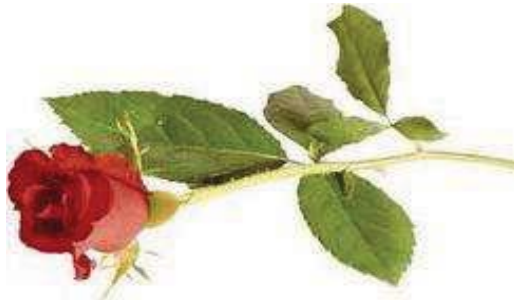
ویسے تو اللہ تعالیٰ کا کرم‘ رحم اور فضل کا کوئی جواز‘ کوئی سسٹم نہیں ہوتا‘ اللہ کی ذات جس پر مہربان ہو جائے یہ اس کیلئے اپنے فضل‘ رحم اور کرم کے سارے دروازے کھول دیتی ہے اور وہ ”منتخب شخص“ دنیا اور آخرت دونوں میں نہال ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے حقیر اور چھوٹے سے دماغ میں اکثر یہ سوال اٹھتا ہے ”اللہ تعالیٰ انسان کے تمام گناہ‘ غلطیاں اور کوتاہیاں کیوں معاف کر دیتا ہے‘ اس کی جناب میں شرک اور ناامیدی کے علاوہ تمام گناہ قابل معافی کیوں ہیں؟“ میں بھی اکثر یہ سوچا کرتا تھا اور ہر نالائق اور جاہل انسان کی طرح اللہ کے فضل‘ کرم اور رحم کا جواز تلاش کرتا رہتا تھا‘ مجھے یہ جواز آج تک کسی کتاب‘ کسی فلسفے اور کسی عالم کے پاس نہیں ملا! یہ ملا تو ایک اُمی درویش سے ملا‘ درویش نے بتایا ”اللہ تعالیٰ انسان سے ستر ماؤں کے برابر محبت کا دعویٰ کرتا ہے‘ محبت کا دل ہمیشہ کھلا‘ وسیع اور اعلیٰ ہوتا ہے‘ محبّ اپنے محبوب کی ہر غلطی‘ ہر کوتاہی اور ہر گستاخی معاف کر دیتا ہے‘ ماں کی محبت محبّ اور محبوب کی محبت سے بھی ہزاروں گنا زیادہ ہوتی ہے‘ ماں خواہ ہٹلر کی ہو‘ میسولینی کی ہو یا پھر چنگیز خان کی‘ یہ کبھی اپنے بیٹے سے نفرت نہیں کر سکتی‘ بیٹا خواہ پوری دنیا میں کھوپڑیوں کے مینار بنا کر ماں کے پاس آ جائے‘ ماں اسے سینے سے لگا لے گی۔ اسی طرح دنیا کے بدبخت ترین بیٹے کو چوٹ لگے‘ اسے کوئی تکلیف ہو تو اس کی ماں بے تاب ہو جائے گی‘ اس کی ماں اس کیلئے ہدایت‘ نیکی اور بخشش کی دعا کرے گی“ وہ رکے اور انہوں نے بتایا ”جبکہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے ستر ماؤں کے برابر محبت کا دعویٰ کرتا ہے‘ یہ ستر ماؤں کے برابر محبت ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہمارے سارے گناہ‘ ساری غلطیاں اور ساری کوتاہیاں معاف کر دیتا ہے‘ بس ہمارے دل میں اپنے گناہوں‘ اپنی کوتاہیوں پر ندامت ہونی چاہئے‘ ہمیں اللہ تعالیٰ سے توبہ اور معافی مانگ لینی چاہئے“۔

مجھے فوراً یہ نقطہ سمجھ آ گیا‘ یہ سب محبت کا کھیل ہے‘ اللہ تعالیٰ ہم سے محبت ہی اس قدر کرتا ہے کہ یہ توبہ کے صرف ایک سجدے اور ندامت کے صرف دو آنسوؤں کے صدقے ہمارا بڑے سے بڑا گناہ اور سنگین سے سنگین ترین غلطی معاف کر دیتا ہے۔ میرا دوسرا سوال عوام کے رویے کے بارے میں تھا‘ آپ اور ہم اکثر سوچتے ہیں عوام ان لوگوں کو بار بار کیوں منتخب کر لیتے ہیں جو ہر بار انہیں دھوکا دیتے ہیں‘ یہ اپوزیشن میں عوام کے جذبات کے ساتھ کھیلتے رہتے ہیں‘ یہ انہیں روٹی‘ کپڑا‘ مکان‘ انصاف‘ احتساب‘ خوشحالی‘ مساوات‘ برابری اور انسانی حقوق کا لولی پاپ دیتے رہتے ہیں‘ عوام ان کی بات مان لیتے ہیں لیکن یہ لوگ جونہی اقتدار میں پہنچتے ہیں‘ یہ لولی پاپ ڈسٹ بن میں پھینکتے ہیں اور عوام کے ساتھ وہ سلوک شروع کر دیتے ہیں جو بھوکے شیر اور چیتے بکریوں اور بھیڑوں کے ساتھ باڑے میں کرتے ہیں‘ یہ عوام کی ہڈیاں تک چبا جاتے ہیں‘ عوام تنگ آ کر دہائیاں دیتے ہیں‘ دعائیں کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر مدد مانگتے ہیں‘ اللہ تعالیٰ عوام کی سن لیتا ہے‘ یہ لوگ فارغ ہو جاتے ہیں‘ جلاوطنی اور اپوزیشن کاٹتے ہیں اور اس دوران ایک بار پھر عوام کے منہ میں لولی پاپ دے دیتے ہیں اور عوام دوبارہ ان کی باتوں میں آ جاتے ہیں! کیوں آ جاتے ہیں؟ مجھے آج تک اس کیوں کا جواب بھی نہیں ملا؟ میں حیران ہوتا تھا‘ عوام ایک بار کے آزمائے ہوئے لوگوں کو بار بار کیوں آزماتے ہیں؟ یہ ہر بار عطار کے لونڈے سے دوا لینے کیوں پہنچ جاتے ہیں‘ مجھے اس کا جواب بھی اسی درویش نے دیا‘ انہوں نے بتایا ”اللہ نے عوام کا دل بھی بڑا کھلا‘ بڑا

وسیع بنایا ہے‘ یہ بھی ماؤں کی طرح سیاستدانوں‘ حکمرانوں اور فوجی جرنیلوں کو معاف کر دیتے ہیں اور ہر بار یہ سمجھتے ہیں یہ لوگ اس بار سنبھل گئے ہوں گے‘ یہ اس بار پہلے جیسے نہیں ہوں گے! ہمارے حکمران اگر عوام کی اس محبت کو سمجھ جائیں اور ایک بار سچے دل سے توبہ کر لیں تو مجھے یقین ہے ملک کے حالات ٹھیک ہو جائیں گے‘ یہ اٹھارہ کروڑ لوگ حکمران طبقے کے ہاتھ اور بازو بن جائیں گے اور یہ ملک ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مسائل کے گرداب سے نکل جائے گا“۔

درویش کی بات درست تھی‘ ہمارے حکمرانوں‘ ہماری حکومت کو ماننا ہو گا پاکستان میں سب کچھ ٹھیک نہیں‘ ادارے بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں اور اگر ادارے ایک بار ٹوٹ جائیں تو یہ بہت بڑی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں‘ آپ دور نہ جایئے آپ انٹیلی جینس بیورو یعنی آئی بی کی مثال لے لیجئے‘ یہ ادارہ ملک دشمنوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کیلئے بنایا گیا تھا‘ اس کا کام عوام کو دہشت گردی‘ لاقانونیت اور قتل و غارت گری سے بچانا تھا‘ یہ ملک میں آنے اور جانے والوں پر نظر رکھنے کیلئے بنا تھا لیکن اس وقت اس کا کام وزیراعظم کو روزانہ ایک خط لکھنا رہ گیا ہے اور وزیراعظم اس کی بھجوائی ہوئی سمری اٹھا کر نہیں دیکھتے‘ اس کا یہ نقصان ہو رہا ہے کہ آج ملک خودکش حملوں اور بم دھماکوں سے گونج رہا ہے! یہ ادارہ اس زوال تک کیسے پہنچا؟ اس کی بے شمار وجوہات میں سے ایک وجہ سیاسی تقرریاں اور میرٹ کی خلاف ورزی بھی ہے‘ 1995ء میں یعنی پاکستان پیپلز پارٹی کے پچھلے دور میں آئی بی کا دائرہ وسیع کرنے کا فیصلہ ہوا تھا‘ اس سلسلے میں آٹھ ہزار نئی عارضی آسامیاں تخلیق کی گئی تھیں‘ پاکستان پیپلز پارٹی نے ان آسامیوں پر اپنے دو سے اڑھائی ہزار کارکن بھرتی کر دیئے‘ ان میں کانسٹیبلوں‘ ہیڈ کانسٹیبلوں اور انسپکٹروں کے ساتھ ساتھ ایک سو بیس اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی شامل تھے‘ ان لوگوں کی بھرتی کے دوران کسی قسم کے میرٹ کا خیال نہیں رکھا گیا تھا‘ شاہی احکامات کی حالت یہ تھی کہ کسی نے انسپکٹر کیلئے اپلائی کیا تو اسے اسسٹنٹ ڈائریکٹر لگا دیا تھا‘ کوئی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کا امیدوار تھا تو اسے انسپکٹر کی پوسٹ دے دی گئی اور ان میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے نوکری کیلئے درخواست تک نہیں دی تھی لیکن ان کا تقرر نامہ جاری ہو گیا بعد ازاں 1997ء میں ملک معراج خالد نے کیئر ٹیکر حکومت کے دوران یہ ساری تقرریاں منسوخ کر دیں‘ یہ لوگ جس کے بعد عدالت چلے گئے‘ عدالتوں میں مقدمہ چلتا رہا یہاں تک کہ معاملہ سپریم کورٹ میں پہنچا اور سپریم کورٹ نے نہ صرف ان تمام تقرریوں کو غیر قانونی قرار دے دیا بلکہ انہیں اس نوکری کیلئے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نااہل بھی قرار دے دیا‘ اسی دوران 2001ء میں فیڈرل پبلک سروس کمیشن نے آئی بی کیلئے گریڈ سترہ کے افسروں کی آسامیاں اناؤنس کیں‘ ملک بھر سے دس ہزار اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپلائی کیا‘ تحریری ٹیسٹ اور انٹرویو ہوئے اور دس ہزار نوجوانوں میں سے 150 افسر گریڈ سترہ میں بھرتی ہو گئے‘ 2008ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت آئی جس کے بعد انٹیلی جنس بیورو دوبارہ پیپلز پارٹی کے دائرہ اختیار میں آ گئی‘ حکومت کو جونہی آئی بی کا چارج ملا‘ حکومت نے 1997ء میں بے دخل ہونے والے تمام افسروں اور ماتحتوں کو تین سال کے واجبات کے ساتھ دوبارہ بحال کر دیا‘ ان بحال ہونے والے افسروں میں پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک ایم پی اے بھی شامل ہیں‘ یہ بحالی ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے ہوئی اور یہ سپریم کورٹ کے قطعی اور فائنل فیصلے کی سیدھی سادی توہین ہے‘ ان

جیالوں کی بحالی کے بعد اس پی آئی اے میں دو دلچسپ صورتحال پیدا ہو گئی۔ ایک پی آئی اے کو ان سابق ملازمین کو کروڑوں روپے کے واجبات دینا پڑ گئے۔ دو' فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ملازمت حاصل کرنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ افسران پڑھ اور سیاسی تقرریوں کے ذریعے ملازمت حاصل کرنے والے جیالوں کے ماتحت ہو گئے' اس صورتحال نے اہل افسروں کا مورال بھی ڈاؤن کر دیا اور یوں اب وہ ادارہ جس نے اٹھارہ کروڑ لوگوں کی حفاظت کرنا تھی اس کی کارکردگی کوری ورس گیئر لگ گیا۔

یہ صرف ایک مثال ہے' آپ کو اس قسم کی مثالیں پاکستان کے ہر بڑے ادارے میں دکھائی دیں گی۔ آپ او جی ڈی سی کو لے لیجئے' پی آئی اے کو دیکھ لیجئے اور سٹیل ملز کا تجزیہ کر لیجئے' آپ کو پاکستان کے ہر بڑے ادارے' ہر بڑی کارپوریشن اور ہر بڑے محکمے میں ایسی ہی داستانیں اور ایسے ہی بحران دکھائی دیں گے' یہ بحران اور یہ داستانیں جہاں اداروں کے اعصاب توڑ رہی ہیں وہاں یہ ملک کے مجموعی بگاڑ میں بھی اضافہ کر رہی ہیں' میری حکومت سے درخواست ہے یہ خود پر بھی رحم کرے اور اس ملک اور اس ملک کے اداروں پر بھی مہربانی فرمائے' آپ ایک بار دل پر ہاتھ رکھ کر سچائی کو تسلیم کر لیں' عوام سے معافی مانگ لیں اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیں' یقین کیجئے آپ کے اقتدار کے سر پر منڈلاتے خطرے بھی ٹل جائیں گے اور عوام کے مسئلے بھی حل ہو جائیں گے کیونکہ ایک اعتراف' ایک معافی اور ایک توبہ انسان کو دس ہزار سال کی مصیبتوں' مشکلوں اور عذاب سے محفوظ کر دیتی ہے' آپ نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا لیکن آپ کے مسئلے حل نہیں ہو رہے' آپ اب ایک بار سچے دل سے اللہ اور عوام سے معافی مانگ کر بھی دیکھ لیں' ہو سکتا ہے یہ فارمولا کامیاب ہو جائے۔

سوری رانگ نمبر
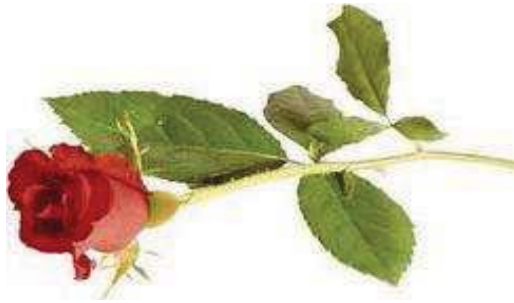
پرویز مشرف کی معافی اور سکھ کے رانگ نمبر میں بے شمار چیزیں کامن ہیں' پرویز مشرف قوم سے کس غلطی پر معافی مانگ رہے ہیں' آپ اس سے پہلے سکھ کے رانگ نمبر کی تفصیل ملاحظہ کیجئے'ایک سردار سفر پر دوسرے شہر گیا' شام کو اس نے اپنے گھر فون کیا' فون کسی ملازم نے اٹھایا' سردار نے ملازم کو حکم دیا'' بیگم صاحبہ سے بات کرا دو'' ملازم نے جواب دیا'' بیگم صاحبہ اس وقت بیڈ روم میں صاحب کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہی ہیں'' سردار نے حیرت سے کہا''اوئے بے وقوف! صاحب تو میں ہوں' وہ کس کے ساتھ چائے پی رہی ہے'' ملازم نے جواب دیا'' جناب یہ میری ملازمت کا پہلا دن ہے' بیگم صاحبہ نے اسی صاحب کو اپنا خاوند کہا تھا'' سردار کو غصہ آگیا اور اس نے چلا کر کہا'' بے وقوف شخص' اس گھر کا مالک اور بیگم صاحبہ کا خاوند میں ہوں اور وہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہی ہے' تم میرا ایک کام کرو'' ملازم نے عاجزی سے عرض کیا'' جی فرمایئے!'' سردار نے اسے حکم دیا'' تم میری سٹڈی میں جاؤ' میری دراز سے ریوالور نکال کر لاؤ'' ملازم نے فون ہولڈ پر کیا' سٹڈی میں گیا' ریوالور نکالا' واپس آیا اور فون اٹھا کر کان سے لگایا' سردار نے اسے حکم دیا'' تم اب یہ فون دوبارہ میز پر رکھو' میرے بیڈ روم میں جاؤ اور دونوں کو گولی مار دو' تم فکر نہ کرو' پولیس تم تک نہیں پہنچے گی اور میں تمہیں دس لاکھ روپے انعام بھی دوں گا'' ملازم نے ''اچھا سرکار'' کہا' فون رکھا اور بیڈ روم میں چلا گیا' چند لمحے بعد سردار کو دو گولیاں چلنے اور لوگوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں' سردار نے ''بے وفاؤں کا یہی انجام ہونا چاہیے'' کا نعرہ لگایا اور ایک لمبی سانس لی' ملازم چند سیکنڈ بعد دوبارہ فون پر آ گیا' سردار نے اسے شاباش دی اور اس کے بعد حکم دیا'' تم اب یہ دونوں نعشیں اٹھاؤ اور سوئمنگ پول میں پھینک دو'' ملازم نے جواب دیا'' لیکن سرکار گھر میں تو کوئی سوئمنگ پول نہیں ہے'' سردار کو غصہ آگیا اور وہ تپتی ہوئی آواز میں بولا'' یہ کیسے ہو سکتا ہے میرے گھر میں شہر کا سب سے بڑا سوئمنگ پول ہے'' ملازم نے جواب دیا'' جناب اس پورے گھر میں کوئی سوئمنگ پول نہیں'' سردار نے حیرت سے کان کھجانا شروع کر دیا اور سوچتے سوچتے بولا'' کیا اس فون کا نمبر .... یہ ہے'' ملازم نے فوراً جواب دیا'' جی نہیں' اس کا نمبر تو .... یہ ہے'' سردار نے ایک لمبی سانس لی اور بولا'' اخو! رانگ نمبر' سوری بھرا جی غلطی ہو گئی''۔

صدر (سابق) پرویز مشرف نے بھی اس سکھ کی طرح یکم اکتوبر 2010ء کو برطانیہ میں اپنی سیاسی جماعت کی ''لانچنگ'' کے دوران اسی قسم کی حرکت فرمائی' پرویز مشرف نے پورے پاکستان کو مخاطب کر کے کہا'' این آر او پر دستخط میری غلطی تھی اور میں اس غلطی پر قوم سے معافی مانگتا ہوں'' پرویز مشرف بھی سکھ کی طرح این آر او کو ''رانگ نمبر'' سمجھ رہے ہیں اور ان کا خیال ہے صرف سوری کہہ دینے سے یہ مسئلہ اب حل ہو جائے گا' پرویز مشرف بھول گئے ہیں این آر او اس ملک کی رہی سہی اخلاقیات کا قتل تھا اور اس آرڈیننس نے ثابت کر دیا تھا پاکستان میں بڑے سے بڑا جرم بھی قابل معافی ہے' آپ بس سیاستدان ہوں' آپ اقتدار کے دوران جی بھر کر لوٹ مار کریں' اثاثے بنائیں' فیکٹریاں لگائیں' غیر ملکی اکاؤنٹس میں رقمیں جمع کریں' محلات خریدیں' سرکاری پراپرٹیز اونے پونے فروخت کریں' آپ اپنے ساتھیوں کو لوٹ مار کی کھلی چھٹی دیں اور جب حکومت تبدیل ہو تو

آپ ملک سے باہر چلے جائیں' جیل میں اے کلاس قیدی کی حیثیت سے چند سال گزاریں اور اس کے بعد کسی نہ کسی این آر او پر دستخط کر کے واپس پاکستان آ جائیں اور اقتدار کی مسند پر جلوہ افروز ہو جائیں' اس کالے قانون نے اس ملک کے ہر بے ایمان شخص کی ڈھارس بندھائی اور ہر ایماندار' سیدھے اور نیک انسان کی قوت ارادی کو کمزور کیا' یہ این آر او محترمہ بے نظیر بھٹو کی جان بھی لے گیا' اس نے عدلیہ کی بحالی کو مزید مشکل بھی بنا دیا' یہ ملک کی دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کو 1990ء کی سیاست تک بھی لے آیا' اس کی وجہ سے کریڈیبلٹی کے بحران کے شکار لوگ بھی اقتدار میں آ گئے' اس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے گروپ بھی سیاسی بندر بانٹ کا حصہ بنے' اس کی وجہ سے حکومت کی کریڈیبلٹی بھی ختم ہو گئی' اس کی وجہ سے آج عدلیہ اور جمہوری حکومت بھی ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہے' اس کی وجہ سے امریکا' برطانیہ اور یو اے ای کی حکومتیں بھی پاکستان کو بلیک میل کر رہی ہیں' اس کی وجہ سے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت بھی پائی جاتی ہے اور آج اس کی وجہ سے ملک تاریخ کے شدید سیاسی بحران میں بھی مبتلا ہے لیکن پرویز مشرف سکھ کی طرح بڑے سکون سے فرما رہے ہیں "این آر او پر دستخط میری غلطی تھی اور میں اس غلطی پر قوم سے معافی مانگتا ہوں" واہ جناب واہ آپ کی کیا بات ہے! یہ ملک واقعی ایک بہت بڑی سرکس ہے اور اس سرکس کے سٹیج پر ہر وقت کوئی نہ کوئی جوکر دکھائی دیتا ہے' میرا خیال ہے اب صرف اتنا باقی ہے کہ پرویز مشرف آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی کو فون کر کے کہیں "اشفاق ان سب کو اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینک دو" اور بس۔

جنرل (ریٹائر) پرویز مشرف میں بے شمار خامیاں ہیں' ان کا عہد ملک کا بدترین سیاسی دور تھا' پرویز مشرف اور شوکت عزیز نے پاکستان میں داڑھی' نماز اور برقعے کو دہشت گردی کا "سمبل" بنا دیا تھا' پرویز مشرف نے ملک کو امریکا کی کالونی کی شکل بھی دی' انہوں نے آزادی کشمیر کو کوسوں دور کر دیا' بھارت کے ساتھ دوستی کے شوق میں ملک کی نظریاتی سرحدیں بھی ہلا کر رکھ دیں' روشن خیالی کی آڑ میں معاشرے کی اخلاقی بنیادیں بھی توڑ دیں' عدلیہ کو بھی "بلڈوز" کر دیا' لال مسجد پر فوجی آپریشن بھی کروا دیا' بین الاقوامی ایجنسیوں کو ملک سے لوگوں کو اٹھانے کا ٹھیکہ بھی دے دیا' پاکستان کو امریکا افغان جنگ میں بھی جھونک دیا' ملکی ادارے اور اثاثے بھی لوٹ سیل پر لگا دیئے' ملک کے سیاسی نظام کو بھی مزید کرپٹ بنا دیا' فوج جیسے ادارے کو بھی عوام میں بدنام کر دیا اور آئین اور قانون کو حکمران طبقے کا غلام بھی بنا دیا وغیرہ وغیرہ لیکن ان تمام خامیوں کے باوجود پرویز مشرف میں تین خوبیاں بھی ہیں اور ہم جہاں ان کی خامیوں پر لعن طعن کرتے ہیں میرا خیال ہے ہمیں ان کی ان خوبیوں کا اعتراف بھی کرنا چاہیے'

پرویز مشرف کی پہلی خوبی بین الاقوامی طاقتوں میں اپنی گنجائش پیدا کرنا ہے' پرویز مشرف اس وقت پاکستان کی بدنام ترین شخصیت ہیں اور یہ لمبی چوڑی سیکورٹی اور عالمی گارنٹیز کے بغیر پاکستان میں قدم نہیں رکھ سکتے اور ملک کا کوئی ادارہ' کوئی سیاسی جماعت اور عوام کا کوئی گروپ انہیں اس وقت سپورٹ نہیں کر رہا لیکن اس کے باوجود یہ امریکا' یورپ' مشرق بعید اور عرب دنیا میں پاپولر ہیں' یہ آج بھی عالمی میڈیا کیلئے "ہاٹ کیک" ہیں' انہیں دنیا بھر کی یونیورسٹیاں کئی کئی لاکھ ڈالر معاوضہ دے کر لیکچر کیلئے بلواتی ہیں اور انہیں یو اے ای اور سعودی عرب کے شاہی خاندان کی حمایت بھی حاصل ہے جبکہ ان کے مقابلے میں پاکستان کے کسی دوسرے سیاسی لیڈر کو یہ اہمیت حاصل نہیں' ...

ہیں ہماری موجودہ سیاسی قیادت کو پرویز مشرف سے یہ جرات سیکھنا چاہیے یہ عہد یہ حقیقت ہے آج کے دور میں کوئی ملک عالمی طاقتوں کی مدد کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا‘ دو پرویز مشرف جانتے ہیں پاکستان میں ان کی کوئی گنجائش نہیں‘ ان کے وہ ساتھی بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں جو اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکال کر ان کے جوتے صاف کرتے تھے۔ پرویز مشرف جانتے ہیں یہ فوج‘ ایم کیو ایم اور امریکا کی گارنٹی کے بغیر پاکستان میں قدم نہیں رکھ سکیں گے لیکن اس کے باوجود انہوں نے نہ صرف لندن میں اپنی سیاسی جماعت لانچ کر دی بلکہ پاکستان کے سیاسی تالاب میں بھی اچھا خاصا طوفان برپا کر دیا‘ یہ حرکت ثابت کرتی ہے پرویز مشرف نے ”گیواپ“ نہیں کیا‘ انہوں نے حوصلہ نہیں چھوڑا‘ میرا خیال ہے ہمارے سیاستدانوں کو ان سے یہ بھی سیکھنا چاہیے اور ان کی تیسری اور آخری خوبی ان کی سیاسی جرأت ہے‘ انہوں نے نقل مکانی کے فوراً بعد لندن سے سیاسی انٹرویوز دینا شروع کر دیئے تھے جبکہ ان کے مقابلے میں محترمہ بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف جلاوطنی کے طویل عرصے تک خاموش رہے تھے‘ ہمارے رہنماؤں کو پرویز مشرف سے یہ بھی سیکھنا چاہیے لیکن ان تینوں خوبیوں کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے پرویز مشرف اب ماضی کا قصہ بن چکے ہیں‘ پاکستان میں ان کی کوئی گنجائش نہیں اور یہ اب زیادہ سے زیادہ لندن میں بیٹھ کر قوم سے معافی مانگ سکتے ہیں یا پھر سکھ کی طرح سوری رانگ نمبر کہہ سکتے ہیں۔

شوکت عزیز سچے نکلے
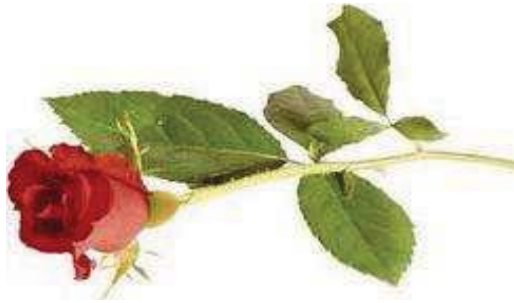
ہم شوکت عزیز کو جتنا چاہیں برا کہہ لیں لیکن یہ حقیقت ہے یہ ایک کاریگر شخص ہیں' یہ سٹی بینک کے ایک عام سے ملازم تھے' دوبئی میں انہوں نے شاہی خاندان کے ساتھ دوستی لگالی' یہ دوستی ان کیلئے ترقی کا دروازہ بن گئی' یہ امریکا واپس گئے وہاں یہ تیسری دنیا کے بادشاہ گروں کے گروپ میں داخل ہوگئے اور یہ بادشاہ گر انہیں بعدازاں پاکستان کے اقتدار تک لے آئے' شوکت عزیز کو پاکستان لانے کا "گناہ" پاکستان مسلم لیگ کے سینیٹر اسحاق ڈار کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا' اسحاق ڈار ایٹمی دھماکوں کے بعد شوکت عزیز کو پاکستان لے کر آئے تھے اور اس دور میں شوکت عزیز میاں نواز شریف کے دوستوں کو پاکستان کے معاشی مسائل کے حل تجویز کیا کرتے تھے' اس دور میں شوکت عزیز کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش سٹیٹ بینک آف پاکستان کی گورنری تھی' اسحاق ڈار اس وقت وزیر خزانہ تھے اور یہ بڑی حد تک شوکت عزیز کی خواہش کا احترام کر رہے تھے لیکن اس دوران 12 اکتوبر 1999ء آگیا' میاں نواز شریف کی حکومت ختم ہوگئی اور جنرل پرویز مشرف نے پاکستان کو ٹیک اوور کر لیا' شوکت عزیز کاریگر شخص تھے' انہوں نے فوراً قبلہ درست کر لیا' انہوں نے پرویز مشرف کا ایک رشتہ دار تلاش کیا' یہ رشتے دار عرف عام میں "شیری موٹا" کہلاتا ہے' شیری موٹا نے انہیں جنرل پرویز مشرف سے ملانے کا بندوبست کیا' شیری کے ایک دوست کا کہنا ہے "ہم شوکت عزیز کو لینے کیلئے اس کے ہوٹل پہنچے تو اس نے شرٹ پہن رکھی تھی' شرٹ پر شاندار ٹائی بھی لگا رکھی تھی لیکن پینٹ کی جگہ اس نے نیکر پہنی ہوئی تھی اور وہ اس عالم میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا' میں نے پینٹ الماری میں لٹکا رکھی ہے تاکہ اس کی کریز خراب نہ ہو' ہم نے چلنے کا اشارہ کیا تو اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ پینٹ میں ٹانگیں گھسیڑیں اور اس احتیاط کے ساتھ ہمارے ساتھ چلنا شروع کر دیا کہ پتلون کی کریز خراب نہ ہو" یہ شوکت عزیز اس ایک ملاقات کے بعد پرویز مشرف کا وزیر خزانہ بھی بنا' پاکستان کا وزیراعظم بھی اور یہ اقتدار کی ایک بھرپور اننگ کھیل کر بڑے سکون' بڑے اطمینان کے ساتھ ملک سے باہر بھی چلا گیا' یہ بھی شنید ہے شوکت عزیز نے سٹاک ایکسچینج کے ذریعے بڑی صفائی سے اربوں روپے کمائے تھے اور یہ اب اس رقم سے عیش کر رہے ہیں' آپ شوکت عزیز کی کاریگری ملاحظہ کیجئے آج پوری دنیا کی توپیں یا تو پرویز مشرف پر فوکس ہیں یا پھر چودھری برادران کو تمام خرابیوں کی جڑ سمجھا جا رہا ہے لیکن پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان مسلم لیگ ن دونوں شوکت عزیز کا نام تک نہیں لے رہیں اور شوکت عزیز بڑے اطمینان سے لندن' نیویارک اور دوبئی میں شاندار زندگی بھی گزار رہے ہیں اور یہ تیسری دنیا کے ممالک کو معیشت بڑھانے کے فارمولے بھی سکھا رہے ہیں' کیا یہ سب کچھ شوکت عزیز کی کاریگری کو ثابت نہیں کرتا۔

مجھے آج کل شوکت عزیز صاحب اپنی چند باتوں کی وجہ سے یاد آ رہے ہیں' شوکت عزیز نے اقتدار سے رخصتی سے چند دن قبل مجھے ملاقات کیلئے بلایا تھا' یہ ملاقات اس لحاظ سے دلچسپ تھی کہ مجھے اس میں وہ شوکت عزیز نظر آیا جو عموماً دکھائی نہیں دیتا تھا' اس ملاقات میں انہوں نے نہ صرف اپنی چند غلطیوں کا اعتراف کیا تھا بلکہ انہوں نے وہ دباؤ بھی مان لیا جس کے باعث انہیں لال مسجد اور چیف جسٹس کی معطلی جیسے اقدامات کرنا پڑے تھے' ان

اعترافات کے بعد شوکت عزیز نے مین حیران کن پیشن گوئیاں کیں' میں نے اس وقت ان سے اختلاف کیا تھا لیکن آج ان کی دو پیشن گوئیاں سچ ثابت ہوتی نظر آرہی ہیں' شوکت عزیز کا کہنا تھا صدر پرویز مشرف کے سارے جرم معاف ہو جائیں گے لیکن یہ مستقبل میں نواب اکبر بگٹی کے قتل میں پھنس جائیں گے کیونکہ اس قتل میں بعض ایسے شواہد موجود ہیں جو جب سامنے آئیں گے تو پرویز مشرف کیلئے بچنا مشکل ہو جائے گا اور ایک ایسا وقت آ جائے گا جب فوج کو ریٹائر جنرل پرویز مشرف اور بلوچستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا اور وہ پرویز مشرف کیلئے مشکل وقت ہوگا' شوکت عزیز کی دوسری پیش گوئی میاں نواز شریف کے بارے میں تھی' ان کا کہنا تھا میاں نواز شریف بھی پاکستان آ جائیں گے لیکن برطانیہ اور سعودی عرب انہیں کھل کر بولنے کی اجازت نہیں دیں گے' اگر مستقبل میں پاکستان مسلم لیگ ق اور پیپلز پارٹی کی حکومت بن گئی تو میاں نواز شریف کبھی گرم' کبھی سرد رہ کر یہ وقت گزاریں گے اور شوکت عزیز کی تیسری پیشن گوئی وکلاء کے بارے میں تھی' ان کا کہنا تھا وکلاء اور ججوں کو کوئی دوسری طاقت اپنے حق میں استعمال کر رہی ہے' وکلاء اس گیم میں خود کو ''جن'' سمجھ رہے ہیں اور جج قوم کا نجات دہندہ' اس گیم کے آخر میں جج بحال ہو جائیں گے لیکن پھر ان ججوں کو قوم کی توقعات اور وکلاء دونوں چلنے نہیں دیں گے اور یوں عدلیہ خوفناک بحران کا شکار ہو جائے گی' جس کے آخر میں وکلاء اور جج دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے' جج یہ سمجھیں گے عدلیہ کی بحالی کی تحریک ان کے استقلال کی وجہ سے کامیاب ہوئی جبکہ وکلاء دعویٰ کریں گے ''ہم اگر سڑکوں پر نہ آتے تو جج کبھی بحال نہ ہوتے'' اور یہ ''میں میں'' عدلیہ کا بھٹہ بٹھا دے گی اور عدلیہ اور وکلاء دونوں کا انجام ''ہمارے'' جیسا ہوگا۔

مجھے شوکت عزیز کی تینوں باتوں سے اختلاف تھا' پرویز مشرف اس وقت تک وردی میں تھے اور ان کی وردی اترنے کے بظاہر امکانات بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے اگر یونیفارم اتر بھی گئی تو بھی فوج ہمیشہ اپنے سابق چیفس کی حفاظت کرتی ہے لہٰذا مجھے یہ پیش گوئی غلط محسوس ہو رہی تھی' میاں نواز شریف اس وقت تک سعودی عرب میں تھے اور ان کی واپسی بھی بظاہر مشکوک دکھائی دیتی تھی اور پیچھے رہ گئے وکلاء تو وکیل ان دنوں ججوں کے ہاتھ چومتے تھے چنانچہ مجھے مستقبل میں ان کے اختلافات کا امکان بھی نظر نہیں آتا تھا لیکن آج شوکت عزیز کی دو پیشن گوئیاں سچ ثابت ہو چکی ہیں' میاں نواز شریف محتاط اپوزیشن پر مجبور دکھائی دے رہے ہیں' یہ حکومت کی حمایت بھی نہیں کر رہے اور کھل کر اس کی مخالفت بھی نہیں اور شوکت عزیز کی دوسری بات کل پانچ اکتوبر کو سچ نکل آئی' آج عدلیہ اور وکلاء نہ صرف ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے وکلاء کے دباؤ میں آکر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج زوار احمد شیخ کو چھٹی پر بھجوا کر تسلیم کر لیا عدلیہ وکلاء کی یرغمال بنتی جا رہی ہے' زوار احمد شیخ لاہور کے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج تھے' یہ ایک ایماندار' قاعدے قانون کے پابند اور غیر جانبدار جج ہیں' لاہور کے چند وکلاء ان کی ایمانداری سے مطمئن نہیں تھے' وکلاء کا خیال تھا یہ عدلیہ کیونکہ ہماری کوششوں سے آزاد ہوئی ہے چنانچہ ججوں کو ہماری طاقت تسلیم کرنی چاہیے' وکلاء نے پہلے سیشن جج کے سامنے احتجاج کیا' پھر 28 ستمبر کو ریلی نکالی' دو دن ہڑتال کی اور 30 ستمبر 2010ء کو چیف جسٹس آف لاہور ہائی کورٹ خواجہ محمد شریف کے دفتر پر حملہ کر دیا' چیمبر کے شیشے اور سیکورٹی آلات توڑ دیئے' بعد ازاں لاہور پولیس اس معاملے میں کود

پڑی ایوان عدل میں لاٹھی چارج اور گرفتاریاں ہوئیں اسکے بعد وکلاء اور پولیس کے درمیان ہاتھاپائی ہوئی پھر جج صاحبان بھی تنازعے میں شامل ہو گئے' پہلے 30 سول ججوں نے استعفے دے دیئے اور بعدازاں 1300 سول جج مستعفی ہو گئے اور یوں یہ تنازعہ شدت اختیار کرتا چلا گیا' اس دوران چار اکتوبر کو ملک بھر کے وکلاء نے یوم سیاہ بھی منایا لیکن یہ یوم سیاہ اس عدلیہ اور ان ججوں کے خلاف تھا جنہیں انہوں نے خود بحال کرایا تھا' لاہور ہائی کورٹ وکلاء کے دباؤ میں آ گئی اور یوں پانچ اکتوبر کو سیشن جج زوار احمد شیخ کو چار ماہ کی رخصت پر بھجوا دیا گیا اور ان کی جگہ سہیل ناصر کو سیشن جج لگا دیا گیا' سہیل ناصر بھی زوار احمد شیخ کی طرح نہایت ایماندار جج ہیں اور مجھے خطرہ ہے چند دنوں میں وکلاء ان کے خلاف بھی جلوس نکالنا شروع کر دیں گے۔ یہ اس نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں' ملک بھر میں اب وکیل عدالتوں میں کھلے عام ججوں کی بے عزتی کرتے رہتے ہیں' اسی سال شیخوپورہ کی عدالت میں وکیل نے جج کو جوتا مار دیا تھا جبکہ فیصل آباد میں وکیل نے مدعی کی گرفتاری کے آرڈر جاری ہونے پر سول جج کو تھپڑ مار دیا تھا' یہ دو واقعات رپورٹ ہو گئے جبکہ اس قسم کے واقعات اب اکثر عدالتوں میں دکھائی دے رہے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے اگر یہ سلسلہ چل نکلا یا پھر وکیلوں کے جلوسوں اور ہڑتالوں سے ججوں کے تبادلے شروع ہو گئے تو ملک میں عدل وانصاف کا رہا سہا بھرم بھی ٹوٹ جائے گا' آپ خود سوچئے جس ملک میں وکیل عدالتوں کے شیشے توڑ دیں کیا اس ملک میں عدل کے زندہ رہنے کے امکانات رہ جاتے ہیں اور ہم اس سٹیج پر پہنچ گئے ہیں۔

میں نے جب سے زوار احمد شیخ کے تبادلے کی خبر پڑھی ہے مجھے اس وقت سے شوکت عزیز سچے دکھائی دے رہے ہیں انہوں نے اس صورتحال کی پیشن گوئی ستمبر 2007ء میں کر دی تھی' میں آج ان کی آبزرویشن کی داد بھی دیتا ہوں اور وکیلوں اور ججوں سے یہ درخواست بھی کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اگر آپ کو عزت دے دی ہے تو اس کی حفاظت کرنا بھی سیکھیں کیونکہ مرد کی عزت اور عورت کی عصمت دنیا میں دو ایسی چیزیں ہیں جو اگر ایک بار چلی جائیں تو دوبارہ کبھی واپس نہیں آتیں۔

فیس بک
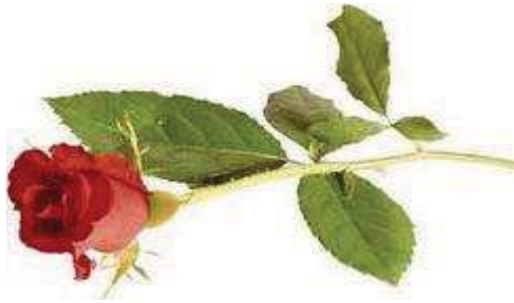
ہمیں جواب سے پہلے سر سید احمد خان کی زندگی پر نظر ڈالنا ہو گی' 1861ء میں یوپی کے انگریز گورنر سر ولیم میور نے نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے بارے میں ایک گمراہ کن کتاب لکھی' یہ کتاب پڑھ کر برصغیر کے مسلمان تلملا اٹھے اور اس وقت کے تمام علماء' اساتذہ' مفتیان اور چھوٹے بڑے کاروباری حضرات نے بطور احتجاج انگریزی تعلیم' انگریزی کتابوں' انگریز اساتذہ اور پادریوں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا' علمائے کرام سارا سارا دن مسجدوں میں بیٹھ کر انگریزوں کو جہنم واصل ہونے کی وعید سناتے رہتے' مسلمان نوجوان عیسائیوں کے گرجا گھروں پر حملوں کے منصوبے بناتے رہتے جبکہ عام شہریوں نے انگریزوں کی نوکریوں کا بائیکاٹ شروع کر دیا تھا' اس وقت ہندوستان میں چندہ جمع کرنے کی مہم بھی شروع ہوئی' مسلمانوں نے ایک خفیہ تنظیم بنائی جس نے گھر گھر جا کر چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ اس تنظیم کا کہنا تھا اس رقم سے فدائی تیار کریں گے اور یہ فدائی ولیم میور کو ڈھونڈ کر قتل کر دیں گے' یہ لوگ بڑی مدت تک چندہ جمع کرتے رہے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا' ہندوستان کے مسلمانوں نے بطور احتجاج اپنے بچوں کو سرکاری سکولوں سے بھی اٹھالیا' ان کا کہنا تھا جب تک ولیم میور معافی نہیں مانگے گا اس وقت تک ہم اپنے بچے سکول نہیں بھجوائیں گے لیکن اس سارے "کراؤڈ" میں سر سید احمد خان واحد ہندوستانی مسلمان تھے جنہوں نے کتاب کا جواب کتاب سے دینے کا فیصلہ کیا' سر سید نے بھانپ لیا اگر ہندوستان کا کوئی بھی مسلمان بچہ سرکاری سکول میں نہیں جاتا تو انگریز حکومت کو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن اگر ہندوستان کے کسی سکالر نے ولیم میور کی کتاب کا دلیل کے ساتھ جواب دے دیا تو انگریزی معاشرے' انگریزی سکالرز اور انگریز کے پڑھے لکھے طبقوں کو بہت فرق پڑے گا چنانچہ سر سید احمد خان نے سامان باندھا' یہ چھ ماہ کا بحری سفر کر کے لندن پہنچے اور انگریزوں کی لائبریریوں کی خاک چھاننا شروع کی' وہ دو سلائس' ایک انڈے اور کافی کے ایک کپ پر سارا سارا دن گزارتے تھے' وہ برفیلی صبحوں میں صرف پاجامے اور کرتے میں لائبریری تک پہنچتے تھے' انہوں نے وہاں اپنی انگریزی کو بہتر بنایا اور 8 سال کی محنت کے بعد ایک معرکتہ الآرا کتاب لکھی' اس کتاب نے نہ صرف یورپ کے باشعور طبقے کو ہلا کر رکھ دیا بلکہ دوسرے گستاخ مصنفوں کے گستاخ ہاتھ بھی روک دیئے۔ سر سید احمد خان کی اس کتاب کے بعد ثابت ہو گیا بچوں کو سکولوں سے اٹھانے' انگریزی کتابوں کے بائیکاٹ اور مسجدوں' درگاہوں اور مدرسوں میں انگریزوں کو بددعائیں دینے کا طریقہ غلط تھا اور سر سید احمد خان کی اپروچ درست۔ کیونکہ کتاب کا جواب کتاب اور دلیل کا جواب دلیل سے دینا بہترین طریقہ ہے۔

دنیا میں احتجاج کے دو طریقے ہوتے ہیں' ایک بائیکاٹ اور دوسرا میدان میں اتر کر اسی ٹیکنالوجی' اسی تکنیک اور اسی ہتھیار سے دشمن کا مقابلہ کرنا جس پر آپ کے دشمن کو غرور ہے' جسے وہ اپنی کامیابی قرار دے رہا ہے۔ چند ماہ قبل فیس بک پر نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ایک گستاخانہ پیج بنا تھا' میں نے یہ پیج نہیں دیکھا کیونکہ میں گستاخی پر مبنی کوئی چیز دیکھنا' سننا یا پڑھنا گناہ سمجھتا ہوں تاہم میں اس پیج کے بارے میں خبریں اور ایس ایم ایس ضرور پڑھتا رہا' ان خبروں اور ان ایس ایم ایس میں نبی اکرم ﷺ سے محبت کا واسطہ دے کر مسلمانوں سے فیس بک کے بائیکاٹ کی اپیل کی جاتی تھی' اس کا یہ نتیجہ نکلا پاکستان کے لاکھوں بچوں اور بچیوں نے فیس بک استعمال کرنا بند کر

دی‘ میں اس وقت بھی اس رویے کا مخالف تھا اور میں آج بھی اس ردعمل کو غلط سمجھتا ہوں‘ میں ایسے معاملات میں سر سید احمد خان کا مقلد ہوں اور میں بائیکاٹ کو کمزوری یا بزدلی سمجھتا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں میدان میں رہ کر مقابلہ کرنا چاہیے۔ فیس بک ایک سوشل میڈیا ہے جس پر دنیا کا کوئی بھی شخص کسی بھی قسم کا پیج بنا سکتا ہے اور فیس بک کی انتظامیہ رنگ نسل‘ مذہب اور روایت کی تفریق کے بغیر اسے اس کا پورا پورا موقع دیتی ہے۔ فیس بک کی اس پالیسی کا چند شرپسند لوگوں نے غلط فائدہ اٹھایا اور انہوں نے اس پر گستاخانہ پیج بنا دیا‘ ہمیں اس گستاخی پر فیس بک کے بائیکاٹ کی بجائے دو کام کرنے چاہیئے تھے۔ اول‘ ہم فیس بک کی انتظامیہ کو اپنے مذہبی جذبات سے آگاہ کرتے‘ ہم اسے بتاتے عالم اسلام اس گستاخی پر ناراض ہے چنانچہ یہ صفحہ فوری طور پر بند کر دیا جائے اور آئندہ کوشش کی جائے فیس بک پر اس قسم کی گستاخی نہ ہو اور دوم‘ ہم لوگ اسلامی دنیا کا کوئی اپنا سوشل میڈیا بنا لیتے‘ اس سوشل میڈیا پر 58 اسلامی ممالک کے بھائی اور بہنیں فیس بک کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ انٹرایکشن کرتے اور اس اسلامی سوشل میڈیا کی کامیابی فیس بک جیسے اداروں کو پریشان کر دیتی لیکن ہم ان دونوں آپشنز کی طرف جانے کی بجائے ناراض ہو کر بیٹھ گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر بائیکاٹ ہی اس مسئلے کا حل ہے تو پھر ہمیں سب سے پہلے کمپیوٹر کا بائیکاٹ کرنا چاہیے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو فیس بکس نہ ہوتی‘ ہمیں پھر گوگل کا بائیکاٹ کرنا چاہیے جس نے فیس بک اور ٹویٹر جیسی ویب سائیٹ کو تحریک دی تھی اور ہمیں پھر ای میل کا بائیکاٹ کرنا چاہیے جو سارے مسائل کی والدہ ہے اور اس کے بعد بھی ہم اگر مطمئن نہیں ہوتے تو پھر ہمیں بجلی اور ٹیلی فون لائن کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے کیونکہ اگر یہ دونوں نہ ہوتیں تو کبھی فیس بک پر گستاخانہ پیج نہ بنتا اور اگر اس سے بھی ہماری تسلی نہیں ہوتی تو پھر ہمیں انگریزی زبان کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے جو آج کل ہر قسم کی گستاخی کا ذریعہ ہے۔ فیس بک کا بائیکاٹ بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم کسی گستاخانہ کتاب کی اشاعت پر پرنٹنگ پریس‘ سیاہیوں اور کاغذ کی صنعت کا بائیکاٹ کر دیں‘ کیا اس نوعیت کا بائیکاٹ ٹھیک ہو گا؟ مجھے یقین ہے آپ کا جواب نفی ہو گا۔

میں آج تک یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکا کہ عقیدت اور پیروی میں افضل کون ہے‘ ہم سب نبی اکرم ﷺ کی ذات سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں‘ ہم عشق رسول ﷺ اور غلامی رسولؐ میں موت تک قبول کر لیتے ہیں‘ اچھی بات ہے‘ یہ محبت‘ یہ عشق اور یہ عقیدت ہمارے ایمان کا حصہ ہونی چاہیے لیکن ساتھ ہی سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم اس رسول ﷺ کی کسی بات پر عمل بھی کرتے ہیں جس کی عقیدت کے ہم دعویدار ہیں؟ کیا ہم نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق جھوٹ بولنا چھوڑ دیا ہے‘ کیا ہم ظالم کو ظالم کہہ رہے ہیں‘ کیا ہم نے کم تولنا اور وعدہ خلافی چھوڑ دی ہے‘ کیا اس اسلامی ملک میں یتیموں اور بیواؤں کو تمام حقوق مل رہے ہیں اور کیا ہم صبح سے رات تک ایک دوسرے کی غیبت نہیں کرتے؟ اور کیا ہماری زندگیوں میں ہمارے رسول ﷺ کے اسوہ حسنہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے؟ نہیں‘ افسوس نہیں۔ اس پورے ملک میں شائد ہی کوئی شخص ہو جو صبح سے لے کر رات تک رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کے مطابق زندگی گزارتا ہو لیکن اس کے باوجود ہم رسول اللہ ﷺ سے عقیدت کے نعرے بھی لگاتے ہیں‘ یہ کیسی محبت ہے جس میں عقیدت تو ہے لیکن پیروی نہیں! مجھے بتایئے کیا نبی اکرم ﷺ نے جدید ٹیکنالوجی کے بائیکاٹ کا حکم دیا تھا؟ آپ کا اسوہ حسنہ تو یہ تھا کہ جنگ بدر کے بعد وہ کفار گرفتار

ہو کر آپ کے سامنے لائے گئے جو آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے اور آپ جب خانہ کعبہ میں نماز ادا
کرتے تھے تو یہ لوگ آپ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دیتے تھے لیکن آپ ؐ نے ان سے کہا آپ اگر ہمارے صحابہ کو
پڑھنا لکھنا سکھادیں تو آپ اپنے گھروں کو واپس جاسکتے ہیں' یہ ہے ہمارے رسول ﷺ کا اسوہ حسنہ یعنی جدید ترین
علم اور جدید ترین ٹیکنالوجی کے عوض جنگ میں غلام بنائے گئے کفار کو بھی معاف کر دیا جائے جبکہ ہم اس
رسول ﷺ کے نام پر جدید ٹیکنالوجی کا بائیکاٹ کر رہے ہیں' مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ میرا خیال ہے ہمیں
سر سید احمد خان کا طریقہ استعمال کرنا چاہئے' ہمیں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے ساتھ ساتھ جدید سائنسز کے
میدان میں کھڑے ہو کر اپنی صلاحیتوں کو منوانا چاہئے' ہمیں فیس بک کا جواب فیس بک کے ذریعے دینا چاہئے'
ہمیں ثابت کرنا چاہئے ہم ایک ایسے نبی کی امت ہیں جو بائیکاٹ نہیں کرتا تھا' جو علم کا علم' ٹیکنالوجی کا ٹیکنالوجی'
ادب کا ادب' طاقت کا طاقت اور اخلاقیات کا اخلاقیات کے میدان میں مقابلہ کرتا تھا اور جس نے علم کو مذہب'
سیاست اور معاشرے کی بنیاد بنایا تھا۔

میں نے چند دن قبل فیس بک جوائن کی' تھوڑے عرصے میں ہمارے صفحے کو چوبیس ہزار لوگوں نے جوائن کر لیا'
ہم اس کی تعداد لاکھوں تک لے جانا چاہتے ہیں' ہماری خواہش ہے یہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا صفحہ بنے اور ہم اس
پیج کے ذریعے اپنے نبی ﷺ کے احکامات کی ترویج بھی کریں' ان کی ناموس کی حفاظت بھی کریں اور اس علم کی
نشرواشاعت کا باعث بھی بنیں جسے رسول اللہ ﷺ نے مومن کی کھوئی میراث قرار دیا تھا چنانچہ آپ لوگ
بائیکاٹ معطل کر کے' اس صفحے پر آکر اپنے اچھے اور نیک خیالات دوسروں کے ساتھ شیئر کریں تاکہ علم اور نیکی
آگے بڑھ سکے' ہم ثابت کر سکیں ہم فیس بک پر رہ کر فیس بک پر ہونے والے پروپیگنڈے کا مقابلہ کریں گے۔

نوٹ: آپ فیس بک پر مجھ سے www.facebook.com/javed.chaudhry پر رابطہ کر سکتے ہیں'
ہم سب دوست وہاں موجود ہیں۔
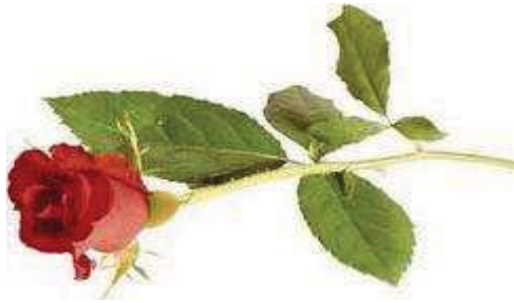
پیرس کی ایک اداس شام

میں چارلس ڈیگال ائیر پورٹ پر اترا تو پیرس شہر بارش میں بھیگ رہا تھا‘ یہ جوانی کے بوسوں جیسی نرم نرم بارش تھی جس نے شہر کی روشنیوں کو خوشبودار بنادیا تھا‘ ہم نے اکثر بارش میں روشنیوں کو پھیلتے دیکھا ہے‘ آپ کبھی بارش میں باہر نکل کر دیکھیں آپ کو روشنیاں سات رنگوں میں تقسیم ہوتیں اور پھر یہ سات رنگ اپنے وجود سے تھوڑا سا باہر نکلتے دکھائی دیں گے‘ میں جب بھی بارش میں بھیگی روشنیوں کو پھیلتے دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے ان روشنیوں کے وجود میں میرے جذبات شامل ہو گئے ہیں اور یہ جذبات اب رنگوں کی پینگ پر آہستہ آہستہ ہلکورے لے رہے ہیں‘ دریائے سین کی روشنیاں بھی بارش میں ڈولتی کشتی کی طرح ڈول رہی تھیں‘ ایفل ٹاور بارش میں بھیگ کر مزید خوبصورت دکھائی دے رہا تھا‘ بارش نے نپولین کے مقبرے کی خاموشی اور تنہائی میں بھی اضافہ کر دیا تھا اور شانزے لیزے کی رونقیں بھی بارش میں بھیگ کر مستانی ہو رہی تھیں‘ میں نے مبشر سے کہا ”یار بڑے عرصے بعد پیرس کی بارش نصیب ہوئی ہے“ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور آہستہ آواز میں بولا ”ہاں یہ تنہائی‘ اداسی اور جدائی کی پہلی بارش ہے“ میں نے سر جھکا لیا‘ میں نے اس بارش کو اس پہلو سے نہیں دیکھا تھا‘ پیرس کی اداسی بڑی جان لیوا ہوتی ہے‘ یہ آرے کی طرح اندر اور باہر دونوں طرف سے انسان کو کاٹتی ہے اور میں اس وقت کٹ رہا تھا‘ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں‘ چھوٹے چھوٹے پیسز میں۔

یہ معاشرے اتنے خوبصورت کیوں ہیں‘ ان میں اتنا سکون‘ اتنا اطمینان اور اتنی خوشی کیوں ہے؟ ان میں ہماری طرح خوف‘ بے چینی‘ پریشانی اور ڈپریشن کیوں نہیں اور ان کی زندگیاں نرم اور سبک ندی کی طرح کیوں بہہ رہی ہیں‘ میں جب بھی ملک سے باہر نکلتا ہوں تو ہر دس منٹ بعد یہ سوال میرے ذہن پر دستک دیتا ہے اور اس کا ایک ہی جواب سامنے آتا ہے‘ ان معاشروں میں برداشت کا عنصر ”ڈامی نیٹ“ کرتا ہے‘ یہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں اور برداشت ہمیشہ ذاتی اور معاشرتی زندگی دونوں کو خوبصورت بنادیتی ہے۔ ہم سب نے نبی اکرمؐ کی زندگی کا وہ واقعہ پڑھا ہو گا جس میں نبی اکرمؐ مکہ مکرمہ کی ایک گلی سے گزرتے ہیں اور اس گلی کی ایک چھت سے ایک بوڑھی خاتون (نعوذ باللہ) آپؐ کے سر مبارک پر گندگی پھینک دیتی ہے‘ آپؐ یہ گندگی جھاڑتے ہیں اور چپ چاپ آگے روانہ ہو جاتے ہیں‘ یہ سلسلہ صرف ایک دن تک محدود نہیں رہتا‘ آپؐ روز ایک مخصوص وقت پر وہاں سے گزرتے ہیں اور وہ خاتون روزانہ آپؐ پر کوڑا کرکٹ پھینکتی ہے اور آپؐ ماتھے پر شکن لائے بغیر روز یہ گندگی جھاڑ کر آگے روانہ ہو جاتے ہیں‘ اس واقعے کے دو پہلو مزید حیران کن ہیں‘ نبی اکرمؐ روزانہ اس جگہ سے ایک خاص وقت پر گزرتے تھے‘ اس کی وجہ خاتون کو تکلیف سے بچانا تھا‘ آپؐ کا خیال تھا آپ اگر وقت بدل بدل کر گزریں گے تو خاتون کو انتظار کی زحمت بھی ہو گی اور اسے مکہ کی گرمی میں دھوپ میں بھی کھڑا ہونا پڑے گا اور دشمن کی یہ تکلیف رحمت اللعالمین کیلئے قابل قبول نہیں تھی‘ دوسرا پہلو اس خاتون کی عیادت تھی‘ وہ خاتون ایک دن کوڑا پھینکنے کیلئے چھت پر نہیں آئی تو آپؐ نے دروازے پر دستک دے کر پوچھا ”خیریت ہے اماں نظر نہیں آ رہیں“ اہل خانہ نے بتایا ان کی طبیعت ناساز ہے‘ آپؐ عیادت کیلئے اندر تشریف لے گئے‘ بوڑھی خاتون کا حال احوال پوچھا اور جب تک وہ خاتون دوبارہ کوڑا کرکٹ پھینکنے کے قابل نہیں ہوئی‘ آپؐ روزانہ اس کی عیادت کرتے

رہے یہاں تک کہ خاتون کی بیماری کے ساتھ اس کی بدتمیزی' اس کی جہالت اور اس کا کفر بھی ختم ہو گیا اور وہ پوری سپرٹ کے ساتھ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئی' یہ ہمارے رسول ؐ کی زندگی کا ایک چھوٹا سا' معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس واقعے میں کامیابی اور اطمینان کا بہت بڑا اصول چھپا ہے اور اس اصول کا نام برداشت ہے' برداشت ایک ایسی عادت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بے انتہا روحانی قوت رکھی ہے' دنیا کی ساری روحانیت کی عمارت دو اصولوں پر کھڑی ہے' اس کا پہلا اصول پازیٹو تھنکنگ ہے' دنیا کا کوئی ولی اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک وہ دوسروں کے بارے میں مثبت نہیں سوچتا' یہی وجہ ہے لوگ سو سو لوگوں کو قتل کر کے ولیوں کی درگاہ پر آتے ہیں' دو دو سو سال کے شیطان ولیوں کی بیٹھکوں میں پہنچ جاتے ہیں اور ولی ماں کی طرح اپنی آغوش اس کیلئے کھول دیتے ہیں' وہ اس کی غلطیوں' اس کے گناہوں اور اس کے جرائم پر ایک لمحے کیلئے توجہ نہیں دیتے شاید یہی وجہ ہے کہا جاتا ہے آپ نے اگر فتویٰ لینا ہو تو کسی ایسے مفتی کے پاس جائیں جو عالم کے ساتھ ساتھ ولی بھی ہو وہ آپ کی زندگی کو آسان بنا دے گا' دنیا کے تمام ولی ولایت میں قدم رکھنے سے پہلے مثبت طرز زندگی اختیار کر لیتے ہیں' یہ برے سے برے شخص کے بارے میں بھی بری رائے نہیں رکھتے' لیڈرز میں بھی کیونکہ ولیوں کی خوبیاں ہوتی ہیں شاید اسی لئے یہ بھی بڑے سے بڑے دشمن کو معاف کر دیتے ہیں اور جن لیڈروں میں ولیوں کی خوبیاں نہیں ہوتیں وہ چنگیز خان اور ہٹلر ثابت ہوتے ہیں' ولیوں کی دوسری خوبی برداشت ہوتی ہے' یہ لوگ بری سے بری صورتحال اور خراب سے خراب حالات کو بھی خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر جاتے ہیں اور یہی برداشت بعد ازاں ان کے روحانی درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہے' دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ولی ہو گا جس نے زندگی کی سختیاں برداشت نہ کی ہوں کیونکہ یہ سختیاں ہوتی ہیں جو آپ کے اندر حالات کو تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کرتی ہیں اور آپ کو کامیابی کے مطابق ظرف بھی دیتی ہیں اور یہ خوبی بھی لیڈروں میں ہوتی ہے!

یہ دونوں خوبیاں مثبت اور برداشت صرف ولیوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ دنیا کے تمام کامیاب لوگوں میں بھی مشترک ہیں' آپ دنیا کے کسی کامیاب شخص کا پروفائل اٹھا کر دیکھ لیں' آپ کو اس میں برداشت اور مثبت طرز عمل دکھائی دے گا' یہ شخص ہمیشہ دوسروں کو معاف کر دے گا' اس کا دل ہمیشہ کھلا ہو گا' یہ بڑے سے بڑے دشمن کیلئے اپنے دروازے کھلے رکھے گا' یہ برے سے برے حالات میں طویل عرصے تک شکایت اور شکوے کے بغیر زندگی گزار لے گا' یہ شخص کبھی کام کی زیادتی اور آمدنی کی کمی پر اعتراض نہیں کرے گا' اسے موسموں کی گرمی اور سردی بھی زیادہ متاثر نہیں کرے گی اور یہ راستوں کے کانٹوں کو بھی حرف شکایت نہیں بنائے گا' یہ بس چپ چاپ سر نیچے کئے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھتا چلا جائے گا یہاں تک کہ یہ وہاں پہنچ جائے گا جہاں پہنچنے کیلئے یہ گھر سے نکلا تھا' مسائل عام شخص اور خاص شخص دونوں کی زندگی میں ہوتے ہیں' دونوں نلکی کے ایک ہی سرے میں داخل ہوتے ہیں اور ایک ہی سرے سے باہر نکلتے ہیں بس اپروچ ان کو کامیاب اور ناکام بناتی ہے' ناکام شخص ہر تکلیف پر رک کر واویلا کرتا ہے' جی بھر کر دوسروں کو کوستا ہے اور اگر لڑنے کا امکان موجود ہو تو یہ بازو چڑھا کر کوڑا پھینکنے' پتھر مارنے اور گالی دینے والے سے الجھ پڑتا ہے اور یوں اس کا فوکس اس کی منزل سے ہٹ جاتا ہے جبکہ کامیاب شخص نبی اکرم ؐ کی طرح مسکراتا ہے' گندگی جھاڑتا ہے اور آگے چل پڑتا ہے یہاں تک کہ گندگی پھینکنے

کی قوت سے واقف ہو پاتے ہیں' ہم اللہ کی اس نعمت کو ناراضی' خفگی اور لڑائی میں ضائع کر دیتے ہیں اور یوں کامیابی کے راستے کے راہی ہونے کے باوجود ناکام ہو جاتے ہیں۔

یہاں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے دنیا کے بے شمار لوگ پوری زندگی مسائل اور مصائب کا شکار رہتے ہیں' یہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پیدا ہوتے ہیں اور پوری زندگی انہی دو پاٹوں کے درمیان گزار دیتے ہیں' زندگی کی پتھریلی سطح ان کی ہڈیاں تک چھیل دیتی ہے لیکن انہیں اس برداشت' اس صبر کا پھل نہیں ملتا' یہ بات بھی درست ہے' یہ لوگ برداشت اور صبر کی انتہا تک پہنچ کر بھی کامیاب نہیں ہوتے! کیوں نہیں ہوتے؟ بات سیدھی ہے ان لوگوں کی کوئی منزل نہیں ہوتی' انہوں نے کوئی ایسا ٹارگٹ طے نہیں کیا ہوتا جسے برداشت کی قوت کھینچ کر ان تک لے آئے۔ یہ لوگ تکلیف کے ساتھ ''یوز ٹو'' ہونے کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں اور یہ اس مریض کی طرح ہو جاتے ہیں جسے ایک خاص وقت کے بعد بیماری لطف دینے لگتی ہے اور وہ اپنی بیماری' اپنی تکلیف کو اپنا تعارف بنا لیتا ہے اور باقی زندگی اسے انجوائے کرتے کرتے گزار دیتا ہے جبکہ کامیاب لوگوں کی زندگی کا ایک ٹارگٹ' ایک مقصد ہوتا ہے اور یہ لوگ تکلیف کی دھوپ میں چیونٹی کی رفتار ہی سے سہی لیکن اپنے مقصد' اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ منزل کو ان پر ترس آ جاتا ہے اور یہ بھاگ کر ان کے گلے لگ جاتی ہے اور نبی اکرمؐ کی زندگی کا یہ واقعہ ہمیں یہی سکھاتا ہے' یہ ہمیں بتاتا ہے اگر ہماری زندگی کا کوئی بڑا مقصد ہے' ہم اگر کسی بڑے ٹارگٹ کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں' ہم لوگوں کی زندگیاں' ان کی سوچ اور ان کا طرز فکر بدلنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں گندگی پھینکنے والی بوڑھیوں کو برداشت کرنا ہوگا' ہمیں اپنی زندگی میں ان کی گنجائش پیدا کرنا ہوگی اور ان معاشروں میں یہ خوبی موجود ہے' یہ مختلف خیالات اور نظریات کے لوگوں کو برداشت بھی کرتے ہیں اور ان کے بارے میں مثبت سوچتے بھی ہیں چنانچہ یہاں سکون بھی ہے' اطمینان بھی' ترقی بھی اور خوبصورتی بھی' میرا ذاتی خیال ہے جس طرح انسان میں برداشت اور مثبت طرز فکر نہ ہو یہ ترقی کو انجوائے کر سکتا ہے اور نہ ہی مطمئن رہ سکتا ہے بالکل اسی طرح اگر کسی معاشرے کی سوچ منفی ہو جائے اور اس میں برداشت بھی کم ہو جائے تو یہ تنور کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس کے بعد اس میں زندگی گزارنا مشکل ہو جاتا ہے اور ہم منفی طرز فکر اور برداشت کی کمی کی سزا بھگت رہے ہیں' یہ پیرس کی اس اداس شام کا میرے نام پہلا پیغام تھا۔
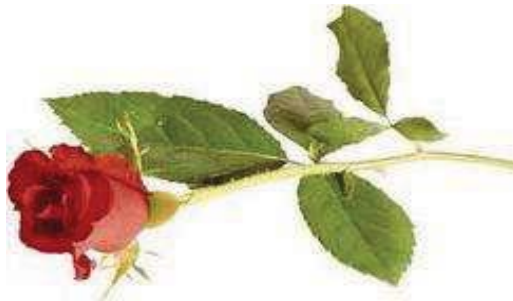
ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کی کریڈیبلٹی پر اعتراضات اپنی جگہ لیکن جہاں تک کرپشن کا معاملہ ہے اور اسے نمبروں کے تناظر میں بھی دیکھا جائے تو ہم دنیا کے کرپٹ ممالک میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ہم کرپشن میں ایک سال میں آٹھ درجے نیچے چلے گئے ہیں' ہم پچھلے سال دنیا کے 178 ممالک کی فہرست میں 42 نمبر پر تھے لیکن اس سال ہم 34ویں نمبر پر آ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا دنیا کے 144 ممالک کا سسٹم ہم سے زیادہ شفاف' زیادہ مضبوط اور زیادہ خوبصورت ہے' اس فہرست میں دنیا کا کرپٹ ترین ملک صومالیہ ہے' دوسرے نمبر پر افغانستان اور برما' تیسرے نمبر پر عراق' چوتھے پر ازبکستان' ترکمانستان اور سوڈان اور پانچویں نمبر پر چاڈ آتا ہے جبکہ شفاف ترین ممالک میں ڈنمارک' نیوزی لینڈ اور سنگاپور جیسے ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک میں کرپشن نہ ہونے کے برابر ہے' صومالیہ' افغانستان اور عراق میں کرپشن کی یہ حالت ہے کہ یورپ اور مشرق بعید کے ممالک ان کے فضائی عملے تک کی کڑی تلاشی لیتے ہیں جبکہ ان تینوں ممالک کے پائلٹس کو امریکا میں اترنے کی اجازت نہیں ہے۔ صومالیہ میں آپ امام کو رشوت دیئے بغیر مسجدوں میں نماز ادا نہیں کر سکتے' افغانستان میں نیٹو کے اہلکاروں پر مقامی افسروں اور اہلکاروں کے ساتھ رابطے پر پابندی ہے اور اگر رابطہ ناگزیر ہو جائے تو ایک افسر کے ساتھ دوسرا افسر ضرور بھجوایا جاتا ہے تاکہ دوسرا افسر پہلے افسر کی نگرانی کر سکے۔ نیٹو انتظامیہ کو خدشہ رہتا ہے مقامی اہلکار کہیں گوروں کو رشوت کی لت ڈال دیں گے۔ عراق کی صورتحال یہ ہے کہ وہاں امریکی فوجیوں اور اہلکاروں تک کو اپنے کام نکلوانے کیلئے رشوت دینا پڑتی ہے۔ عراقی صدر جلال طالبانی کے بارے میں پچھلے دنوں یہ کہا جا رہا تھا انہوں نے اپنے کسی عزیز ٹھیکیدار کو مشورہ دیا "تم سرکاری افسروں کی شکایت کے بجائے انہیں تھوڑے سے پیسے دے کر کام نکلوا لیا کرو" یہ ٹھیکیدار صدر کے پاس سرکاری محکموں کی شکایت لے کر گیا تھا' ازبکستان اور ترکمانستان کی صورتحال بھی مختلف نہیں' ان دونوں ممالک میں احتساب اور اینٹی کرپشن کے محکمے کام نہیں کر رہے چنانچہ دونوں ممالک کے وزراء سرے عام رشوت وصول کرتے ہیں اور دفتروں سے بریف کیس لے کر گھر واپس جاتے ہیں چنانچہ رشوت اور کرپشن کے اس کلچر کی وجہ سے ترکمانستان ہو' ازبکستان ہو یا پھر عراق' افغانستان اور صومالیہ یہ دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں شمار ہوتے ہیں اور ہم اس فہرست میں 34ویں نمبر پر ہیں۔

یہ تمام حقائق اپنی جگہ لیکن ہم اس رپورٹ کے تین پہلوؤں پر توجہ نہیں دے رہے' اس رپورٹ کا پہلا "اینگل" براعظم افریقہ کے ممالک ہیں' براعظم افریقہ کو غربت اور جرائم کی جنت کہا جاتا ہے' یہ براعظم فی کس آمدنی اور ترقی کے وسائل کے لحاظ سے دنیا کا بدترین خطہ ہے' اس براعظم میں ایک روٹی اوسطاً پانچ لوگوں میں تقسیم ہوتی ہے اور ان ممالک کے بارے میں کہا جاتا ہے اگر فرشتہ بھی لینڈ کر جائے تو اسے رشوت دیئے بغیر افریقہ میں داخلے کی اجازت نہیں ملے گی۔ افریقہ اس معاملے میں اس قدر بدنام ہے کہ یورپ' امریکا اور مشرق بعید کے لوگ اپنے ممالک میں کالوں کے علاقوں میں گھسنے سے گھبراتے ہیں۔ امریکا یا یورپ میں کوئی جرم ہو جائے تو پولیس اور مقامی آبادی کی نظریں بے اختیار کالوں اور ایشیائی باشندوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں لیکن آپ اگر ٹرانس پیرنسی

انٹر نیشنل کی تازہ ترین رپورٹ دیکھیں تو آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی اس افریقہ کے 29 ممالک میں کرپشن کی صورتحال پاکستان سے بہتر ہے‘ ہم افریقہ کے ممالک بوٹسوانا‘ برونڈی‘ ماریشس‘ کیپ وردے‘ نمیبیا‘ گھانا‘ روانڈا‘ لیسوتھو‘ لائبریا‘ جیبوتی‘ گیمبیا‘ سوازی لینڈ‘ برکینیا فاسو‘ مصر‘ ساؤتوم‘ سینیگال‘ بینن‘ گابون‘ ایتھوپیا‘ مالی‘ موزمبیق‘ اریٹیریا‘ مڈغاسکر‘ نائیجر‘ نائیجریا‘ سیرالیون‘ ٹوگو‘ زمبابوے اور ماریطانیہ سے بھی زیادہ کرپٹ ہیں اور یہ ہمارے لئے حقیقتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ آپ اندازا کیجئے افریقہ کے وہ ممالک جن میں لوگ آج بھی گدھا گاڑیوں پر سفر کرتے ہیں اور ان کی آبادی کے نصف حصے نے زندگی میں کبھی ٹوتھ پیسٹ استعمال نہیں وہ ممالک بھی کرپشن کی رینکنگ میں ہم سے آگے ہیں۔ اس رپورٹ کا دوسرا پہلو بنگلہ دیش ہے‘ بنگلہ دیش 2001ء سے 2003ء تک دنیا کا سب سے بڑا کرپٹ ملک تھا‘ یہ ٹرانس پیرنسی انٹر نیشنل کی فہرست میں تین سال تک پہلے نمبر پر رہا لیکن پھر بنگلہ دیش کے عوام‘ حکومت اور غیر سرکاری اداروں نے اس صورتحال سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور آج صرف سات سال بعد بنگلہ دیش فہرست میں 43 نمبر پر ہے۔ یہ وہ بنگلہ دیش ہے جو 1971ء تک پاکستان کا حصہ تھا اور لاہور سے لے کر ڈھاکا تک دونوں حصوں میں ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام چلتا تھا۔ ہم لوگ بنگالیوں کو ”چھوٹی مخلوق“ کہتے تھے‘ ہم کہتے تھے یہ لوگ ٹائلٹس تک نہیں بناتے اور یہ چھوٹے قد اور تنگ چھاتیوں کی وجہ سے پولیس اور فوج کیلئے بھی نااہل ہیں‘ یہ بھی حقیقت ہے 1971ء کے سانحے کے بعد پاکستان کے چند طبقوں نے بنگالیوں سے جان چھوٹ جانے پر خوشیاں منائی تھیں لیکن آج وہ بنگلہ دیش نہ صرف معاشی‘ سماجی اور صنعتی لحاظ سے پاکستان سے چند قدم آگے ہے بلکہ فیصل آباد‘ سیالکوٹ اور کراچی کے صنعت کار پاکستان سے اپنی فیکٹریاں بند کر کے بنگلہ دیش میں صنعتیں لگا رہے ہیں اور پوری دنیا اس بنگلہ دیش سے ”کاٹن پراڈکٹس“ خرید رہی ہے جہاں کپاس کا ایک پودا تک نہیں اگتا‘ وہ بنگلہ دیش جس میں کبھی سرکاری گاڑیاں باہر کھڑی کرنے پر پابندی تھی کیونکہ لوگ رات کو گاڑیوں کے پہیے اتار کر لے جاتے تھے وہ بنگلہ دیش بھی آج کرپشن کی رینکنگ میں ہم سے آگے ہے اور یہ بھی ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

ٹرانس پیرنسی انٹر نیشنل کی رپورٹ کا تیسرا پہلو بھارت ہے‘ انڈیا پچھلے چودہ برسوں سے اس فہرست میں ہم سے آگے ہے‘ آپ اگر پچھلے دس برسوں کا انڈکس دیکھیں تو آپ کو ہر سال بھارت کی پوزیشن پاکستان سے بہتر دکھائی دے گی‘ آج بھی ہم جب 34ویں درجے پر ہیں تو انڈیا کا نمبر 91 ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا ہم بھارت کے مقابلے میں تین گناہ زیادہ کرپٹ ہیں۔ ہم پچھلے 62 برسوں سے بھارت کو اپنا دشمن قرار دیتے آرہے ہیں‘ ہم نے آج تک جتنی ترقی کی اس کی بنیاد انڈیا سے ہماری دشمنی تھی لیکن جہاں تک بھارت کی خوبیوں اور اچھائیوں کا معاملہ ہے تو ہم نے بدقسمتی سے آج تک اس فیلڈ میں انڈیا کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہیں کی‘ ہم نے آج تک اس پر غور نہیں کیا کہ بھارت میں فوج اقتدار پر قابض کیوں نہیں ہوتی۔ وہاں کا عدالتی نظام کیوں مضبوط ہے اور وہاں وزیراعظم‘ صدر اور آرمی چیف کو جج کے سامنے دم مارنے کی جرات کیوں نہیں ہوتی؟۔ بھارت کی ایکسپورٹ میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے؟ بھارت سپر پاور یا دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بن کر کیوں ابھر رہا ہے؟ انڈیا کمپیوٹر سافٹ ویئر کی سب سے بڑی مارکیٹ کیوں بن رہا ہے؟ میڈ ان انڈیا آہستہ آہستہ بھارت کی سرحدوں سے باہر

کیوں [illegible] رہا ہے اور [illegible] اوباما [illegible] سال پرانے دوست پاکستان کو چھوڑ کر اپنے نئے دوست انڈیا کا دورہ پہلے کیوں کر رہا ہے؟ان تمام سوالوں کے جواب میں ہماری ناکامی اور بھارت کی کامیابی چھپی ہے۔۔!!

ہم اگر غور کریں تو بھارت‘ بنگلہ دیش اور پاکستان نسلی‘ لسانی‘ کلچر اور روایات کے اعتبار سے ایک جیسے ملک ہیں جبکہ براعظم افریقہ کی اقوام ہماری نسبت زیادہ پسماندہ‘ بے کشش اور کمزور ہیں لیکن افریقہ کے 29 ممالک نے اپنے سسٹم ریفائن کر کے اپنے لئے آسانیاں پیدا کر لیں‘ اسی طرح ہمارے اپنے کلچر اور روایت کے لوگ یعنی انڈین اور بنگلہ دیشی بھی ہم سے آگے نکل گئے۔اب سوال یہ ہے اگر افریقہ کے 29 ملک اور بنگلہ دیش اور بھارت کے لوگ اپنا سسٹم بہتر بنا سکتے ہیں‘ یہ معاشرے کو کرپشن فری بنا سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے ہیں۔۔!یہ کیوں بھی ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے کیونکہ یہ کیوں ہمیں چیخ چیخ کر بتا رہا ہے دنیا کا کوئی شخص‘ کوئی نسل اور کوئی قوم اللہ کی محبوب نہیں ہوتی‘ اللہ کے سسٹم میں اگر ابوسفیان اسلام قبول کر لے تو یہ حضرت ابوسفیانؓ بن جاتا ہے اور اگر ابوجاہل اپنی جہالت پر ڈٹا رہے تو یہ ابوجاہل ہو جاتا ہے۔یہ کیوں چیخ چیخ کر بتا رہا ہے جو قوم اپنے ہاتھوں اور اپنے ایمان کو استعمال نہیں کرتی وہ قوم اقوام عالم کے چوک میں بھکاری بن کر رہ جاتی ہے اور بھکاریوں کا نصیب بھیک ہوتی ہے‘ عزت نہیں اور ہم اس طرف بڑھ رہے ہیں۔

شیشے کی گیندیں
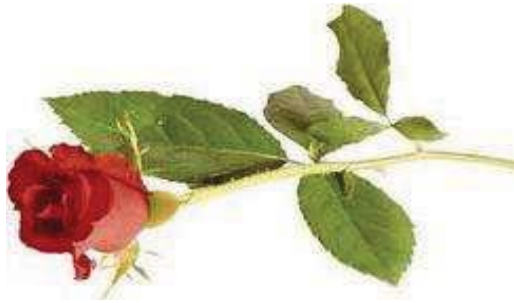
بریان ڈائی سن دنیا کی مشروبات بنانے والی سب سے بڑی کمپنی کا چیف ایگزیکٹو ہے' یہ ایک سمجھدار' خوش لباس اور ہنس مکھ انسان ہے۔ اس نے مارچ میں اپنے ورکروں سے ایک تاریخی خطاب کیا' ڈائی سن کی اس تقریر کو دنیا کی مختصر ترین اور جامع تقریر کا ٹائٹل ملا' اس تقریر میں وہ سب کچھ موجود ہے جس کو ہم سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ڈائی سن نے کہا "کام' خاندان' صحت' دوست اور روح وہ پانچ گیندیں ہیں جنہیں ہم لوگ سرکس کے جادوگروں کی طرح بیک وقت ہوا میں اچھالتے اور پکڑتے رہتے ہیں لیکن پھر زندگی کے ایک خاص حصے میں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوتا ہے ان پانچ گیندوں میں سے کام ربڑ کی گیند کا ہے' یہ جب نیچے گرتی ہے تو یہ اچھل کر دوبارہ ہمارے ہاتھ میں آجاتی ہے جبکہ باقی چار گیندیں یعنی خاندان' صحت' دوست اور روح شیشے سے بنی ہیں اور یہ اگر ایک بار گر جائیں تو یہ ٹوٹ جاتی ہیں' ان میں لکیر آجاتی ہے یا پھر یہ کسی نہ کسی زاویے سے دب جاتی ہیں" ڈائی سن کی تقریر ختم ہو گئی۔

مجھے یہ تقریر پچھلے دنوں کسی صاحب نے ٹورانٹو سے میل کی تھی اور میں نے جب سے یہ تقریر پڑھی ہے میں اس وقت سے اس کے سحر میں گرفتار ہوں' ہم لوگ روزانہ خاندان' صحت' دوستوں اور روح کی بات کرتے ہیں لیکن یہ چیزیں ہماری زندگی کیلئے کتنی اہم ہوتی ہیں ہم اس پر کبھی غور نہیں کرتے۔ خاندان انسان کی زندگی کی سب سے بڑی اچیومنٹ ہوتی ہے' ہم دنیا میں اکیلے آتے ہیں' ہمیں دوسرے لوگ یعنی ہمارے والدین' ہمارے چچا' تایا' پھوپھیاں اور خالائیں یا پھر بڑے بہن بھائی پالتے ہیں' ہمیں دوسرے لوگ تعلیم دیتے ہیں' ہم دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلتے اور زندگی گزارتے ہیں لیکن پھر ہماری زندگی میں کوئی عورت یا مرد آجاتا ہے اور ہم خاندان بن جاتے ہیں' اس خاندان کی وسعت سے بے شمار نئے رشتے جنم لیتے ہیں' یہ رشتے اور یہ خاندان بنیادی طور پر ہماری اصل طاقت اور ہماری اچیومنٹ ہوتا ہے' ہم دنیا میں کچھ بھی کر لیں' ہم پچاس مرتبہ ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لیں' ہم نیوکلیئر بم بنا لیں' ہم مریخ پر چلے جائیں یا پھر ہم سمندر کی اس تہہ میں اتر جائیں جہاں آج تک کوئی شخص نہیں پہنچ سکا لیکن اگر ہمارا کوئی خاندان نہیں' ہمارے گھر میں کوئی ایسی عورت نہیں جو صبح سے لے کر رات تک ہمارا انتظار کرتی ہے یا ہمارا کوئی خاوند نہیں جو دنیا بھر کے سفر سے واپسی پر ہمارے لئے نیکلس خرید کر لاتا ہے' جو ہمارے لئے رنگوں کا انتخاب کرتا ہے یا جو ہمیں یہ بتاتا ہے تمہیں اس کے بجائے وہ سینڈل زیادہ سوٹ کرے گا یا تم سرخ کی جگہ براؤن لپ سٹک لگاؤ تو تم زیادہ خوبصورت لگو گی اور اگر ہمارے گھر میں کوئی بچہ نہیں جو ہماری گاڑی کا ہارن سن کر یا ہمارے قدموں کی چاپ پہچان کر ابو آگئے' پاپا جی آگئے کے نعرے نہیں لگاتا اور اگر ہمارے گھر میں کوئی ماں ہماری سلامتی کیلئے دعائیں نہیں مانگ رہی یا کوئی بوڑھا والد ہماری واپسی تک بستر پر کروٹیں نہیں بدل رہا تو ہماری یہ ساری کامیابی پھیکی ثابت ہو گی' ہماری ہر اچیومنٹ کا ذائقہ کسیلا ہو گا اور ہمارے لئے ہر شام' ہر رات ہولناک ثابت ہو گی۔ اسی طرح اگر ہماری صحت سلامت نہیں' ہماری آنکھیں دکھ رہی ہیں' ہمارے کانوں میں ہر وقت شاں شاں ہوتی رہتی ہے' ہماری ناک خوشبو برداشت نہیں کر سکتی اور ہم ہر خوشبو پر بیس چھینکیں مارتے ہیں' ہمارا دل کمزور ہے ہم سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتے' ہم تیراکی نہیں کر سکتے' ہم پکوڑے نہیں کھا سکتے' ہمارا معدہ جواب دے

چکا ہے' یہ دلیہ تک برداشت نہیں کر سکتا' ہمیں ہر وقت کھٹے ڈکار آتے ہیں' ہمارے دانتوں کو کیڑا لگ گیا ہے' ہمارے منہ میں لعاب نہیں بنتا' ہمیں خدانخواستہ کینسر ہو چکا ہے' ہم شوگر' بلڈ پریشر اور ٹی بی میں مبتلا ہو گئے ہیں' ہمیں مرگی کے دورے پڑتے ہیں یا پھر ہماری ریڑھ کی ہڈی میں زخم لگ گیا ہے' ہماری ٹانگیں ٹیڑھی ہو گئی ہیں یا پھر ہمارے بازو سیدھے نہیں ہو رہے تو آپ تصور کیجئے اس وقت ہماری زندگی کتنی خوفناک ہو گی' ہمارے لئے اپنی اچیومنٹس کو انجوائے کرنا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ محمد علی کلے دنیا کے سب سے بڑے باکسر تھے لیکن یہ باکسر اس وقت انگلی سے اپنا ٹیلی ویژن آن نہیں کر سکتے' یہ نوٹ نہیں گن سکتے اور یہ اپنا پین اپنی جیب سے نہیں نکال سکتے کیونکہ ان کی انگلیوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے' ان کے ہاتھ سلامت ہیں' ان کی انگلیاں بھی اپنی جگہ موجود ہیں لیکن ان انگلیوں کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ آپ تصور کیجئے محمد علی کلے کی زندگی اس وقت کیا ہو گی؟ یہ کس اذیت سے گزر رہے ہوں گے؟ میں نے دنیا کے بے شمار لوگوں کو ویل چیئر پر اپنی ٹرافیوں اور میڈلز کے درمیان بیٹھے دیکھا' یہ سب لوگ کامیاب تھے لیکن آخر میں بیماری ان کی کامیابیوں کا سارا رس چوس گئی اور زندگی ان کیلئے چوسی ہوئی' تھوکی ہوئی گنڈیری بن گئی۔ ہم صحت کے بغیر موسم کو انجوائے کر سکتے ہیں اور نہ ہی کامیابی دولت' دوستوں اور عزیزوں کو۔ ہماری ایک اچیومنٹ ہمارے دوست بھی ہوتے ہیں' ہماری زندگی میں دوست ہیلپ لائن کی حیثیت رکھتے ہیں' ہم لوگ جب زندگی کے سخت اور کھردرے راستوں پر ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر تھک جاتے ہیں تو پھر ہمیں دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ دوست اس وقت ہمارے لئے جلے ہوئے زخموں پر برف کی ڈلی ثابت ہوتے ہیں' یہ ہمیں ریلیف بھی دیتے ہیں' حوصلہ بھی' ہمت بھی اور استقامت بھی۔ ہمارے دوست ہمارے لئے اس چھتری کی طرح ہوتے ہیں جو عام دنوں میں فضول چیز محسوس ہوتی ہے لیکن جونہی بارش کی پہلی پھوار پڑتی ہے یا پھر سورج عام دنوں سے زیادہ گرم ہوتا ہے تو اس وقت چھتری دنیا کی قیمتی ترین چیز بن جاتی ہے۔ آپ کبھی اس شخص کی اذیت ملاحظہ کیجئے جس نے قیمتی اطالوی سوٹ اور اس سے کہیں زیادہ قیمتی جوتے پہنے ہوں' وہ سڑک پر کھڑا ہو' اس پر بارش کی تیز پھوار پڑ رہی ہو اور اس کے دائیں بائیں' آگے پیچھے سے گزرنے والوں نے چھتریاں تان رکھی ہوں اور وہ شخص کبھی اپنے قیمتی سوٹ اور مہنگے جوتوں کو دیکھتا ہو اور پھر دوسرے لوگوں کی ٹوٹی پھوٹی چھتریوں پر نظر ڈالتا ہو' آپ اس وقت اس شخص کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کریں' آپ کو دوستی کی ساری سائنس سمجھ آ جائے گی۔ میں نے زندگی میں بے شمار لوگوں کو مصیبت کی گھڑیوں میں ایسے کندھے اور ایسے ہاتھ تلاش کرتے دیکھا جس پر وہ سر رکھ کر رو سکیں یا جسے وہ تھام کر چند لمحوں کیلئے اپنے آپ کو مطمئن کر لیں لیکن ضرورت کی اس گھڑی میں ساڑھے چھ ارب لوگوں میں ان کا کوئی دوست نہیں ہوتا چنانچہ یہ لوگ اپنی مصیبت' اپنی فرسٹریشن کی صلیب اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور ہماری آخری گیند روح ہے' ہمارے اندر ایک زہریلا سانپ بیٹھا ہے اس سانپ کے منہ پر ایک باریک ڈوری بندھی ہے' یہ ڈوری ہمارے اچھے کاموں' ہماری مثبت سوچ کے دھاگے سے بنی ہے اور جب تک ہم اچھے کام کرتے رہتے ہیں' ہم دوسروں کی مدد کرتے رہتے ہیں' ہم سیدھی اور نیک راہ پر چلتے رہتے ہیں' یہ ڈوری اس وقت تک سانپ کے منہ پر بندھی رہتی ہے لیکن جب ہم یہ کام بند کر دیتے ہیں تو ڈوری کھل جاتی ہے اور یہ سانپ ہمیں اندر سے ڈسنا شروع کر دیتا ہے' ہمیں ایک ایسی خوفناک اذیت میں مبتلا کر دیتا ہے جو ہمیں سانس تک نہیں لینے دیتی' ہم لوگ

[illegible]
دن میں کم از کم پندرہ مرتبہ ایسی روحانی اذیتوں سے گزرتے ہیں۔

یہ وہ تمام گیندیں ہیں جنہیں ہم روزانہ ہوا میں اچھالتے ہیں' اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہیں اور پھر اچھالتے ہیں اور ہماری کوشش ہوتی ہے ہم ان میں سے کسی گیند کو فرش پر نہ گرنے دیں لیکن پھر ہماری زندگی میں ایک عجیب وقت آتا ہے' ہم کام کو اپنی سب سے قیمتی گیند سمجھ بیٹھتے ہیں' ہم نوکری' دکان' صحافت' مشاورت' وزارت اور سفارت کو اپنی عزیز ترین گیند بنا لیتے ہیں' ہم اپنی ساری توجہ اس پر مرکوز کر دیتے ہیں اور ہماری خواہش ہوتی ہے ہماری یہ گیند زمین پر نہ گرے' اس کوشش کے دوران ہماری توجہ دوسری گیندوں سے ہٹ جاتی ہے اور باقی چاروں گیندوں میں سے کوئی نہ کوئی گیند ہمارے ہاتھ سے پھسل جاتی ہے' ایک چھناکے کی آواز آتی ہے اور ہمارا خاندان ٹوٹ جاتا ہے' ہم صحت کی نعمت سے محروم ہو جاتے ہیں' ہمارے دوست ہم سے الگ ہو جاتے ہیں یا پھر ہماری روح میں بیٹھے ہوئے سانپ کا منہ کھل جاتا ہے اور ہم حیرت سے دائیں بائیں دیکھتے ہیں اور اس لمحے کام کی گیند بھی ہمارے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور ہمیں اس وقت معلوم ہوتا ہے ہماری اصل متاع' ہماری اصل میراث تو ہمارا خاندان' ہماری صحت' ہمارے دوست اور ہماری روح تھی لیکن ہم نے ربڑ کی ایک گیند کے عوض شیشے کی ساری گیندیں زمین پر گرا دیں' ہمیں اس وقت معلوم ہوتا ہے ربڑ کی گیند تو زمین پر گر کر بھی سلامت ہے' یہ چند لمحوں میں لڑھک کر' اچھل پھدک کر کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے گی لیکن شیشے کی گیندیں زمین سے کبھی دوبارہ نہیں اٹھ سکیں گی۔ ہمیں اس وقت معلوم ہوتا ہے ہم سب گھاٹے کے سوداگر ہیں لیکن اس وقت ہمیں اس علم کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا کیونکہ وقت' سوچ' جھونکا اور شیشے کی ٹوٹی ہوئی گیند کبھی واپس نہیں آتی' ٹوٹے ہوئے رشتے اور کٹے ہوئے ہاتھ کبھی دوبارہ نہیں جڑتے۔

آٹے کا تھیلا
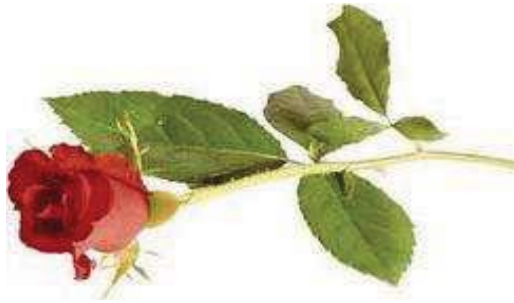
یہ امریکن ہیلی کاپٹر کی تصویر تھی ' ہیلی کاپٹر سکھر کے ہیلی پیڈ پر کھڑا تھا' وردی اور بغیر وردی کے مختلف لوگ ہیلی کاپٹر سے سامان اتار رہے تھے' ان لوگوں میں سفید شرٹ اور گرے پتلون میں ملبوس ایک درمیانی عمر کا امریکی بھی شامل تھا' اس امریکی نے چالیس کلو کا وزنی تھیلا اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا اور یہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہیلی پیڈ سے باہر نکل رہا تھا' میں نے اس امریکی کو پہچان لیا' یہ پاکستان میں امریکا کے نئے سفیر کیمرون منٹر ہیں' میں پچھلے ہفتے واشنگٹن میں حسین حقانی کے گھر ان سے ملا تھا' میرے ایک ساتھی نے ان سے میرا تعارف کرایا تو منٹر نے ہنس کر ریمارکس دیئے '' آپ لوگ پاکستان میں مجھے زیادہ تنگ نہ کیجئے گا' میں یہاں بیٹھ کر ہی پاکستانی میڈیا سے خوفزدہ ہوں'' ہم سب نے قہقہہ لگایا' اس کے بعد منٹر نے پہلو میں کھڑی اپنی بیگم کی طرف اشارہ کیا اور کہا'' اور اگر تنگ کرنا ضروری ہوا تو اپنی مہارت میری بیگم پر صرف کیجئے گا' میں چاہتا ہوں' کوئی شخص ان سے میرے بدلے بھی لے'' محفل میں ایک اور قہقہہ پڑا' اس کے بعد حسین حقانی نے ایک شرارتی قسم کا فقرہ داغا اور سفارتخانے کے دروازے تک قہقہے گونج گئے' یہ میری کیمرون منٹر سے پہلی اور شاید آخری ملاقات تھی کیونکہ یہ اب پاکستان تشریف لے آئے ہیں اور پاکستان میں امریکی سفیر پاکستانی صدر سے بھی زیادہ مصروف ہوتے ہیں' امریکی سفیر پاکستان آنے کے ایک ہفتے بعد امدادی سامان لے کر سکھر گئے' پاکستان کے سیلاب سے متاثرہ علاقے پوری طرح بحال نہیں ہوئے' کیمپوں میں پڑے ہوئے لوگ ابھی تک امداد کے منتظر ہیں' سردیاں شروع ہو چکی ہیں اور ان سردیوں کے ساتھ ہی متاثرین کی ضروریات بھی بدل رہی ہیں اور متاثرین کو اس بدلتی ہوئی صورتحال میں امداد کی نئی کھیپ کی ضرورت ہے' کیمرون منٹر امداد لے کر 30 اکتوبر 2010ء کو سکھر پہنچ گئے' ہیلی کاپٹر سے جب سامان اتارا جا رہا تھا تو امریکی سفیر کیمرون منٹر نے بھی اپنے ہاتھوں سے سامان اتارنا شروع کر دیا' یہ تصویر اس دوران کھینچی گئی تھی' یہ تصویر اتوار کے دن پاکستان کے تقریباً تمام بڑے اخبارات میں شائع ہوئی۔

یہ تصویر اپنی خاموش زبان سے دیکھنے والوں کو دو بڑے نقطے سمجھا رہی تھی۔ ایک' بڑی قوموں کی روایات بھی بڑی ہوتی ہیں' یہ اخلاقی لحاظ سے بھی سپر پاور ہوتی ہیں اور دوم' ہم جیسی چھوٹی قومیں اس لئے بھی چھوٹی ہیں کہ ہمارے اعلیٰ طبقے اس قسم کی عاجزی اور انکساری سے محروم ہیں۔ ہم پہلے بڑی قوموں کی اخلاقیات کی بات کرتے ہیں' تیسری دنیا کے ممالک میں امریکی سفیر وائسرائے کی حیثیت رکھتے ہیں' ان ممالک کے صدور اور وزراءاعظم تک ان سے بڑی '' عقیدت'' کے ساتھ ملتے ہیں' یہ جب کسی سیاسی جماعت کی قیادت سے ملاقات کیلئے جاتے ہیں تو یہ لوگ ان کی آمد سے قبل اپنے گھر' اپنے ڈرائنگ روم کو عرق گلاب سے غسل دیتے ہیں اور دو' دو دن تک ٹائیاں باندھنے اور کھولنے کی پریکٹس کرتے ہیں' یہ لوگ براہ راست اس ملک کے صدر' وزیراعظم اور آرمی چیف کو ٹیلی فون کرتے ہیں اور اپنی بات منواتے ہیں لیکن ان وسیع تر اختیارات کے باوجود یہ لوگ ذاتی رویوں میں انکساری کا مظاہرہ کرتے ہیں' یہ دوسروں کیلئے خود دروازہ کھولتے ہیں' مہمانوں کو گاڑی تک چھوڑنے جاتے ہیں' اپنی چائے اور کافی کا کپ خود بناتے ہیں' اپنے نوکروں' ملازموں اور ماتحتوں کو اپنے برابر کا انسان سمجھتے ہیں اور

قومی سانحوں میں اس قوم کا آگے بڑھ کر ہاتھ بٹاتے ہیں' آپ کو یاد ہو گا 2005ء کے زلزلے کے بعد اس وقت کے امریکی سفیر ریان سی کروکر نے بارہ کہو کے ایک سکول میں اپنے ہاتھ سے پینٹ کیا تھا' میں نے یہ تصویر بھی مختلف اخبارات میں دیکھی تھی' اب کیمرون منٹر کی تصویر بھی یہ ثابت کرتی ہے یہ لوگ اپنے ہاتھ سے کام کو برا نہیں سمجھتے' منٹر بھی ہمارے وزیروں' وزیراعظم اور صدر کی طرح سوٹ پہن کر ایک طرف کھڑے ہو سکتے تھے' ہیلی کاپٹر سے سامان اترتا' لوگوں کو قطاروں میں کھڑا کیا جاتا' کسی صاف ستھرے متاثرہ شخص کو نہلا دھلا کر لایا جاتا' امریکی سفیر مسکرا کر اسے لفافہ پکڑاتا بعد ازاں امریکی سفارتخانے کا کوئی ملازم امدادی سامان کا ایک تھیلا متاثرہ شخص کو پکڑا دیتا' تصویر بنتی اور یہ تصویر تمام اخبارات میں شائع ہو جاتی لیکن امریکی سفیر نے اس کے بجائے اپنے ہاتھوں سے سامان اتارنے کو اہمیت دی' ہو سکتا ہے یہ تصویر امریکی پروپیگنڈے کا حصہ ہو اور امریکی حکومت اس تصویر کے ذریعے پاکستانی معاشرے کو "پازیٹو میسج" دینا چاہتی ہو لیکن کیا ہماری حکومت اس قسم کا پروپیگنڈا نہیں کر سکتی تھی' تصویر اتروانے کیلئے ہی سہی لیکن کیا صدر' وزیراعظم' وفاقی وزراء' گورنرز اور وزراء اعلیٰ اپنے ہاتھوں سے امدادی سامان نہیں اتار سکتے تھے' کیا یہ لوگ اپنے کندھوں پر آٹے کا تھیلا نہیں اٹھا سکتے تھے اور یہ پانی اور کیچڑ میں چل کر لوگوں تک نہیں پہنچ سکتے تھے لیکن چار ماہ میں حکومت کے کسی اعلیٰ عہدیدار کو یہ توفیق نہیں ہوئی' یہ لوگ قیمتی عینکیں لگا کر' ویسٹ کوٹ پہن کر اور ٹائیاں لگا کر جعلی امدادی کیمپوں کے دورے کرتے رہے ہیں اور وہاں سے قوم سے خطاب کر کے واپس آتے رہے ہیں' یہ لوگ تصویر اتروانے کیلئے ہی سہی یہ ایسا کر سکتے تھے مگر ان لوگوں نے یہ بھی نہیں کیا۔

اس تصویر کا دوسرا پیغام ہمارا کلچر ہے' ہم لوگوں میں عاجزی اور انکساری کا فقدان ہے' ہمارے سیاستدان' ہمارے حکمران عام آدمی کو صرف ووٹوں کی مشین سمجھتے ہیں لہٰذا یہ لوگ جوں ہی اقتدار تک پہنچتے ہیں یہ عام آدمی کو بھول جاتے ہیں اور جہاں کہیں ان کا عام آدمی کے ساتھ انٹرایکشن ہوتا ہے وہاں سیکورٹی' پروٹوکول' پولیس' رینجرز' گارڈز اور بیوروکریسی عام آدمی کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور یہ لوگ اقتدار کی ماؤنٹ ایورسٹ پر بیٹھ کر عام کیڑے مکوڑوں سے مخاطب ہوتے ہیں' یہ تکبر' یہ فاصلہ بھی ہماری سیاست کا المیہ ہے اور اس نے بھی ہمیں ترقی یافتہ قوم نہیں بننے دیا' اس کے مقابلے میں بڑی اقوام کے حکمرانوں اور عام آدمی کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے' امریکی عوام صدر باراک حسین اوباما کو اپنے درمیان ریستورانوں میں کھانا کھاتے بھی دیکھتے ہیں اور ان کے وزراء' گورنرز اور دوسرے اعلیٰ عہدیدار بسوں' ٹرینوں اور ٹیکسیوں میں ان کے ساتھ سفر بھی کرتے ہیں' پچھلے دنوں معاشی حالات کی خرابی کے باعث برطانوی وزیراعظم ڈیوڈ کیمرون برٹش ائیرویز کی کمرشل فلائیٹ پر امریکا کے دورے پر گئے تھے' ان کا خیال تھا برطانیہ کے معاشی حالات خراب ہیں اور ان خراب معاشی حالات میں وزیراعظم کو اپنا طیارہ استعمال نہیں کرنا چاہیے جبکہ اس کے مقابلے میں ہمارے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اس انجلینا جولی کے ساتھ تصویر بنوانے کیلئے خصوصی طیارے پر اپنے خاندان کے لوگوں کو ملتان سے اسلام آباد منگواتے ہیں جو سیلاب سے متاثرہ لوگوں کی مدد کیلئے امریکہ سے پاکستان آئی تھی' ہمارے صدر' ہمارے وزیراعظم اور ہمارے گورنرز اور وزراء اعلیٰ آج اس وقت بھی طیارے اڑاتے پھر رہے ہیں جب سیلاب گزرنے

کے بعد بھی دو کروڑ لوگ اپنی چھتوں کے نیچے آباد نہیں ہو سکے ہماری [illegible] ان کی [illegible] جبکہ عام آدمی سڑکوں پر ایڑھیاں رگڑ رہا ہے۔

یہ تصویر اپنے منہ سے چیخ چیخ کر اعلان کر رہی ہے حضرت عمر فاروقؓ ہوں یا یوسف رضا گیلانی حکمران جب تک آٹے کا تھیلا اپنے کندھے پر اٹھا کر مظلوم کے دروازے تک نہیں پہنچتے اس وقت تک قوموں کا مقدر تبدیل نہیں ہوا کرتا اُس وقت تک روشن سورج مقدر کے بند دروازے پر دستک نہیں دیتا اور کیمرون منٹر کا ملک اس لئے سپر پاور ہے کہ اس کی قوم دو سو سال پہلے اسلام کے اس اصول کو سمجھ گئی تھی جبکہ اسلام کا یہ پیغام ہمارے حکمرانوں تک ابھی نہیں پہنچا' یہ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن اسلام ابھی ان کے ذہنوں تک نہیں پہنچا۔
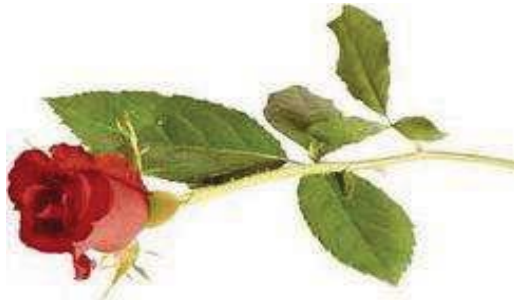
عقل پر تالہ

دنیا کی تاریخ میں علاؤالدین خلجی واحد بادشاہ تھا جس نے نہ صرف مہنگائی پر قابو پالیا تھا بلکہ دنیا کے بے شمار ممالک نے بعدازاں اس کی اصلاحات کو "کاپی" کیا۔ ہمیں آج امریکا' برطانیہ' جاپان اور انڈیا میں مہنگائی پر قابو پانے کے جتنے قوانین اور ادارے دکھائی دیتے ہیں ان کا اصل بانی علاؤالدین خلجی تھا۔ علاؤالدین خلجی نے اقتدار سنبھالا تو اس وقت ہندوستان دو بڑے مسائل کا شکار تھا' سابق حکمرانوں کی عیاشیوں کی وجہ سے خزانہ خالی تھا' حکومت قرضوں پر چل رہی تھی۔ دو' تاتاری عفریت بن کر آگے بڑھ رہے تھے اور دہلی کے تخت کو صاف دکھائی دے رہا تھا اگر ہندوستان نے اپنی دفاعی پوزیشن مضبوط نہ بنائی تو تاتاری اژدھے کی طرح پورے ملک کو نگل جائیں گے' اس صورتحال میں بادشاہ مخمصے کا شکار ہو گیا' ہندوستان کو بچانے کیلئے ایک مضبوط فوج چاہئے تھی لیکن فوج کو تنخواہیں اور دیگر مراعات کہاں سے دی جائیں گی؟۔ دوسرا' معاشی صورتحال کو کنٹرول کرنے کیلئے فوج کی تعداد اور مراعات میں کمی کی جائے تو ملک کو تاتاریوں سے کون بچائے گا؟۔ بادشاہ کے مشیروں نے اسے وہ مشورے دینا شروع کر دیئے جو عموماً اس قسم کی صورتحال میں حفیظ شیخ قسم کے مشیر یا وزیر دیتے ہیں۔ بادشاہ سے کہا گیا آپ عوام پر ٹیکس بڑھا دیں' ہندوستان میں اگنے' فروخت ہونے' خریدے جانے یا پھر استعمال کی جانے والی ہر جنس پر دس پندرہ فیصد جی ایس ٹی لگا دیا جائے لیکن بادشاہ نے سوچا کیا لقمے لقمے کو ترسے عوام مزید ٹیکس دے سکیں گے؟ اس کا جواب نفی میں تھا کیونکہ اس وقت دہلی شہر میں سفید پوش باآواز بلند زکوٰۃ اور صدقے کے حصول کیلئے صدائیں لگاتے تھے' لوگ تین کی جگہ دن میں ایک بار کھانا کھاتے تھے اور کچا پیاز باقاعدہ سالن بن چکا تھا۔ اس صورتحال میں بادشاہ کا ایک مشیر ملک خطیر الدین آگے بڑھا اور اس نے بادشاہ کو ایک ایسی پالیسی بنا کر دی جو آج سات سو سال گزرنے کے بعد بھی نہ صرف قابل عمل ہے بلکہ ماڈرن ورلڈ اس پر عمل پیرا بھی ہے۔ ملک خطیر الدین نے بادشاہ کو مشورہ دیا' آپ ملک کے تمام ادارے مختلف وزیروں کے حوالے کر دیں لیکن مہنگائی کنٹرول کرنے کا محکمہ اپنے ہاتھ میں رکھیں' آپ کھانے پینے اور عام استعمال کی اشیاء کی قیمتیں خود طے کریں اور روزانہ کی بنیاد پر ان کی پڑتال کریں۔ بادشاہ کو یہ مشورہ اچھا لگا چنانچہ اس نے سب سے پہلے پورے ملک کیلئے گندم' جو' چنے' چاول' گڑ اور دالوں کے نرخ طے کر دیئے' یہ ریٹس پورے ملک میں یکساں تھے اور کسی تاجر کو اس میں گڑبڑ کی اجازت نہیں تھی' بادشاہ نے بڑے شہر میں غلہ فروشوں کی منڈیاں بنوائیں' تاجروں کو ان منڈیوں میں آباد کرایا' شہر کے تمام لوگ صرف انہی منڈیوں سے اناج خرید سکتے تھے' ان منڈیوں کے علاوہ اناج کی خرید و فروخت پر پابندی لگا دی گئی' ان منڈیوں کے کھلنے اور بند ہونے کا وقت طے تھا' ملک میں اناج کی ذخیرہ اندوزی پر پابندی لگا دی گئی' جو تاجر اس قانون کی خلاف ورزی کرتا تھا' اسے منڈی کے عین درمیان میں کوڑے مارے جاتے تھے' سرکاری اہلکار کھیتوں سے براہ راست غلہ خریدتے تھے' یہ غلہ بعدازاں تاجروں کو فروخت کیا جاتا تھا اور تاجر طے شدہ منافع رکھ کر اسے گاہکوں کو فروخت کرتے تھے' بادشاہ کسانوں کی لاگت پر بھی توجہ دیتا تھا' اگر کسی سال بارش کم ہوتی یا بیج مہنگا ہو جاتا تو بادشاہ قیمتوں کو خود "ری وائز" کر دیتا تھا۔

علاؤالدین خلجی نے غلے کے بعد سبزی اور گوشت کے نرخ پر توجہ دی' اس نے سبزی بازار اور گوشت کی مارکیٹیں

بنائیں اور سرکاری اہلکاروں کو نگرانی کیلئے ان مارکیٹوں میں تعینات کر دیا اس کے بعد اس نے کپڑے پر توجہ دی' اس نے رومال سے لے کر ریشمی گاؤن تک ہر قسم کے کپڑے کی قیمتیں طے کر دیں' اس نے تمام شہروں میں "سرائے عدل" کے نام سے کپڑے کی مارکیٹیں بنوائیں اور ان مارکیٹوں کے علاوہ کپڑے کی فروخت پر پابندی لگا دی' ان مارکیٹوں کے اوقات طے تھے اور جو تاجر ان اوقات کی خلاف ورزی کرتا تھا اسے کڑی سزا دی جاتی تھی' اس نے اس کے بعد گھوڑوں' خچروں' اونٹوں' بیلوں اور گائے بھینسوں کے ریٹس بھی طے کر دیئے' اس نے غلاموں اور کنیزوں کے نرخ بھی طے کر دیئے' اس نے سوئی' کنگھی' جوتوں' برتنوں' روٹی' حلوے' ریوڑی اور پودینے تک کے ریٹس طے کر دیئے' اس نے تیل اور مہندی تک کا نرخ بھی فکس کر دیا' بادشاہ روزانہ نرخ چیک کرتا تھا' اپنے اہلکاروں سے رپورٹس منگواتا تھا' خود بازاروں کا جائزہ لیتا تھا اور کبھی کبھار بچوں کو پیسے دے کر بازار بھجوا دیتا تھا' یہ بچے مختلف دکانوں سے مختلف چیزیں خریدتے تھے اور اگر کسی دکاندار کے ریٹس میں فرق ہوتا تھا تو علاؤالدین خلجی اس دکاندار کی ناک یا کان کٹوا دیتا تھا۔ بادشاہ ریٹس کے معاملے میں اس قدر سخت اور قانونی تھا کہ اس نے دہلی کی طوائفوں کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا اور ان کے نرخ بھی طے کر دیئے۔ بادشاہ کی اس حکمت عملی کی وجہ سے مہنگائی کنٹرول ہوئی' لوگ خوشحال اور مطمئن ہوئے' خزانے میں پیسے آنے لگے اور بادشاہ نے فوج بڑھانا شروع کر دی۔ بادشاہ کی اس حکمت عملی کے باعث چار لاکھ 75 ہزار سواروں کا ایک لشکر جرار تیار ہو گیا' اس لشکر نے بعد ازاں نہ صرف مغلوں اور تاتاریوں کا مقابلہ کیا بلکہ بادشاہ نے مالوہ' اجین اور دکن کے علاقے بھی فتح کر لئے اور یہ دنیا کے نامور حکمرانوں میں شمار ہونے لگا۔

علاؤالدین خلجی تاریخ عالم کی ایک بڑی "سکسیس سٹوری" ثابت ہوا' اس نے ثابت کر دیا اگر حکمران چاہے تو یہ مہنگائی جیسے جن کو بھی بوتل میں بند کر سکتا ہے' علاؤالدین خلجی کے اس ماڈل سے اقوام عالم نے بہت کچھ سیکھا' یورپ اور امریکا میں بعد ازاں کوالٹی کنٹرول اور پرائس کنٹرول کے ادارے بنے' ہول سیلز مارکیٹیں اور کیش اینڈ کیری کے تصور نے جنم لیا' ڈرگ انسپکٹر اور پرائس کنٹرول اتھارٹیز کی بنیاد پڑی اور بنیادی اشیاء ضرورت کے کنٹرول کے فلسفے نے جنم لیا۔ یہ تمام ادارے اس وقت پاکستان میں بھی کام کر رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ ادارے فعال نہیں ہیں۔ اس کی چند بڑی وجوہات ہیں۔ اس کی پہلی وجہ حکومتوں' حکمرانوں اور سیاسی جماعتوں کے ذاتی مفادات ہیں' بدقسمتی سے عوام کو لوٹنے والے نوے فیصد تاجر اور صنعت کار حکومتوں اور سیاسی جماعتوں کا حصہ ہیں لہٰذا حکومت اور حکومتی ادارے ان کے سامنے بے بس ہیں' آپ ایک لمحے کیلئے سوچئے اس ملک میں آٹے کا بحران کون پیدا کرتا ہے' چینی کون سستی نہیں ہونے دے رہا۔ گھی' دالوں اور چاولوں پر کون قابض ہے' کپڑا کون مہنگا کر رہا ہے اور بجلی' گیس اور پٹرول کی مہنگائی سے کون فائدہ اٹھاتا ہے؟ آپ کو اس کا جواب حاصل کرنے کیلئے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں ہو گی۔ دوسری وجہ ترجیح ہے۔ پاکستان میں بدقسمتی سے مہنگائی سمیت تمام عوامی مسائل حکومتوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہیں چنانچہ ہمارے وزرائے اعظموں اور صدور کے پاس عراق' افغانستان' امریکا حتیٰ کہ چلی کے مسائل حل کرنے کیلئے وقت ہوتا ہے لیکن عوام کو سستے داموں چینی' آٹا' دالیں اور سبزیاں فراہم کرنے کیلئے ٹائم نہیں ہوتا۔ اس ملک میں این آر او جیسے ایشوز پر پارلیمنٹ کے دس دس

[illegible]
کیلئے وزیر قانون کو چودھری پرویز الٰہی کی رہائش گاہ پر بھجوا دیتے ہیں لیکن مہنگائی پر قابو پانے کیلئے پانچ منٹ کی میٹنگ نہیں کرتے' حکومت کی سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ وفاقی وزیر زراعت نذر گوندل فرماتے ہیں اگر چینی مہنگی ہے تو عوام چینی کا استعمال بند کر دیں' واہ کیا جواز ہے' کیا دلیل ہے۔اس کا مطلب تو یہ ہوا اگر کسی شخص کو جینے میں پرابلم ہو رہی ہے تو وہ خودکشی کر لے اور تیسری وجہ جب تک وزرائے اعلیٰ اور وزیراعظم پرائس اور کوالٹی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گے' یہ علاؤالدین خلجی کی سپرٹ سے کام نہیں کریں گے اس وقت تک ملک سے مہنگائی ختم نہیں ہو سکے گی لیکن ہمارے حکمران تو مار کوس بننے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ان کی کوشش ہے ان کی آخری عمر ہوائی میں گزرے لہٰذا ان کے پاس علاؤالدین خلجی جیسے کم عقل بادشاہ کی حکمت عملی پر غور کیلئے وقت نہیں۔

اللہ تعالیٰ جب کسی کی عقل پر تالہ لگا دیتا ہے تو وہ اس کو کیسا بنا دیتا ہے؟ یہ دیکھنا ہو تو آپ آج ایوان اقتدار کی طرف دیکھ لیجئے' آپ کو وہاں ایسے لوگ دکھائی دیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اقتدار دے کر ان سے عقل' درد دل اور عزت چھین لی۔

اگر کرنا چاہیں
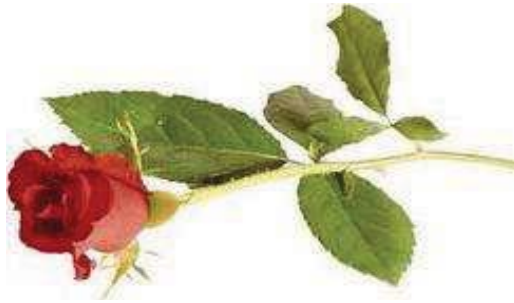
مجھ سے جب بھی کوئی شخص بے روزگاری‘ کم آمدنی اور غربت کی شکایت کرتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں تم مجھے اپنے ہاتھ دکھاؤ‘ وہ اپنے دونوں ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیتا ہے‘ میں اس کی انگلیاں گنتا ہوں‘ اس کا انگوٹھا دیکھتا ہوں‘ میں اس سے پھر اٹھ کر چلنے پھرنے اور دائیں بائیں دیکھنے کی درخواست کرتا ہوں‘ وہ اٹھ کر کمرے کا چکر لگاتا ہے‘ میں دیکھتا ہوں اللہ تعالیٰ نے اس کو دو پاؤں بھی دے رکھے ہیں اور یہ دنیا کے ہر انسان کی طرح دائیں بائیں بھی مڑ سکتا ہے۔ میں پھر اس سے پوچھتا ہوں ”کیا تمہیں سرخ رنگ سرخ‘ سبز رنگ سبز اور نیلا رنگ نیلا دکھائی دیتا ہے“ وہ اس پر بھی ہاں میں سر ہلا دیتا ہے‘ میں پھر اس سے پوچھتا ہوں ”کیا تم اخبار پڑھ سکتے ہو‘ خط لکھ سکتے ہو‘ کیا تمہیں کمپیوٹر آن کرنے کا طریقہ معلوم ہے‘ کیا تم یہ جانتے ہو اس وقت امریکا کا صدر بارک حسین اوباما ہے اور کیا تمہیں یہ معلوم ہے چین دنیا میں بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ مجھے ان تمام سوالوں کا جواب ہاں میں ملتا ہے تو میں کرسی کے ساتھ ٹیک لگاتا ہوں‘ ایک لمبی سانس لیتا ہوں اور اس سے عرض کرتا ہوں ”لیکن تم اس کے باوجود بے روزگار ہو‘ تمہاری تنخواہ کم ہے یا تم اپنی ضرورت کے مطابق پیسے نہیں کما پا رہے‘ مجھے اس کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی“ زیادہ تر لوگ اس بات پر مجھے حیرت‘ شک اور افسوس سے دیکھتے ہیں مگر میرے پاس اس نظریے کی باقاعدہ ٹھوس وجوہات موجود ہیں‘ میں یہ سمجھتا ہوں اس ملک کا وہ ان پڑھ سلیم جس کو اللہ تعالیٰ نے غربت‘ پسماندگی اور بے روزگاری دے کر زمین پر بھیجا تھا اگر تھوڑی سی توجہ اور معمولی سی ذہانت سے ارب پتی بن سکتا ہے تو اس ملک کے وہ تمام نوجوان جنہوں نے انیس سو اسی یا نوے میں آنکھ کھولی‘ جنہیں سکول جانے‘ تعلیم حاصل کرنے‘ کمپیوٹر چلانے اور آج کی ڈیجیٹل ایج میں زندگی گزارنے کا موقع ملا وہ تمام نوجوان بل گیٹس بن سکتے ہیں‘ یہ سب دس بیس برس میں ارب پتی ہو سکتے ہیں بس انہیں اس سپرٹ سے کام کرنا ہو گا جس سے سلیم نے کیا تھا۔

سلیم لاہور کا ایک معمولی سا الیکٹریشن تھا‘ یہ 84-1983ء میں لاہور کی ایک کاٹن مل میں چھوٹا سا ملازم تھا‘ یہ مل میں سوئچ لگاتا تھا‘ فیوز لگاتا تھا‘ کسی جگہ کوئی تار سپارک کر جاتی تو یہ تار تبدیل کر دیتا تھا اور اگر کوئی ساکٹ خراب ہو جاتی تھی تو یہ اس کی جگہ نئی ساکٹ لگا دیتا تھا۔ یہ مل کا ایک ایسا ملازم تھا جس کو فورمین سے اوپر کوئی نہیں جانتا تھا‘ اس دور میں سٹ ینٹر مشین نئی نئی آئی تھی‘ یہ مشین رنگائی کے دوران کپڑے کی ”ہیٹ سٹینگ“ کرتی تھی اور اس مشین سے گزرنے کے بعد کپڑے کا رنگ نہیں اڑتا تھا‘ سلیم جس فیکٹری میں کام کرتا تھا اس فیکٹری کے مالک نے کوریا سے سٹ ینٹر مشین منگوائی‘ یہ مشین اس دور میں ایک کروڑ روپے میں آئی اور یہ پاکستان میں اس نوعیت کی پہلی مشین تھی‘ فیکٹری کے مالک کو مشین کو لگانے اور چلانے کیلئے کوریا سے انجینئر بلانا پڑ گئے‘ یہ بیس لوگوں کی ٹیم تھی جس کی آمد و رفت‘ رہائش اور خوراک کے اخراجات فیکٹری مالک نے برداشت کئے‘ کوریا کے ان انجینئرز کیلئے فائیو سٹار ہوٹل میں کمرے بک کئے گئے‘ ان کیلئے گاڑیوں‘ گائیڈز اور گارڈز کا بندوبست کیا گیا اور ان کیلئے مشروبات اور خوراک کا انتظام بھی کیا گیا‘ یہ لوگ دو ماہ تک پاکستان میں رہے‘ سلیم مقامی کارکنوں میں شامل تھا‘ کوریا کا چیف انجینئر سلیم کو جہاں تار لگانے کا کہتا تھا یہ لگا دیتا تھا‘ جس جگہ سوئچ لگانے‘ فیوز لگانے اور جس پرزے کو جتنی وولٹیج کا کرنٹ دینے کا حکم دیتا تھا یہ اس کو اتنا کرنٹ دے دیتا تھا‘ سلیم اس وقت ایک کمرے کے

کوارٹر میں رہتا تھا' اس نے اس دوران مختلف رنگ کے چاک خرید لئے' یہ سارا دن کوریا کے انجینئروں کو مشین فٹ کرتے دیکھتا اور رات کو اپنے کمرے کی بڑی دیوار پر مختلف رنگوں کے چاک سے اس مشین کا ماڈل بناتا رہتا' یہ دیوار پر یہ نقش کر دیتا کہ یہ لوگ کس رنگ اور کس گیج کی تار کس مشین سے نکال کر کس مشین میں لا رہے ہیں' مشین کے بوائلرز کا سائز کیا ہے' کون سا پائپ کس جگہ فٹ کیا گیا' کس قسم کا نٹ یا بولٹ کس جگہ لگایا گیا اور کون سا پرزہ کس جگہ فٹ کیا گیا' وہ ایک دن یہ نقشہ بناتا اور اگلے دن مشین کا دوبارہ معائنہ کرتا اور اسے اپنے نقشے میں جو کمی یا کوتاہی نظر آتی یہ گھر واپس جا کر اسے ٹھیک کر لیتا' دو ماہ بعد جب مشین نے پروڈکشن شروع کی تو مشین کا پورا ڈایا گرام سلیم کے کمرے کی دیوار پر شفٹ ہو چکا تھا' سلیم سٹ بنٹر مشین کو لگانے کا سارا عمل سیکھ چکا تھا' کوریا کے انجینئر مشین لگا کر واپس چلے گئے' یہ مشین پاکستان کی کاٹن انڈسٹری میں انقلاب تھی' اس نے کپڑے کی پیداوار بھی بڑھا دی اور کوالٹی کو بھی امپروو کیا' اس سے فیکٹری کے کاروبار میں اضافہ ہو گیا لہٰذا مالک نے دوسری مشین کا آرڈر دے دیا' سلیم کو اس آرڈر کا علم ہوا تو یہ فیکٹری کے مالک کے پاس گیا اور اس سے عرض کیا "حاجی صاحب آپ نے کوریا کے انجینئروں کو مشین لگانے کے کتنے پیسے دیئے تھے" حاجی صاحب نے جمع تفریق کر کے اسے بتایا "وہ انجینئر ہمیں پچیس لاکھ روپے میں پڑے تھے" سلیم نے حاجی صاحب کو پیش کش کی "آپ مجھے صرف پانچ لاکھ روپے دے دیں' میں آپ کو یہ مشین فٹ کر دوں گا" حاجی صاحب کیلئے یہ ایک حیران کن آفر تھی کیونکہ یہ ایک جدید ترین ٹیکنالوجی تھی اور پورے ملک میں اس کو سمجھنے والا کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ دوسرا' سلیم ایک ان پڑھ' عام اور سادہ سا الیکٹریشن تھا جس کا علم تین تاروں کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ حاجی صاحب نے اسے طنزیہ نظروں سے دیکھا اور اس سے کہا "اور اگر تم نہ کر سکے تو!" سلیم نے سینے پر ہاتھ باندھ کر جواب دیا "آپ مجھے اس فیکٹری میں پھانسی دے دیجئے گا" حاجی صاحب نے سلیم کو موقع دینے کا فیصلہ کیا' اس فیصلے کی دو وجوہات تھیں' پہلی وجہ بیس لاکھ روپے کا فائدہ تھا' سلیم انہیں یہ 25 لاکھ کا کام پانچ لاکھ روپے میں کر کے دے رہا تھا۔ دوسرا' اگر یہ تجربہ کامیاب ہو جاتا تو فیکٹری کوریا کے انجینئروں کی محتاجی سے نکل جاتی۔ حاجی صاحب نے سلیم کی پیش کش قبول کر لی۔ انہوں نے کوریا سے مشین منگوائی اور سلیم کو کام کرنے کی اجازت دے دی۔ سلیم نے دیوار پر بنائے ہوئے ڈایا گرام کے مطابق مشین جوڑ دی۔ اس مشین نے نہ صرف کام شروع کر دیا بلکہ یہ پہلی مشین کے مقابلے میں زیادہ پروڈکشن دینے لگی' یوں تین ہزار روپے ماہانہ کمانے والا معمولی سا الیکٹریشن ایک ماہ میں پانچ لاکھ روپے کا مالک بن گیا' یہ سلیم کی کامیابی کا آغاز تھا' اس کے بعد پورے ملک میں تمام سٹ بنٹر سلیم نے لگائے' اس کا ایک پاؤں کراچی ہوتا تھا' دوسرا لاہور' تیسرا فیصل آباد اور چوتھا پشاور اور یہ ہر کاٹن مل کی ضرورت بن چکا تھا۔ 1990ء کی دہائی شروع ہوئی تو سلیم نے اپنا سٹ بنٹر بنا لیا' یہ سٹ بنٹر غیر ملکی سٹ بنٹر کے مقابلے میں سستا بھی تھا' اس کے سپیئر پارٹس بھی دستیاب تھے اور یہ لوکل مارکیٹ کی ضرورت کے مطابق بھی تھا۔ قصہ مختصر وہ سلیم جو کبھی ہاتھ باندھ کر حاجی صاحب کے پاس گیا تھا اور اس نے ان سے عرض کیا تھا "میں آپ کو مشین فٹ کر دیتا ہوں" اور حاجی صاحب نے بڑی نخوت سے اس سے پوچھا تھا "تم یہ مشین کیسے فٹ کرو گے" اس سلیم پر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہی حاجی صاحب اسے فون کرتے تھے اور اس سے کہتے تھے "سلیم صاحب میری مشین گڑبڑ

[illegible]

تین دن بعد آپ کے پاس چکر لگاؤں گا" اور حاجی صاحب اس کی منتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ سلیم آج بھی لاہور میں موجود ہے اور کاٹن کے کاروبار سے وابستہ زیادہ تر لوگ اس کے نام سے واقف ہیں۔ میں آج کے نوجوانوں کو دیکھتا ہوں' انہیں بے روزگاری' کم آمدنی اور غربت کی شکایت کرتے ہوئے سنتا ہوں تو مجھے سلیم یاد آ جاتا ہے اور میں ان سے کہتا ہوں اس ملک میں اگر ان پڑھ الیکٹریشن ارب پتی بن سکتا ہے' یہ اگر ایک کمرے کی دیوار پر مشین کا ڈایاگرام بنا کر کوریا کے انجینئروں کو "شکست" دے سکتا ہے تو پھر دوسرے لوگ ترقی کیوں نہیں کر سکتے؟ یہ اپنے لئے کامیابی اور ترقی کا راستہ کیوں نہیں کھول سکتے؟۔ حقیقت تو یہ ہے انسان اگر سلیم کی طرح ترقی کا فیصلہ کر لے تو اس کیلئے چاک کے چند ٹکڑے اور ایک کوری دیوار کافی ہوتی ہے اور انسان اگر بے ہمتی کا کمبل اوڑھ کر لیٹ جائے تو دنیا بھر کا علم اور اکیسویں صدی کی تازہ ترین ٹیکنالوجی بھی اسے ایک وقت کا کھانا فراہم نہیں کر سکتی۔ انسان اگر کرنا چاہے تو انٹارکٹکا کے برفیلے پہاڑوں سے لے کر گوبی کے صحرا تک یہ ساری زمین اس کیلئے وسیلہ بن جاتی ہے اور اگر انسان کچھ نہ کرنا چاہے تو اسے روٹی کا نوالہ توڑنے کیلئے بھی روبوٹ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ سونے کے پہاڑ پر بیٹھ کر بھی کنگلا رہتا ہے اور ہمارے زیادہ تر لوگ کنگلے ہیں' یہ وسائل کے پہاڑ پر بیٹھ کر بھی بے روزگار ہیں۔

چھوٹے چھوٹے راجہ داہر
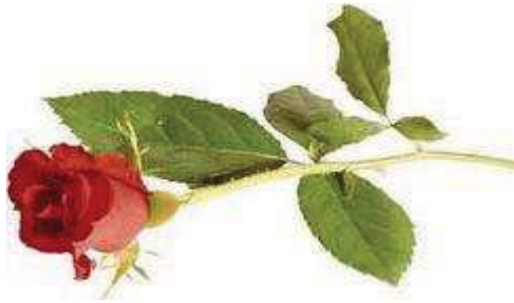
دنیا کے تمام بڑے بڑے واقعات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہوتا ہے اور ہم اکثر اس پہلو پر توجہ نہیں دیتے مثلاً آپ محمد بن قاسم کے واقعے ہی کو لے لیجئے' دیبل کے راجہ داہر نے مسلمانوں کا بحری جہاز لوٹ لیا' سامان ضبط کر لیا اور خواتین اور بچوں کو قید میں ڈال دیا۔ راجہ داہر کی قید میں محبوس ایک نوجوان لڑکی نے اپنے خون سے رومال پر مسلمانوں کے نام اپیل لکھی' یہ اپیل حجاج بن یوسف تک پہنچی' حجاج بن یوسف نے اپنے نوجوان بھتیجے محمد بن قاسم کی قیادت میں ایک لشکر ہندوستان بھجوا دیا' یہ ہندوستان پر مسلمانوں کا پہلا حملہ تھا' محمد بن قاسم نے نہ صرف دیبل کا قلعہ فتح کر لیا بلکہ وہ مار تا دھاڑ تا ہوا ملتان تک پہنچ گیا۔ ٹھٹھہ کے قریب راجہ داہر کے دیبل اور سسی کے بھنبھور (یہ دونوں ایک ہی شہر کے دو نام ہیں) کے آثار آج تک موجود ہیں' مجھے یہ آثار دیکھنے اور محمد بن قاسم کے ہاتھوں بننے والی ہندوستان کی پہلی مسجد میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا' دیبل کے آثار پر کھڑے ہو کر ڈھلتے ہوئے سورج کا مشاہدہ ایک "لائف ٹائم" تجربہ ہے' میں جب دیبل پہنچا تو یہ عصر کا وقت تھا' سورج آہستہ آہستہ پانیوں میں گھل رہا تھا لیکن اس وقت آسمان پر چاند بھی دکھائی دے رہا تھا' سورج مغرب کی سمت میں پانی پر جھکا ہوا تھا اور بارہویں رات کا چاند مشرق سے اوپر اٹھ رہا تھا' میں عصر کے وقت سورج اور چاند دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا' یہ میرے لئے ایک عجیب تجربہ تھا' آپ خود سوچئے' آپ مسجد باب الاسلام کے فرش پر کھڑے ہوں' آپ کے بائیں ہاتھ پر پانی کی وسیع چادر بچھی ہو' دائیں جانب شہر بھنبھور (دیبل) کے آثار بکھرے ہوئے ہوں اور آپ کائنات کی تنہائی کا ایک اداس عنصر بن کر قدرت کی مٹھی میں بند پڑے ہوں' آپ تصور کیجئے یہ منظر کس قدر خوبصورت' کس قدر جان لیوا اور کیسا یادگار ہو گا اور یہ یادگار منظر میرے حافظے کی سکرین کا مستقل وال پیپر بن چکا ہے۔ بہرحال موضوع کی طرف واپس آتا ہوں' جب بھی محمد بن قاسم کے دیبل پر حملے کا ذکر آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں مسلمانوں کی غیرت کا تصور ابھر آتا ہے' ہم فوراً سوچتے ہیں بنت اسلام کی ایک چیخ پر محمد بن قاسم حجاز سے تلوار لے کر نکل کھڑا ہوا اور اس نے جب تک غیرت اسلام کا حساب چکتا نہیں کیا' اس نے اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پینے دیا' وغیرہ وغیرہ۔ یہ درست ہے لیکن اس سچائی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور اس پہلو کو "رٹ" کہتے ہیں' مسلمان اس وقت دنیا کی ابھرتی ہوئی سپر پاور تھے' یہ مغرب کی طرف سے اٹلی' ایشیا کی طرف سے ایران اور افریقہ کی طرف سے مراکش' لیبیا اور مصر پر قبضہ بھی کر چکے تھے اور دنیا کے دلوں میں اپنا خوف بھی بٹھا چکے تھے لہٰذا اس دور میں اگر دیبل جیسے علاقوں کے چھوٹے چھوٹے سردار مسلمانوں کے جہاز لوٹ لیتے اور مسلمان عورتوں اور بچوں کو اپنا غلام بنا لیتے اور اس پر اسلامی ریاست خاموش رہتی تو کیا اس کی "رٹ" خطرے میں نہ پڑ جاتی؟ یہ یقیناً اسلامی ریاست کی رٹ کا معاملہ تھا لہٰذا حجاج بن یوسف نے راجہ داہر کو منہ توڑ جواب دینے کا فیصلہ کیا' حجاج بن یوسف کا فیصلہ بروقت بھی تھا اور دانش مندانہ بھی چنانچہ اس فیصلے کا یہ نتیجہ نکلا کہ آج تیرہ سو سال بعد بھی دنیا کے مورخ اس کا حوالہ دیتے ہیں اور اسلامی غیرت کی تعریف کرتے ہیں۔

حکومت کاری میں چھوٹے چھوٹے واقعات پر سخت ایکشن کامیابی' نیک نامی اور اقتدار کی مضبوطی کا ذریعہ ہوتے ہیں' حکومتوں کو سکندر اعظم جیسے دشمنوں کے مقابلے کا موقع ہزاروں سال میں ملتا ہے لیکن راجہ داہر جیسے

لوگ حکومت کو روزانہ اپنی رٹ اسٹیبلش کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں اور حکومت اگر ان موقعوں سے فائدہ اٹھالے تو حکومت کی نیک نامی' وقار اور عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے بر عکس اگر حکومت چھوٹے چھوٹے راجہ داہروں کی چھوٹی چھوٹی وارداتوں پر خاموش رہے' یہ ان کی وارداتوں' سازشوں اور تکبر سے لبریز حرکتوں پر آنکھیں بند رکھے تو حکومت کی رٹ ختم ہو جاتی ہے اور یہ مداری کا وہ ریچھ بن جاتی ہے جسے گلی کے آوارہ لونڈے پتھر مارتے ہیں اور یہ دھوپ میں لیٹ کر دم ہلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ اب اس تھیوری کو چینی کے موجودہ بحران میں رکھ کر دیکھئے' ملک میں چینی کا بحران پچھلے سال اگست میں پیدا ہوا تھا' مل مالکان نے اس دور میں چینی کا مصنوعی بحران پیدا کر دیا' اس وقت یہ خبریں پھیلنا شروع ہوگئیں کہ اس وقت کے وزیر صنعت و پیداوار میاں منظور وٹو اور وفاقی کابینہ کے چند دوسرے وزراء نے وسیع پیمانے پر چینی ذخیرہ کر لی ہے' ان خبروں کے ساتھ ہی چینی کی قیمت میں اضافہ ہونے لگا' یہ صورتحال اس قدر گھمبیر ہوگئی کہ سپریم کورٹ کو نہ صرف اس پر سوموٹو ایکشن لینا پڑ گیا بلکہ عدالت نے حکومت کو چالیس روپے میں عوام کو چینی فراہم کرنے کا حکم بھی دے دیا لیکن عدالت کے حکم کے باوجود چینی کا بحران قائم رہا' اس دوران وزیر خزانہ شوکت ترین کے دو بیانات نے بڑی شہرت پائی' شوکت ترین نے دعویٰ کیا چینی چور وفاقی کابینہ میں بیٹھے ہیں اور دوسرا ان لوگوں نے اس بحران سے 25 ارب روپے کمائے ہیں۔ آپ شوکت ترین پر ہزاروں الزام لگا سکتے ہیں لیکن جہاں تک ان کی معاشی مہارت' ایمانداری اور جرات کی بات ہے ہم ان میں کسی قسم کے شک کا اظہار نہیں کر سکتے' شوکت ترین کی بات درست تھی' چینی مافیا ہماری پارلیمنٹ کا حصہ ہے' پاکستان میں کل 82 شوگر ملیں ہیں اور ان میں سے زیادہ تر کے مالک سیاستدان ہیں' ان میں میاں برادران' چوہدری برادران' گوہر فیملی' اختر عبدالرحمان فیملی اور ہمارے صدر تک شامل ہیں' ان لوگوں کی وجہ سے حکومت چینی کے بحران پر قابو نہ پا سکی' جس کے نتیجے میں چھوٹے چھوٹے چور' ذخیرہ اندوز اور منافع خور بھی شیر ہوگئے لہٰذا آج پاکستان میں چینی 130 روپے کلو میں بک رہی ہے اور حکومت نے بے بسی سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر حکومت سمجھ دار ہوتی تو چینی ایک ایسا بحران تھا جس سے نہ صرف حکومت کی نیک نامی میں اضافہ ہو سکتا تھا بلکہ حکومت اس سے ملک میں اپنی رٹ بھی سٹیبلش کر سکتی تھی' یہ چینی چوروں' چینی مافیا اور چینی کے ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کریک ڈاؤن کرتی' یہ صدر آصف علی زرداری اور ذوالفقار مرزا سے لے کر میاں برادران اور اختر عبدالرحمان فیملی تک ان سب کے نام سامنے لے کر آتی جو اس وقت شوگر ملوں کے مالک ہیں اور جن کی وجہ سے چینی کی قیمتیں کنٹرول نہیں ہو رہیں' یہ ذخیرہ اندوزوں کو بھی گرفتار کرتی' یہ وقت پر چینی امپورٹ بھی کرتی اور اپنی نگرانی میں ملک بھر کی تمام دکانوں پر چینی پہنچاتی تو اس سے حکومت کی رٹ بھی مضبوط ہوتی' اس کی نیک نامی بھی بڑھتی اور جمہوریت پر لوگوں کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوتا لیکن حکومت نے نہ صرف یہ موقع کھو دیا بلکہ آج لوگ کھلے عام یہ کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں جو حکومت عوام کو چینی فراہم نہیں کر پا رہی یہ عوام کے بڑے بڑے مسئلے کیسے حل کرے گی' یہ ملک کے وقار کا جھنڈا کیسے بلند کرے گی' لوگوں کی بات درست ہے واقعی جو حکومت چھوٹے سے چور کو گرفتار نہیں کر سکتی وہ حکومت راجہ داہر جیسے لوگوں کا مقابلہ کیسے کرے گی۔ حکومتیں اور حکمران ہمیشہ اپنے چھوٹے چھوٹے فیصلوں سے پہچانے جاتے ہیں اور ہماری حکومت چھوٹے فیصلوں میں بھی ناکام ثابت ہو رہی ہے [illegible]

[illegible] کے شکار کیلئے نکل جاتی ہے لیکن یہ اندھیرے میں بلی کے خوف سے باہر جھانک کر نہیں دیکھتی' یہ آمریت کے سکندر اعظم کے مقابلے کیلئے تیار ہے لیکن اسے چینی مافیا کے چھوٹے چھوٹے راجہ داہر دکھائی نہیں دے رہے' یہ ان کے ہاتھوں میں بے بس ہے۔